ھوالقاھرُ فوق عبادہٖ

علماء ہند کا شاندار ماضی

جلد ۴

سنہ ۱۸۵۷ء

اور:-

جانبازانِ حُرّیت

از:-

مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند

ناشر:- ایم برادرس۔ دہلی ۶

مطبوعہ:- الجمعیۃ پریس۔ دہلی۔

تعداد:- ایکہزار (۱۳۸۰ھ / ۱۹۶۰ء)

قیمت مجلد ۷/۵۰

(کتبہ وزیر دوار رامپوری)

ملنے کا پتہ:-

۱- الجمعیۃ بک ڈپو۔ دلی ۶

۲- ایم برادرس کتابستان قاسمجان اسٹریٹ دلی ۶

فہرست مضامین و مردان کار آخر میں ملاحظہ فرمایئے

انتساب

نوشہ خاں ایک رضا کار تھا۔ تحریک خلافت میں گرفتار ہوا۔ سزا کاٹی۔ پھر ۳۲/۱۹۳۰ء کی تحریک آزادی میں پیش پیش رہا۔ سرکار پرستوں کے طعنے سُنے۔ بچّوں کو بھوکا ننگا رکھا۔ مگر حُبِّ وطن کے تقاضوں کو پُورا کرنے کے لیے اُس کا قدم آگے ہی بڑھتا رہا۔

۱۹۳۶ء میں یو۔ پی کونسل کے لیے ضلع مراد آباد کے ایک حلقہ میں ضمنی انتخاب ہوا۔ مولانا بشیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ رکن مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کانگریس کی طرف سے اُمیدوار تھے۔ مقابلہ بہت سخت تھا۔ نوشہ خاں بھی شہر مراد آباد کے رضا کاروں کا ایک دستہ لیکر اس الیکشن میں کام کرنے کے لئے "کانٹھ"[1] پہونچے۔ بھوکے پیٹ دن بھر کام کیا۔ رات کو کھانے میں صرف چاول میسّر آسکے۔

جنوری کا مہینہ۔ کڑاکے کی سردی۔ کپڑے ناکافی۔ چاول کھا کر فرش زمین پر سونا ہوا۔ صُبح آنکھ کھُلی تو نوشہ خاں کو نزلہ و زکام تھا۔ شام تک نمونیہ ہو گیا۔ اپنے وطن مراد آباد واپس ہوئے اور اگلے روز اس وطنِ عارضی سے وطن حقیقی کی طرف رخصت ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

یہ کتاب ایسے ہی جان باز و ایثار شیوہ مجاہدینِ حُرّیت کی خدمت میں نذر ہے جن کی قربانیوں نے ایثار و اخلاص کی عظیم الشان مثال قائم کی۔ مگر وہ خود سنگ بنیاد کی طرح ایسے اوجھل ہوئے کہ نہ کامیاب ہونے والوں کی نظریں اُن پر پڑیں اور نہ تاریخ اُن کے آثار و نشانات کو محفوظ رکھ سکی۔

محمد میاں

[1] کانٹھ۔ ضلع مراد آباد کا ایک قصبہ ہے۔

بِسمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ النبی الاُمی خاتم الانبیاء والمرسلین رحمۃ للعالمین المبعوث الیٰ کافۃ الناس بشیرًا و نذیرا۔ وعلیٰ اٰلہ و صحبہ الطیبین الطاہرین ما کانت الایام متداولۃ بین الناس و ما دام فی دفع الناس بعضھم ببعض حیاۃ للملل ودفعًا للباس۔

ضرورت و مقصد

ناکامی ایک قسم کی موت ہے۔ میت کی صورت دیکھنے والے جس آسانی سے ...ں اور ناتوانی کا تصور کر سکتے ہیں اس طرح عہد شباب کی قوت و رعنائی کا تصور نہیں کر سکتے ...ر اگر کوئی کہنے لگے کہ ع "انھیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے" تو افسردہ طبیعتوں اور پژمردہ ماغوں کو اس کے یقین کرنے میں ذرا تامل نہ ہوگا۔

سو سال پہلے ۱۸۵۷ء کا وہ عظیم الشان جہاد جس کو نشہ کامرانی کے بدمستوں نے "غدر" کا نام دیا تھا جس نے ایک برس سے زیادہ عرصہ تک شمالی ہند کے طول و عرض کو تہ و بالا

اور مظلومانہ جان سپاری کا لالہ زار بنائے رکھا تھا، وہ اسی اصول کی ایک تاریخی مثال ہے۔

دورِ غلامی کی افسردہ آب و ہوا میں جن دماغوں نے پرورش پائی تھی اگر وہ انگریز ماسٹروں کے پڑھائے ہوئے سبق کو یاد کرلیں اور برطانوی سامراج کے اس پروپیگنڈے کو کہ

"۱۸۵۷ء کا خلفشار شورہ پشت فوجیوں کی سرکشی اور خود غرض اقتدار پسندوں کی حرکت مذبوحانہ اور گمراہ سازش تھی۔"

حقیقت سمجھنے لگیں گے تو اس سے اصل حقیقت نہیں بدل سکتی۔ اور جو واقعہ ہے اس کے واقعہ ہونے میں فرق نہیں آسکتا۔

حقیقت بہرحال حقیقت ہے خواہ اس پر کتنے ہی پردے ڈال دیئے جائیں اور اس کو دیکھنے سے خواہ کتنی ہی چشم پوشی کی جائے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

برطانوی جبر و قہر کے بادل جیسے ہی چھٹنے شروع ہوئے آفتاب حقیقت کی کرنیں نمودار ہونے لگیں جس کو نصف صدی سے زائد تک غدر کہا گیا تھا طبیعتیں اس کو غدر کہتے سے شرمانے لگیں اور جن کو غدار کہا جارہا تھا اُن کو "عاشقانِ پاک طینت" سمجھا جانے لگا۔ اُن کے رسم جاں بازی کو زندہ کرنے کی اُمنگیں دلوں میں پیدا ہونے لگیں

عجب رسمے بنا کردند بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

دنائک[۵۱] دامودر ساورکر، خواجہ حسن نظامی اور پنڈت سندر لال جیسے مصنفین نے انگریزی، اُردو اور ہندی میں اپنے اپنے طرز پر حقیقت کی نقاب کشائی شروع کی اسی برطانوی سامراج کے دورِ تشدد میں اسی کتاب یعنی شاندار ماضی جلد چہارم نے اختصار و اجمال کے ساتھ کچھ اشارے کنائے کئے تھے مگر ساورکر کی کتاب نیز "بھارت میں[۵۲] انگریزی راج" کی طرح علماء ہند کا شاندار ماضی بھی حبس و بندش کی نذر ہوا۔ کتاب ضبط۔ پریس ضبط۔ مصنف گرفتار، اس پر مقدمہ جرمانہ، سزا۔ لیکن یہ جور و ستم کب تک۔؟

پنداشت ستمگر کہ جفا بر ما کرد

بر گردن او بماند و بر ما بگذشت

خدا کا شکر ہے دوسری بار ۱۹۴۷ء (۱۹۵۷ء) آیا تو یہ تمام بند شیں داستان پارینہ بن چکی تھیں اور اب آفتاب حقیقت کو حق تھا کہ جتنی تابانی کے ساتھ چاہے وہ درخشاں ہو۔ چنانچہ بیشمار کتابیں اور رسالے اُردو ہندی اور انگریزی میں شائع ہوئے اور ہر ایک نے اپنے اپنے اسلوب اور انداز میں قربان ہونے والوں کو خراج عقیدت پیش کیا اور اُن کے ایثار و قربانی کے ترانے گائے۔

تصانیف کا سلسلہ اتنا وسیع ہوا اور اس موضوع پر کتابوں کا شمار اتنا بڑھ گیا کہ

---

۵۱ یہ وہی ساورکر ہیں جو آخری دور میں تنگ نظر متعصب رہنما کی حیثیت سے مشہور ہوئے ابتدا میں پُرجوش انقلابی تھے۔ اُن کی کتاب پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۱۰ء میں لندن میں شائع کی گئی جو ہندوستان میں پہونچتے ہی ضبط کر لی گئی۔

۵۲ بھارت میں انگریزی راج۔ پنڈت سندر لال جی کی مشہور کتاب ہے جو تقریباً سنہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی اور فوراً ہی ضبط کر لی گئی۔

کہ شاندار ماضی کی ترتیب جدید میں اس حصہ کی اشاعت فضول اور عبث معلوم ہونے لگی "کما قیل"

سخن گرچہ دلبند و شیریں بود ❊ سزاوار تصدیق و تحسیں بود
چو یکبار گفتی مگو باز پس ❊ کہ حلوا چو یکبار خوردند بس

مگر قابل قدر تصانیف کی کثرت کے باوجود چند مسئلے ایسے تھے جن کی جستجو باقی رہی اور اس کے باوجود کہ ہر ایک شائع شدہ کتاب کا مطالعہ پورے ذوق و شوق سے کیا، توسنِ جستجو ناکام ہی واپس ہوتا رہا۔

تب ضرورت محسوس ہوئی کہ شاندار ماضی کی ترتیب جدید کو اس دور کے تذکرہ سے محروم نہ کیا جائے۔ تاکہ وہ پہلو جو مصنفین کرام سے نظر انداز ہو گئے ہیں اُن پر روشنی پڑ جائے اور اس دور کے رہنما بالخصوص علمائے کرام کی خدمات کسی قدر تفصیل کے ساتھ سامنے آجائیں۔ و باللہ التوفیق۔

جلد چہارم کے ابواب

شاندار ماضی کے اس حصہ میں باب کا عنوان تو آپ کہیں ملاحظہ نہیں فرمائیں گے البتہ ذہنی تربیت کے لحاظ سے یہ کتاب تین ابواب پر منقسم ہے۔ (۱) تحریک کی حیثیت اُس کے وجوہ اور اسباب۔ اس کے متعلق اعتراضات کے جوابات۔ (۲) تحریک کے مرکز اور مجاہدین حریت کی جدوجہد۔ پھر انتقامی کارروائیاں (۳) تحریک کے زعماء اور رہنما۔ اور اُن کی خدمات۔

شکریہ

ع۱ اور ع۲ کے متعلق مطبوعہ اور قلمی کتابوں سے مواد فراہم کیا گیا ہے۔ حاشیہ میں ہر ایک ماخذ کا حوالہ دیدیا گیا ہے لیکن ع۳ یعنی زعماء تحریک کے تذکرہ کے لئے تصنیفات کے علاوہ بیانات سے بھی استفادہ کرنا پڑا ہے۔ یہ ناکارہ خادم اُن تمام احباب اور بزرگوں کا شکر گذار ہے جنھوں نے کسی بھی صورت سے اس مقصد میں مدد فرمائی۔ بہت سے حضرات نے معلومات فراہم کر کے کسی شخصیت کے متعلق مضمون مرتب کیا جو روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا، اس کتاب میں ان مضامین سے استفادہ کیا گیا ہے یہ سب حضرات ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اُن کے اسمائے گرامی اُن کے مضامین کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں ان کے علاوہ یہ احقر خصوصیت سے مولانا عبدالشاہد خاں صاحب شیروانی مصنف باغی ہندوستان کا شکر گذار ہے جنھوں نے احقر کے لئے وہ نایاب کتابیں فراہم کیں جن کی جستجو سے دست طلب ناکام اور ماندہ ہو چکا تھا۔

مولانا عبداللہ خاں صاحب بجنوری بھی احقر کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ آپ نے سرسید رح کی مشہور مگر نایاب تصنیف "سرکشی اہل بجنور" کا قلمی نسخہ احقر کے لئے فراہم کیا۔

مولانا وحیدالدین صاحب قاسمی انچارج دفتر جمعیۃ علماء ہند کا بھی احقر شکر گذار ہے کہ آپ نے احقر کے لئے قلمی رسالے فراہم کئے اور جہاں جو مضمون مناسب معلوم ہوا خاص طور سے اس کو مہیا فرما کر احقر کو ممنون فرمایا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس کتاب کی ترتیب کی سب سے بڑی تحریک آپکی زیرلب فرمائش تھی جس نے احقر میں آمادگی پیدا کی

فشکرھم اللہ ومن لم یشکر الناس لم یشکر اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسباب[1] وجوہات اور پس منظر

(۱) اقتصادی وجوہات

پروفیسر باری کی مشہور کتاب "کمپنی کی حکومت" کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

ہندوستان میں مغلوں کی حکومت جاگیری نظام کا عروج تھی۔ جاگیری عہد کی تاریخ میں اتنی بڑی سلطنت کسی دوسری جگہ دکھائی نہیں دیتی۔

سترھویں صدی عیسوی کے آخری سالوں میں مغل حکومت نے دکن کی ریاستوں کو ختم کرنا چاہا۔ چنانچہ لمبی لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان لڑائیوں نے مفتوح کو کمزور اور فاتح کو کمزور تر کر دیا۔ چند سال بعد

---

[1] یہ ایک پامال عنوان ہے۔ ہر ایک مصنف نے تفصیل سے اسباب و وجوہات بیان کئے ہیں۔ ہمارا منشاء ان کا اعادہ کرنا نہیں ہے بلکہ کچھ اعتراض ہیں ان کے جواب دینے کے لئے یہاں یہ تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

مغل سلطنت کی مرکزیت ختم ہوگئی [1] دہلی ہی کے نمونے پر ہندوستان میں کئی ایک جاگیری ریاستیں قائم ہوگئیں۔ یہ ریاستیں دہلی سے تو کٹ چکی تھیں لیکن عام طور پر اُسی نظام کی پیروی کر رہی تھیں جو صدیوں سے دہلی میں رائج ہوچکا تھا۔

ان ریاستوں نے پیدائش کی نئی نئی قوتوں کو دبائے رکھا اس دباؤ سے ان ریاستوں کا جاگیری نظام بھی ٹوٹنے لگا۔

جب یہ جاگیری نظام ٹوٹ رہا تھا تب انگریزوں نے ہندوستان کی سیاست میں دخل دیا۔

انگلستان میں جاگیری نظام ختم ہوچکا تھا۔ وہاں پیدائش کے نئے عناصر کارفرما تھے۔

انسانی تہذیب کی تاریخ میں ان عناصر نے خواہ کتنے ہی اہم نتائج پیدا کئے ہوں وہ ہندوستان کی تسخیر میں سب سے زیادہ موثر ثابت ہوئے

---

[1] حقیقت اور واقعہ یہی ہے کہ یہاں عالمگیر کی وفات سے چند سال بعد مرکزیت ختم ہوگئی مگر سلطان عالمگیر کے حامی اس کا الزام عالمگیر کے بجائے اس کے نااہل جانشینوں پر لگاتے ہیں کہ وہ اپنے باپ دادا کی روایات کے خلاف کاہل، متلون مزاج، ناعاقبت اندیش ہوتے رہے اگر ان میں صلاحیت ہوتی تو اکبر اور ہمایوں کی طرح وہ اس کمزوری کو دور کر سکتے تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ جب خود عالمگیر نے باپ سے بغاوت کر کے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو مغل شاہنشاہیت کمزور نہیں ہوئی تھی۔ مگر عالمگیر کے عزم و استقلال نے کمزوری کے جراثیم ختم کر کے مغل شاہنشاہیت کی رگوں میں ہمت و جرأت کا ایسا انجیکشن کیا کہ تنزل کے بجائے حدود مملکت دو چند وسیع ہوگئیں۔ اور ہندوستان جو ایک ہزار سال سے بہت سے حصوں میں بٹا ہوا تھا ایک مرکز کے ماتحت متحد ہوگیا۔

انگریزوں نے ہندوستان میں جن حکمرانوں کو آسانی سے شکستیں دیں وہ پرانے
اور مٹتے ہوئے جاگیری نظام کے علم بردار تھے. نئی معاشی قوتوں نے نہ
صرف یورپ میں بلکہ ہندوستان میں بھی جاگیری نظام کو شکست دی۔
یورپی ملکوں میں اس نظام کو وہاں کے دیسی لوگوں نے ختم کیا۔
لیکن ہندوستان میں یہ نظام اجنبی ہاتھوں سے مٹا۔
اجنبی ہاتھوں نے اس نظام کو جہاں چاہا مٹا دیا اور جہاں چاہا اسے
زندہ رکھا۔ اس مٹتی ہوئی جاگیرشاہی نے ۱۸۵۷ء میں انگڑائی لی۔[1]

اگر آپ پروفیسر صاحب کی اس فاضلانہ تحریر کا خلاصہ معلوم کرنا چاہیں تو اُس کے مختصر الفاظ یہ ہوں گے۔

(۱) یہ تحریک صرف ہنگامی شورش نہیں تھی جو چند شورہ پشت اور سرکش فوجی افسروں کی ناراضگی سے پیدا ہوگئی تھی بلکہ اس کی تہ میں ایسے اسباب موجود تھے جن کو نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی حالات کا تقاضا کہا جا سکتا ہے جن کا سلسلہ پوری دنیا ورنہ کم از کم ہندوستان اور بیدار مغز یورپ میں عرصہ سے چل رہا تھا

(۲) ہندوستان کے نظام کہن کو بدلتے میں انگریزوں نے عالمی حالات کی آڑ ضرور لی مگر صرف نمائش کی حد تک۔ ورنہ اُن کا حقیقی نصب العین انگریزی شاہنشاہیت کا بقا اور تحفظ تھا۔ اسی وجہ سے سب جگہ اُن کا عمل یکساں نہیں رہا۔ بلکہ بقول پروفیسر صاحب۔

"جہاں چاہا اس نظام کو مٹایا اور جہاں چاہا زندہ رکھا۔"

(۳) اس ردّ و بدل کا لازمی نتیجہ تھا کہ بحرانی اور اضطرابی کیفیت پیدا ہو چنانچہ

---

[1] کمپنی کی حکومت ص ۳۵۶

پروفیسر صاحب کی رائے ہے۔

اس مٹتی ہوئی جاگیر شاہی نے ۱۸۵۷ء میں انگڑائی لی۔"

پروفیسر صاحب کا منشا یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا یہ ہنگامہ محض وقتی نہیں تھا بلکہ ایک عرصہ سے اس کی چنگاریاں ہندوستانی جذبات کے خاکستر میں سلگ رہی تھیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

لارڈ ڈلہوزی کے مستعفی ہونے کے بعد لارڈ کیننگ (۱۸۵۶-۱۸۶۲) کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ کمپنی کی مجلس نظامت نے لندن میں لارڈ کیننگ کو ایک الوداعی پارٹی دی۔ اس پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ کیننگ نے کہا :-

"میری خواہش ہے کہ میرا عہد حکومت پُرامن رہے۔ لیکن میں اس بات کو نہیں بھول سکتا کہ ہندوستان کی فضا میں بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دکھائی دیگا۔ اتنا چھوٹا جتنا انسانی ہاتھ۔ لیکن یہ ٹکڑا اتنا بڑا ہوتا جائے گا کہ خود ہمارا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا۔"

پروفیسر صاحب اس پیشین گوئی کی تصدیق ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"اگلے سال بنگال آرمی کے فوجیوں نے بغاوت کر دی۔ انسانی ہاتھ اتنا بڑا بادل میرٹھ سے اُٹھا۔ بادل بڑا ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ شمالی ہندوستان پر چھا گیا۔ [1]

پروفیسر صاحب نے کمیونسٹ نقطہ نظر سے اس عظیم الشان ہنگامہ کی جو وجہ بیان کی ہے

---

[1] کمپنی کی حکومت ص ۳۵۷

(یعنی مٹتی ہوئی جاگیر شاہی کی آخری انگڑائی) وہ ممکن ہے کسی خاص مفہوم کے ساتھ درست ہو سکے۔ لیکن اس توجیہہ کا یہ پہلو نظر انداز نہ ہونا چاہیئے کہ اس صورت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپرداز جن کے خلاف یہ علم بغاوت بلند کیا گیا تھا ہماری ہمدردیوں کے زیادہ مستحق قرار پاتے ہیں کیونکہ وہ جاگیر شاہی کے خلاف اصلاح پسندوں کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں جن کا احترام ہر ایک انصاف پسند کو کرنا چاہیئے۔ بہت سے بہت ان پر یہی الزام لگایا جا سکتا ہے کہ وہ نمائشی لیڈر کی طرح اپنے عمل میں اخلاص نہیں رکھتے تھے۔ مگر یہ الزام ایسا ہے جس سے بہت ہی کم رہنما اور زعماء نجات پا سکتے ہیں حتیٰ کہ بیسویں صدی کے وہ رہنما جن کو کامیابی کے سہرے پہنائے گئے اگر ان کی نیتوں اور ارادوں کا ایکسرے کیا جائے تو ایسی تعداد بہت ہی کم ہو گی جن کے جذبات حریت میں نمود و نمائش اور گندم نمائی و جو فروشی کے دھبے نظر نہ آئیں۔

پروفیسر صاحب شاید بہادر شاہ ظفر۔ جنرل بخت خاں۔ نواب جھجر۔ راجہ بلب گڈھ مہارانی لکشمی بائی۔ کنور جگدیش سنگھ۔ عظیم اللہ صاحب۔ تانتیا ٹوپیا۔ نواب محمد علی اور نواب خان بہادر خاں وغیرہ کو صرف اس بنا پر ہمدردی کا مستحق قرار دیں کہ ان پر ظلم بہت کئے گئے اور تہذیب کی دعویدار قوم نے بربریت اور سفاکی کے وہ مظاہرے کئے کہ ہلاکو اور نادر شاہ کی روحیں بھی کانپ اٹھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ

(۱) اول تو ہر ایک جاگیردارانہ نظام کو ایک ہی حیثیت دینا اور روس کی نفرت انگیز دنباہ کن جاگیر شاہی کی عینک سے ہر ایک جاگیردارانہ نظام کو دیکھنا ایسی انتہا پسندی ہے کہ کوئی بھی منصف مزاج اس کی تائید و حمایت نہیں کر سکتا۔

خدا پنج انگشت یکساں نکرد

چنانچہ روس کے نظام جاگیر شاہی کے مظالم سے عوام یہاں تک آزردہ تھے کہ کلیسا کو جاگیرداری کا ہم نوا دیکھا تو وہ کمیونزم کی حمایت میں نہ صرف کلیسا بلکہ مذہب سے بھی دست بردار ہو گئے۔

لیکن ہندوستان میں حالت اس کے برعکس تھی۔ ہندوستانی عوام ان اصلاح پسندوں کے مقابلہ میں اپنے پرانے جاگیرداروں کے حامی تھے انتہا یہ کہ وہ ان کو ختم کرنے کے لئے ہر ایک قربانی دینے کو تیار تھے جو اُن کے جاگیرداروں۔ مکھیاؤں، مُقدموں اور گاؤں کے پٹیلوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

اس سلسلہ میں ایسے افسر کی شہادت سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو ہندوستانی نہیں بلکہ انہیں اصلاح کے دعویداروں کا ہم قوم ہم وطن اور ہم مذہب ہے اور جو صرف تحریر یا تجویز کا شاہ نہیں بلکہ تجاویز کو عملی جامہ پہنانا اُس کے سپرد ہے۔ یہ ولیم اڈوارڈس ہیں جو اس ہنگامہ کے وقت ضلع بدایوں کے مجسٹریٹ تھے۔ ان کی تحریری شہادت ہے۔

"ضلع میں ایسے بہت لوگ میرے دوست تھے جو مجھ کو پناہ دے سکتے تھے بلکہ یہ لوگ خود اس کے آرزومند تھے۔ لیکن میرے ساتھ میرے بہت سے ساتھیوں کو بھی پناہ دیکر اپنے امن کو تذبذب میں ڈالدینا کسی طرح پسند نہیں کرتے تھے۔ خصوصًا اس سبب سے کہ اُن میں بعض لوگوں نے ایسی زمینداریاں مول لی تھیں جو ہماری دیوانی عدالتوں کی ڈگریوں میں سختی کے ساتھ نیلام ہوئی تھیں اور اسی لئے ضلع کے لوگ اُن سے عداوت رکھتے تھے۔ پچھلے بارہ پندرہ برسوں میں

ایسے نیلام بڑی کثرت سے ہوئے اور تحصیل مالگذاری کے ایسے طریقے جاری ہوئے کہ ملک کے رئیس لوگ برباد ہو گئے اور دیہات کے جتھے ٹوٹ گئے .... اکثر ذی مرتبہ اور مقتدر خاندانوں کے علاقے فریب بادغابازی سے چھن گئے اور اجنبی لوگوں مثلاً مہاجنوں یا سرکاری ملازموں نے جن کا پاس و لحاظ یاد بادِ رعایا پر مطلق نہیں تھا خرید لئے۔ یہ لوگ خود بھی اپنے خریدے ہوئے علاقوں سے علی الاکثر غیر حاضر رہا کرتے ہیں یا تو وہاں رہنے سے ڈرتے ہیں یا وہاں کا رہنا اُن کو خوش نہیں آتا کیونکہ اُن کو وہاں کے لوگ غاصب اور دخیل بے جا کی طرح دیکھتے ہیں۔ پھر ان چھنے ہوئے علاقوں کے مالکان قدیم اسی آراضی پر جو پہلے کبھی اُن کی اپنی تھی کاشتکارانہ قابض ہیں اور اپنی حالت کا انقلاب اُن کو نہایت رنجیدہ ہوتا ہے۔ گو قبضہ مالکان آراضی اُن کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن رعایا کی محبت اور ہمدردی پر ویسا ہی مستقل موروثی قبضہ رکھتے ہیں جیسا ہمیشہ سے چلا آتا ہے اور رعیت بھی آمادہ و مستعد ہے کہ جب کبھی اُن کے کھیا۔کھویا ہوا درجہ یا اپنے علاقوں پر قبضہ حاصل کرنے کا ارادہ کریں اُن کا ساتھ دے[1] ایک برس بلکہ اس سے بھی آگے ہیں نے حکام اعلیٰ سے صاف صاف بیان کردیا تھا کہ دیوانی عدالتیں اپنے اختیارات بہت بُری طرح عمل میں لاتی ہیں۔ اُن کا یہ طریقہ نہایت بے ٹھور ٹھکانے ہے کہ تھوڑے تھوڑے

---

[1] مصائب غدر ص ۹ مطبوعہ نول کشور

ابتدائے عملداری سے آج تک شاید کوئی گاؤں ایسا ہوگا جس میں تھوڑا
بہت انتقال (ردو بدل) نہ ہوا ہو۔ ابتدا ابتدا میں ان نیلاموں
نے ایسی بے ترتیبی سے کثرت پکڑی کہ تمام ملک اُلٹ پلٹ ہو گیا[1]

مہاجنوں کا ذکر آیا ہے تو واقعہ کی صحیح تصویر نظر میں لانے کے لئے مسئلہ سود کا بھی صحیح خاکہ سامنے رکھئے۔

بےشک ہندوستان میں سود کا رواج ہمیشہ رہا۔ مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی وحشیانہ بھوک معمولی سود سے نہیں مر سکتی تھی۔ اُس نے سود در سود کا قانون بنایا۔ جس کی تھنڈی مار نے تھوڑے ہی دنوں میں ہندوستان کا اقتصادی ڈھانچہ درہم برہم کر دیا۔ بڑے بڑے گھرانے ختم ہو گئے۔ اُن کے سایہ میں پرورش پانے والے ہزاروں لاکھوں نفوس اناج کے ایک ایک دانہ کو محتاج ہو گئے اور دولت کے یہ انبار یورپ کے ساہوکاروں یا اُن ہندوستانی مہاجنوں کی تجوریوں میں بند ہو گئے جن کے باورچی خانہ کا دھواں بھی کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

زمینداری کی نوعیت

آج سوشلزم اور کمیونزم کے دور میں زمینداری کا لفظ ایسا ناگوار ہو گیا ہے کہ کان اُس کے سُننے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ مگر واقعات کی کھود کرید کے وقت یہ نازک مزاجی کسی طرح بھی جائز نہیں۔

مظلوم کی داستان تو سُننی ہی پڑتی ہے خواہ آپ کو کتنی ہی ناگوار ہو۔ سر سید

[1] کئی Home نے بنگال کے ایک مقدمہ کا حوالہ دیا ہے جس میں چار روپیہ کی ڈگری کے عوض ایک جاگیر کے نیلام کا حکم دیا گیا تھا۔ حاشیہ ص ۱۷ بحوالہ ۱۸۱۵ء از مولانا ظہیر

زمینداروں کے حامی نہیں ہیں۔ مگر جو بات حق ہے اس کا اظہار وہ بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

"اگر خیال کیا جائے تو ہندوستان میں ہر ایک محال زمینداری کا
"ایک چھوٹی سی سلطنت" دکھائی دیتی ہے۔ قدیم سے (دستور ہے)
کہ سب کی رضامندی سے ایک شخص سردار ہوتا ہے۔ وہ ایک بات تجویز
کرتا تھا۔ اور ہر ایک حقیت دار کو بقدر اپنے حصہ زمینداری کے
بولنے کا اور دخل دینے کا اختیار ہوتا تھا۔ رعیت باشندہ دیہہ
(گاؤں میں رہنے والوں کے) چودھری بھی حاضر ہو کر کچھ کچھ گفتگو
کرتے تھے۔ اگر کسی مقدمہ نے زیادہ طول پکڑا تو کسی بڑے گاؤں کے مقدم اور
سردار کے حکم سے فیصلہ ہو گیا۔
ہندوستان کے ہر ایک گاؤں میں بہت خاصی صورت ایک
چھوٹی سلطنت اور پارلیمنٹ کی موجود تھی۔[۱]

زمینداری اور جاگیرداری کے دور میں عدل و انصاف اور شہری حقوق کی ادائیگی کی یہ ایک صورت تھی۔ دوسرا مسئلہ کہ خود اُن زمینداروں اور جاگیرداروں کا سلوک اُن کے ساتھ جن کو رعایا کہا جاتا تھا۔ کیسا ہوتا تھا۔ تو سیکڑوں تاریخی مثالوں کی شہادت یہ ہے کہ زمیندار و رعایا۔ راجہ اور پرجا کا باہمی تعلق۔ محبت و خیر خواہی، پرورش اور وفاداری کا ہر دلعزیز رشتہ مانا جاتا تھا۔

بیشک بیرونی نفع اندوزوں کی آمد کے بعد جب استحصال بالجبر نفس پرستی

---

[۱] اسباب بغاوت ہند ص ۲۷

بے دردانہ قتل و غارت اور انسانی حقوق سے بے پروائی کے ناپاک نخفے جگہ جگہ تقسیم ہونے لگے۔ اور بے مروتی۔ خود غرضی۔ محنت کشی نے سکہ رائج الوقت کی حیثیت اختیار کر لی تو کچھ زمینداروں اور جاگیرداروں نے بھی وہ ظلم و تعدی اختیار کی جن کی مثالیں پیش کر کے موجودہ نسلوں کو اپنے پیش رو بزرگوں سے نفرت دلائی جاتی ہے۔ مگر اسی گئے گذرے دور میں (جبکہ یوروپین نفع اندوزوں کو قدم جمائے ہوئے ڈیڑھ سو برس گذر چکے تھے) وہ مثالیں بھی سامنے آتی ہیں جن کی شہادت یہ ہے کہ باد سموم کی تمام آتش انگیزیوں اور شعلہ افشانیوں کے باوجود رعایا پروری اور غربا نوازی کے چمن اب بھی بالکل خشک نہیں ہوئے تھے۔ محنت کش طبقہ کسی بھی عنوان سے جب اپنے زمینداروں اور جاگیرداروں کی پناہ ڈھونڈتا تھا تو یہ خزاں رسیدہ چمن اور گلشن تازگی اور آسودگی کی بخشش میں فراخ حوصلگی کی مردہ روایتیں زندہ کرنے میں کوتاہی نہیں کیا کرتے تھے۔ اس وقت "مشتے نمونہ از خروارے" ہندوستان کے سب سے بڑے نامور جاگیردار بہادر شاہ کی سیر چشمی اور فراخ حوصلگی کی صرف ایک روایت جو دہلی کے دیہات میں مشہور ہے، پیش کی جا رہی ہے۔ ایک دہقان کی زبان سے سنیئے۔

غدر سے پہلے پرانے قلعہ کی دھرتی میں باجرا بہت اچھا پیدا ہوتا تھا۔ یہ دھرتی ہمارے پاس تھی۔ ہم پر سرکاری لگان صرف یہ تھا کہ بادشاہ سلامت کے کبوتروں کے واسطے ہل پیچھے سوا سیر باجرا دینا پڑتا تھا۔ بوڑھے دھقان نے کہا۔ گوجروں کی قوم بہت شریر ہوتی ہے ایک دفعہ ہم لوگوں کے دل میں شرارت آئی۔ ہم نے سوچا کہ اس مرتبہ باجرے کو بھی گول کر جاؤ اور بادشاہ سلامت کو کسی طرح

پھسلا دو۔ بات یہ تھی کہ اس سال برکھا کچھ کم ہوئی تھی۔ اگر ہم ایسے ہی سیدھی طرح بادشاہ سلامت سے معافی مانگ لیتے تو لگان معاف ہو جاتا۔ مگر ہمیں چال سوجھی کہ ہم نے باجرے کی بالیں صفائی سے کاٹ لیں اور خالی پودے کھیتوں میں کھڑے رہنے دیئے۔ پھر سارے کسان لال قلعہ کے جھروکوں کے سامنے جمنا کی ریتی پر جا پڑے۔ اور بادشاہ سلامت کی دُہائی کا شور مچانے لگے۔ شور و غل کی آواز بادشاہ تک پہونچی تو جہاں پناہ نے خود جھروکوں میں آکر ہمیں درشن دیئے۔ "کیا بات ہے۔ کیسا شور ہے؟ جہاں پناہ کے ایک نقیب نے دریافت کیا۔

"سرکار ہم لُٹ گئے۔ کھاری باؤلی کے بنیوں نے باجرے کا بیج جانے کیسا دیا کہ پیڑ تو خوب اُگ آئے۔ ہرے بھرے بھی خوب ہیں لیکن بال ایک بھی نہیں آئی۔ اب ہم جہاں پناہ کے کبوتروں کا باجرا کیسے ادا کریں گے۔ اس سال لگان معاف کر دیا جائے" کسانوں نے کہا ــــ "

"اچھا کل کو ہم خود موقع پر پہونچ کر ملاحظہ کریں گے۔ پھر حکم دیں گے"۔ بادشاہ نے جواب دیا۔

چنانچہ دوسرے دن شام کے وقت بادشاہ سلامت ہوادار پر سوار ہو کر پُرانے قلعے آئے۔ کھیتوں کو ملاحظہ فرمایا۔ وہاں کوئی بال چھوٹی ہوتی تو نظر بھی آتی۔ بادشاہ سلامت نے دور ہی سے کھیتوں پر نظر ڈالکر

فرمایا۔ اماں[۱]۔ گوجروں کی فریاد ٹھیک ہے۔ کھاری باؤلی کے بنیوں نے بڑا دھوکا کیا۔ کل کو انہیں بلواؤ۔ اچھا جاؤ اس سال لگان معاف

دہقان کا کہنا ہے کہ گاؤں کے سمجھدار مکھیا وغیرہ اس کھیل میں شریک نہیں تھے وہ بخار کا بہانا بنا کر گھروں میں لیٹ گئے تھے۔ انہیں خیال تھا کہ بادشاہ سلامت ایسے بے وقوف نہیں ہیں وہ جب پیٹر دیکھیں گے اصل بات سمجھ جائیں گے پھر ان کی خفگی جانے کیا رنگ لائے۔

بات بھی یہی تھی۔ بادشاہ سلامت ایسے بے وقوف نہیں تھے۔ مگر یہ رعایا کا ناز تھا اور وہ ناز برداری اور رعایا پروری۔ سچ ہے۔ آدمی آدمی انتر ہے۔ کوئی ہیرا ہے کوئی کنکر ہے۔

اسی دہقان کی ایک روایت اور بھی ہے کہ ایک سال بارش نہیں برسی۔ کھیت سوکھ گئے۔ غلہ مہنگا ہوگیا۔ بادشاہ سلامت کے پاس لوگ فریاد لے کر گئے پہلی مرتبہ بنیوں کو بلا کر غلہ کا ایک نرخ (ایک من فی روپیہ) مقرر کردیا۔ مگر کچھ دنوں بعد بنیوں نے اپنی مجبوری اور پریشانی کا اظہار کیا تو اب بادشاہ سلامت نے نماز استسقاء کا فیصلہ کیا۔ عام اعلان ہوگیا کہ کل کو صبح کے وقت عیدگاہ پر نماز استسقاء ہوگی۔ شہر کے تمام چھوٹے بڑے۔ امیر غریب۔ ہندو مسلمان عیدگاہ پہونچے۔ بادشاہ اور بیگم بھی معمولی لباس میں عیدگاہ پہونچے۔ نماز پڑھی گئی۔ بادشاہ سلامت نے رونا شروع کیا تو ساری مخلوق کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔

دل کا فغاں اور آنکھوں کے آنسو ابھی ختم نہیں ہوئے تھے کہ بقول دہقان

---

[۱] بادشاہ کا تکیہ کلام تھا۔ ارے میاں۔ کے بجائے اماں کہا کرتے تھے۔

پھر جو کالی کالی۔ بھوری بھوری گھٹا اٹھ کر برسنی شروع ہوئی تو لوگوں
کو گھر پہونچنا مشکل ہو گیا۔[1]

بادشاہ سلامت اچھے تھے یا برُے۔ بادشاہ بیگم کا کردار کیا تھا۔ ان سب سے قطع نظر یہ ہمدردی اور وطن کے دکھی انسانوں سے یہ میل جول وہ جوہر ہے جو اس جاگیرداری میں کمیاب نہیں تھا جس کا شکوہ کیا جا رہا ہے۔

(۲) علاوہ ازیں تاریخ انسانیت کے اس یادگار حادثہ کو صرف جاگیرداروں کا رقص بسمل قرار دینا اگر قصد و ارادہ سے ہے تو تاریخ کے حق میں بہت بڑی خیانت ہے اور ایک ایسی چشم پوشی ہے جو مورخ کے لیے کبھی بھی جائز قرار نہیں دی جا سکتی۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے دور تسلط میں جاگیرداری سے کہیں زیادہ صنعت و تجارت کو برباد کر دیا تھا۔ اور وہ ہندوستان جو علوم و فنون میں تمام دنیا سے فائق۔ فراوانی دولت میں سونے کی چڑیا۔ خوشحالی میں رشکِ ارم۔ راحت و آرام میں جنت نشان مانا جاتا تھا اس کو انتہائی بے دردی اور خود غرضی سے تباہ کاری اور غارت گری کا تختہ مشق بنا کر اتنا برباد کر دیا تھا کہ اب وہ علم و ہنر سے تہی دامن۔ قحط زدہ فاقہ مست، کاشتکاروں اور بے ہنر مزدوروں کا ویران خانہ بن کر رہ گیا تھا کہیں کہیں کوئی شمع باقی رہ گئی تھی تو ہسٹنگز اور ڈلہوزی جیسے ستم ایجاد گورنروں کی پھونکیں ان کو بھی بجھا چکی تھیں یا بجھا رہی تھیں۔ تاریخ ہندوستان کی یہ المناک حقیقتیں اتنی واضح ہو چکی ہیں کہ تحریر کی ضرورت نہیں۔ عیاں را چہ بیاں۔

تفصیلات اگر مطلوب ہوں تو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

---

[1] افسانۂ غم۔

نے نقش حیات جلد اول میں اور مولوی سید طفیل احمد صاحب مرحوم علیگ نے حکومت خود اختیاری اور روشن مستقبل میں اُردو خواں حضرات کے لئے کافی ذخیرہ جمع کر دیا ہے،

ہم سر سید مرحوم کے ایک دلچسپ فقرہ پر اس باب کو ختم کرتے ہیں :-

"اہل حرفہ کا روزگار بسبب جاری اور رائج ہونے اشیاء تجارت ولایت کے بالکل جاتا رہا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سوئی بنانے والے اور دیا سلائی بنانے والے کو بھی نہیں پوچھتا تھا۔ پارچہ بافوں کا تار تو بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ اسی وجہ سے سب سے زیادہ اس ہنگامہ میں یہی لوگ گرمجوش تھے[۱]

(۳) مزید براں جاگیر شاہی کا جو کچھ بھی خاتمہ ہوا تھا وہ اس لئے نہیں کہ اس نو وارد اُمت کو جاگیرداری سے نفرت تھی — شاہنشاہیت نواز اور سامراج پرست قوم جاگیرداری سے کس طرح نفرت کر سکتی ہے۔ بلکہ صرف اس لئے تھا کہ

(الف) ہر ایک جاگیر اور ریاست کے ختم کرتے وقت ان سفید روندوں کے ہاتھ جس طرح لوٹ مچاتے تھے اس میں لاکھوں کروڑوں روپیہ کا فائدہ شخصی طور پر خود ان مہذب غارتگروں کا ہوا کرتا تھا۔

(ب) پُرانی جاگیر شاہی ختم کر کے نئی جاگیر شاہی اور اجارہ داری قائم کی جائے جس میں زیادہ سے زیادہ نفع ان سامراج پرستوں اور اُن کے ہم وطنوں کا ہو۔ جن کے عشرتکدوں میں دولت و ثروت کے انبار لگانے کے لئے یہ تمام کھیل کھیلا جا رہا تھا اور غارت گری کی یہ مشق کی جا رہی تھی۔

---

[۱] اسباب بغاوت ہند ص ۳۶

انگریزوں کی تنخواہوں اور بھتوں کا جائزہ لیجئے اور یہ بھی یاد رکھئے کہ تحصیلداری یا ڈپٹی مجسٹریٹی سے آگے کسی ہندوستانی کو کوئی عہدہ نصیب نہیں ہو سکتا تھا اور جو عہدہ بھی ہندوستانیوں کو عطا کیا جا سکتا تھا۔ اُس میں انگریزوں کی تنخواہ دس گنے تک زیادہ ہوتی تھی یعنی ہندوستانی کو اگر سو روپے دیئے جاتے تھے تو اسی پوسٹ پر انگریز کی تنخواہ پانچسو سات سو اور کبھی ایک ہزار تک ہوتی تھی۔ اس جائزے کے بعد سرسید مرحوم کی یہ شہادت بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ ضبطی معافیات وغیرہ سب اس لئے تھا کہ حکومت کا یہ غیر معمولی خرچ چلایا جا سکے۔ جو انگریز کے لئے "گنج بخش" تھا اور ہندوستانی کے لئے محض "فاقہ شکن"،

پس حقیقت یہ ہے کہ ۵۷ء کا یہ خونیں حادثہ

مٹی ہوئی جاگیر شاہی کی انگڑائی نہیں بلکہ ایک قوم کی بڑھتی ہوئی جاگیر شاہی کے مقابلہ میں دوسری قوم کی حرکت مذبوحانہ تھی۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یہ بحث طویل ہے۔ اس کا ہر ایک گوشہ ایک داستان رکھتا ہے۔ تنخواہوں کا تفاوت۔ مالگذاری کا اضافہ۔ وصولی مالگذاری کے لئے جائدادوں کا نیلام۔ نیلام کے دل آزار اور توہین آمیز طریقے۔ سود۔ اور سود در سود کا رواج وغیرہ غرض ہر ایک باب داستان الم ہے۔ اسی سلسلہ کا ایک مستقل باب۔ دوامی اور عارضی بندوبست بھی ہے۔

ایک مورخ کی حیثیت سے اگر تفصیلات تلاش کرنا چاہیں تو وہ شیخ الاسلام قدس سرہ کا نقش حیات جلد اول۔ مولوی سید طفیل احمد صاحب (علیگ) مرحوم کی "حکومت خود اختیاری

اور روشن منتقل وغیرہ ملاحظہ فرمایئے۔ یہاں بندوبست کے سلسلہ میں سرسید رح کا ایک تاریخی نوٹ قابل مطالعہ ہے وہ اگرچہ کسی قدر طویل ہے مگر اُس کو پیش نہ کرنا بھی ایک قسم کا بخل ہو جو حقیقت کے متلاشی کے لئے درست نہیں۔ سرسید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

بندوبست مالگذاری جو ہماری گورنمنٹ نے کیا نہایت قابل تعریف ہے۔ مگر اگلے بندوبستوں کی نسبت سنگین ہے۔

اگلی عملداریوں میں بطور خام تحصیل مالگذاری لی جاتی تھی۔

شیر شاہؒ نے پیداوار کا ایک تہائی حصہ گورنمنٹ کے لئے مقرر کیا تھا[1]

کچھ شک نہیں کہ اس طریقہ میں بہت مشکلیں تھیں[2] اور گورنمنٹ کو نقصان متصور تھا۔ مگر کاشتکار سب آباد رہتے تھے کسی کو ٹوٹا دینا نہ پڑتا تھا

---

[1] اسلام کی فیاضی اور غریب نوازی ملاحظہ فرمایئے کہ اُس نے عشر اور نصف عشر کی تعلیم دی ہے یعنی بارش کی زمینوں پر پیداوار کا دسواں حصہ اور جو زمینیں کنویں یا تالاب وغیرہ سے سیراب کی جائیں جن کی آبپاشی پر رقم خرچ کرنی پڑے اُن کی پیداوار پر بیسواں حصہ یعنی اگر سو من پیداوار ہے تو پہلی صورت میں دس من اور دوسری صورت میں صرف پانچ من غلہ واجب ہوگا۔ البتہ جو اراضی خراجی ہیں اُن کا محصول آپس کے مشورہ سے طے ہوگا جس میں کاشتکاروں اور مزارعین کی رائے کو پورا دخل ہوگا۔ ہندوستان کی زمین خراجی مانی گئی ہے۔ اس لئے شیر شاہ کا یہ فعل جائز قرار دیا جائیگا کہ عشر کے بجائے ثلث مقرر کیا۔ محمد میاں

[2] دنیاوی حکومتوں کے نزاکت مآب حکام ان مشکلات کو اپنے بجائے کاشتکاروں اور زمینداروں پر ڈالدیتے ہیں۔ مگر اسلامی تعلیم یہ ہے کہ اس قسم کی مشکلات برداشت کرنا حکومت کے کارپردازوں کا فرض ہو البتہ اسلامی تعلیم یہ بھی ہے کہ اگر یہ فرض دیانتداری اور خوش اسلوبی سے انجام دیا جاتا رہا تو دیانتدار کارپرداز کو مجاہد کا درجہ اللہ کے یہاں ملتا ہے۔ محمد میاں۔

"اکبر اول" نے اسی بندوبست کو (یعنی پیداوار کا تہائی حصہ لینا) پسند کیا
اور اسی کو جاری کیا۔ مگر بندوبست پختہ کر دیا جس کا ذکر لارڈ الفنسٹن صاحب
کی عمدہ تاریخ میں مندرج ہے اور آئین اکبری میں بھی اس کا بیان ہے
اکبر نے اقسام زمین کے مقرر کئے۔ اوّل قسم کی زمین کا نام "پولج" تھا۔
اور ہر سال بوئی جاتی تھی۔ برابر مالگزاری کا حصہ لیا جاتا تھا۔ دوم
قسم کی زمین جس کا نام "پڑوتی تھا۔ اس زمین سے انہیں سالوں
کے بابت مالگزاری لی جاتی تھی جس میں وہ کاشت ہوئی تھی۔ سوم
قسم کی زمین جس کا نام "چچر" تھا اور تین چار برس سے بے تردد ہوتی
تھی اور اُس کی درستی کے لئے خرچ بھی درکار ہوتا تھا۔ اوّل سال
زراعت میں "بچرد" لیا جاتا تھا اور پھر بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک
کہ پانچویں میں پورا ہوتا تھا۔ چہارم قسم کی زمین جس کا نام "بنجر" تھا
اور پانچ برس سے زیادہ سے بے تردد پڑی تھی اور ملائم شرطیں تھیں اس خام
بندوبست کا نقدی سے بدلنا اس طرح پر تھا کہ پیداوار ہر بیگھہ کی اور ہر قسم
کی زمین کی اوسط کے حساب سے غلّہ کے وزن پر نکالی جاتی تھی مثلاً بیگھہ پیچھے
نو من غلّہ کی پیداوار نکالی تین من غلّہ اس بیگھہ کا کاشتکار سے لینا حصہ
گورنمنٹ ٹھیر گیا۔ پھر اوسط نرخ ناموں سے غلّہ کی قیمت قرار دی گئی
وہ نقدی اس بیگہ کی ٹھیر گئی۔ پھر اس میں بڑی رفاہ یہ تھی کہ اگر کاشتکار
بعوض نقدی گرانی سمجھ کر تین من غلّہ دیدے تو اُس کو اختیار تھا۔ سرکاری
بندوبست میں اُن میں سے بہت سی باتوں کا خیال نہیں رہا۔ افتادہ

زمین پر برابر محصول لگ گیا۔ جن زمینوں کا زور بڑھانے کو کچھ دنوں اُفتادہ رکھنا تھا اُن میں تہائی نہیں ہوئی۔ ہر سال برابر جوتے جانے سے زور کم ہو گیا۔ پیداوار کم ہونے لگی۔ جو حساب بندوبست کے وقت لگایا تھا وہ نہ رہا اکثر اضلاع میں ہر ایک بندوبست سخت ہوتا گیا۔ زمینداروں کاشتکاروں کو نقصان عائد ہوئے رفتہ رفتہ بے سامان ہو گئے۔ زراعت کا سامان بہت کم ہو گیا اور اس سبب سے جو زمین کاشت کرتے تھے۔ وہ جیسا کہ چاہیئے کمائی نہ گئی۔ اس سبب سے بھی کمی پیداوار کی ہوئی۔ ادائے مالگذاری کے لئے وہ قرضدار ہوئے سود قرضہ زیادہ ہونے لگا۔ بہت سے زمیندار مالگذار جو بہت اچھا اور معقول سامان رکھتے تھے مفلس ہو گئے۔ جن دیہات میں اُفتادہ زمین سوا تھی وہ اور زیادہ خراب ہو گئی۔ آنریبل ٹامسن صاحب بہادر اپنے ہدایت نامہ کی دفعہ ۴۰ میں لکھتے ہیں کہ آئین نہم ۱۸۳۳ء کے بندوبست میں علی العموم یہ بات نظر آتی ہے کہ اچھی دیہات کی جمع کچھ نرم تجویز ہوئی اور خراب دیہات کی جمع سنگین ہو گئی۔ زمینداروں کی ناجائز منفعتیں جاتی رہیں۔ اگرچہ یہ بات بہت اچھی تھی مگر بندوبست کے وقت اس کی رعایت چاہیئے تھی۔ غرضکہ ان اسباب سے زمینداروں اور کاشت کاروں کو مفلسی نے گھیر لیا تھا جس کے سبب باوجود اس امن و آسائش کے جو زمینداروں کو تھی اُن کے دل سے پچھلی عملداریوں کی یاد بھولتی نہ تھی۔ (اسباب بغاوت ہند صفحہ ۲۵ تا صفحہ ۳۰)

خاتمہ بحث اور خلاصہ اقتصادیات کے سلسلہ میں بحث بہت طویل ہو گئی ہے ۔ اب ہم اس کو ختم کرتے ہیں اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کے الفاظ میں اس بحث کا خلاصہ بھی پیش کر دیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ وہ ہندوستانی جو نہ جاگیردار تھے نہ معافی دار یا سرمایہ دار۔ اُن کے تاثرات کیا تھے اور وہ کس درجہ اس آنے والی بدیشی حکومت سے نالاں ہو چکے تھے ۔

"ہندوستان کی رعایا روز بروز مفلس ہوتی جاتی تھی ٹیکس کی زیادتی نے زمینداروں اور کاشتکاروں کو تباہ کر دیا تھا ۔ بقایا وصول کرنے کے لئے زمینداریاں نیلام کرائی جاتی تھیں ۔ جو ہندوستان میں بالکل نیا دستور تھا ۔ ولایتی مال کی آمد نے اہل حرفہ کو برباد کر دیا تھا ۔ بایں ہمہ حکومت نے پرامیسری نوٹ جاری کر دیئے جس پر ملک سے سود وصول کیا جاتا تھا اگلی عملداریوں میں شاہی انعام و اکرام آسودگی رعایا کا ایک مستقل ذریعہ تھا ۔ جب شاہجہاں تخت پر بیٹھا تو صرف تخت نشینی کے دن چار لاکھ بیگہ زمین اور ایک سو بیس گاؤں اور لاکھوں روپے انعام دیئے تھے ۔ یہ بات ہماری گورنمنٹ میں یک قلم مسدود تھی ۔ بلکہ پہلی جاگیریں بھی ضبط ہو گئی تھیں ، اس عام افلاس کا نتیجہ تھا کہ جب باغیوں نے لوگوں کو نوکر رکھنا چاہا تو جیسے بھوکا آدمی قحط کے دنوں میں ناج پر گرتا ہے اسی طرح یہ لوگ نوکریوں پر جا گرے ۔ بہت سے آدمی صرف ۴ روپیہ پر نوکر ہوئے تھے اور بہت سے آدمی سیر ڈیڑھ سیر روزینہ اناج پاتے تھے [1]

[1] ص ۳۵ تا ۳۶ اسباب بغاوت ہند۔

آخر میں سرسید مرحوم نہایت جوش سے لکھتے ہیں۔

غرض کہ ملک ہر طرح سے مفلس ہوگیا تھا اگلے خاندان جن کو ہزاروں کا مقدور تھا معاش سے بھی تنگ آ گئے تھے۔ اور یہ اصلی سبب ناراضگی رعایا کا گورنمنٹ سے تھا۔

لوگوں کے دل جو تبدیلی عملداری کو چاہتے تھے اور نئی عملداری کے لئے راغب اور دل سے اس سے خوش تھے میں سچ کہتا ہوں کہ اسی سبب سے تھے۔ ہم سچ کہتے ہیں اور پھر ہم سچ کہتے ہیں کہ ہم بہت سچ کہتے ہیں کہ جب افغانستان سرکار نے فتح کیا تو لوگوں کو بڑا غم ہوا۔ کیا سبب تھا؟

صرف یہ سبب تھا کہ اب مذہب پر علانیہ دست اندازی ہوگی۔ جب گوالیار فتح ہوا۔ پنجاب فتح ہوا۔ اودھ لیا گیا تو لوگوں کو کمال رنج ہوا۔ کیوں ہوا؟

اس لئے ہوا کہ ان پاس کی ہندوستانی عملداریوں سے ہندوستانیوں کو بہت آسودگی تھی۔ نوکریاں اکثر ہاتھ آتی تھیں۔ ہر قسم کی ہندوستانی اشیاء کی تجارت بکثرت تھی۔ ان عملداریوں کے خراب ہونے سے زیادہ سے زیادہ افلاس اور محتاجی ہوتی جاتی تھی۔ [۱]

عدل وانصاف پر ٹیکس | چند قوانین برخلاف رواج اور مخالفت طبیعت ہندوستانیوں کے صادر ہوئے جس کی وجہ سے رعایا

---

[۱] اسباب بغاوت ہند ص ۳۶ و ص ۳۷

ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر یا شہد کی چھری یا ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی اور سمجھتی تھی کہ ہم آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں۔ اور کل ہیں تو پرسوں نہیں اور پھر اس پر اضافہ یہ ہوا کہ باوجود ہندوستانیوں کی مفلسی کے عدالت کی چارہ جوئی پر اسٹامپ لگا دیا گیا جو ناقابل برداشت تھا۔[۵۷]

(۴) درست ہے۔ بہادر شاہ کی خاندانی سلطنت ختم ہو رہی تھی۔ واجد علی شاہ کی ریاست چھین لی گئی تھی۔ اسی طرح تانتیا ٹوپی کنور سنگھ۔ مہارانی لکشمی بائی وغیرہ بھی زخم خوردہ تھے۔ مگر کیا اُن کے دلوں کا آپریشن کرکے دیکھ لیا گیا ہے کہ اس وقت کی تمام جدوجہد صرف اپنی ریاستوں اور جاگیروں کے لئے تھے اور اس میں کوئی بھی جزو اُس ہمدردی اور غمناکی کا نہیں تھا جس میں پورا ہندوستان مبتلا تھا۔

بہادر شاہ کے متعلق تو یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ وہ نہ اس تحریک کے بانی تھے نہ اُن کو پہلے سے اس کی خبر تھی۔ وہ صرف نام کی بادشاہی کو غنیمت سمجھ کر کمپنی کی پنشن پر قناعت کئے ہوئے تھے اور اپنی اولاد کے لئے اس سے بھی صبر کر چکے تھے۔ اُن کا مشہور شعر اس کی شہادت ہے۔

اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظام سلطنت
بعد تیرے نے ولیعہدی نے نظام سلطنت

ستم رسیدہ فوجی جب بہادر شاہ کی دُہائی دیتے ہوئے اُس کے دیوان خاص میں گھس آئے تو باوجودیکہ بوڑھے بادشاہ کے اس یقین میں کوئی فرق نہیں آیا تھا کہ نتیجہ ناکامی اور خاندان تیموریہ کی آخری تباہی ہے[۵۸] مگر رعایا سے محبت جو اس خاندان کے خمیر میں گندھی ہوئی تھی۔ یہ

---

۵۷ ہمارے محترم شمس العلماء ذکاء اللہ خاں تحریر فرماتے ہیں بادشاہ کا دم تو پہلی ہی جون کو نکلنے لگا تھا اُس نے اپنی بیٹوں اور پوتوں کو بلا کر کہا میرا کہنا یاد رکھو۔ انگریز ایک دن آکر تمکو پھانسی دیں گے اور میرا حال یہ ہوگا۔ کفن پہن کر زندگی کے ایام کسی باغ میں گذران دوں گا۔ (تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۹۷) ۵۸ اسباب بغاوت ہند بحوالہ روشن مستقبل ص ۲۶۲

بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ رعایا تباہ و برباد ہو اور بادشاہ آنکھ بند کئے رکھے[1]۔ محبت خلق اور ہمدردی اہل وطن کے اسی جذبہ نے تیموری خون میں حرارت پیدا کی۔ رگ حمیت پھڑکنے لگی اور چار و ناچار بہادر شاہ نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

پس اگر اس ہمدردی اور فریادرسی کا نام "جاگیر شاہی کی انگڑائی" ہے تو یہ انگڑائی بہت مبارک۔ اور کمیونزم کا فیصلہ کچھ بھی ہو مگر ایشیائی فطرت تو یہ ہے کہ ایسی انگڑائیوں میں جو بربادی آئے وہ آبادی ہی اور جو موت آئے وہ سراسر زندگی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

رہے واجد علی شاہ۔ تو اگرچہ وہ ایک سال پہلے ہی معزول کر دیئے گئے تھے اور اس موقع پر واجد علی شاہ نے نہیں بلکہ اُن کی بیگم "حضرت محل" اور اُن کے سب سے چھوٹے لڑکے "برجیس قدر" نے تحریک میں حصہ لیا تھا (جس کا تذکرہ دوسرے موقع پر آئیگا) لیکن واجد علی شاہ کی سیاسی زندگی سے اُن کی بیگم اور لخت جگر کے ارادوں کا بھی اندازہ

---

[1] یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ مظلوم فوجیوں نے بادشاہ کی طرف رجوع کیا بلکہ انگریزی حکومت دہلی کے ذمہ دار رکن "تھیوفلس مٹکاف" جوائنٹ مجسٹریٹ دہلی کا بیان ہے کہ "جب خوفناک بلوے ظہور میں آجاتے تھے جیسا کہ وہ واقع ہوتے رہتے تھے تو اس وقت عوام بادشاہ کی طرف رجوع ہوتے تھے۔ تاکہ انگریزی حکام سے انہیں پناہ مل جائے۔ ایک دفعہ بلوے کے موقع پر اسسٹنٹ ریزیڈنٹ نے لکھا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ یہ بلوہ کبھی وقوع پذیر نہ ہوتا اگر لوگوں کو توقع نہ ہوتی کہ بادشاہ انہیں بچا لیگا۔ جیسا کہ اُنھوں نے بالآخر بچا لیا۔
(غدر کی صبح شام ص۲۵)

ہو سکتا ہے۔ واجد علی شاہ کے متعلق خود پروفیسر باری صاحب کی شہادت یہ ہے

"واجد علی نے ولی عہدی کا زمانہ عیش و عشرت میں صرف کیا لیکن تخت پر بیٹھتے ہی وہ ملکی انتظامات میں مصروف دکھائی دیتا ہے واجد علی اپنی فوج کی تربیت پر اپنا بہت سا وقت صرف کرتا تھا ایسٹ انڈیا کمپنی اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

۳۲ سال کی عمر میں اُسے کلکتہ میں جلاوطن ہونا پڑا جہاں اُس نے ۱۸۸۷ء میں وفات پائی"[1]

. . . .

اودھ کا آخری تاجدار واجد علی شاہ۔ عربی۔ فارسی اور اردو کا فاضل تھا۔[2] اُس نے اُردو میں کئی کتابیں لکھیں۔ اُسے تاریخ سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اودھ کی فوجی طاقت کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اختری پلٹن اور نادری پلٹن بنائی۔ واجد علی شاہ نے لکھنؤ

[1] کمپنی کی حکومت ص ۲۱۱ [2] اسی طرح بھاکا اور سنسکرت میں بھی شعر کہتا تھا اور ان زبانوں کی مناسبت سے اپنے تخلص میں یہ تبدیلی کی تھی کہ اختر کے بجائے اکھتر لکھتا تھا۔ خود بادشاہ کا بیان ہے۔ تخلص خود اختر میدارم۔ در تصانیف اردو فارسی احتیاج تبدیل نمودنش نبود مگر در تصنیف ہذا کہ مملو از زبان ہندی و بھاکا و سنسکرت است بناچاری بجائے خاء معجمہ کاف عربی را معین نمودم تا در لہجہ و زبان ہندی و بھاکا و سنسکرت بے ربط نہ شود پس ہر جا کہ لفظ اکھتر با کاف عربی در اواخر اشعار یعنی مصرع دوم یافتہ شود تخلص راقم ست۔
"ناجو" بحوالہ تاریخ اودھ جلد ۵ ص ۱۱۱

میں "سلطانی پریس" قائم کیا۔ دیوانی اور فوجداری مقدموں کی مزید سماعت کے لئے ہائیکورٹ قائم کیا۔ حفظان صحت کا الگ محکمہ قائم کیا تھا دستورات واجدی کے نام سے ایک عدالتی رسالہ شائع ہوتا تھا۔ واجد علی شاہ کے عہد حکومت میں لکھنؤ ہندوستان کے تمام شہروں میں ترقی یافتہ اور مرفہ الحال تھا۔ شہر کے وسطی حصہ میں گھنی آبادی تھی خاص سڑکوں کے مناظر بہت دلکش تھے لوگ شاہانہ لباس پہنکر گھر سے نکلتے تھے۔ سارا شہر ایک تصویر نظر آتا تھا۔[۵۱]

مرزا معین الدین حسن خاں اپنے روزنامچے میں تحریر فرماتے ہیں:

جب ۱۸۴۷ء میں شاہ لکھنؤ امجد علی شاہ بادشاہ کا انتقال ہوا تو شاہ واجد علی اُن کے جانشین مقرر ہوئے اُنھوں نے فوج کو از سر نو مرتب کرنا شروع کیا۔ احکام نافذ کئے گئے کہ لکھنؤ کی تمام پلٹنیں روزانہ صبح کے پانچ بجے پریڈ کیا کریں گی۔ بادشاہ خود پریڈ کے موقع پر کمان کرتے تھے۔ اور جنرل کی وردی زیب تن فرماتے تھے وہ روزانہ چار پانچ گھنٹے تک فوج سے ڈرل کرایا کرتے تھے مزید براں اُنھوں نے حکم نافذ کر رکھا تھا کہ امور سلطنت کی ضروریات کے سوائے اگر کبھی وہ خود غیر حاضر ہو جایا کریں گے تو وہ دو ہزار روپے جرمانہ ادا کیا کریں گے جسے لکھنؤ کی فوج میں تقسیم کرایا جایا کرے گا اتنا ہی جرمانہ اس پلٹن سے وصول کیا جاتا تھا جو پریڈ میں دیر سے آتی تھی الخ (ص ۴۵ غدر کی صبح وشام)

---

۵۱ کمپنی کی حکومت ص ۲۱۸

تہذیب بَاداور مذہب کے لئے خطرہ

"فلسفۂ کارل مارکس" ہرایک انقلاب کا محرک اقتصادی مسائل قرار دیتا ہے۔ اُسے مذہب کے چلن میں بھی اقتصادی تقاضے ہی نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور تہذیب خود ایک محرک ہے اور ایسا طاقتور جذبہ ہے جو انسان کو ہرایک قربانی پر آمادہ کردیتا ہے یہاں تک کہ وہ موت کو حیات اور فنا کو بقا سمجھنے لگتا ہے۔

مذہب بسا اوقات ذاتی رجحانات کا نتیجہ ہوتا ہے اور تہذیب کو انسان اپنا خاندانی اور آبائی ترکہ تصور کرتا ہے جس طرح موروثی جائداد کی حفاظت کے لئے جان ہتھیلی پر لئے رہتا ہے۔ اسی طرح حفاظت تہذیب کے لئے بھی وہ ہمیشہ کفن بردوش رہتا ہے۔

اس ہنگامہ کے پس پردہ مذہبی اور تہذیبی تقاضے بھی اتنے شدید تھے کہ ہندوستانی اگر ۱۸۵۷ء کی یہ قیامت برپا نہ کرتے تو فطرت انسانی کا فیصلہ اُن کے خلاف نہایت سخت ہوتا۔

بیشک وہ ناکام ہوئے۔ مگر ان کو معذرت کا موقع مل گیا کہ

ع مصتا بانہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔

سرسید مرحوم کو مذہبی اعتبار سے وسیع المشرب کہا جاتا ہے اور تہذیب کے لحاظ سے اُن کی آزادی یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ آخر عمر میں تو ایشیائی تہذیب کے بجائے یوروپین تہذیب کے داعی اور منادبن گئے تھے۔ یہی سرسید اس بغاوت کے اسباب میں جو مذہبی اور تہذیبی خطرات بیان کرتے ہیں وہ یقیناً قابل مطالعہ ہیں اور ظاہر ہے

اس بارہ میں سر سید کی شہادت قطعاً غیر جانبدارانہ ہوگی — اور اُن کی شہادت سے زیادہ مستند کسی کی شہادت نہیں ہو سکتی۔

مداخلت مذہبی اور رسم و رواج (تہذیب) کے لئے خطرات

کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور قابل، اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو کیا مسلمان عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم و رواج پر لا ڈالے۔ اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی میں یہی ہے۔

ہر شخص دل سے جانتا تھا کہ ہماری گورنمنٹ کے احکام بہت آہستہ آہستہ ظہور میں آتے ہیں اور جو کام کرنا ہوتا ہے رفتہ رفتہ کیا کرتے ہیں اس واسطے دفعتاً اور جبراً دین بدلنے کو نہیں کہتے۔ مگر جتنا جتنا قابو پاتے جائیں گے اتنی اتنی مداخلت کرتے جائیں گے اور جو باتیں رفتہ رفتہ ظہور میں آتی گئیں جن کا بیان آگے آئے گا اُن کے اس غلط شبہ کو زیادہ تر مستحکم اور مضبوط کرتی گئیں۔ سب کو یقین تھا کہ ہماری گورنمنٹ علانیہ جبر مذہب بدلنے پر نہیں کرے گی بلکہ خفیہ تدبیریں کر کر مثل نابود کر دینے علم عربی و سنسکرت کے اور مفلس اور محتاج کر دینے ملک کے اور لوگوں کو جو اُن کا مذہب ہے اس کے مسائل سے ناواقف کر کر اور اپنے دین و مذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر نوکریوں کا لالچ دیکر لوگوں کو بے دین کر دیں گے۔ ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کئے گئے تمام اضلاع مغربی و شمالی میں ارادہ گورنمنٹ کے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اس طرح پر مفلس اور محتاج کر کر اپنے مذہب میں لے آئیں گے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب سرکار آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کوئی ملک فتح کرتی تھی ہندوستان کی رعایا کو

کمال رنج ہوتا تھا اور یہ بھی میں سچ کہتا ہوں کہ منشار اس رنج کا اور کچھ نہیں ہوتا تھا بجز اس کے کہ لوگ جانتے تھے کہ جوں جوں اختیار ہماری گورنمنٹ کا زیادہ ہوتا جائیگا اور کسی دشمن اور ہمسایہ حاکم کے مقابلہ اور فساد کا اندیشہ نہ رہے گا دوں دوں ہمارے مذہب اور رسم ورواج میں زیادہ تر مداخلت کریں گے۔

مذہبی گفتگو بہت ہوئی | ہماری گورنمنٹ کی ابتدائی حکومت میں ہندوستان میں گفتگو مذہب کی بہت کم تھی۔ روز بروز زیادہ ہوتی گئی۔ اور اس زمانہ میں بدرجہ کمال پہنچ گئی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ کو ان امور میں کچھ مداخلت نہیں تھی۔ مگر ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب معاملے بموجب حکم اور بموجب اشارے اور مرضی گورنمنٹ ہوتے ہیں۔ سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادریوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے۔ گورنمنٹ سے پادری صاحب تنخواہ پاتے ہیں۔

حکام معتمد کا مشنری طریقہ برتنا | گورنمنٹ اور حکام انگریزی جو ولایت سے اس ملک میں نوکر ہیں وہ پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں اور ہر طرح اُن کے مددگار اور معاون ہیں۔ اکثر حکام معتمد اور افسران فوج نے اپنے تابعین سے مذہب کی گفتگو شروع کی تھی۔ بعضے صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی پر آکر پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ غرضکہ اس بات نے ایسی ترقی پکڑی تھی کہ کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا۔

پادری صاحبوں کا وعظ | پادری صاحبوں کے وعظ نے نئی صورت نکالی تھی۔ تکرار مذہب کی کتابیں بطور سوال وجواب چھپنی اور تقسیم ہونی شروع ہوئیں۔ ان کتابوں میں دوسرے مذہب کے مقدس لوگوں کی نسبت الفاظ اور مضامین رنج دہ مندرج ہوتے۔ ہندوستان میں

وعظ اور کتھا کا دستور یہ ہے کہ اپنے اپنے معبد یا مکان پر بیٹھ کر کہتے ہیں جس کا دل چاہے اور جس کو رغبت ہو وہاں جا کر سُنے۔ پادری صاحبوں کا طریقہ اس کے برخلاف تھا وہ خود غیر مذہب کے مجمع یا تیرتھ اور میلہ میں جا کر وعظ کہتے تھے اور کوئی شخص حکام وغیرہ کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحب کے ساتھ تھانہ کا ایک چپراسی جانے لگا۔ پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو اور مقدس مقاموں کو بہت بُرائی اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سُننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی اور ہماری گورنمنٹ سے ناراضی کا بیج لوگوں کے دلوں میں بویا جاتا تھا۔

مشنری اسکول مشنری اسکول بہت جاری ہوئے اور اُن میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حکام متعہدان اسکولوں میں جاتے تھے اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا تھا اور طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے، پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون؟ تمہارا نجات دینے والا کون؟ اور وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے اس پر اُن کو انعام ملتا تھا ان سب باتوں سے رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھرتا جاتا تھا۔

یہاں ایک بڑا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر لوگ اس تعلیم سے ناراض تھے تو اپنے لڑکوں کو کیوں داخل کرتے تھے۔ اس بات کو عدم ناراضی پر خیال نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ ایک بڑی دلیل ہے۔ ہندوستان کے کمال خراب حال اور مفلس اور نہایت تنگ اور تباہ حال ہو جانے پر۔ یہ صرف ہندوستان کی محتاجی اور مفلسی کا باعث تھا کہ لوگ اس خیال سے کہ

ان اسکولوں میں داخل ہوکر ہماری اولاد کو کچھ وجہ معیشت اور روزگار حاصل ہوگا۔ ایسی سخت بات کو جس سے بلاشبہ اُن کو دلی رنج اور روحانی غم تھا گوارا کرتے تھے نہ رضامندی سے۔

دیہاتی مکاتیب دیہاتی مکتبوں کے مقرر ہونے سے سب لوگ یقین سمجھتے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوئے ہیں۔ پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر جو ہر ہر گانوں اور قصبہ میں لوگوں کو نصیحت کرتے پھرتے تھے کہ اپنے لڑکوں کو مکتبوں میں داخل کرو۔ ہر ہر گانوں میں اُن کا نام کالا پادری تھا جس گانوں میں پرگنہ وزیٹر یا ڈپٹی انسپکٹر پہنچا۔ اور گنواروں میں یہ چرچا ہوا کہ "کالا پادری" آیا۔ عوام الناس یوں خیال کرتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب ہیں اور کرسٹان بنانے کو بٹھاتے ہیں۔ اور فہمیدہ آدمی اگرچہ یہ نہیں سمجھتے تھے مگر یوں جانتے تھے کہ ان مکاتب میں صرف اُردو تعلیم ہوتی ہے۔ ہمارے لڑکے ان میں پڑھ کر اپنے مذہب کے احکام اور مسائل اور اعتقادات اور رسمیات سے بالکل ناواقف ہوجائیں گے اور عیسائی بن جائیں گے اور یوں سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا ارادہ یہی ہے کہ ہندوستان کے مذہبی علوم کو معدوم کردے تاکہ آئندہ کو عیسائی مذہب پھیل جائے۔ اکثر اضلاع مشرقی ہندوستان میں ان مکتبوں کا جاری ہونا اور لڑکوں کا داخل ہونا صاف تحکماً ہوا اور کہہ دیا کہ گورنمنٹ کا حکم ہے کہ لڑکوں کو داخل کیا جائے۔

لڑکیوں کے اسکول کا اجراء لڑکیوں کی تعلیم کا بہت چرچا ہندوستان میں تھا اور سب یقین جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں اسکولوں میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہوجائیں کہ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی بعض اضلاع میں اس کا نمونہ قائم ہوگیا تھا۔ پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم سعی کرکر لڑکیوں کے مکتب قائم کردیں گے تو ہماری بڑی نیک نامی گورنمنٹ میں ہوگی۔ اس سبب سے وہ ہر طرح پر بطریق جائز وناجائز لوگوں کو واسطے قائم کرنے لڑکیوں کے مکتبوں کی فہمائش کرتے تھے اور اس سبب سے زیادہ تر

لوگوں کے دلوں کو ناراضی اور اپنے غلط خیالات کا اُن کو یقین ہوتا جاتا تھا۔

بڑے کالجوں میں طریقۂ تعلیم کا تبدّل

بڑے بڑے کالج جو شہروں میں مقرر تھے اوّل اوّل گو اُن سے بھی کچھ کچھ وحشت لوگوں کو ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں شاہ عبدالعزیز جو تمام ہندوستان میں نہایت نامی مولوی تھے، زندہ تھے مسلمانوں نے اُن سے فتویٰ پوچھا اُنھوں نے صاف جواب دیا کہ کالج انگریزی میں جانا اور پڑھنا انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب کے سب درست ہے اس پر سیکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہوئے۔ مگر اس زمانہ میں کالجوں کا حال ایسا نہ تھا بلکہ ان میں تعلیم کا سر رشتہ بہت اچھا تھا ہر قسم کے علوم فارسی اور عربی اور سنسکرت اور انگریزی پڑھائے جاتے تھے۔ فقہ اور حدیث اور علم ادب پڑھانے کی اجازت تھی۔ فقہ میں امتحان ہوتا تھا۔ سندیں ملتی تھیں کسی طرح کی ترغیب مذہبی نہ تھی۔ مدرس بہت ذی عزت اور معتبر اور مشہور اور ذی علم اور پرہیزگار مقرر ہوتے تھے مگر آخر کو یہ بات نہ رہی قدر عربی کی بہت کم ہو گئی اور فقہ اور حدیث کی تعلیم یکسر جاتی رہی فارسی بھی چنداں قابل لحاظ نہ رہی۔ تعلیم کی صورت اور کتابوں کے رواج نے بالکلیہ تغیر پکڑا اردو اور انگریزی کا رواج بہت ہوا جس کے سبب سے یہی شبہ کہ گورنمنٹ کو ہندوستان کے مذہبی علوم کا معدوم کرنا منظور ہے قائم ہو گیا۔ مدرس لوگ معتبر اور ذی علم نہ رہے۔ وہی مدرسہ کے طالب علم جنھوں نے ابھی تک لوگوں کی آنکھوں میں اعتبار پیدا نہ کیا تھا۔ مدرس ہونے لگے۔ اس لئے ان مدرسوں کا بھی وہی حال ہو گیا۔

گورنمنٹ کا اشتہار درباب استحقاق نوکری

ادھر تو دیہاتی مکاتب اور کالجوں کا یہ حال تھا کہ اُن پر سب کو شبہ رواج دینے مذہب عیسائی کا ہو رہا تھا کہ دفعۃً پیشگاہ گورنمنٹ سے اشتہار جاری ہوا کہ جو شخص مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہوگا اور فلاں

فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دیکر سند یافتہ ہوگا وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔ چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سارٹیفکیٹ پر جن کو ابھی تک سب لوگ "کالا پادری" سمجھتے تھے۔ منحصر ہوگئیں اور ان غلط خیالات کے سبب لوگوں کے دل پر ایک غم کا بوجھ پڑ گیا اور سب کے دل میں ہماری گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہوگئی لوگ یہ سمجھے کہ ہندوستان کو ہر طرح بے معاش اور محتاج کیا جاتا ہے تاکہ مجبور ہوکر رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مذہبی باتوں میں تغیر و تبدل ہو جائے۔ [۱]

جیل خانوں میں اختلاط اکل و شرب

اسی زمانہ میں بعض اضلاع میں تجویز ہوئی کہ قیدی جیل خانوں میں ایک شخص کے ہاتھ کا پکا ہوا کھائیں جس سے ہندوؤں کا مذہب بالکل جاتا رہتا تھا مسلمانوں کے مذہب میں اگرچہ کچھ نقصان نہیں آتا تھا مگر اس کا رنج سب کے دل پر تھا کہ سرکار ہر ایک کا مذہب لینے پر آمادہ اور ہر طرح پر اس کی تدبیر میں ہے

پادری اے ایڈمنڈ کی چٹھیات کا اجراء

یہ سب خرابیاں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو رہی تھیں کہ دفعتہً ۱۸۵۵ء میں پادری اے ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیات بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ "اب

---

[۱] لفٹننٹ کرنل ویلر جو ایک رجمنٹ کا کمانیر تھا اس نے ۱۸۵۷ء میں بڑے فخر سے کہا تھا کہ بیس برس سے کچھ زیادہ دنوں سے میری یہ عادت رہی ہے کہ سب قسم کے آدمیوں کو بغیر کسی تمیز کے وعظ سناتا ہوں۔ مسیح کا سپاہی بن کر خدا کے احکام اور سرکار کمپنی کا سپاہی بنکر اس کے احکام سناتا ہوں۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۳۰۱

تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہوگئی مذہب بھی ایک چاہیئے اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔" میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔ پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی۔ سب کو یقین ہوگیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آگیا اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اوّل اُن کو کرسٹان ہونا پڑیگا اور پھر تمام رعیت کو۔ سب لوگ بیشک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں آپس میں ہندوستانی لوگ اہلکاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی چٹھی آئی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم بھی بسبب لالچ نوکری کے کرسٹان ہوگئے ان چٹھیوں نے یہاں تک ہندوستانی اہلکاروں کو الزام لگایا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں وہ مارے شرمندگی اور بدنامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے کہ ہمارے پاس تو نہیں آئی لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آجائے گی۔ کیا تم سرکاری نوکر نہیں ہو؟ اگر سچ پوچھو تو یہ چٹھیاں تمام ہندوستانیوں کے غلط شبہات کو پکا اور مستحکم کرنے والی تھیں۔ چنانچہ اُنھوں نے کردیا اور اُس کے مٹانے کو کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ کچھ عجیب نہ تھا کہ اسی زمانہ میں کچھ برہمی اور تھوڑا بہت فساد ملک میں شروع ہو جاتا۔ چنانچہ اُس وقت کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے مگر جناب معلیٰ القاب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر بنگال نے بہت جلد خبر لی اور ایک اشتہار جاری کیا جس سے فی الجملہ لوگوں کے دلوں میں تسلی ہوئی اور وہ اضطراب جو ہوگیا تھا وہ دھیما ہوا مگر جیسا کہ چاہیئے ویسا قلع اور قمع اس کا نہ ہوا۔ لوگ سمجھے کہ بالفعل یہ بات موقوف ہوگئی پھر کبھی قابو پا کے وقت پر جاری ہوگی۔

مسلمانوں کو مداخلت امور مذہبی سے زیادہ رنج ہونا اور اس کا سبب

ان سب باتوں سے مسلمان بہ نسبت ہنود کے زیادہ ناراض تھے اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو اپنے مذہب کے احکام بطور رسم و رواج کے ادا کرتے ہیں۔ نہ بطور احکام مذہب کے ان کو اپنے مذہب کے احکام اور عقائد اور وہ دلی اور اعتقادی باتیں جن پر نجات عاقبت کی موافق اُن کے مذہب کے منحصر ہے مطلق معلوم نہیں ہیں اور نہ اُن کے برتاؤ میں ہیں اس سبب سے وہ اپنے مذہب میں نہایت سست اور بجز ان رسمی باتوں کے اور کھانے پینے کے پرہیز کے اور کسی مذہبی عقیدے میں پختہ اور متعصب نہیں ہیں۔ اُن کے سامنے اُن کے اس عقیدے کے جس کا دل میں اعتقاد چاہیئے۔ برخلاف باتیں ہوا کریں۔ اُن کو کچھ غصہ یا رنج نہیں آتا۔ برخلاف مسلمانوں کے وہ اپنے مذہب کے عقائد بموجب جو باتیں کہ اُن کے مذہب میں نجات دینے والی اور عذاب میں ڈالنے والی ہیں بخوبی جانتے ہیں اور ان احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس سبب سے اپنے مذہب میں پختہ اور متعصب ہیں ــ ان وجوہات سے مسلمان زیادہ تر ناراض تھے۔ اور ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ تر فساد میں اُن کا شریک ہونا قرین قیاس تھا چنانچہ یہی ہوا۔ بلاشبہ جتنی گورنمنٹ کی مداخلت مذہب میں خلاف قواعد ملک داری ہے ایسا ہی کسی مذہب کی تعلیم کو روکنا علی الخصوص اس مذہب کی جس کو وہ حق سمجھتی ہے' برخلاف اور بیجا ہے۔ مگر ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ باوجودیکہ ہماری گورنمنٹ ایسی ہی ہے مگر کام اس طرح پر ہوئے کہ رعایا کا یہ غلط شبہ رفع نہ ہوا۔[1]

پنڈتوں کی مخالفت

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں۔ مشنریوں اور انگریزی حکام کی اُن کوششوں کو جو ہندوؤں کے مذہب اور اُن کے

---

[1] اسباب بغاوت ہند از ص ۱۷ تا ص ۲۳

رسم ورواج کے خلاف نہایت تفصیل سے بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

پنڈتوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں دنیاوی علوم کی ہر شاخ کو باقاعدہ نظام کے ساتھ داخل کر رکھا ہے۔ غرض اس دنیا میں اور اس سے باہر ہندوؤں پر اقتدار پنڈتوں کو وہ حاصل ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں۔ اب انگریزی عملداری میں اُن کے سارے اقتداروں اور اختیاروں میں خلل پڑا۔ مقدمات میں رجوع انگریزی عدالتوں میں کی جاتی۔ اور اُن کے اپیل بھی اعلیٰ عدالتوں میں ہوتے۔ پنڈتوں کی پوچھ گچھ اُن میں کمتر ہو گئی۔ اس لئے یہ سارا فرقہ انگریزی عملداری کا بدخواہ ہو گیا۔[۱]

(۳) عزت شرافت اور خودداری پر کاری ضرب

ہندوستان کی عزت وعظمت پر کاری ضرب تو سو سال پہلے مئی ۱۷۵۷ء میں لگ چکی تھی۔ جب عیاری اور مکاری سے سراج الدولہ کو شکست دیکر بنگال پر قبضہ کیا گیا تھا اور بقول ایک کمیونسٹ مصنف کے ۱۸۵۷ء میں جس کی صدسالہ یادگار منائی جا رہی تھی لیکن اسوقت ہندوستان کی مختلف طاقتیں اس طرح آپس میں دست وگریبان تھیں کہ سراج الدولہ کا قتل بھی ایک معمولی واقعہ تصور کیا گیا۔

ظاہر ہے جب ایک طرف احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کی عظیم الشان طاقت کو تہ وبالا کر رہا ہو۔ پھر شمالی ہند میں شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں۔ اور جنوبی ہند میں نظام الملک

---

[۱] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۱۹۷

اور سلطان ٹیپو ۔ ایک دوسرے کی شکست پر چراغاں کر رہے ہوں ۔ احمد شاہ ابدالی کے قتل عام کے بعد بھی مرہٹوں کے آپس کے جھگڑے ختم نہ ہوئے ہوں اور نہ صرف جنوبی مغربی سرحد کے علاقوں میں بلکہ وسط ہند تک اُن کے اکھاڑے جمے ہوئے ہوں تو انگریزوں کے ڈپلومیٹک اور پُر فن ہاتھ جو گل کھلا رہے تھے اُن کا احساس عوام تو عوام خواص کو بھی مشکل ہی سے ہو سکتا تھا ۔ اور چونکہ انگریز خود بھی اپنے مستقبل سے مطمئن نہیں تھے ایک طرف یورپ میں نپولین بونا پارٹ ۔ اُن کے سینے پر سوار تھا ۔ دوسری جانب ہندوستان میں فرانسیسی فوجیں نبرد آزما تھیں ۔ ہندوستان کا نپولین اعظم ۔ جس کو انگریزوں نے نہیں بلکہ خود اُس کے غدار ساتھیوں نے ناکام نپولین بنا دیا ۔ یعنی سلطان ٹیپو ۔ اُس کا کر و فر انگریزوں کی نیند حرام کئے ہوئے تھا ۔ اُس سے فراغت ہوئی تو جسونت راؤ ہلکر ۔ نواب امیر علی خاں اور وسط ہند میں پنڈاری ۔ عرصہ تک اور اُن کے بعد سید احمد شہیدؒ کی غیر معمولی تنظیم ۱۸۳۱ء تک انگریزی قوت کے لئے تپ و لرزہ بنی رہی تھی لہٰذا انگریز کا ٹھنڈا دماغ بھی اُس کو چاپلوسی اور خوشامدانہ سیاست پر آمادہ کئے ہوئے تھا ۔ وہ نہ صرف بادشاہوں اور نوابوں کے دربار میں دست بستہ مودبانہ حاضری دیتا تھا ۔ بلکہ علماء ، فقراء اور جوگیوں کی خدمت میں بھی ہاتھ باندھ کر حاضر ہوتا تھا ۔ انتہا یہ کہ سید احمد صاحب شہید کا قافلہ سفر کرتا ہے تو ہندو مسلمانوں کی طرح نیل کی کمپنیوں کے انگریز مالک بھی جگہ جگہ دعوت کرتے ہیں ۔

مگر یہی انگریز جب ۱۸۳۱ء میں سید صاحب شہید اور اُن کی جماعت کو سکھوں اور سامراج پرست مسلمانوں کے ہاتھ ۔ پھر سکھوں کو خود آپس کی خانہ جنگی کے ذریعہ قلع قمع کر دیتا ہے تو ایک طرف اپنی شاہنشاہیت کا اعلان کرتے ہوئے مغل بادشاہ اور اودھ کے بادشاہ کے بجائے کمپنی بہادر کا سکّہ رائج کرتا ہے ۔ عدالتوں میں شاہی دستاویزوں کے بجائے

کمپنی کے اسٹامپ جاری کرتا ہے اور دوسری طرف غرور اور تکبر کا پارہ یہاں تک چڑھتا ہے کہ سرسید جیسے وفادار کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ سرسید مرحوم کا شکوہ ملاحظہ فرمایئے اس مؤدب شکوے میں سرسید نے دونوں رُخ پیش کردیئے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

حال کے حکام متعہد سے (اُس وقت کے افسران متعلقہ کے مقابلہ میں) وہ پہلے لوگ (سابق زمانہ کے یورپین افسر) بہت عزت کرتے تھے ہندوستانیوں کی ہرطرح سے خاطرداری کرتے تھے۔ اُن کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے دوستانہ اُن کے رنج وراحت کے شریک ہوتے تھے۔ باوجودیکہ وہ بہت بڑی سرداری اور حکومت ہندوستان میں رکھتے تھے اور تحشم اور رعب اور دبدبہ جو شایان حکومت ہے وہ بھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ پھر ایسی محبت اور عزت ہندوستانیوں کی کرتے تھے کہ ہرایک شخص ملکراُن کے اخلاق کا اور اُن کی محبت کا فریفتہ ہوجاتا تھا اور تعجب سے کہتا تھا کہ یہ کیسے اچھے لوگ ہیں کہ باوجود اس حشمت و شوکت اور حکومت کے بے غرور ہیں اور کس طرح اخلاق سے ملتے ہیں۔ ہندوستان میں جو لوگ بزرگ گنے جاتے تھے اُن سے اسی طرح پیش آتے تھے۔ بیشک اُن لوگوں نے پطرس مقدس کی پیروی کی تھی اور برادرانہ محبت پر اُلفت بڑھائی تھی۔ حال میں جو حکام متعہد ہیں اُن میں سے اکثروں کی طبیعتیں اس کے برعکس ہیں۔ کیا اُن کے غرور اور تکبر نے تمام ہندوستانیوں کو اُن کی آنکھوں میں ناچیز نہیں کردیا ہے۔ کیا اُن کی بدمزاجی اور بے پروائی نے ہندوستانیوں کے دل میں بے جا وحشت نہیں ڈالی ہے۔ کیا ہماری

گورنمنٹ کو نہیں معلوم ہے کہ بڑے سے بڑا ذی عزت ہندوستانی حکام سے لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے ترساں نہ تھا اور کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ایک اشراف اہل کار۔ صاحب کے سامنے مثل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے۔ اور صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دُشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی۔ اس نوکری سے تو گھانس کھودنی بہتر ہے[۵۱]
بلاشبہ تمام رعایا ہندوستان کی اس بات کی شاکی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے اُن کو نہایت بے قدر اور بے وقر کر دیا ہے۔ ہندوستان کے اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں ہے جیسی ایک چھوٹے یورپین کی ایک بہت ڈبوک کے سامنے۔ یوں تصوّر کیا جاتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی جنٹل مین نہیں ہے[۵۲]

(۴) الحاق

ہم اس کے قائل نہیں ہیں کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ صرف مٹتی ہوئی جاگیر شاہی کی انگڑائی تھی" یہ ہنگامہ تقاضا تھا انسانی شرافت کا۔ عزّتِ نفس اور ہندوستانیوں کی خودداری کا۔ اُن کی حمیّت و غیرت کا۔ احساس صحیح اور جذبہ تعاون کا۔ یہ ہنگامہ اضطراب تھا۔ دین و ایمان کے ماننے والوں۔ دھرم اور مذہب کے پابند۔ پاک نفوس۔ اور پاک باطن خدا پرستوں کے پاک جذبات و احساسات کا۔ یہ ہنگامہ شور و فغاں تھا۔ تباہ شدہ

---

۵۱ اسباب بغاوت ہند ص۴۲ و ص۴۳۔ ۵۲ ایضاً ص۴۲

دست کاروں کی فاقہ مستیوں کا۔ زیادہ ستانی کی مصیبت کے مارے ہوئے کسانوں اور کاشت کاروں کے رنج و غم کا۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہنا بھی حقیقت کے خلاف ہوگا کہ جاگیرداروں کے اضطراب اور اُن کی بے چینی کو اس کے اُبھارنے میں کوئی دخل نہیں تھا بلا شبہ اُن کو بھی دخل تھا اور اس بے سروسامان ہندوستان میں اس کا بھی پورا پورا سامان موجود تھا۔ اس کی مختصر سی سرگذشت ملاحظہ فرمائیے۔

"لارڈ ڈلہوزی نے جنگ اور فتوحات کے ذریعہ پنجاب اور برما کو کمپنی کی مملکت میں شامل کرلیا۔ پنجاب کی دوسری جنگ کے بعد کمپنی پنجاب پر بھی قابض ہوگئی۔ تین سال تک پنجاب کی عنان حکومت ایک کونسل کے ہاتھ میں رہی ۱۸۵۳ء میں کونسل توڑ کر پنجاب کو ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا گیا۔ اس صوبہ کا پہلا چیف کمشنر سرجان لارنس تھا۔

برما کی دوسری جنگ کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے برطانوی مؤرخوں نے بہت تعصب سے کام لیا ہے۔ رنگون کے برمی حاکم کو برطانوی تجارت کا دشمن ظاہر کرتے ہیں اُنھوں نے واقعات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا کمپنی کو حق بجانب قرار دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

فتوحات کے ذریعہ لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب اور برما کو کمپنی کی مملکت میں شامل کیا لیکن ڈپلومیسی کے کام میں لاکر اُس نے ستارا، ناگپور، جھانسی، برار، سنبھل پور، ادے پور اور اودھ پر قبضہ کیا۔

جن شہزادوں کی مدد سے کمپنی ہندوستان میں ایک وسیع سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اُن کے لاولد مرنے پر اُن کی ریاستوں پر قبضہ جمانے کا نام مسئلہ الحاق ہے کمپنی پرتاپ سنگھ کو ستارا کا حکمراں تسلیم کرچکی تھی۔ اس کے سن بلوغت تک کپتان

گرانٹ ڈف ریاست کا ناظم مقرر ہوا۔ شہزادہ جوان ہوا۔ بلوغت کے ساتھ ذہانت بھی آئی۔ کپتان دیسی رئیسوں کی ذہانت کو کمپنی کے لئے آفت خیال کرتا تھا۔ پرتاپ سنگھ کو جلاوطن کر کے بنارس بھیجدیا گیا۔ ستارا کا جدید حکمراں اُس کا بھائی مقرر ہوا۔ دونوں بھائی ۱۸۴۸ء میں لاولد مر گئے اُن کے متبنوں کو وراثت کا جائز حقدار تسلیم کرتے ہوئے ڈلہوزی ستارا پر قابض ہوگیا۔[۱] (داستان ستارا از میجر باسو)

ناگپور کے راجہ رگھوجی بھونسلہ ثالث نے ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۳ء کو وفات پائی چونکہ وہ لاولد تھا اس لئے اُس کی دادی نے اُس کے بھائی کے بیٹے کو ریاست کا وارث تسلیم کرلیا۔ مرحوم کی رانیوں نے بھی اُسے راجہ تسلیم کرلیا۔ لیکن ڈلہوزی نے یشونت راؤ کو ناگپور کا راجہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ لاولدیت کا بہانہ کرتے ہوئے ڈلہوزی ناگپور پر قابض ہوگیا۔ ناگپور کے الحاق کے ساتھ متوفی راجہ کی رانیوں کے ساتھ بُرا سلوک کیا گیا اُن کے جواہرات اور سامان آرائش نیلام کیا گیا۔ (ہندوستان میں سلطنت از میجر ایوانز بل) ناگپور کے الحاق کا سبب کمپنی کا اپنا پیدا کردہ تھا۔

جھانسی کے آخری راجہ نے ۲۱ر نومبر ۱۸۵۳ء کو وفات پائی۔ ڈلہوزی نے متوفی راجہ کے متبنی کو وارث تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ رانی کو پنشن دے کر جھانسی کا الحاق کردیا گیا۔ جھانسی کے الحاق نے ۱۸۵۷ء میں رانی کو انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے پر مجبور کردیا۔

لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت میں ہندوستانی راجوں کی لاولد موت

---

[۱] مزید معلومات کے لئے باسو کی داستان ستارا نیز میجر ایوانز بل کی "ہندوستان میں سلطنت" ملاحظہ ہو۔

بہت بڑا معمہ ہے۔

ڈلہوزی نے اپنی نگاہ حرص مملکت آصفیہ پر جمائی۔ ڈلہوزی نے نظام کو توہین آمیز خط لکھا۔ ڈلہوزی نے امدادی فوج کے اخراجات کے لئے نظام سے برار کا علاقہ چھین لیا۔ وہ مملکت آصفیہ پر قابض ہو جاتا۔ اگر سالار جنگ اس کے عزائم کو شکست نہ دیتا۔ پچاس سال بعد لارڈ کرزن نے برار پر مکمل قبضہ کر لیا۔

اودھ کا الحاق سیاسی اور اخلاقی طور پر ایک بہت بڑا گناہ تھا۔ مورخوں نے اس الحاق کو ۱۸۵۷ء کے حادثہ کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔ اودھ کا آزادانہ وجود مغلیہ سلطنت کے دور انحطاط سے شروع ہوتا ہے وہ اگرچہ آزاد تھے لیکن انہیں مغل شہنشاہ کا وزیر خیال کیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ نواب وزیر مغلیہ دربار کے تاثرات سے آزاد ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ کمپنی نے انہیں دہلی کے حلقہ اثر سے آزاد ہونے میں مدد دی۔ مارکوئس آف ہسٹینگز نے اودھ کے نواب وزیر کو "شاہ" کا خطاب دیا۔ وزارت سے شاہیت زیادہ غلامانہ ثابت ہوئی۔ شاہانِ اودھ کمپنی کے زیر اثر آ گئے۔ کمپنی نے حسب منشا شاہانِ اودھ کی طاقت کم کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ ۱۸۰۱ء کے معاہدہ نے کمپنی کو مملکت اودھ کا محافظ بنا دیا۔ اودھ کی تمام مصیبتوں کا سرچشمہ یہی معاہدہ تھا۔ کمپنی کی پنجاہ سالہ سرپرستی حالاتِ اودھ کو بہتر نہ بنا سکی۔ لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں اودھ کے حالات بہت نازک ہو چکے تھے۔ ڈلہوزی معاملات اودھ میں مداخلت چاہتا تھا۔ ڈلہوزی کی مداخلت کا مقصد اودھ کا خاتمہ کرنا تھا۔ مدتوں سے انگریز اودھ پر آنکھ لگائے ہوئے تھے۔

اودھ کی برطانوی آبادی ڈلہوزی کو الحاق کا مشورہ دے رہی تھی۔ ذرپار

ناصرالدین کے ایک برطانوی مصوّر نے شاہانِ اودھ کو بدنام کرنے کے لئے "مشرقی بادشاہ کی خانگی زندگی" لکھی۔ اسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے "کلکتہ ریویو" کے ایک مدیر نے ایک مقالہ بعنوان "کیا فتوحات کا زمانہ ختم ہوچکا ہے" لکھا اس مقالہ میں الحاقِ اودھ کا مشورہ دے دیا گیا۔

الحاق اودھ کے بعد ڈلہوزی ۱۸۵۶ء میں انگلستان چلاگیا

(کمپنی کی حکومت از پروفیسر باری ص ۳۳۴ تا ص ۳۳۶)

یہ طویل خاموشی کیوں؟ ——————

پہلے باب میں جن اسباب اور وجوہات کی طرف مختصر اشارے کئے گئے ہیں اگرچہ اُن کے سنہ اور تاریخیں نہیں بیان کی گئیں۔ مگر اتنی بات ظاہر ہے کہ آج (۱۸۵۶ء) سے نہیں بلکہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے کمپنی کی لوٹ مار جاری تھی۔ اس لوٹ کھسوٹ سے ہندوستان کی صنعت و تجارت برباد ہوچکی تھی۔ اور سو سال پیشتر یعنی جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء کے بعد تو اُس نے حکومت کا روپ بھی دھارن کرلیا تھا۔ پہلے اگر "گربہ مسکین" بنکر خون چوستی اور گوشت نوچتی تھی تو اب "گرگ مردم خور" بن کر نہ صرف دستکاری کے کارخانوں اور تجارت کی منڈیوں کو تباہ کر رہی تھی۔ بلکہ بڑی بڑی حکومتوں کے پرخچے اُڑا رہی تھی۔ بس سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستانیوں کے دلوں کی سرزمین میں قومی احساس کے ذرّے چمک رہے تھے۔ اگر اُن کے سینوں میں وطنی جذبات زندہ تھے۔ اگر خودداری اور خود اعتمادی کی حرارت سرد نہیں پڑی تھی۔ اگر دور اندیشی اور انجام بینی کے چراغ گل نہیں ہوئے

تھے تو وہ اتنے طویل عرصہ تک کیوں خاموش رہے اور اُن کے تن بدن میں حرکت کیوں نہیں پیدا ہوئی؟ یہ ایک نہایت معقول سوال ہے۔ اس کا جواب ہندوستان کے ایک مشہور صاحب قلم نے یہ دیا ہے۔

"انگریز جب یہاں پہونچے تھے تو تاجروں کی حیثیت میں پہونچے تھے عام لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں صرف بیوپار سے دلچسپی ہے ملک داری سے کوئی واسطہ نہیں اور انھوں نے جو لڑائیاں کیں وہ ملک گیری کے لئے نہ تھیں بلکہ ملکی حکمرانوں میں سے کسی ایک کی امداد کے لئے تھیں یا اُن کا مقصد یہ تھا کہ دوسری یورپی تاجروں کا مقابلہ کر سکیں۔ پھر جب باقی یورپی قومیں مقابلہ کے میدان سے ہٹ گئیں تو انگریزوں نے یا تو ملکی حکمرانوں کی حمایت کو پردہ بنائے رکھا یا ایسی چالیں چلتے رہے کہ اُن کے حقیقی مقاصد سب پر آشکارا نہ ہو سکے۔

چند مثالیں | مثلاً

۱۔ وہ بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ میں جعفر کے پس پردہ پہونچے۔ پھر اُنھوں نے شاہ عالم ثانی سے تینوں صوبوں کے لئے دیوانی کی سند حاصل کی (۱۷۶۵ء)

۲۔ اودھ میں عمل دخل حاصل کیا تو شجاع الدولہ یا آصف الدولہ یا سعادت علی خاں یا غازی الدین حیدر وغیرہ کے حامیوں اور مددگاروں کی حیثیت میں حاصل کیا اور اسی حیثیت میں وہ عہدوں کو نباہ کیا۔

۳۔ حیدر علی۔ ٹیپو سلطان سے مرہٹوں اور نظام کے شریک کار رفیق اور بہی خواہ کی حیثیت میں لڑائیاں کیں۔ جب ٹیپو سلطان نے شہادت پائی تو مرہٹوں کو بالکل مٹا دیا۔ اور نظام کو بے دست و پا بنا کر آخری دم تک مرقع عبرت کے طور پر قائم رکھا۔

۴۔ دہلی پہونچے تو "شاہ عالم" کے ہمدرد اور بہی خواہ بنے۔ عجب بات یہ ہے کہ شاہ عالم کے نزدیک بھی انگریزوں کی حیثیت یہی تھی اکبر شاہ ثانی کے وقت تک یہی حالت تھی کہ انگریز جو رقم بادشاہ کو دیتے تھے اُسے وظیفہ نہیں خراج کہا جاتا تھا۔ اکبر شاہ کا ایک خط موجود ہے جس میں خراج بڑھانے کی طرف توجہ دلائی گئی تھی جب پردے چاک ہو گئے اور انگریزوں کا اقتدار برہنہ ہو کر سامنے آگیا تو لوگوں پر حقیقت حال آشکارا ہوئی۔ اُس وقت قومی غیرت کا جذبہ بیدار ہوا۔ پھر دوسرے اسباب اس جذبے پر برابر تازیانوں کا کام دیتے رہے"۔

یہ فاضل مقالہ نگار جو ہند و پاکستان کے جلیل القدر مصنف ہیں جن کی تعظیم و تکریم کے لئے ہماری گردن خم ہے اور اُن کی فاضلانہ تنقید و تحقیق کے سامنے پیشانی خامہ سرنگوں۔ آپ کی تمام عظمتوں کے اعترافات کے باوجود ہمیں اس جواب کی اصابت و صداقت میں تامل ہے۔ ممکن ہے خامۂ نوک دریدہ کی یہ جولانی جسارت بے جا اور حدِ ادب سے تجاوز قرار دی جائے لیکن تحقیق تفتیش اور نظر و تفکر کی سیاحت گاہوں میں ایسی منزلیں بھی آتی ہیں جہاں مؤدبانہ نقد و تبصرہ کے لئے اجازت لینی پڑتی ہے۔

فاضل مقالہ نگار کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ انگریز تاجر کی حیثیت میں ہندستان

پہونچے اور کم از کم ابتدائی دور کے لئے یہ بھی تسلیم ہے کہ "عام لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں صرف بیوپار سے دلچسپی ہے ملک داری سے کوئی تعلق نہیں" اور ہم یہ بھی تسلیم کر سکتے ہیں کہ سراج الدولہ کو ختم کرنے کے لئے میر جعفر نے جو سازش کی اس کی بنیاد بھی یہی تصور تھا کہ روپیہ ان بیوپاریوں کا ہوگا اور سلطنت میری۔

لیکن غور و فکر کا مقام یہ ہے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد جب جعفر کی گدی میر قاسم کو بخش کر کمپنی بہادر سودا فروش کی حیثیت میں نہیں بلکہ "نواب گر" کی شان میں جلوہ افروز ہوئی تو کیا اب بھی اس تصور کے لئے کوئی گنجائش باقی رہ گئی تھی کہ "انگریز کو صرف بیوپار سے دلچسپی ہے"۔[۱]

حافظ رحمت خاں (شہید) اور روہیلوں کی طاقت کو ختم کرنا بیشک شجاع الدولہ کا سیاسی منصوبہ تھا جس کی تکمیل کے لئے اس نے انگریزوں سے مدد لی۔ مگر کیا بہار میں شکست پر شکست اٹھانے اور کوڑہ جہان آباد کے معاہدہ کی رو سے محصور اور پابند ہو جانے کے بعد بھی شجاع الدولہ یہی تصور کرتا رہا تھا کہ انگریز کو صرف بیوپار سے دلچسپی ہے۔

صرف یہ تین[۱] واقعات جو صرف سترہ سال (۱۷۵۷ء تا ۱۷۷۴ء) کی قلیل مدت میں پیش آگئے سونے والوں کو بیدار کرنے اور دیدہ ہائے بستہ کو وا کرنے کے لئے کافی تھے۔ جو قوم ان تین قیامت خیز حادثوں کے بعد بھی انگریز کو نہیں پہچان سکی تھی اس کے لئے ناممکن تھا کہ وہ کسی بھی وقت انگریز کو پہچان سکتی۔ کیونکہ بجلیوں کے کڑاکوں کو نہ سنتا۔ اور برق خرمن سوز کی

لہ (۱) میر جعفر اور میر قاسم میں گدی کا تبادلہ (۲) کوڑہ جہان آباد کا معاہدہ (۳) روہیلہ طاقت کی شکست و تخریب۔

چمک اور تڑپ کو نہ دیکھنا غفلت کی دلیل نہیں بلکہ فقدان صلاحیت کی علامت ہے کہ یہاں سمع و بصر کی طاقت ہی موجود نہیں کہ گرج اور چمک کا احساس ہو۔

اسی صدی کے آخر میں سلطان ٹیپو شہید کو ختم کرکے اس کے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور صرف سات سال بعد دہلی فتح کرکے شاہ عالم کو نظر بند کردینا۔ انگریزی مقاصد کی سراسر عریانی تھی۔ اب کونسا پردہ تھا جو اس نیم برہنہ قوم کی کامل برہنگی میں حائل رہ گیا تھا۔

اتنی بات قابل تسلیم ہے کہ یورپ کے سفید فام جو دلوں کی سیاہی اور اپنی جلادانہ طبیعت کو چٹی چمڑی اور بھولی بھالی صورتوں میں پنہاں کئے ہوئے تھے۔ اپنے کردار کی وحشت و بربریت پر بھی رنگ برنگ نقاب ڈالتے رہے۔ مگر کیا ہندوستانی مدبر ایسے کوتاہ اندیش تھے کہ ان کی نگاہیں سیاسی چالبازیوں کے پس منظر تک نہ پہونچ سکیں جن کے دعوے یہ تھے کہ من انداز قدت را مے شناسم

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش

اور وہ رنگ برنگ نقابوں کے نظر فریب نظاروں میں ایسے محو ہو گئے تھے کہ اندازہ قدو قامت کے بعد بھی پری اور دیو میں فرق نہ کرسکے۔ تعجب ہے یہ فاضل مقالہ نگار ایک طرف اپنی محققانہ تصانیف میں جماعت مجاہدین اور ان کے قائد حضرت سید احمد شہیدؒ رحمۃ اللہ علیہ کی ان بے مثال قربانیوں اور عظیم الشان مجاہدانہ خدمات کا تعارف کرا رہے ہیں جن کی نظیر کم از کم تاریخ ہندوستان میں ناپید ہے اور دوسری جانب ہندوستانیوں کی نہ صرف کوتاہ اندیشی بلکہ کور باطنی اور کور چشمی کا ثبوت فراہم کررہے ہیں۔

ممکن ہے یہ توجیہہ کی جائے کہ "مقالہ نگار" کا جواب عام ہندوستانیوں کے لحاظ سے ہے (سید صاحب) کی مخصوص جماعت اس سے مستثنیٰ ہے۔ لیکن تاریخ کی ناقابل انکار

حقیقتیں اس توجیہہ کو بھی جائز نہیں قرار دے سکتیں کیونکہ اگر تحقیق و تفتیش کے دائرے کو صرف انگریزی کتابوں تک محدود نہ رکھا جائے اور اپنے کسی مخصوص تصور کو نبھانے کی خاطر واقعات کے تسلسل کو توڑنے کی کوشش نہ کی جائے۔ تو جو حقیقت روز روشن کی طرح نکھر کر سامنے آئے گی وہ یہ ہوگی کہ ہندوستان کے ارباب حل و عقد۔ فرمانروا اور علماء انگریز کو اسی وقت پہچان چکے تھے جب انھوں نے اور اُن کے پیش رو پرتگیزیوں نے ہندوستان کے ساحلوں پر قزاقی شروع کی تھی اور حاجیوں کے جہازوں کو لوٹ کر اپنی بربریت اور وحشت کو تاریخ ہند کا ایک دلخراش باب بنا دیا تھا۔

خطرات کا احساس اور اُن کا علاج

ظاہر ہے "داسکوڈی گاما" مغل سلطنت کی بنیاد پڑنے سے بھی تقریباً ربع صدی پہلے کالی کٹ پہنچ چکا تھا اُسی وقت سے سوداگروں کے لباس میں ان قزاقوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی تھی اور اکبر کے زمانہ تک وہ متعدد بندرگاہوں پر قابض ہو چکے تھے۔

مغل اعظم "اکبر" نے ایک مرتبہ اپنے دربار میں پرتگیزی وفد کا اعزاز و اکرام کرکے بلاشبہ اپنی بلند حوصلگی۔ سیر چشمی اور اعلیٰ کردار کا ثبوت دیا۔ لیکن ساتھ ہی جب پرتگیزی قزاقوں کے متعلق شکایتیں پہونچیں تو گجرات و مالوہ کے گورنروں کے ذریعہ اُن کی گوشمالی بھی کرادی۔

جہانگیر کے دورِ حکومت میں انگلستان کے نمائندے ہندوستان پہنچے۔ "سر طامس رو" کی سفارت باریاب ہوئی۔ شاہی اعزاز و اکرام نے اُن کا استقبال کیا۔ مگر شاہزادہ خرم (بعد کا شاہجہاں بادشاہ) اُن کے چہرے بشرے سے اُن کی نیتیں تاڑ رہا تھا اس کی کوشش بھی یہی رہی کہ یہ سفارت ناکام ہو۔ پھر جب شاہزادہ خرم شاہجہاں بن گیا

تو اُس نے اور اُس کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے جس طرح اُن کو بار بار ہندوستان کی سرحدوں سے ہنکایا۔ پیش قدمی کرنے والوں کو گرفتار کر کے سزائیں دیں وہ اس کا بین ثبوت ہے کہ یہ بیدار مغز فرمانروا اُن کے سبز قدموں کی نحوست سے غافل نہ تھے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شاندار ماضی جلد اول - شاہانِ مغلیہ کا نظامِ حکومت)

جہاں تک طبقۂ علماء کا تعلق ہے تو عہدِ اکبر و جہانگیر کے سب سے بڑے عالم جنکو دنیائے معرفت نے "مجدد الف ثانی" کا خطاب دیا اُن کا ایک عارفانہ جملہ مشہور ہے جس میں آپ نے کفر و عصیان کے بدترین نمونہ کے طور پر "کافر فرنگ" کا نام لیا ہے۔

"معرفت بر آں کس حرام است کہ خود را از کافر فرنگ بہتر داند"[۵۱]

دورِ خود فراموشی

پس ان اربابِ بصیرت علماء اور فرمانرواؤں کے متعلق یہ ارشاد کہاں تک اور کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ یہ انگریز کو نہیں پہچان سکتے تھے۔ البتہ سلطان عالمگیر کی وفات کے بعد وہ دور آیا جو سلطنت مغلیہ کی جانکنی کا دور تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اُس ملک (ہندوستان) کی عزت و عظمت بھی حالت نزع میں گرفتار ہونے لگی جس نے دو سو برس سے اپنی قسمت کے تار و پود مغل بادشاہت کے دامنوں سے باندھ دیئے تھے یہ دور تھا جب مرکزیت فنا کے گھاٹ اتاری جا رہی تھی اور طوائف الملوکی کے عفریت ہندوستان کے چپہ چپہ پر رینگ رہے تھے۔ اس دور کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ لوگوں نے انگریزوں کو پہچاننا چھوڑ دیا تھا۔ البتہ یہ درست ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے غافل ہو گئے تھے اور انھوں نے اپنے مستقبل کو پہچاننا چھوڑ دیا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انگریز کو پہچان لینے کے باوجود وہ نہیں کیا یا نہیں کر سکے جو کرنا چاہیئے تھا۔ خود پرستی نے خود غرضی اور ذاتی مفاد کی ہوسناکی جو قومی عظمت و وقار اور حیاتِ اجتماعی کے لئے سرطان

---

۵۱ بحوالہ مکتوبات شیخ الاسلام و حیات شیخ الاسلام ص ۲۷

اور پلیگ سے بھی زیادہ مہلک امراض ہیں اور جن کی بنا پر طوائف الملوکی عروج پاتی ہے انھیں امراض نے ارباب اقتدار کی چشم کو نابینا اور گوش سخن نیوش کو اصم و مدہوش بنا دیا تھا۔

فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

یہ عجیب فلسفہ ہے کہ انسان جتنا زیادہ اپنی پرستش میں مشغول ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ خود فراموش ہو جاتا ہے۔ ذاتی مفاد اور خود پرستی کے شوالے جو دکن بنگال اور اودھ میں تعمیر کئے گئے تھے ان کی خصوصیت یہ تھی کہ اُن کے پجاری انگریزوں کو پہچاننے سمجھنے اور بوجھنے کے باوجود اس پر مجبور تھے کہ سُنی کو اَن سُنی اور دیدہ کو نادیدہ بنا دیں۔ کیوں کہ وہ اغراض جن کے آب و گل سے یہ شوالے تعمیر ہوئے تھے اُن کا تقاضا ہی یہ تھا ورنہ یہ شوالے مسمار ہو رہے تھے۔

دردِ جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری ٭ چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

گزشتہ واقعات اگر اس لئے یاد دلائے جاتے ہیں کہ مستقبل کے لئے اُن سے سبق لیا جائے تو یاد دلانے والوں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی الگ الگ کر کے دکھائیں کوئی ضرورت نہیں کہ "یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِہٖ" جیسا فعل کر کے تاریخ کی افادیت میں ہم خلل انداز ہوں۔ جب آئین قدر و قضا یہ ہے کہ

گندم از گندم بروید جو زجو ٭ از مکافاتِ عمل غافل مشو۔

تو مورخ کے قلم حقیقت رقم کو بھی بے لوث اور بے باک ہونا چاہیئے۔ کیوں نہیں کہہ دیا جاتا کہ میر جعفر نے وہی سبق دہرایا جو سراج الدولہ کے مکتب سیاست میں پڑھا تھا اور سراج الدولہ کے اسکول کا کورس وہی تھا جس کو علی وردی خاں کی عملی سیاست نے مرتب کیا تھا پھر جب کمپنی کا دور آیا تو کمپنی بہادر کے ارباب حل و عقد نے وہی کیا جو میر جعفر اور سراج الدولہ نے سکھایا تھا "وقس علیٰ ھذا"۔ پس ہندوستان میں انگریزی عروج کا سبب انگریز ناشناسی نہیں بلکہ اس کا سبب وہ خود پرستی خود فراموشی اور خود ناشناسی ہے جو بنیاد تھی طوائف الملوکی کی

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں (اقبال)

مختصر یہ کہ نووارد فرنگیوں کے پہچاننے میں اگر ابتدا غلطی ہوئی بھی تھی تو وہ بہت جلد ختم ہو گئی البتہ جن اغراض مشئومہ نے جانے پہچانے پڑوسیوں سے انجان بنایا تھا وہی اغراض اب انگریزوں کے شناخت کرنے میں چشمِ بصیرت کے لئے باعثِ خیرگی بنی ہوئی تھیں غفران مآب نظام حیدرآباد نے جب اٹھارھویں صدی کے وسط میں مرہٹوں کو پایۂ تخت "دہلی" کا راستہ بتا کر اُن کی حوصلہ افزائی کی تھی تو کیا نا اپنے پڑوسی مرہٹوں سے واقف نہیں تھا لیکن جن اغراض کی خاطر نظام نے مرہٹوں کے ہاتھوں مرکز کو کمزور کر کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی وہی اغراض آج ٹیپو سلطان کو دشمن اور انگریزوں اور مرہٹوں کو دوست بنا کر پیش کر رہی تھیں۔ ان اغراض کا نتیجہ یہ المناک عذاب تھا کہ بادشاہانِ ذی جاہ اور نوابانِ ذی اقتدار اپنی موت کی دستاویزوں پر خود اپنے ہاتھ سے دستخط کرتے رہے اور اس اجنبی قوم سے دانستہ حاصل کرنے کے باوجود جتنی بھی گلو خلاصی کی کوشش کرتے تھے طوقِ غلامی کی گرفت سخت اور مضبوط ہو جاتی تھی۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

پس انگریز کی اجنبی طاقت سے ایک لمحہ نفرت اور دوسرے لمحہ میں اس کی امداد و اعانت اور اس سے تعلق بڑھانے کی ضرورت۔ اگر یہ عملی تضاد نتیجہ تھا طوائف الملوکی کا تو اس طویل خاموشی کا سبب یہ طوائف الملوکی قرار پائے گی جس نے ایک کو دوسرے سے اس طرح اُلجھائے رکھا کہ وہ خود ختم ہو گیا مگر یہ اُلجھاؤ ختم نہیں ہوا۔

علماءِ کرام کا احساسِ صحیح اور جہادِ پیہم

البتہ اسی اغراض پرستی اور طوائف الملوکی کے دور میں تحقیق و تفتیش کی ندرت آفرینی اور تلاش و جستجو کی عجائب نوازی ہمیں ایک جماعت سے روشناس کراتی ہے جس کے جذبات مقدس، مقاصد بلند اور جس کی جدوجہد ہر قسم کے شبہ سے پاک ہے۔ بادشاہوں، شاہزادوں نوابوں اور راجاؤں کے متعلق بجا طور پر جاگیر شاہی کی زرّیں تمناؤں کا شبہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس جماعت کا دامن ایسے تمام داغوں سے پاک ہے یہ جماعت نہ اقتدار کی خواہاں نہ حکومت و سلطنت کی آرزومند نہ اعزاز و اکرام اور اعلیٰ خطابات کی ہوس اس کے دامنوں سے اُلجھی ہوئی۔ اس کے سامنے

صرف وطن ہے ۔ باشندگان وطن ہیں وطن عزیز کی حفاظت اہل وطن کی ہمدردی اور اپنے ملک کی تعمیر و ترقی ہے یہی اُن کا نصب العین ہے ہاں اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اس دین و مذہب کی حفاظت بھی ضروری سمجھتے ہیں جس نے اُن کے پاک نفوس میں یہ پاکیزہ جذبات پیدا کئے "یہ علمار ہند کی جماعت ہے" وہ جماعت کہ اگر اس کے فکر سلیم اور جذبۂ صادق کا اعتراف نہ کیا جائے اور اگر تاریخی واقعات کی ترتیب اور اُن کے سلسلہ میں سے اس جماعت کی سنہری کڑی کو نکال دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ با اخلاص اور ایثار شیوہ جماعت کے حق میں ناانصافی ہوگی بلکہ حق یہ ہے کہ وطن عزیز کے حق میں خیانت اور ایثار و قربانی کی پوری تاریخ پر ایک بہت بڑا ظلم ہوگا۔ بیشک اس ستم شعار دنیا میں قوموں کی تاریخ پر ایسے ظلم بارہا ہوئے ہیں کہ صفحات تاریخ سے اُن کے نام تک کھرچ دیئے گئے ہیں۔ لیکن یہاں ایک بہت بڑی قباحت یہ پیدا ہوتی ہے کہ اگر اس کڑی کو بیچ سے نکال دیا جائے تو اس دور کے بہت سے واقعات معمہ بن جاتے ہیں یعنی نتیجہ تو ناقابل انکار مگر اس کے اسباب مفقود اور ناپید۔ اور جب فلسفۂ تاریخ، سبب کے بغیر نتیجہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تو کبھی کسی واقعہ کو تاریخ کا معجزہ ماننا پڑتا ہے۔ کبھی ۱۸۵۷ء کی عظیم الشان اور حیرت انگیز جنگِ آزادی کو "مٹتی ہوئی جاگیر شاہی کی انگڑائی" کہنا پڑتا ہے اور کبھی اس محاذ عظیم کو "سرکش فوجیوں کی ہنگامی بغاوت" کہہ کر قصہ مختصر کرنا پڑتا ہے۔ یہ تمام اعجوبہ کاریاں اُسی وقت ہوتی ہیں جب اس جماعت (جماعت علمار) کی مدبرانہ اور پیہم کوششوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

جماعتِ علمار کی کارگذاری

اس جماعت نے اٹھارہویں صدی کے وسط سے رفتار زمانہ کو بھانپ کر جو نظریئے مرتب کئے وطن عزیز کی ترقی اور کامیابی کے لئے جو تدبیریں سوچیں اور جس طرح اُن پر عمل کیا اس کی تفصیل اسی سلسلہ کی دوسری جلد میں گذر چکی ہے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ موقع کی مناسبت سے کچھ اشارے ضروری ہیں جو آئندہ صفحات میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

علماء کرام کے نظریات تجویزیں۔ لائحہ عمل اور عمل

(۱)

اٹھارھویں صدی کا تقریباً وسط تھا۔ سلطنت مغلیہ کی کشتی ڈانواڈول اور انگریزی اقتدار کی گھٹائیں دن بدن گاڑھی ہو رہی تھیں۔ وطنی سیاست کے چاند تارے۔ ان گھٹاؤں میں چھپ چکے تھے یا چھپتے جا رہے تھے۔ تب حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے (قدس اللہ سرہ العزیز) خوش حال، ترقی پذیر متمدن اور فوجی لحاظ سے نہایت مضبوط وطن کے نقشہ کو نصب العین بنا کر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں اقتصادی اور سیاسی نظریات مرتب کئے اور ان نظریات پر دماغوں کی تربیت کے لئے وطن عزیز میں چند مرکز قائم کر دیئے (دیکھو شاندار ماضی جلد دوم اور حضرت شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک)

(۲)

سب سے بڑا مرکز دہلی کا مدرسہ تھا (مدرسہ شاہ عبدالعزیز) جس نے استاذ العلماء حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی زیر تربیت ہندوستان کے علمی حلقوں میں نئی زندگی پیدا کی اور حضرت سید احمد شہید۔ مولانا اسمٰعیل صاحب شہید۔ شیخ الاسلام مولانا عبدالحیٔ۔ مولانا محمد یوسف پھلتی جیسے جرنیل۔ حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب[۱] حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب[۲]۔ حضرت مفتی صدرالدین صاحب۔ حضرت مولانا

---

[۱] المتوفی رجب ۱۲۶۳ھ مطابق جون ۱۸۴۷ء [۲] المتوفی ذیقعدہ ۱۲۸۳ھ مطابق مارچ ۱۸۶۷ء

رشید الدین صاحب دہلوی۔ مولانا مرزا حسن علی محدث لکھنوی۔ مولانا سید اولاد حسین صاحب قنوجی۔ مولانا الٰہی بخش صاحب کاندھلوی۔ مولانا قطب الدین صاحب دہلوی۔ مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی۔ جیسے مفکر و مدبر پیدا کئے۔ اسی مرکز کے مربی اور سرپرست (حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ) نے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریزی اقتدار کے بعد وہ مشہور فتویٰ صادر کیا جو بعد کے علماء اور تمام مذہب پرست طبقہ کے لئے نشانِ راہ بنا۔ اور ابھی آپ دنیا سے رخصت نہیں ہوئے تھے کہ سیکڑوں تربیت یافتہ انقلابی نوجوانوں کی فوج حضرت سید احمد صاحب شہید کی زیر کمان انقلاب کے لئے قدم بڑھا چکی تھی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شاندار ماضی جلد ۲)

(۳)

منھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر

(کچھ وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں اور کچھ انتظار کر رہے ہیں)

بیشک حضرت سید صاحب شہید جنھوں نے ہندوستان کے بہت بڑے حصہ کا دورہ کرکے عوام کے اندر روح انقلاب پیدا کی۔ مئی ۱۸۳۱ء میں جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ مگر وہ مرکز جو اُن کے لئے نئے مجاہد اور مالی امداد فراہم کر رہا تھا جسکی صدارت و قیادت حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرّہ العزیز کے بعد اُن کے صحیح جانشین حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب قدس اللہ سرّہ العزیز کے سپرد تھی وہ زندہ تھا۔ محفوظ تھا۔ متحرک تھا۔ چنانچہ اسی محاذ کو سرگرم عمل کرنے کے لئے حضرت شاہ اسحاق صاحب نے اپنے داماد عزیز مولانا سید نصیر الدین دہلوی قدس اللہ سرّہ العزیز کو اپریل ۱۸۳۵ء میں دہلی سے روانہ کر دیا۔ اور جب یہ نخل آرزو بار آور ہونے سے پہلے ۱۸۴۰ء میں طبعی

وفات سے پژمردہ ہوگیا تو حضرت شاہ اسحاق صاحب اور اُن کے برادر عزیز مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب رحمہما اللہ نے وطن عزیز سے رخت سفر باندھا اور مکہ معظمہ میں جاکر ڈیرے ڈال دیئے۔

(۴)

حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب اور مولانا یعقوب صاحب کا یہ سفر مایوسی کا نتیجہ تھا یا انقلاب کے لئے نئے راستہ کی تلاش؟

اس کا جواب مشہور انقلابی عالم حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کے ایک فقرہ سے معلوم کیجئے۔

> مولانا محمد اسحاق نے اوّلاً مکہ معظمہ پہونچکر پوری آزادی سے اپنی ہندوستانی تحریک کی رہنمائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس پر دولت عثمانیہ کی وزارت خارجہ کو اُن کے اخراج پر آمادہ کرنے کی کوشش کیگئی[۱]

شاہ صاحب ممدوح نے وہاں کا معاملہ تو شیخ الحرم کو بیچ میں ڈال کر ٹھیک کر لیا چنانچہ بطور پناہ گزیں وہاں رہنے کی اجازت مل گئی[۲] مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل و عقد کے غیض و غضب کو دور کرنا نہ اُن کے امکان میں تھا اور نہ وہ عزائم اس کی اجازت دے سکتے تھے جنکو وہ سینہ میں لیکر مکہ معظمہ گئے تھے چنانچہ یہاں اُنکی تمام املاک ضبط کر لی گئیں جس کا مقابلہ اُنھوں نے اُسی خندہ پیشانی سے کیا جو ایسے جلیل القدر اور اولوالعزم رہنماؤں کی شان کے مناسب تھا۔ چنانچہ جب ضبطی جائداد کی خبر ان بزرگوں کو پہونچی

---

[۱] حضرت شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۱۸۴۔ [۲] ایضاً ص ۱۸۵۔ [۳] یہ جہاد حریت ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ہوا کیونکہ ۱۸۴۶ء میں حضرت شاہ اسحاق صاحب وفات پاچکے تھے۔

تو ان پر وجد کی کیفیت طاری تھی. آپس میں مبارکباد دے رہے تھے۔ اور بڑی خوشی سے یہ خبر دوستوں کو سناتے تھے[۵۱]

سیدنا حضرت شاہ اسحاق صاحب کو مکہ معظمہ رخصت کرنے[۵۲] کے بعد آپ ایک ایسے موڑ پر کھڑے ہیں جہاں سے ۱۸۵۷ء میں صرف تیرہ منزل کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء احساس حریت کا وہ روشن منارہ ہے جس کی ضیا پاشیاں سو سال گذر جانے کے بعد (۱۹۵۷ء میں) بھی نظروں کو چکاچوند کر رہی ہیں۔

میرٹھ کی باغی فوج کے سامنے صاحب ریزیڈنٹ بہادر دہلی کی اُس تقریر کے بعد جس کے ایک ایک فقرہ میں امیدوں کے سرسبز و شاداب باغ دکھائے گئے تھے میرٹھ سے آئے ہوئے انقلابی فوجیوں کی یہ صدا آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے

اب سرکار جو چاہے ہمارا کرے۔ ہم سب مرنے پر تیار ہیں اور ہم اپنے آپ کو اسی وقت مردہ تصور کر چکے ہیں جب وقت جیلخانہ توڑ کر افسروں کو برآمد کیا تھا (ص۵۲ داستان غدر از حضرت راقم الدولہ ظہیر دہلوی)

کہہ سکتے ہو فوجوں میں یہ جوش و خروش حال کی پیداوار ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ شمالی ہند کا تقریباً دو ہزار میل لانبا وہ علاقہ جو حضرت سید صاحب اور اُن کے رفقاء اور خلفاء کا آماجگاہ رہا تھا، اسی جوش و خروش کے انگاروں میں دہک رہا ہے۔ کیا اس

---

۵۱ امیر الروایات۔ ۵۲ امیر شہید اور مولانا شہید کی شہادت سے تقریباً گیارہ سال بعد سنہ ۱۲۶۰ھ۔ ۱۸۴۴ء میں مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب نے اپنے خاص خاص متوسلین سمیت ہندوستان سے ہجرت کر کے حرم محترم کو اپنا نشیمن بنا لیا۔

(شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک حاشیہ ص۱۰۷)

پورے علاقہ میں عوام کا جوش و خروش انہیں چند ماہ کی پیداوار ہے جب سے کارتوسوں کا معاملہ پیش آیا تھا اور خفیہ طور پر چپاتیاں تقسیم ہونی شروع ہوئی تھیں۔

عوامی تحریکوں کا جن کو تجربہ ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ عوام میں بیداری پیدا کرنا کتنا صبر آزما اور کتنا مدت طلب کام ہے۔ بالخصوص ایسی بیداری جو اُن کو اس پر آمادہ کردے کہ

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

اگر اپنے سامنے کے تجربات اور ذاتی مشاہدات پر تاریخی واقعات کو قیاس کرنا صحیح اور درست ہے اور اگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس بیداری کے پیدا ہونے کے بعد جو ۱۸۵۷ء کے ہیبت ناک دھماکہ سے ہوئی تھی بیدار ہندوستان کو پورے نوے سال جدّ وجہد کرنی پڑی ہے اور اگر انڈین نیشنل کانگریس کے آغاز سے شعور و احساس کی ابتدا مانی جائے تو ابتدائے شعور سے کامیابی کی منزل تک پہونچنے میں پورے تریسٹھ سال صرف ہوئے ہیں حالانکہ نشر و اشاعت اور پروپیگنڈے کی سہولتیں اس وقت ۱۸۵۷ء سے پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ میسر تھیں اور جیسا کہ کہا جاتا ہے فہم و فراست، سیاسی شعور اور تعلیم میں بھی پہلے سے بہت اضافہ ہو گیا تھا تو اگر اس نوے سالہ یا باسٹھ سالہ دور کو انگریزوں سے ناواقفی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تو یقیناً ۱۷۶۵ء (انگریزوں کو دیوانی دیئے جانے اور کوڑہ جہان آباد کے معاہدہ کے وقت سے لیکر ۱۸۵۷ء تک بہتر سالہ دور کے ہندوستانیوں کے متعلق بھی یہ فتویٰ صادر کرنا غلط ہوگا کہ وہ انگریزوں اور اُن کی ڈپلومیسیوں سے ناواقف جھوٹے وعدوں کے سبز باغوں میں بسر کر رہے تھے۔

(۶)

مولانا سید نصیر الدین دہلوی

یہ مولانا سید نصیر الدین[۵۱] دہلوی جن کا ذکر خیر فقرہ (۳) میں گذرا کون تھے۔ اُن کی سیرت نگاری اگرچہ ایک مقدس خدمت ہے۔ مگر اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ کیونکہ اُن کا دور ۱۸۵۷ء سے سولہ سترہ سال پہلے ختم ہو چکا تھا لیکن اس دور کے اثرات جو قدرتاً اور طبعاً ۱۸۵۷ء تک زندہ رہ سکتے تھے چنانچہ زندہ رہے اُن کا اجمالی تذکرہ اس موقع پر از بس ضروری ہے اور اس مناسبت سے حضرت مولانا سید نصیر الدین صاحب کا کچھ ذکر خیر بھی ضروری ہے۔

مولانا سید نصیر الدین صاحب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (بانی نظریات انقلاب) سے ننہالی رشتہ رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھائی حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب سے شاندار ماضی جلد دوم کے مطالعہ کرنے والے حضرات واقف ہیں۔ مولانا سید نصیر الدین صاحب انہیں حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے ہیں۔ جدید رشتہ یہ ہے کہ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کی صاحبزادی آپ سے منسوب ہیں

---

۵۱ مولانا سید نصیر الدین صاحب کا ددھیالی تعلق حضرت سید ناصر الدین صاحب تھانیسری سے اور ننہالی رشتہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے ہے (جس کی تفصیل آ گے آ رہی ہے) آپ نے دہلی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ پھر بسلسلہ تدریس کلکتہ تشریف لے گئے۔ حضرت سید صاحب جب قافلہ لے کر حج کے لئے تشریف لے گئے آپ کا قیام کلکتہ ہی میں تھا۔

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے نواسے اور مسند درس کے جانشین جو حضرت سید احمد صاحب شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید (رحمہما اللہ) کی تحریک جہاد کے لئے مرکز دہلی سے مجاہد اور مالی امداد فراہم کرتے رہے تھے اُن کی اور اُن کے داماد مولانا سید نصیر الدین صاحب کی دلچسپیاں اس تحریک کے ساتھ والہانہ تھیں۔ چنانچہ۔

"۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء (جب سید صاحب کا قافلہ سفر جہاد کی تیاری کر رہا تھا تو)
حضرت شاہ اسحاق صاحب وعظ فرماتے تھے اور مولانا نصیر الدین صاحب
مدرسے کے دروازے پر فراہمی زراعانت میں مصروف رہتے تھے [۱]

بہرحال ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں جب یہ دونوں بزرگ (سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب) بالاکوٹ میں شہید ہو چکے تو اگرچہ جاں نثاران حق کے چھوٹے چھوٹے گروہ وقتاً فوقتاً سرحد پہنچتے رہتے تھے (اور جیسا کہ شاندار ماضی ج ۲ اور ج ۳ میں واضح کیا گیا ہے جاں نثاران حق نے ان بزرگوں کی شہادت کے بعد بھی اُن کے بلند کئے ہوئے عَلَم جہاد کو سربلند رکھا) تاہم عام مسلمانوں کے جوش جہاد میں افسردگی پیدا ہو رہی تھی اس لئے کہ سرحد میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام پانے کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔ لہذا سید صاحب کی تحریک جہاد کے کارفرماؤں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ دوبارہ ایک بڑی جماعت تیار کرکے آزاد علاقے میں بھیجدی جائے جس سے سید صاحب کے شروع کئے ہوئے کام میں جوش و خروش کی نئی روح پیدا ہو جائے۔

اس اہم فرض کی بجا آوری کا شرف روز ازل سے مولانا سید نصیر الدین دہلوی کے

---

[۱] سرگذشت مجاہدین ص ۱۳۶

لئے مقدر ہو چکا تھا جنھوں نے سید صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملک کے[1] مختلف حصوں کا دورہ کیا۔ دعوتِ جہاد سے ایک جماعت تیار کی اور سید صاحب کی طرح وطن مالوف سے ہجرت کر کے کاروبار جہاد کی تجدید کا انتظام فرمایا[1]۔

اس کے بعد آپ نے ٹونک۔ اجمیر۔ میرٹھ۔ امروہہ رام پور وغیرہ کا دورہ کیا۔ حاجی سید عبدالرحیم سورتی۔ مولوی بہاؤ الدین چنیاپٹی[2]۔ احمد سادہ کار۔ امام الدین سوزن ساز وغیرہ آپ کے رفیق خاص تھے[3]۔

آپ کی خواہش یہ بھی تھی کہ ہجرت سے پیشتر ملک کے اور حصوں کا بھی دورہ کریں۔ حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے مقرر فرمائے ہوئے نقیب جا بجا دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے۔ مثلاً مولانا ولایت علی عظیم آبادی (جو سید صاحب کی شہادت کے بعد وطن واپس آگئے تھے اور نظام از سر نو قائم فرما رہے تھے) ان کے بھائی مولانا عنایت علی مشرقی بنگال میں سرگرم عمل تھے۔ مولانا سید محمد علی مدراس میں وعظ و نصیحت کے مرکز قائم کرنے کے بعد ملک کے دوسرے حصوں میں مشغول تھے۔ مولانا سید اولاد حسن[4] قنوجی بھی اپنے گرد و پیش کام انجام دے رہے تھے۔

مولانا سید نصیر الدین صاحب چاہتے تھے کہ دعوت و تبلیغ کی ان مساعی میں تنظیم پیدا کر کے اندازہ فرمالیں کہ کُل کتنی جمعیت کا انتظام ہو سکے گا اور آئندہ کے لئے مجاہدین کی آمد کا سلسلہ کس پیمانے پر جاری رہ سکے گا۔ مگر جب سوچا کہ اس طرح آغاز

---

[1] سرگذشت مجاہدین ص۱۳۵　[2] چنیاپٹن مدراس کا پرانا نام ہے۔
[3] سرگذشت مجاہدین ص۱۳۶　[4] والد ماجد نواب صدیق حسن صاحب والی بھوپال۔

کار میں بہت تاخیر ہو جائے گی تو یہی فیصلہ کیا کہ زیادہ تاخیر روا نہ رکھی جائے اور ظاہر ہے جوال مردانہ میدان جہاد میں اُتر آنا بجائے خود دعوت و تبلیغ کا ایک موثر پیغام تھا [1] مولانا نصیر الدین صاحب کی والدہ محترمہ حیات تھیں۔ اُن سے اجازت [2] حاصل کی۔

---

[1] سرگذشت مجاہدین ص ۱۳۸ [2] والدہ ماجدہ سے اجازت حاصل کرنے کا قصہ بہت ہی دلدوز اور بہت ہی دلچسپ ہے۔ آپ بھی مطالعہ فرمائیے اور یاد رکھئے (ان فی ذلک لعبرۃً لاولی الابصار) دہلی کی پردہ نشین خواتین ہمارے زمانہ میں تو جس وقت جہاں چاہتی ہیں سیر و تفریح، بازار، نماز اور شرکت مجالس وعظ کے لئے چلی جاتی ہیں صرف برقع کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کا نقاب عموماً نیم باز ہوتا ہے۔ مگر اُس زمانہ میں یہ آزادی نہیں تھی۔ قد و قامت اور وضع قطع تو در کنار، شرم و حیا کے نازک احساسات یہ بھی گوارا نہ کرتے تھے کہ کوئی اجنبی شخص آنچل بھی دیکھ سکے حضرت مولانا نصیر الدین صاحب کی والدہ ماجدہ انہیں غیور پاکباز خواتین میں سے تھیں مگر اس کے باوجود اُن کی ایک تمنا یہ تھی کہ رمضان شریف کے مہینہ میں جامع جہاں نما (جامع مسجد دہلی) میں نماز ادا کریں۔ جنوری ۱۸۳۵ء سنہ ۱۲۵۰ھ کا رمضان شریف آیا۔ مولانا نصیر الدین صاحب کے قدم راہ جہاد میں خار مغیلاں کو بوس و کنار کے لئے مضطرب ہونے شروع ہوئے اور جذبات فدائیت اپنی حسرتیں پوری کرنے کے لئے مچلنے لگے اس وقت آپ کو خیال آیا کہ اپنی تمنا پوری کرنے سے پہلے والدہ محترمہ کی دیرینہ تمنا بھی پوری کرا دیں۔ چنانچہ ایک شب والدہ صاحبہ کو جامع مسجد میں لے گئے کہ اپنی آرزو پوری کر لیں۔ والدہ محترمہ جامع مسجد میں پہونچیں۔ خدا کا شکر ادا کیا پھر نماز میں مصروف ہو گئیں۔ اطمینان سے نماز پڑھی اس کے بعد اپنے گوشہ جگر کو جس نے یہ پرانی آرزو پوری کرائی تھی بہت بہت دعائیں دیں۔ حضرت مولانا نصیر الدین صاحب نے والدہ محترمہ کو بے حد مسرور پایا تو سمجھے کہ حصول اجازت کا یہی موقع سب سے بہتر ہے۔ والدہ صاحبہ سے عرض کیا۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لن تنالوا البرّ حتی تنفقوا مما تحبون۔ (تم ہرگز "برّ" نہیں حاصل کر سکتے (اور کلمہ توحید ادا کر کے ایثار و للٰہیت کا جو عہد کیا ہے اس کو اس وقت تک پورا نہیں کر سکتے) جب تک تم ان چیزوں میں سے خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہیں) مولانا نصیر الدین صاحب نے یہ آیت پڑھ کر اپنی والدہ صاحبہ سے عرض کیا "آپ کو مجھ سے محبت ہے میں راہ خدا میں جہاد کا آرزو مند ہوں۔ آپ اس کار خیر کے لئے مجھے اجازت دیں (باقی ص ۶۹ پر)

سفر کا نہایت مختصر سامان ساتھ لیا[۱]۔ ۳۰ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ ۲ اپریل ۱۸۳۵ء کو گھر بار، اہل و عیال، اور اعزا و احباب سے مفارقت اختیار کر کے عرب سرائے میں جا ٹھیرے۔

۱؎ سامان کیا تھا؟ جس کی تفصیل معلوم ہو سکی وہ چند کتابیں تھیں یعنی قرآن مجید، تفسیر جلالین مشکوٰۃ شریف، سنن ابی داؤد شریف، الحبل المتین، حجۃ اللہ البالغہ کے چند جزو جس میں احسان سے متعلق ابواب ہیں۔ کچھ ساتھیوں نے کہا تفسیر بیضاوی بھی ساتھ لے لیجئے۔ فرمایا ہم جس مقصد سے یہ سفر اختیار کر رہے ہیں اس میں کتابوں کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئیگی۔ جو کتابیں ساتھ لی گئیں وہ صرف اس لئے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں عمل کے لئے ہدایات حاصل کر سکیں۔ بیضاوی شریف میں عملی ہدایات کی تشریحات برائے نام ہیں۔ زیادہ تر منطقی قسم کے مباحث ہیں۔ اس سلسلہ میں دوسری بات جو معلوم ہو سکی وہ یہ کہ مولانا کی اہلیہ محترمہ نے بستر اور فرش فراہم کیا۔ کچھ برتن ساتھ کئے اور اپنے کپڑوں کی ایک جوڑی پیش کر دی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۸) اور جدائی پر صبر و سکون اور تسلیم و رضا سے کام لیں۔ اس فرشتہ خصلت خاتون کے جذبات بھی بیٹے سے کم نہیں تھے۔ بیٹے کے درخواست کرنے کی دیر تھی جیسے ہی یہ درخواست سامنے آئی۔ حرف اجازت والدہ محترمہ کی زبان پر تھا اور دل صبر و سکون کی دعاؤں میں مصروف۔ (رحمہما اللہ)

تصور کیجئے اکلوتے فرزند کی محبت کا۔ کیا حالت ہوگی جب خیال آتا ہوگا کہ شاید اس کے بعد زندگی میں دوبارہ ملنا نصیب نہ ہوگا۔ (جیسا کہ ہوا) مگر حضرت شاہ اسحاق صاحب کی صاحبزادی کو ایسے تمام وسوسوں سے بالاتر ہونا چاہیئے تھا۔

۵؎ الحمد للہ یہ سعادت ایک نہایت معمولی درجہ میں احقر کو بھی نصیب ہوئی۔ تحریک آزادی کے زمانہ میں (از ۱۹۲۹ء تا ۱۹۴۵ء) والدہ صاحبہ حیات تھیں جو اس ناکارہ کو تحریک میں شرکت کی عام اجازت دیتی رہتی تھیں۔ اگرچہ زمین اور آسمان کا فرق یہ تھا کہ مولانا نصیر الدین صاحب ایسی تحریک کے لئے اجازت مانگ رہے تھے جس میں جانبازی اور سرفروشی سب سے مقدم تھی اور احقر نے ایسی تحریک کی اجازت چاہی تھی جس کی بنیاد عدم تشدد پر تھی مگر بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است۔ رب ارحمہما کما ربیانی صغیرا۔ محمد میاں۔

۶ ذی الحجہ کو عرب سرائے سے روانہ ہوئے اور قطب صاحب میں حوض شمسی کے کنارے مسجد اولیاء کے متصل قیام کیا۔ ۱۰ ذی الحجہ کو چلے تو ریواڑی پہونچے۔ عید اضحیٰ کی نماز یہیں ادا کی۔

ریواڑی سے روانہ ہو کر جے پور قیام کیا۔ پھر ٹونک پہونچے جہاں نواب وزیرالدولہ کا دورِ حکومت تھا۔ نواب وزیرالدولہ (سید احمد صاحب شہید کے پروردۂ خاص) مولانا سید نصیرالدین صاحب کی تشریف آوری کے لئے چشم براہ تھے۔ بڑے حوصلہ سے خاطر مدارات کی۔ مجمعہ کثیر کے ساتھ حلقہ بگوش ارادت[۱] ہوئے اور رخصت کے وقت بہت کافی سامان نذر کیا۔

مولانا سید نصیرالدین صاحب کا قافلہ ٹونک سے روانہ ہو کر اجمیر پہونچا۔ پھر جودھپور میں قیام کیا۔ جودھپور سے جیسلمیر ہوتے ہوئے سندھ میں داخل ہوا۔ جہاں مختلف مقامات پر قیام ہوا۔ سندھ کے علماء، زعماء اور مشائخ سے تبادلہ خیالات کیا گیا۔ جہاد کی ترغیب دی گئی جس قدر میسر ہو سکا سامان جہاد فراہم کیا گیا۔ ان مرحلوں سے گذرنے کے بعد یہ قافلہ مزاری[۲] بلوچوں کے علاقہ میں[۳] پہونچا اور اسی علاقہ کو قیام کے لئے منتخب کر لیا جہاں کچھ معرکے ہوئے۔ پھر آپ سنھانہ تشریف لے گئے اور اسی کو جہاد حریت کا مرکز بنا لیا۔ مگر

---

[۱] مولانا سید نصیرالدین صاحب کے متعلق آپ کا اعتقاد یہ تھا کہ آپ، حضرت سید احمد شہید رح کے پَرتو ہیں۔ [۲] مزاری بلوچوں کی بہت بڑی برادری ہے۔ وجہ تسمیہ کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مزار اُن کے کسی مورث اعلیٰ کا نام تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یہ قبیلہ ابتدا میں ایک ندی پر آباد تھا جس کا نام مزار تھا۔ اس لئے اس برادری کا نام مزاری ہو گیا۔

[۳] یہ علاقہ خیرپور کی حدود سے متصل موجودہ ڈیرہ غازی خاں کے جنوبی حصہ پر مشتمل ہے

ابھی پوری طرح جمنے نہ پائے تھے کہ پیغام اجل آپہونچا جس کو لبیک کہنا ناگزیر تھا۔ رحمۃ اللہ و قدس سرہٗ - یہ چند سطریں جو اوپر گذریں سیرت سر سید نصیر الدین کا نقش ناتمام ہیں

وہ خاص بات جس کے لئے مولانا نصیر الدین صاحب کا تذکرہ یہاں پر کیا گیا ہے یہ ہے کہ آپ کی جد و جہد چند نفوس کی جاں بازی اور سرفروشی تک محدود نہیں رہتی بلکہ جذبات حریت کے جو شعلے آپکے دل و دماغ میں مشتعل تھے، آپنے اُن کی چنگاریاں پورے شمالی ہند میں پھیلادی تھیں - وہ سیکڑوں عمائد اور اپنے اپنے علاقہ کے سربرآوردہ علماء اور زعماء جن کے پاس مولانا نصیر الدین صاحب نے اعلام نامے بھیجے اور جن سے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا۔ اُن میں سے محترم غلام رسول صاحب مہر نے ایک سو چھ حضرات کے نام دریافت کرلئے ہیں[ل]۔

[ل] دہلی و نواح دہلی - مولانا شاہ اسحاق صاحب مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مولوی محبوب علی صاحب مولوی نصیر الدین صاحب مولوی مظفر حسین صاحب مولوی شیخ محمد صاحب حاجی محمد حاجی مزمل مولوی حافظ محمد حسین مولوی کرم اللہ مولوی الٰہی بخش مولوی جمال الدین حافظ عبد الرحمٰن مولوی محمد وزیر علی منشی ایزد بخش امیر الدین امین الدین حافظ عبد الرزاق مولوی عبد اللہ مولوی علی محمد مولوی بہار الدین مولوی عبد الخالق مولوی امام علی حافظ اکرام الدین مولوی شاہ علی مولوی عبد اللہ خاں علوی بشارت خاں مولوی عبد المجید قاری احمد زماں حافظ جہجو بیگ حافظ احمد خاں عظیم اللہ خاں مرزا ایوب بیگ میاں احمد میاں نجابت علی قاضی عبد الرحمٰن عرب سرائے والے میاں غلام محی الدین حافظ ولی محمد میاں رکن الدین میاں الٰہی بخش آئینہ ساز مولوی امداد علی مولوی نذیر حسین

میرٹھ :- مولوی بزرگ علی مولوی عنایت احمد مولوی محمد متقی وغیرہ

پھلت و نگینہ :- مولوی وحید الدین مولوی خدا بخش مولوی تہور علی مولوی خیر الدین مولوی منیر الدین - (باقی ص۲۲ پر)

یہ بزرگ اور رہنما۔ دہلی۔ میرٹھ۔ پھلت۔ نگینہ۔ گڈھ مکتیسر۔ امروہہ۔ مراد آباد
رام پور۔ بریلی۔ کانپور۔ لکھنؤ۔ فرخ آباد۔ باندہ۔ قنوج۔ جون پور۔ غازی پور۔ بنارس

(بقیہ حاشیہ ص ۷۱) **امروھہ**:۔ مولوی رمضان علی مولوی امانت علی مولوی کریم اللہ
شیخ رحمن بخش صوفی صاحب شاہ غلام علی میرہری

مراد آباد:۔ حافظ عبدالرحیم میاں عثمان میاں جی خلیفہ۔

گڈھ مکتیسر:۔ حاجی صبغۃ اللہ شیخ محمد حسین۔

رام پور:۔ مولوی حیدر علی مولوی نور الاسلام اخوند زعفران اکبر علی خاں شاہ دل خاں
حافظ احمد علی مرتضیٰ خاں اخوند امام الدین وغیرہ

لکھنؤ:۔ مرزا حسن علی مولوی خرم علی

قنوج:۔ سید اولاد حسین

جون پور:۔ مولوی سخاوت علی مولوی کرامت علی مولوی محمود علی مولوی الٰہی بخش و مولوی
مکارم خاں وغیرہ ساکنان فرخ آباد باندہ بریلی

بنارس:۔ مولوی احمد اللہ مولوی رحمت اللہ حافظ صدیق۔

غازی پور:۔ شیخ فرزند علی مولوی محمد فصیح صاحب

عظیم آباد:۔ شاہ محمد حسین صاحب مولوی ولایت علی صاحب مولوی الٰہی بخش صاحب

کلکتہ و نواح کلکتہ:۔ مولوی محمد علی صاحب مولوی امام الدین صاحب مولوی مراد صاحب
قاضی عبدالباری صاحب صوفی نور محمد صاحب منشی غلام رحمن صاحب مولوی جراءت اللہ صاحب
مولوی عبداللہ صاحب مستری رجب علی صاحب

اجیبر شریف:۔ مولوی محمد سراج الدین صاحب

ٹونک:۔ مولوی خلیق الرحمن صاحب مولوی بہادر علی صاحب سید حمید الدین صاحب (خواہرزادہ سید صاحب)
سید زین العابدین صاحب۔ سید ابوالقاسم صاحب (ابناء سید احمد علی خواہرزادہ سید صاحب۔ سید محمد یعقوب
صاحب برادرزادہ سید صاحب۔

آرہ۔ سہسرام۔ پٹنہ۔ مظفرپور۔ چھپرہ۔ مونگیر۔ کلکتہ اور نواح کلکتہ کے رہنے والے ہیں۔
ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا تعارف حضرت سید احمد شہید قدس سرہٗ کی تحریک کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ بہت سے وہ ہیں جن کا تعارف خاص اسی موقع پر ہو رہا ہے۔
جہاں تک ۱۸۵۷ء کی تحریک میں ان حضرات کی شرکت کا تعلق ہے تو یہ درست ہے کہ ان میں سے بہت سے وہ ہوں گے جو ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی زندگی کے تمام مرحلے طے کر کے دار بقا کے منزل گزیں ہو چکے ہوں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سوں کے جذبات افسردہ ہو چکے ہوں اور اس دار فنا میں زندہ رہتے ہوئے اُن کے جذبات حرب بت فنا ہو چکے ہوں لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہی مقام ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں قربانگاہ ایثار اور فدائیت بنے اور یہی آتشدان تھے جن کے شراروں نے شمالی ہند کے بڑے حصہ کو آتشکدۂ حرب و ضرب بنا دیا۔ تو کیا ہمیں یہ فرض کرنا ضروری ہوگا کہ جو تپش مولانا سید نصیر الدین صاحبؒ نے پیدا کی تھی وہ سرد ہو چکی تھی۔ اُس کا نام و نشان باقی نہیں رہا تھا۔ یا قرین قیاس یہ ہے کہ وہی چنگاریاں جن کو مولانا نصیر الدین صاحبؒ نے اپنی پھونکوں سے جگہ جگہ سلگایا تھا، ۱۸۵۷ء کے بادِ صرصر نے دفعۃً اُن کو آتش افروزاں بنا دیا۔ تحریکات کی تدریجی رفتار اور اُن کے مد و جزر سے جو واقف ہیں اُن کا فیصلہ وہی ہوگا جس کو قرین قیاس بتایا گیا ہے۔

۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کا تیس سالہ دور ہماری آنکھوں کے سامنے ہے خلافت آل عثمان کے سقوط پر تحریک خلافت کی جو آندھی اُٹھی تھی وہ پانچ سال بعد دھم پڑ گئی۔ ہندو مسلم اتحاد کے بجائے منافرت اور عداوت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ یہاں تک کہ جب ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے دوبارہ میثاق آزادی مرتب کیا تو ایک نئی نسل سامنے

تھی۔ لیکن کیا کوئی بھی انصاف پسند اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اس نئی نسل کے تازہ خون میں حرارت پیدا کرنے والے وہی انجکشن تھے جو شہیدان جلیانوالہ باغ ۱۹۱۹ء کے خون شہادت سے تیار کیے گئے تھے۔ بیشک ۱۹۱۷ء کے بہت سے نبرد تھک کر بیٹھ گئے تھے بہت سے ساتھی بچھڑ گئے تھے۔ بایں ہمہ جنھوں نے ۱۹۲۹ء میں زمام قیادت سنبھالی وہ وہی تھے جن کو ۱۹۱۷ء کی تحریک نے پیدا کیا تھا[51]۔

پس اگر ۱۹۱۷ء کی تحریک ۱۹۲۹ء کا پہلا زینہ قرار دی جا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرت سید احمد صاحب شہید اور مولانا نصیر الدین (رحمہما اللہ) کی تحریک کو ۱۸۵۷ء کی تحریک کا زینہ نہ قرار دیا جائے اور اس طوفان بے پناہ کے سر چشمے کہیں اور تلاش کیے جائیں۔

البتہ ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت سید احمد صاحب اور حضرت مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی کی تحریکیں خالص اسلامی بنیادوں پر تھیں مسلمان ہی ان کے جاں باز تھے اور مسلمان ہی علمبردار، کہیں استثنا تھا تو برائے نام تھا[52]۔ اس کے برخلاف ۱۸۵۷ء کی تحریک میں تفرد کے بجائے اشتراک۔ اور علیحدگی کے بجائے اختلاط تھا۔ تو سوال یہ ہو سکتا ہے کہ تفرد اور علیحدگی کے بجائے یہ اختلاط کیسے پیدا ہوا۔ مگر اس سوال کو وہی شخص حجت بنا سکتا ہے جو سیاسی تحریکات کے مدوجزر سے قطعاً ناآشنا ہو لیکن جس نے بارہا دیکھا ہو کہ سیلاب کے

---

۵۱ مثلاً شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ حضرت علامہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند۔ ابوالمحاسن مولانا سجاد صاحب۔ حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری۔ رفیع احمد صاحب قدوائی۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب۔ حافظ محمد ابراہیم صاحب۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب۔ خان عبدالغفار خاں وغیرہ وغیرہ۔ ہندو حلقہ میں مہاتما گاندھی۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد وغیرہ وغیرہ

۵۲ مثلاً حضرت سید احمد صاحب شہید کے توپخانہ کا افسر راجہ رام تھا۔

وقت دریاؤں کی دھاریں کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہیں۔ جہاں گھاس کے سوکھے ہوئے تنکے نمی کو ترس رہے تھے وہاں آبِ رواں کی لہریں اُچھلنے لگتی ہیں۔ اس کی نظر میں یہ محبت سوت کا کچا دھاگا ہے۔ جس میں مضبوطی کا نام ونشان نہیں۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہے گا کہ جس وادی کو سیلاب بداماں بتایا جارہا ہے کیا وہاں پہلے سے نشیب تھا جو سیلاب کا خیر مقدم کرسکے۔ یا اُس میں ایسی نرمی تھی کہ سیلاب کے لئے اپنا سینہ کھول سکے؟

آیئے اس زاویہ سے بھی سیدصاحب کی تحریک پر ایک نظر ڈال لیں کہ کیا اس میں اشتراک و اختلاط کی گنجائش تھی یا نہیں۔ آئندہ صفحات کے ملاحظہ سے اندازہ ہوگا کہ سیدصاحب کی تحریک کا تفرقہ اس بناء پر نہیں تھا کہ گل چین کا دامن تنگ تھا بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ اب تک گلوں کو اپنی پژمردگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

وطن عزیز کو نجات دلانے کے لئے مشترک جدّوجہد

انگریزی دور کے تاریخ نویس۔ نہ مہاراجہ اندور جسونت راؤ ہلکر کے مداح ہیں اور نہ نواب امیر علی خاں (بانی ریاست ٹونک) کی عزت و عظمت کے قائل ہیں لیکن ہر ایک حقیقت پسند اس اعتراف پر مجبور ہے کہ اس مرہٹی راجہ اور روہیلہ پٹھان نے ملکر جو محاذ قائم کیا تھا اُس کا اہم ترین مقصد یہی تھا کہ وطن عزیز کو انگریزوں کی روزافزوں چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھا جائے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اپنے خلیفہ خاص حضرتؒ سیّد احمد صاحب شہید کو ۱۸۱۱ء میں اس محاذ پر کام کرنے کے لئے بھیجا تو مشترک جدّوجہد

پر شرعی تصدیق کی مہر بھی ثبت ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ سید صاحب نواب امیر علی خاں کی فوج میں ایک سوار کی حیثیت سے ملازم تھے لیکن اگر آپ کی حیثیت صرف ملازم کی تھی تو نواب امیرعلیخاں آپ کو اپنے مشوروں میں شریک اور آپ کا غیر معمولی اعزاز کیوں کرتا تھا؟ اس پر بھی شبہ کیا جاتا ہے کہ اس وقت آپ کا تشریف لیجانا اپنے شیخ اور مرشد حضرت شاہ عبدالعزیز کے ایما پر تھا۔ بلکہ کسب معاش کے لئے آپ تشریف لے گئے تھے۔ حالانکہ یہی شبہ کرنے والے یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ سید صاحب جب تقریباً سترہ سال کی عمر میں اپنے وطن سے چند دوستوں کے ساتھ طلب روزگار کے لئے نکلے تو رفتہ رفتہ تمام ساتھیوں کو کسی نہ کسی ملازمت میں لگا دیا اور خود ملازمت کا خیال چھوڑ کر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے تھے کہ کاروبار دنیا کے بجائے دین کا کاروبار کریں" یہاں پہونچکر کسب فیض کیا۔ ولایت انبیاء کے شرف سے بہرہ اندوز ہوئے۔ خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

تعجب ہے جو شخص ابتدا شعور میں ملازمت اور زر اندوزی کی طرف مائل نہیں ہوا کیا زہد و تقوے کی منزلیں طے کرنے اور حضرت شیخ سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد وہ طلب روزگار کے لئے سفر کریگا اور سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک نواب کی فوج میں بھرتی ہو کر چند ٹکوں کی خاطر اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ فروخت کر ڈالے گا اور با ایں ہمہ ایک مقدس پیشوا اور رہنما کی حیثیت سے اس کی سوانح حیات مرتب کرنا قابل فخر دینی خدمت سمجھا جائے گا۔

بہرحال اس سفر کے متعلق حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی تحقیق ہی درست معلوم ہوتی ہے۔ عقلی اور قیاسی قرائن اسی کی تائید کرتے ہیں کہ

ارسله الامام عبد العزيز الى (النواب امیر علی خاں)

لتحصیل المہارۃ فی العلوم العسکریۃ[۵۱]۔

امام عبدالعزیز ہی نے سید صاحب کو امیر خاں نواب ٹونک کے
لشکر میں بھیجا تاکہ فنون جنگ میں عملی تجربہ اور مہارت حاصل کرلیں[۵۲]۔

جب نواب امیر خاں نے انگریزوں سے معاہدہ کرلیا تو سید صاحب خاطر برداشتہ ہوکر اپنے شیخ محترم حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس تشریف لے آئے۔ لیکن نواب امیر خاں اور اس کی اولاد آخر تک حضرت سید صاحبؒ کا احترام پیرو مرشد کی طرح کرتی رہی۔ اس کے بعد مرہٹی اقتدار اور اولوالعزمیوں کا آخری نشان "دولت راؤ سندھیا" کی راجدھانی (گوالیار) شاہد ہے کہ حضرت سید صاحب نے جب فوجی قافلہ کو لے کر سرحد کی طرف کوچ کیا تو سب سے پہلی قابل ذکر منزل جہاں چند روز قیام فرمایا اسی سرزمین کے شاداب خطہ میں ہوئی تھی جس کو "باغ فتح علی خاں" کہا جاتا تھا۔ یہاں حضرت سید صاحب اور اُن کے ساتھیوں کا شاہانہ احترام کیا گیا۔ امیرانہ حوصلوں کے ساتھ دعوتیں ہوئیں اور تنہائی میں مہاراجہ سے بات چیت ہوئی۔

اس وقت مہاراجہ مرض استسقا میں مبتلا تھا تھوڑے ہی دنوں بعد انتقال کرگیا۔ اس زمانہ کی برطانوی پالیسی کے مطابق جانشینی کا قضیہ چلا۔ اس دور میں دولت راؤ سندھیا کا نسبتی بھائی "راجہ ہندو راؤ" ریاست کا مختار اور مدارالمہام تھا۔ آپ نے اس کو اور اُس کے معتمد خاص غلام حیدر کو علاقہ سرحد کے "مرکز جہاد" سے خط لکھا۔ امداد کی درخواست کی۔ اس کا یقین دلایا کہ کامیابی کے بعد مہاراجہ کی حکومت بدستور رہے گی بلکہ مضبوط ہوجائے گی۔ یہ پورا خط نقش حیات جلد دوم اور شاندار ماضی

---

۵۱ تمہید، بحوالہ سیاسی تحریک صفحہ ۱۴۷ ۵۲ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۱۵

جلد دوم وغیرہ میں ملاحظہ فرمایا جائے۔ یہاں اس کا پہلا فقرہ پیش کیا جا رہا ہے ملاحظہ فرمائیے اور جذبات کا اندازہ کیجیئے۔

بیگانگاں بعید الوطن ملوک زمین	سمندر پار کے رہنے والے پردیسی
وزماں گردیدہ وتاجران متاع	دنیا جہان کے تاجدار اور سودا بیچنے
فروش بپایہ سلطنت رسیدہ	والے دوکاندار سلطنت کے مالک بنگئے ہیں

(نقش حیات ج ۲ ص ۱۳۱)

اس سے بڑھ کر جذبہ حریت اور حب وطن کیا ہو سکتا ہے کہ اپنے یا اپنے ساتھیوں کے لئے نہ حکومت اور سلطنت کی تلاش ہے نہ کسی منصب اور عہدے کی خواہش۔ نہ اس پر بحث ہے کہ مسلمانوں کا حصہ کیا ہوگا بلکہ اور وضاحت کردی گئی کہ ہمیں کچھ درکار نہیں

وقتے کہ میدان ہندوستان از بیگانگاں دشمنان خالی گردیدہ و تیر سعی ایشاں بر ہدف مراد رسیدہ۔ آئندہ مناصب ریاست وسیاست بطالبین آں مسلم باد۔ و بیخ شوکت وسطوت ایشاں محکم شود۔

(نقش حیات جلد دوم)

جب ہندوستان ان بیگانے دشمنوں سے خالی ہو جائے گا تو سیاست و ریاست ارباب حکومت کو مبارک ہو اور انکی شوکت وحشمت کی جڑ مضبوط ہو۔

آگے اور وضاحت کردی ہے کہ ہم تو صرف اتنا چاہیں گے کہ اسلام کی خدمت آزادی سے کرتے رہیں اور آپ ہماری دل وجان سے مدد کرتے رہیں۔

بہرحال جس طرح اس مقدس جماعت نے جہاد حریت کے لئے قدم بڑھایا تھا

مشترک جد و جہد کا تصور بھی اسی نے پیدا کیا۔ جو اس وقت اگرچہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن چند دنوں بعد ہی تخم بار آور ہوا[۱]۔

---

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے[۲]

الحاق۔ لاخراجی زمینوں کی ضبطی۔ جیل خانوں میں ایک کھانا۔ فوجی بھرتی میں سمندر پار جانے کی شرط۔ نکاح بیوگان۔ گھی میں چربی اور آٹے میں ہڈیوں کی راکھ کا پروپیگنڈہ۔ چپاتیوں کی تقسیم اور چربی لگے ہوئے کارتوس کے افسانے۔ اور اُن کے اثرات پیشگوئیاں شاہ ایران اور شاہ روم سے غلط توقعات۔ وغیرہ وغیرہ

(شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب کے الفاظ ہیں)

(۱)

برٹش گورنمنٹ کے کاموں کی شرحیں عجیب عجیب رنگ سے ہوتی تھیں بڑی ذہانت سے قصے اور افسانے بنائے جاتے جن کا مطلب یہ ہوتا کہ سپاہی کے دل میں بے چینی

---

[۱] ایک عجیب بات ہے کہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک جو آزادی کی تحریک چلتی رہی اس میں جمعیۃ علماء کا نظریہ یہی رہا کہ جد و جہد آزادی ایسا فرض ہے کہ ہندو مسلم حقوق کے تصفیہ پر اس کو موقوف نہیں رکھا جا سکتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہی سبق تھا جس کی تعلیم حضرت سید احمد صاحب کے کردار سے حاصل کی تھی۔ مسلمانوں کی بعض دوسری جماعتیں تصفیہ حقوق کو مقدم قرار دیتی رہیں اور اس بہانہ انگریزی سامراج کے ہاتھوں میں کھیلتی رہیں۔ محمد میاں

[۲] بہت پہلے کے واقعات کا اجمالی ذکر دجوہات و سیاسیہ کے سلسلہ میں گذر چکا ہے۔

پیدا ہو۔ اور وہ گورنمنٹ کی وفاداری اور جاں نثاری سے دست بردار ہو۔ گو یہ سب باتیں مختلف راگوں میں گائی جاتیں مگر سب کا سم اس پر ٹوٹتا کہ سپاہی کو یہ سمجھایا جائے کہ انگریزوں کی کل تدابیر کا مآل یہ ہے کہ جات کو بالکل غارت کر دیں اور کل ملک میں عیسائی مذہب کو داخل کر دیں۔

الحاق جب کوئی صوبہ الحاق کیا جاتا تو یہ کہا جاتا کہ اسے عیسائی بنانے کے لئے آسانی ہوئی کہ بہت سے آدمی عیسائی ہو جائیں گے۔

معافیات کی ضبطی لاخراجی زمینوں کی ضبطی کا مطلب یہ بیان کیا جاتا تھا کہ ملک میں تمام مذہبی اوقاف کا نام نہ رہے۔

سرکاری قانون سرکاری قانون جو جاری ہوتے اُن کا مطلب یہ ہی بیان کیا جاتا کہ ہندو مسلمانوں کے مذہب تہ و بالا ہو جائیں۔

تعلیم تعلیم کی تمام تدابیر کو کہتے تھے کہ یہ تو براہ راست ملک کے مذہب پر حملہ ہے۔

جیلخانوں میں ایک کھانا تعزیرات کے نظام کو بتاتے تھے کہ وہ جات کے برباد کرنے کے لئے ہے جیل خانوں میں دیکھو سب کا کھانا پینا ایک کر دیا۔

چھاؤنی کی ہر لین میں اس قسم کے آدمی تھے جو سپاہیوں کو ان جھوٹی باتوں کی تعلیم کرتے تھے اور اس کے ساتھ یہ یقین دلاتے تھے کہ عنقریب وقت آنے والا ہے کہ ایک فرنگی زندہ باقی نہیں رہے گا۔ نئی سلطنت قائم ہو گی۔ سپاہ کا نیا انتظام

ہوگا جس میں سارے اعلیٰ عہدے، جن کا فرنگیوں نے اجارہ لے رکھا ہے وہ سب ہندوستانیوں کو ملیں گے [1]

(۲)

سمندر پار جانے کی شرط اور نکاح ثانی

اس زمانہ میں سپاہ کی بھرتی ہونے کے لئے سمندر پار جانے کی شرط کا داخل ہونا اور بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی کا قانون اس بات کے سمجھانے کے لئے کافی تھا کہ یہ باتیں اسی تدبیر کا جزو ہیں جو ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے لئے گورنمنٹ کر رہی ہے [2]

خوراک میں آمیزش کا پروپیگنڈہ

لارڈ کیننگ [3] پر خوب ظاہر ہو گیا کہ ہندوستانی سپاہ کے دلوں میں نہایت بڑے شبہات نے خوب جڑ پکڑ لی ہے پھر انھوں نے سپاہ کی ناراضی کے آثاروں پر بڑی توجہ کی تو یہ معلوم ہوا کہ شبہات فقط سپاہ ہی کے دلوں میں نہیں تھے بلکہ عموماً آدمیوں کے دل بے چین ہو رہے تھے۔ صرف میرٹھ ہی میں نہیں بلکہ ملک کے اور اطراف میں بھی یقین تھا کہ دونوں ہندو مسلمانوں کے دین کو انگریزوں نے بگاڑنے کی تجویز کی ہے

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ صفحہ ۱۵۲ و صفحہ ۱۵۳ [2] ایضاً صفحہ ۳۰۳

[3] لارڈ ڈلہوزی جسے اپنے کارناموں کی بنا پر خود یقین تھا کہ ہندوستان میں لوگ پین آتش فشاں پہاڑ پر بیٹھے ہیں۔ مارچ ۱۸۵۶ء میں یہاں سے واپس ہوا۔ اس کی جگہ لارڈ کیننگ وائسرائے ہند ہو کر آیا۔ جس نے یورپ سے روانگی سے کچھ پہلے ایک وداعی پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: میری خواہش ہے کہ میرا عہد حکومت پر امن رہے لیکن میں اس بات کو نہیں بھول سکتا کہ ہندوستان کی فضا میں بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دکھائی دیگا اتنا چھوٹا جتنا کہ انسانی ہاتھ لیکن یہ ٹکڑا اتنا بڑا ہوتا جائیگا کہ خود ہمارا وجود خطرے میں پڑ جائے گا (تاریخ عروج عہد انگلیشیہ صفحہ ۲۶۶ (کمپنی کی حکومت صفحہ ۳۲۵)

کہ ان کی روزانہ خوراک کو ممنوع و حرام چیزوں سے ناپاک کردیں۔ اب اس خوراک کے ناپاک کرنے کی بہت سی صورتیں بیان کی جاتی تھیں کہ برٹش گورنمنٹ نے سرکار کمپنی اور ملکہ معظمہ کے حکم سے پسی ہوئی ہڈیاں آٹے اور نمک میں ملادی ہیں کہ وہ بازاروں میں فروخت ہوں اور گھی میں جانوروں کی چربی ملادی ہے اور شکر کو جلی ہوئی ہڈیوں سے صاف کیا ہے اور کنوؤں میں سور اور گائے کا گوشت ڈلوادیا ہے تاکہ پانی پینے کا نجاست آلود ہو جائے۔ یہ چکنے کارتوس تو فقط مذہب خراب کرنے کی تدبیر کا ایک جزو تھا جو سپاہ کے ساتھ مخصوص تھا۔ یہاں تو گورنمنٹ سب ہندو مسلمانوں کے مذہب بگاڑنے کی تجویز کر رہی ہے اور یہ کہانی بھی گھڑی گئی کہ بڑے بڑے صاحبوں نے حکم دیا ہے کہ تمام سلاطین و امراء و تعلقہ دار و زمیندار و رؤسا و اہل زراعت و اہل تجارت سب انگریزی روٹی کھائیں۔ ان ان جھوٹ موٹ کہانیوں میں آرد استخوان آمیز کی کہانی ہندوستانیوں کے دلوں میں بڑی موثر تھی وہ اپریل کے شروع میں بارک پور میں مشتہر ہوئی تھی۔ اس مہینے میں یہ وبا بالا ہند میں پھیلی۔ کان پور میں آٹا مہنگا ہو گیا تھا میرٹھ کے بنیوں نے گورنمنٹ سے چند کشتیاں کرایہ پر لے کر اس میں آٹا لاد کر کان پور بھیجا۔ پہلی دفعہ جب یہ آٹا کان پور میں آیا تو سستا ہونے کے سبب سے فوراً بک گیا لیکن جب اور آٹا آیا تو یہ شہرت ہوئی کہ ہنی پن چکیوں میں یوروپین کے اہتمام سے گیہوں پیسے گئے ہیں اور اس میں گائے کی ہڈیوں کی خاکستر ملادی گئی ہے تاکہ ہندوؤں کی جات آٹے کے کھانے سے جاتی رہے۔ اس بات کی شہرت کانپور کی بستیوں اور بازاروں میں ایسی ہوئی کہ میرٹھ کے آٹے کا بکنا موقوف ہو گیا۔ کوئی ایک سپاہی اس کو ہاتھ نہ لگاتا تھا اور نہ کوئی آدمی اس کو خریدتا تھا۔ اگرچہ وہ کانپور کے بازار کے آٹے سے سستا بکتا تھا۔ یہ خبر ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی میں پہونچی آٹے کا

دہم یہاں تک لوگوں کے دلوں پر چھایا کہ اُنھوں نے آٹا کھانا چھوڑ دیا۔ جو روٹیاں پکی ہوئی تھیں اُن کو پھینک دیا۔ غرض لوگوں کے دلوں میں یہ نقش کالحجر ہو گیا کہ گورنمنٹ اُن کی جات اور مذہب خراب کرنے کی تدبیر کر رہی ہے۔

(۴)

چپاتیوں کی تقسیم اور اُس کی توجیہات

لارڈ کیننگ کو یہ یقین ہو گیا کہ رعایا کو بڑا خوف لگ رہا ہے کہ گورنمنٹ اُن کے مذہب بگاڑنے کے درپے ہے۔ اس لئے وہ اس سے بڑی نفرت وعداوت رکھتے ہیں۔ یہ خیال کر کے اُنھوں نے ایک دوسری کہانی پر جو چپاتیوں کی تقسیم سے متعلق تھی توجہ کی۔ ممالک مغربی سے ان چپاتیوں کی تقسیم کی خبر پہونچی جن کی وجہ اُن کے بڑے بڑے تجربہ کار مشیر بھی نہیں بتا سکے۔ یہ چپاتیاں دہ بدہ (گاؤں گاؤں) اس طرح بٹیں کہ ایک شخص اُن کو ایک گاؤں میں زمیندار کو دے جاتا۔ اور اُس سے فرمائش کر جاتا کہ تم دوسرے گاؤں میں ان کو بھیجدینا۔ بس اس طرح یہ چپاتیاں دہ بدہ گشت کرتی پھریں۔ اُن کے باب میں نہ کوئی سوال کرتا۔ نہ کوئی سمجھتا کہ یہ کہاں سے آئی ہیں اور کیوں آئی ہیں۔ بے سمجھے دوسرے گاؤں میں بھیجنے کے حکم کی اطاعت کی جاتی۔ ایک مدت کے بعد گورنمنٹ کے عہدہ داروں کو خبر ہوئی۔ بعض نے اس پر بہت بعض نے تھوڑا خیال کیا۔ ہر ایک نے اپنی طبیعت اور ذہانت کے موافق اس کے مختلف سبب بیان کئے۔

اوّل مسٹر فورڈ کلکٹر گوڑگانوہ نے ممالک مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر مسٹر کالون کو ان چپاتیوں کا حال لکھا۔ اُنھوں نے حکام اضلاع کے نام سرکلر جاری کئے۔

دہلی کے بادشاہ کی تحقیقات جرم میں یوروپین اور ہندوستانی گواہوں کے اظہارات میں تفتیش کی گئی کہ چپاتیوں کی تقسیم کا راز کھلے۔ مگر وہ نہ کھلا۔ بہت سے افسروں نے بیان کیا کہ وہ صرف اس بات کی نشانی ہے کہ آئندہ جو کوئی حادثۂ عظیم واقعہ ہونے والا ہے اس کے لئے عین وقت پر سب تیار رہیں۔ ایک بڑے مستند حاکم نے گورنر جنرل کو لکھا کہ مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ چپاتی آدمیوں کی خوراک کی ایک علامت ہے۔ اس کے گشت لگانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمیوں کو چونکا دے اور اُن کے دلوں پر اثر کرے کہ اُن کی خوراک حاصل کرنے کے وسائل چھین جائیں گے اس لئے ان کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ سب آپس میں متفق رہیں۔ دوسرے افسروں نے اس خیال کی بڑی ہنسی اُڑائی۔ اور بیان کیا کہ وہ کل ملک کے اوہام میں سے ہے۔

یہ بھی کہا گیا کہ یہ ہندوؤں کی عادت کے موافق ہے جب کسی ہندو کے خاندان میں بیماری ہوتی ہے تو وہ چپاتیاں اس لئے تقسیم کرتا ہے کہ اس کے گھر سے بیماری کو چپاتیاں اپنے ساتھ باہر لے جائیں یا جب کسی گروہ میں ہیضہ پھیلتا ہے یا دبائیں آتی ہیں تو وہ بھی اس طرح کا ٹوٹکا کرتے ہیں۔ اور آدمی یقین کرتے تھے کہ برٹش گورنمنٹ کے دشمنوں نے اس مطلب کے لئے تقسیم کیا ہے کہ جھوٹی باتوں کو جو اُنھوں نے پھیلا رکھا ہے اُن کے ساتھ یہ خوفناک دروغ بھی منسلک ہو جائے جس کا اثر یہ ہو کہ ان میں گائے کی پسی ہوئی ہڈیاں ہیں اور انگریزوں نے ان لوگوں کے مذہب بگاڑنے کی ترکیب کا تتمہ ان کو بنایا ہے۔

بعض لوگوں نے اٹکل سے یہ کہا کہ جیل خانوں میں بعض دفعہ مراسلت اس طرح کی جاتی ہے کہ جس کو "بیچ کوڑی خان" سے ظاہر کیا تھا کہ جب کوئی قیدی سپاہیوں کی

سنگینوں تلے مقید ہوتا ہے تو اُس کو روٹی کھانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ روٹی پکانے والے کو رشوت دی جاتی ہے اور ایک چھوٹا سا رقعہ چپاتی میں رکھ دیتا ہے یا رکابی پر کوئی فقرہ لکھ دیا جاتا ہے پس جب قیدی روٹی کھاتا ہے تو اُس کو پڑھ لیتا ہے پس اس طرح ان چپاتیوں کے اندر بغاوت آمیز فتنہ انگیز خطوط ہیں جو وہ بدہ (گاؤں گاؤں) اس طرح پہونچلنے جاتے ہیں اور اُن کو گاؤں کا ایک سردار پڑھ کر اُن پر آٹا لپیٹ کر اور چپاتی بنا کر دوسرے کے پاس بھیج دیتا ہے جو اس کو کھول کر پڑھ لیتا ہے۔

کپتان کیٹنج لکھتے ہیں کہ چپاتیوں کا گشت ۱۸۵۷ء کے شروع سے شروع ہوا۔ بنارس سے اس کا آغاز ہوا ہے۔ کہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں وہ بھیجی جاتی ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شمالی ہند میں بھی یہی حال ہوا ہے اور وہ ایک بلوہ کی علامت بتائی گئی ہے جو اس سال میں آ پیچھے واقع ہوگا۔ جب وہ بنارس میں نمایاں ہوئی ہیں تو وہ سب جگہ اندر کی طرف سے آتی تھیں۔ اندر میں اس وقت ہیضے کی وبا سخت پھیل رہی تھی اور ہر روز شہر میں بہت سے آدمی مرتے تھے۔ بیمار کے آدمی یقین کرتے تھے اور اب بھی یقین کرتے ہیں کہ گیہوں کی چپاتیاں ایسے منتروں کے پڑھنے کے بعد جن سے یہ یقین ہو کہ وہ وبا کو ساتھ لے جائیں گی۔ باہر تقسیم ہوئی ہیں۔

چپاتیاں شمال سے جنوب کو براہ راست نہیں آتی تھیں وہ پاجانگر میں بھی ۹ فروری کو آئیں جو گوالیار اور اندور کے عین وسط میں واقع ہے اور مندسور میں وہ ۱۲ جنوری ۱۸۵۷ء کو تقسیم ہوئیں۔ جب گاؤں میں سینلا بچوں کو نکلتی ہے تو ایک بینڈھا لیتے ہیں اور اس کے گلے میں ناریل ڈالتے ہیں اور چوکیدار اس کو "من داتا" کی سڑک پر جو گاؤں اول آتا ہے لے جاتا ہے اس کو بستی کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ پھر اسی طرح

ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں منڈھا پھرتا رہتا ہے اس کو قرار نہیں ہوتا۔ یہ ترکیب دھرم شاستر میں لکھی ہے۔ میجر آرسکن۔ کمشنر ساگرو نربدا۔ رپورٹ بھیجتے ہیں کہ جنوری ۱۸۵۷ء کے پیچھے تک چپاتیاں ایک راز کے طور پر اکثر اضلاع میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں گشت کرتی رہیں۔ اگرچہ اس کو کسی آنے والی بات کی نشانی جانتے ہیں لیکن کل قسمت میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا کارسازی کرتی ہیں۔ یا کہاں سے وہ آتی ہیں اور ان کی نسبت بہت ہی کم خیال کیا جاتا ہے۔ الا ساگر کے مہاجنوں کے بازار میں کچھ تھوڑا سا اثر ہنڈیوں کے معاملہ میں کرتی ہیں۔ میں اس معاملہ کی رپورٹ گورنمنٹ کو کر رہا ہوں لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ کوئی شخص ان چپاتیوں کے اسرار سے واقف کار ہو یا اُن کو وہ آئندہ سرکشی کی طرف راجع جانتا ہو۔ اگرچہ اب ہماری رائے اس کی نسبت یہی ہو۔

غرض بعض اُن چپاتیوں کے گشت کرنے کو بے معنے جانتے تھے بعض اس کے معنے عظیم جانتے تھے۔ آئندہ زمانہ نے بھی کوئی معنے اُن کے روشن نہیں کئے۔ اب تک اس کے معانی میں اختلافات چلے آرہے ہیں۔ بعض مورخین یہ لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں ایک مولوی نے ان چپاتیوں کو تقسیم کیا تھا اور اس کا مطلب جہاد تھا "مارا گھونٹا پھوٹی آنکھ"

غرض ان چپاتیوں کی بابت قیاسات تو بہت گھڑے گئے مگر کوئی رازداں ایسا نہیں ملا کہ وہ تاریخ میں لکھنے کے قابل افشا راز کرتا۔ اب تاریخ صرف اس یقینی امر کو بیان کرتی ہے کہ یہ عجیب چپاتیاں جہاں ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتیں تو وہاں نئی برانگیختیاں اور فضول توقعیں (توقعات اور امیدیں) پیدا ہوتیں۔[1]

ان بہت سے خیالات میں غالباً سب سے صحیح وہ ہے جو مولوی کی طرف منسوب کیا گیا

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ صفحہ ۳۴۲ تا صفحہ ۳۴۵

چپاتیاں بٹنے کا واقعہ ہندوستان میں نیا نہیں تھا۔ سنتھالیوں کی بغاوت سے پہلے سال کے درخت کی ٹہنیاں گاؤں گاؤں بھیجی گئیں تھیں۔ مرہٹوں نے جب شمالی علاقے پر حملے کئے تو اس سے پہلے روٹی پر جوار کی ٹہنی رکھ کر بانٹی گئی تھی۔ بعض جگہ ان پر بکری کے گوشت کی بوٹیاں بھی رکھ دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے محاورات میں چپاتیاں بٹنا اور کچے گوشت کا اس پر رکھا ہونا۔ قلع قمع کردینے۔ کچا چپاڈالنے اور کلی طور پر استیصال کی علامت مانی جاتی ہے۔ ساورکر کا خیال یہی ہے کہ مختلف طبقات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی تھی۔ بنگال میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایک خاص قاصد ہر ایک چھاؤنی میں جاتا سب سے بڑے ہندوستانی افسر سے ملتا اور اسے سرخ کنول کا پھول دکھاتا۔ افسر وہ پھول پاس کے سپاہی کو دیدیتا اور اسی طرح پھول ایک ایک سپاہی کے ہاتھ میں پہونچتا یہ پھول نشان تھا صفائی۔ پاکیزگی۔ فتح اور شادابی کا۔

(۵)

پیشین گوئیاں

اخباروں میں ولیوں کی پیشین گوئیاں بھی برٹش گورنمنٹ کے ختم ہونے کی چھاپی جاتی تھیں۔

اخباروں میں سید نعمت اللہ شاہ متخلص ولی ہانسوی کے قصیدہ کے اشعار لکھے جاتے تھے۔

یہ قصیدہ بھی عجیب ہے۔ جو واقعات واقع ہوتے جاتے ہیں، منظوم ہو کر اسں قصیدے کے دُم چھلّا بنتے جاتے ہیں۔ اور وہ ولی کی پیشین گوئیاں تسلیم کی جاتی ہیں جن اشعار میں اس زمانہ کے لئے پیشین گوئیاں کی گئیں وہ یہ ہیں۔

قوم سکھاں چیرہ دستیہا کند بر مسلماں

تا چہل ایں عہد و بدعت اندراں پیدا شود
بعد ازاں گیرد نصاریٰ ملک ہندوستان تمام
تا صدی حکمش میاں ہندوستان پیدا شود
چوں شود درعہد آں با جور و بدعت را رواج
شاہ غربی بحر قتلش خوش عناں پیدا شود
درمیان این و آں گردد بسے جنگ عظیم
قتل عام بیگیاں درعہدشان پیدا شود
فتح یا بدشاہ درویشاں بزور تیغ جہد
قوم عیسےٰ راکشش او بیگیاں پیدا شود
پانصد و ہفتاد ہجری بود تا ایں گفتہ شد
درہزار و درصد و ہفتاد آں پیدا شود[۱]

(۶)

شاہِ ایران اور شاہِ رُوم سے غلط توقعات

انگریزی کتابوں میں لکھا جاتا ہے "جب شاہ ایران سے ۱۸۵۶ء میں انگریزوں کی لڑائی ہوئی تو اُس نے اپنے ہی جاسوس شاہ دہلی کے پاس بھیجے کہ وہ انگریزوں کے ساتھ لڑائی کرے اور ہم دونوں آپس میں متحد ہو جائیں جس سے اُمید ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی سلطنت قائم ہو جائے گی اس لئے ایک اشتہار تیار ہوا اور وہ دہلی اور جامع مسجد کی دیواروں پر چسپاں ہوا۔ اور یہ شہرت بھی ہوئی

---

[۱] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۳ و ص ۳۸

کہ خلیج فارس میں انگریزوں کو بڑی شکست فاش ہوئی ہے۔ اور یہ بات مشہور ہوئی کہ انگلش یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم نے امیر دوست محمد خاں کو دوست بنالیا۔ مگر اصل میں وہ ایران کا زیر فرمان ہے۔ انگریزوں کے ساتھ دوستی اس لئے اختیار کی ہے کہ افغانوں کو انگریز پشاور دیدیں۔[۵۱]

صادق الاخبار وغیرہ میں جو خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں جن کی حقیقت افواہ سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اُن کا خلاصہ یہ تھا کہ

شاہ ایران درہ بولان سے بے مزاحمت اُتر آیا ہے اور
اٹک تک آگیا ہے۔

اصل لڑائی کا حال یہ ہے کہ شاہ ایران پانچ برس سے خزانے پر خزانے سپاہ پر سپاہ، اور اسباب پر اسباب حرب وضرب اس لئے جمع کر رہا تھا کہ ہندوستان کو فتح کرے۔ اب لڑائی کا وقت آگیا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ روسیوں نے بہت سا سامان جنگ، شاہ ایران کو حوالہ کیا ہے اور پانچ لاکھ سپاہیوں کا لشکر جرار جس کے ساتھ بہت کچھ اسباب حرب وضرب ہے ایران کی کمک کے لئے بھیجدیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ اس کی یہ سپاہ قواعد داں کافی نہ ہوگی تو بہت سی پولیس کی سپاہ کمک کے لئے اور بھیجدی جائیگی۔ شاہ ایران کے ممد ومعاون شاہ فرانس وسلطان روم ہیں اصل جنگ کا سرمنشأ روس ہے جو ایران کی آڑ میں ہندوستان کے فتح کرنے کے لئے کارستانیاں کر رہا ہے امیر دوست محمد خاں والی کابل نے انگریزوں کے ساتھ ظاہری مصالحت اس لئے کرلی ہے کہ اُن سے ہتھیار اور روپیہ لے لے اور ایران کی حمایت میں کام میں لائے۔[۵۲]

---

۵۱ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ صفحہ ۳۰۱ ۵۲ ایضاً صفحہ ۳۰۱

جنوری ۱۸۵۷ء سے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء تک

۱۸۵۷ء کا آغاز کارتوسوں کا قصہ

دل آزار تکلیف دہ اور ہندوستانیوں کے لئے توہین آمیز واقعات کا سلسلہ جو عرصہ سے چل رہا تھا وہ دن بدن زیادہ ہوتا رہا۔ حکومت کو بار بار آگاہ کیا۔ لیکن اس کے سول اور ملٹری حکام نے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ پر کان دھرنے سے انکار کر دیا۔ اُنھیں اسی وقت ہوش آیا جب طوفان نے درختوں کو اکھاڑنا شروع کر دیا۔

اس بے چینی نے سب سے پہلے ۲۲ جنوری ۱۸۵۷ء کو ڈم ڈم[۱] میں عملی شکل اختیار کی۔ ڈم ڈم میں مقیم دیسی سپاہیوں نے اپنے انگریز افسر سے شکایت کی کہ ان نیلڈ رائفلوں کے لئے جو کارتوس بنائے جاتے ہیں اُن میں گائے اور سور کی چربی ہے۔ اس افسر نے حکومتِ ہند کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔ حکومت نے بعض چھاؤنیوں میں دیسی سپاہیوں کو یقین دلا دیا کہ کارتوسوں میں ممنوعات استعمال نہیں کی جارہی ہیں لیکن یہ افواہ بارود کے ڈھیر میں چنگاری کا کام کر چکی تھی۔ بارک پور[۲] کے فوجیوں نے بہرام پور[۳] کی انیسویں رجمنٹ میں بے چینی کا بیج بو دیا۔ ۱۹ فروری کی رات کو اس رجمنٹ نے مظاہرہ شروع کر دیا۔ کرنل "مچل" نے فوجیوں سے اس مظاہرہ کا سبب دریافت کیا۔

---

[۱] ڈم ڈم کلکتہ سے تقریباً ۱۲ میل۔ آج کل کلکتہ کا ہوائی اڈہ ڈم ڈم میں ہی ہے [۲] بارک پور کلکتہ سے ۱۶ میل [۳] بہرام پور۔ بارک پور سے سو میل۔ نواب بنگال کے قدیم دارالخلافہ مرشد آباد سے چند میل۔

فوجیوں کا جواب یہ تھا:-

"سرکار ہمارا دین بگاڑ رہی ہے"

کرنل نے فوجیوں کے سامنے ایک تقریر کی اور یقین کر لیا کہ فوج مطمئن ہوگئی۔ اطمینان کہاں؟ جب لارڈ کیننگ کو برہام پور کے واقعہ کا پتہ چلا تو اُس نے ایک دوسری رجمنٹ کو بارکپور پہونچنے کا حکم دیا۔ نیز برہام پور کی اُنیسویں رجمنٹ کو بھی حکم ملا کہ وہ بارکپور پہونچ جائے۔

یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ بارکپور کی چونتیسویں رجمنٹ کے ایک فوجی نے پریڈ کے وقت "دین دین" کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو فرنگیوں کے خلاف لڑنے کے لئے اُکسایا۔ سرجنٹ میجر موقع پر پہونچ گیا۔ اس فوجی نے اس پر گولی چلادی۔ وہ بال بال بچ گیا۔ بغاوت کے آثار پاکر جنرل ہرسی موقع پر پہونچ گیا۔ حالات پر قابو پالیا گیا۔

منگل پانڈے

یہ دین دین کا نعرہ لگانے والا ایک برہمن تھا "منگل پانڈے نام" اس کا واقعہ یہ تھا کہ۔ فوج کے ایک خلاصی نے جو نیچ ذات کا تھا۔ اس سے کہا کہ اپنے لوٹے سے مجھے پانی پلادے منگل پانڈے نے جواب دیا تو کس ذات کا ہے۔ خلاصی نے طنزاً کہا۔ ذات کیا پوچھتے ہو۔ اب سب ذات پات رکھی رہ جائے گی۔ وہ کارتوس آگئے ہیں جن میں سور اور گائے کی چربی لگی ہے۔ اُن کو دانت سے کاٹنا پڑے گا۔

بہرحال اس سے اگلے روز انیسویں رجمنٹ بھی "بارک پور" پہونچ گئی تھی۔ اسی شام کو انگریزی سپاہی بھی بارک پور آگئے تھے۔ اگلے دن جرنیل نے گورنر جنرل کا ایک فرمان سُنایا جس میں اُنیسویں رجمنٹ کو توڑ دینے کا حکم تھا۔ ۸ اپریل کو منگل پانڈے کا

مقدمہ شروع ہوا۔ ۔ ر کو پھانسی کی سزا تجویز کی گئی اور ۸ ر کو اُسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ۲۱ راپریل کو اُس کے ایک ساتھی ایشوری پانڈے کو پھانسی دیدی گئی۔ اُس کا جرم یہ تھا کہ منگل پانڈے جب فائر کی تیاری کر رہا تھا اور ایشوری سے کہا گیا تھا کہ منگل پانڈے کو گرفتار کرلے تو ایشوری نے تعمیل میں لاپرواہی برتی تھی۔ جب دوبارہ اس کو حکم دیا گیا تو کہدیا۔ منگل پانڈے تو پاگل ہوگیا ہے۔

ایشوری کا جواب یہ تھا کہ میں نے سب سے کہا تھا منگل پانڈے سے بچو اور درختوں کی اوٹ میں کھڑے ہو جاؤ منگل پانڈے پاگل ہو رہا ہے۔

چند روز بعد چونتیسویں رجمنٹ کی سات کمپنیوں سے ہتھیار چھین کر انھیں الگ کر دیا گیا۔ حکومت مطمئن تھی کہ بغاوت ختم ہو چکی ہے۔ بغاوت تو ابھی ہونے والی ہے ——

بارک پور کی خبریں کسی قدر مبالغہ کے ساتھ شمالی ہند تک جا پہونچیں۔ اپریل ۱۸۵۷ء کے آخری ہفتہ میں میرٹھ میں ہندوستانی سپاہیوں نے مختلف صورتوں میں بے چینی کا اظہار کیا تھا۔ چونکہ میرٹھ میں انگریزی سپاہیوں کی ایک پوری رجمنٹ موجود تھی اور یہاں کا توپ خانہ پورے ملک میں سب سے بہتر توپ خانہ تھا۔ اس لئے یہاں کے فوجی حکام مطمئن تھے۔ غالبًا اسی زعم میں یہاں پر ۲۳ راپریل کو پریڈ کا حکم نافذ کیا گیا۔ ۲۴ ر کو دیسی فوج نے پریڈ کی۔ پریڈ کے بعد حوالدار میجر اور اس کے اردلی نے ان کارتوسوں کو چلایا جن کے متعلق خیال تھا کہ اُن کے چلانے وقت دانتوں سے کاٹنا پڑتا ہے۔ پریڈ ختم ہوئی دیسی سپاہی اپنی بارکوں میں چلے گئے۔ اسی رات اردلی کے خیمہ کو آگ لگا دی گئی۔ اگلے دن دیسی سپاہیوں نے کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔ ۲۵ راپریل کو ڈپٹی جج کے سامنے اس معاملہ کی پڑتال کی گئی۔ سپاہیوں نے کارتوسوں کو ناپاک بتایا۔ نہیں

سمجھایا گیا کہ کارتوسوں میں ممنوعات استعمال نہیں کی گئیں۔ سپاہیوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ ان کارتوسوں کو استعمال کریں گے۔

سپاہیوں کے سامنے بڑی پریشانی یہ تھی کہ کارتوسوں کے خلاف پروپیگنڈہ اتنا زیادہ کر دیا گیا تھا کہ اگر فوج کے سپاہی مطمئن ہو کر کارتوسوں کو لے بھی لیتے تو فوج سے باہر اُن کی بات ماننے والا کوئی نہیں تھا۔ اُن کی ذات برادری کے آدمی بھی اُن سے نفرت کرنے لگتے۔

فوجی اس تصور سے لرز جاتے تھے۔ وہ زار زار روتے تھے کہ اگر ہم کارتوس لے لیتے ہیں تو ذات برادری سے خارج ہوتے ہیں۔ اپنے عزیزوں سے چھوٹتے ہیں جینا بر باد اور موت کے وقت ایمان اور دھرم کا خطرہ اور نہیں لیتے تو سرکار کے باغی ٹھہرتے ہیں۔

ادھر ہر سفید چمڑی والا اقتدار کے نشہ میں ایسا مدہوش تھا کہ غیر مشروط وفاداری کے سوا کسی بات کے ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دلوں کی بے چینی زبانوں تک۔ اور زبانوں سے بڑھ کر ہاتھ پاؤں تک پہونچ چکی ہے۔ چھاؤنیوں کی بیرکوں میں آگ لگنے کا سلسلہ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ آگ لگانے والوں کا پتہ کیسے چلتا جب پتہ چلانے والے خود مجرم تھے اور کوئی گواہی دینے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود فتوحات کے غرور نے گردنوں کو اتنا سخت کر دیا تھا کہ وہ کسی طرح خم ہونے کو تیار نہ تھیں۔

مختصر یہ۔ ۶ مئی کو میرٹھ چھاؤنی میں پریڈ کرائی گئی۔ ہر ایک فوج سے پندرہ پندرہ آدمی منتخب کئے گئے۔ کل نوّے آدمی پریڈ میں موجود تھے۔ کارتوسوں کی

تقسیم کا حکم دیا گیا۔ پانچ کے سوا سب نے انکار کر دیا جن میں اونچاس ۴۹[1] مسلمان تھے، ۳۶ غیر مسلم۔

۹ مئی۔ فیصلہ سنانے کا دن تھا۔ پوری فوج پریڈ پر جمع تھی۔ سب کے سامنے بہت بلند آواز سے سزا کا حکم سنایا گیا "دس دس سال قید با مشقت"۔ پھر فوراً ہی فوجی نشان چھین لئے گئے۔ ان کی وردیاں پشت کی طرف سے پھاڑ دی گئیں۔ پھر لوہار آگے بڑھے۔ چند لمحوں میں یہ بے داغ۔ وفادار سپاہی بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

یہ نظارہ بہت ہی حسرتناک۔ اور اشتعال انگیز تھا۔ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے سپاہیوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ ساتھی جو اُن کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ یہ اپنی اپنی لین میں با عزت تھے۔ فوج میں نام آور رہے تھے۔ یاس انگیز نگاہوں نے اشاروں ہی اشاروں میں بغاوت کا سبق پڑھا دیا۔ مگر گرد اگرد تیار توپخانہ کی موجودگی میں سرکشی کا تصور بھی خودکشی تھا۔

اس کے بعد ان پچاسی جوانوں کو پاپیادہ شہر کے جیلخانہ میں پہونچا دیا گیا۔ جدھر سے یہ سپاہی گذرتے تھے اُن کے مایوس دلوں کی سوزش ہندوستانی غیرت و حمیت کی ٹوٹی جھونپڑیوں میں چنگاریاں چھوڑتی جاتی تھی۔ عورتیں بھی بے تاب ہو کر چیختی تھیں۔ اگر مردوں میں اُن کے چھڑانے کی ہمت نہیں ہے تو چوڑیاں اور ہتھیاروں کا تیاگ کر لیں۔ چوڑیاں وہ پہن لیں اور تلوار ہمارے ہاتھ میں دیں ہم دکھا دیں گے غیرت کس چیز کا نام ہے اور حمایت کس طرح کی جاتی ہے۔

کیا آج کے آفتاب کے بعد بھی آفتاب طلوع ہوگا۔ آفتاب ضرور طلوع ہوگا، مگر اب اس کی چلکتی ہوئی دھوپ اور نوکیلی کرنیں انگریزی اقتدار کی جڑیں اکھاڑنے

---

[1] غلام رسول صاحب مہر نے اپنی تصنیف ۱۸۵۷ء میں ان کے نام بھی نقل کر دیئے ہیں ۱۲۔

کے لئے کام میں لائی جائیں گی۔ یہ تجویز دکھی دلوں کی پوری تائید کے ساتھ بلا کسی کانفرنس کے پاس ہو گئی۔

۱۰ مئی اتوار کا دن۔ صبح کا سہانا وقت ختم ہوا۔ جیسے جیسے درجہ حرارت بڑھنے لگا، جذبات کے تنور دہکنے لگے۔ کہا جاتا ہے ۳۱ مئی بغاوت کے لئے متعین تھی۔ مگر جس کو شام کرنی مشکل تھی۔ وہ ۳۱ مئی کا انتظار کہاں تک کرتا۔

آفتاب دن بھر کی بکھری ہوئی کرنوں کو ابھی سمیٹنے نہیں پایا تھا۔ گرجا میں شام کا گھنٹہ بجنا شروع ہی ہوا تھا۔ کہ بغاوت کا آتش فشاں انگارے اگلنے لگا ایک دستہ نے بیرکوں کو آگ لگائی، دوسرا جیل خانہ کی طرف دوڑا۔ کل جن کی مدد نہ کر سکے تھے آج ان کی بیڑیاں کاٹ ڈالیں جیل خانے کے جنگلے توڑ کر آٹھ سو اخلاقی قیدیوں کو بھی رہائی کا فیصلہ عملاً سنا یا گیا۔

دہلی چلو

بغاوت کر دی۔ بارکیں پھونک دیں۔ قیدی چھڑا لئے۔ جو انگریز سامنے آیا اسے گولی کا نشانہ بنا یا۔ اب کیا کرنا ہے؟ یہاں انگریزی فوج موجود ہے۔ اس کے پاس بہترین توپ خانہ ہے وہ آناً فاناً سب کو توپ دم کر سکتے ہیں اب کیا کیا جائے اور کس طرح کیا جائے، جوش اور وحشت سے لبریز دماغوں کا یہ سوال تھا۔

جواب ایک تھا۔ دہلی چلو اور اتنا تیز چلو کہ انگریزوں کی تیاری سے پہلے ایک منزل طے کر لو۔ اور صبح کو جمنا کے پانی سے وضو کرو اور اشنان کر لو۔ چلتے چلتے یہ باتیں طے ہو گئیں۔

دہلی میں انقلابی فوج کی آمد

باغی سپاہی جو دن چھپنے کے بعد میرٹھ سے چلے تھے صبح سویرے دہلی پہونچ گئے کہیں آرام کرنا اور سانس لینا تو درکنار۔ کھانے پینے سے بھی بے نیاز۔

مئی کا مہینہ۔ چاند کی سولہویں رات۔ دن گرم۔ رات خوشگوار۔ جوش جنوں نے قدموں کی رفتار بڑھا دی۔ یا زمین کی طنابیں کھینچ کر نو گھنٹے میں پاپیادہ چالیس میل طے کر لئے۔

غلطی اور غفلت مثل مشہور ہے۔ "چوں قضا آید طبیب ابلہ شود" قضا اور تقدیر کو کوئی مانے یا نہ مانے لیکن تاریخ کا یہ کس قدر عجیب و غریب سانحہ ہے کہ میرٹھ میں انگریزی سپاہیوں کی پوری رجمنٹ اور پورے ہندوستان کا سب سے بہتر توپ خانہ موجود تھا جو دنیا کے بہترین توپ خانوں میں شمار ہوتا تھا۔ ادھر دہلی میں فوج کی ایسی بڑی جمعیت جو باغیوں پر دہلی کے دروازے بند کر سکتی تھی، حاضر تھی لیکن میرٹھ چھاؤنی کے افسران کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ وہ حیران اور ایسے بدحواس ہو گئے کہ یہ بھی نہ معلوم کر سکے کہ انقلابی فوج کس طرف گئی۔[1]

---

[1] روایت ہے کہ ہندوستانی رسالہ کا انگریز کمانڈر کرنل اسمتھ بغاوت کی خبر سنتے ہی جان بچانے کے لئے کہیں چھپ گیا اور جب توپخانہ کے کمانڈر نے توپیں تیار کرائیں۔ ہندوستانی فوج دلی کے راستہ پر بہت دور نکل چکی تھی۔ انگریزی فوج کو بہانہ ہاتھ آگیا وہ بجائے تعاقب کے چھاؤنی میں پڑ کر سو گئی۔

اور جب حواس ٹھکانے ہوئے تو برسبیل احتیاط یا کسی تقیین کی بنا پر دہلی تار دیا۔
تار[1] فوراً پہونچ گیا۔ مگر سائمن فریزر (ریزیڈنٹ وکمشنر دہلی) جن کے نام تار تھا نیند یا نشہ میں ایسے بے خود تھے کہ تار کو بغیر پڑھے جیب میں رکھ لیا اور سو گئے۔

انقلابی فوج دہلی میں

۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء - ۱۶ ررمضان ۱۲۷۳ھ دوشنبہ کے دن صبح کے سہانے وقت جمنا کے ایک کنارے لال قلعہ کی سرخ وسپید برجیاں اور ان کے سنہرے کلس آفتاب کی کرنوں سے شوخیاں کر رہے تھے اور دوسرے کنارہ پر جوش وخروش سے وارفتہ انقلابی فوج بے چینی سے گذرگاہ تلاش کر رہی تھی اسی کنارہ پر پرمٹ کی چوکی تھی۔ باغی فوج نے اس میں آگ لگائی۔ کلکٹر کو مارا۔ پھر کشتیوں کے پل پر پہونچے۔ محکمہ تار کا انگریز افسر جس کا نام ٹاڈ تھا سامنے آیا،

---

[1] ایک روایت یہ بھی ہے کہ کسی ہندوستانی کو کافی رقم دیکر بھیجا گیا تھا اور صبح کے وقت محکمہ تار کا انگریز افسر "ٹاد" جو جمنا کے کنارہ پر مارا گیا تھا۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ یہاں اس لئے آیا تھا کہ تار کی لین خراب ہوگئی تھی اس کو درست کرنا تھا۔ یہ اس امر کا قرینہ ہے کہ تار باغی فوج نے کاٹ ڈالے تھے۔ لہذا میرٹھ سے تار نہ ہو سکا تو کسی آدمی کو بھیجا گیا۔ مگر یہ روایت اس لئے صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ سائمن فریزر کے پاس اطلاع رات ہی کو پہنچ گئی تھی پس تار کاٹنا اگرچہ قرین قیاس ہے مگر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ ایک دو بجے رات تک کوئی آدمی میرٹھ سے دہلی گیا ہو۔ نیز اگر تار رات ہی کو کٹ گئے تھے تو انگریز افسر کو اسی وقت دیکھنا تھا۔ صبح کا انتظار کرنا غلط تھا۔ اس بنا پر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ تار صبح کے وقت یا آخر شب میں کاٹے گئے اور اس سے پہلے میرٹھ سے تار دینا اور دہلی تار پہونچ جانا دونوں قرین قیاس ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی کوتاہیوں کو چھپانے کے لئے طرح طرح کی باتیں بنائی گئیں۔ محمد میاں۔

اس کو قتل کیا۔ کلکتہ دروازہ جو کشتیوں کے پُل سے قریب تھا (موجودہ ریلوے لائن سے شمال کی طرف) اُس نے ان سرفروش انقلابیوں کے استقبال میں تامل کیا تو سامنے راج گھاٹ کے کھلے ہوئے دروازے نے اپنی طرف اشارہ کر کے داخلہ کی اجازت دیدی۔ پیادہ اور سواروں کی بھیڑ قلعہ معلی کے جھروکوں کے نیچے سے گذرتی ہوئی آگے بڑھی اور راج گھاٹ کے دروازہ سے شہر میں داخل ہوگئی۔ اب داخل ہونے والی فوج کے دہنے جانب قلعہ تھا اور بائیں جانب کسی قدر فاصلہ سے دریا گنج جہاں کچھ انگریزوں کے بنگلے تھے۔ فوج قلعہ کی طرف بڑھی۔ پھاٹک پر سنتری موجود تھے۔ مگر اشاروں ہی اشاروں میں ایسی باتیں ہوئیں کہ انقلابی فوج بلا مزاحمت قلعہ میں داخل ہو کر بادشاہ کے حضور میں پہونچ گئی۔ اب بادشاہ سے جو گفت گو ہوئی۔ پہلے اس کو سُن لیجئے۔ راقم الدولہ ظہیر دہلوی جن کا دربار سے تعلق تھا۔ بادشاہ کے حضور میں روزانہ حاضری دیا کرتے تھے اور اس روز اگرچہ باغیوں کے پہونچنے کے وقت وہ دربار میں نہیں تھے مگر تھوڑی ہی دیر بعد ہی پہونچ گئے تھے اُن کے طویل بیان کے کچھ حصے یہاں نقل کئے جا رہے ہیں۔

لے یہ دروازہ موجودہ سنہری مسجد کی سیدھ میں تھا۔ جامع مسجد کے مشرقی صدر دروازہ کے سامنے سے اگر سیدھی سڑک جمنا تک نکالی جائے تو راج گھاٹ کے دروازہ سے گذرے گی اس دروازہ کے کھلنے کے متعلق مختلف روایتیں ہیں کہ کچھ سپاہیوں نے جو پہلے سے سازش میں شریک تھے انھوں نے کھول دیا۔ بظاہر صحیح یہ ہے کہ اشنان کے واسطے جانے والوں کے لئے یہ کھلا ہوا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اشنان کے لئے جانے والوں نے زبردستی کھلوا یا تھا۔

انقلابی سپاہی اور بادشاہ بہادر شاہ

دربار میں حاضری ۔ سرپرستی کی درخواست ۔ بادشاہ کا فقیرانہ جواب

راقم الدولہ ظہیر صاحب دہلوی کی روایت ہے کہ فوج کے نمائندوں نے بادشاہؒ سے عرض کیا ۔

"حضورِ جہاں پناہ سلامت ۔ آپ دین و دنیا کے بادشاہ ہیں ۔ تمام ہندوستان آپ کا محکوم و فرمانبردار ہے ۔ آج تک منادی میں پکارا جاتا ہے "خلقت خدا کی ۔ ملک بادشاہ کا ۔ حکم کمپنی کا" ۔ انگریز لوگ آپ کی طرف سے مالک و مختار ہیں، ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں امیدوار انصاف ہیں ۔ ہم لوگ ملازم انگریزی ہیں ۔ ہمیں لوگوں نے اپنی جانیں بیچکر اور سر کٹوا کر کلکتہ سے کابل تک چودہ سو کوس میں انگریزی عملداری قائم کرادی اور ہمیں لوگوں کی استعانت و امداد سے تمام ہندوستان پر تسلط ہو گیا ۔ یہ ولایت سے کوئی فوج ہمراہ لیکر نہیں آئے تھے ۔ سب ہندوستانی فوج کی کارگذاری ہے ۔ شہادت کے واسطے ہمارے پاس تمغے موجود ہیں ۔ اب چونکہ تمام ہندوستان پر قبضہ اور تسلط انگریزوں کا ہو گیا اور کوئی سرکش باقی نہ رہا ۔ اب سرکار کی نیت میں فتور واقع ہوا اور ہمارے دین و مذہب کے درپئے

تخریب ہوئی اور چاہا کہ تمام ہندوستان کو عیسائی کرلیں اور ابتدا اُس کی فرقہ فوج سے ہونی چاہیئے۔ چنانچہ باہم صلاح کرکے یہ تجویز قرار پائی کہ ایک قسم کی بندوق ایسی ایجاد کی گئی کہ جس میں ٹوٹا یعنی کارتوس دانتوں سے کاٹ کر بندوق کے منہ میں دینا پڑے اور اس ٹوٹے کو جانوروں کی جھلی سے منڈھوایا گیا۔ اب نہ معلوم وہ جھلی کسی جانور کی ہو۔ وہ بندوقیں ہم لوگوں کو دی گئیں کہ تم کارتوس کو دانتوں سے کاٹ کر بندوقوں میں ڈالو۔ ہم لوگوں نے بالاتفاق ہندو اور فرقہ مسلمان نے تعمیل حکم سے انکار کیا کہ ہم ہرگز ہرگز ایسا نہ کریں گے۔ خواہ سرکار نوکر رکھے یا نہ رکھے۔ فرقہ ہنود کو تو گائے کی جھلی کا اشتباہ ہوا اور اہل اسلام کو سور کی جھلی کا۔

اس کے بعد ظہیر صاحب کی روایت کا خلاصہ یہ ہے۔

"اب سرکار کو اپنی بات کی آن تھی۔ اور ہمیں دھرم اور ایمان کی۔ چار ماہ سے زیادہ ہو گئے یہ تنازع درپیش ہے۔ حکام کی کمیٹیاں ہو رہی ہیں۔ اور ہم لوگوں میں بھی سواروں اور پیادوں کی چھاؤنیوں میں جگہ جگہ چٹھیاں دوڑ گئی ہیں کہ یک قلم کل فوج انکار کردے اور زیادہ سختی برتی جائے تو ایک معین تاریخ پر تمام ہندوستان میں غدر مچا دیا جائے۔ پھر دیکھو انگریز کیا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مفسدہ کا ظہور اب آکر ہوا اور اس وقت اس کی بنا اس طرح ہوئی کہ انگریز افسران کو خیال ہوا کہ میرٹھ میں انگریزی فوج بھی کافی ہے ۔۔۔۔۔

ہندوستانی فوج بھی وہ ہے جو پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ بھروسے کی اور بہت پرانی فوج مانی جاتی ہے۔ لہٰذا کارتوسوں کی مہم اگر یہاں کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر پورے ہندوستان میں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ چنانچہ پریڈ کرائی گئی۔

اس کے بعد ظہیر صاحب نے پریڈ پر کارتوسوں کے پیش کئے جانے۔ ان فوجیوں کے انکار۔ پھر انکار کرنے والوں کی سزا وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد تحریر ہے

باقیماندہ تقریر سواران باغیہ

بیک گردش چرخ نیلو فری ⁂ نہ نادر بجا ماندہ نے نادری

جب ہم داخل جیلخانہ ہوئے تو کیمپ میرٹھ میں تہلکہ عظیم برپا ہو گیا اور گھر گھر کھچڑی پکنے لگی اور باہم صلاح و مشورے ہونے لگے خصوصاً فرقہ مستورات میں کہ ہمیشہ سے ناقص العقل اور کوتہ اندیش ہوتی آئی ہیں ان کو ہرگز اپنے انجام پر نظر نہیں ہوتی ان میں اکثر عورتیں تھیں جن کے وارثا محبوس ہوئے تھے انھوں نے زبان طعن و تشنیع سے پنکھا جھل جھل کر نائرہ فتنہ و فساد کو بھڑکانا شروع کیا اور ان کی چرب زبانی آتش فساد پر روغن کا کام کر گئی۔ اس موقع پر "دیوانہ را ہوئے بس است" کا مضمون صادق آیا۔ ان عورتوں نے مردوں کو طعنے دینے شروع کئے کہ تم لوگ مرد ہو اور سپاہ گری کا دعویٰ کرتے ہو مگر نہایت بزدلے اور بے غیرت اور بے شرم ہو۔ تم سے تو ہم عورتیں اچھی۔ تم کو شرم نہیں آتی کہ تمہارے سامنے تمہارے افسروں کے ہتھکڑیاں

پڑ گئیں اور تم کھڑے کھڑے دیکھا کئے اور تم سے کچھ نہ ہو سکا تو یہ چوڑیاں تو تم پہن لو اور ہتھیار ہم کو دو ہم افسروں کو چھڑا کر لاتی ہیں۔ ان کلمات فتنہ انگیز نے اور اشتعال طبع پیدا کیا اور تمام فوج کے دلوں میں جوش و خروش مردمی اور مردانگی کی آگ بھڑک اٹھی اور مرنے مارنے پر تیار ہو گئے اور باہم یہ صلاح قرار پائی کہ شب کو چل کر جیل خانہ توڑ کر افسران فوج کو چھوڑا لاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اس کے بعد انقلابی فوج کے افسروں نے کہا۔ تیس کوس کی مسافت طے کر کے اس وقت ہم یہاں پہنچے ہیں، بادشاہ سلامت ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں اور ہمارا انصاف فرمادیں۔ ہم دین پر بگڑ کر آئے ہیں۔

جواب باصواب از جانب بادشاہ عالیجاہ

سنو بھائی مجھے بادشاہ کون کہتا ہے میں تو فقیر ہوں، ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لئے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضہ میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے آباؤ اجداد کے نوکر چاکر اپنے خداوندان نعمت کی اطاعت سے جداگانہ رئیس بن بیٹھے۔ میرے باپ دادا کے قبضہ سے ملک نکل گیا۔ نوبت لایموت کو محتاج ہو گئے۔"

اس کے بعد بادشاہ نے شاہ عالم کا ... کس طرح انگریزوں سے وظیفہ اپنا قبول کیا

پھر فرمایا:-

لڑائی جھگڑے سے کچھ کام نہیں۔ اس کا انسداد اور انتظام انگریز لوگ خود کریں گے میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں سب مجھے ستانے کیوں آئے میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمہاری امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمہیں نوکر رکھوں گا میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھ سے کسی طرح کی توقع استعانت کی نہ رکھو۔ تم جانو یہ لوگ جانیں۔ ہاں ایک امر میرے اختیار میں ہے۔ البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمہارے درمیان میں ہو کر انگریزوں سے تمہاری صفائی کرا سکتا ہوں۔ تم ابھی یہیں ٹھیرے رہو۔ میں نے صاحب رزیڈنٹ کو بلوایا ہے۔ وہ میرے پاس آنے والے ہیں۔ پہلے میں اُن سے دریافت کرلوں۔ اُن کی زبانی مجھے حال فتنہ و فساد کا معلوم ہو جائے گا اور خدا چاہے تو میں اس فساد کو رفع دفع کرا دوں گا۔ غرض یہ گفتگو ہنوز ناتمام تھی کہ سائمن فریزر صاحب رزیڈنٹ بہمراہی قلعہ دار صاحب داخل دیوان خاص ہو گئے۔ خواجہ سرا نے جاکر آداب کورنش ادا کیا۔ اندر سے حکم آیا کہ دونوں صاحب محل میں حاضر ہوں۔ اس وقت صاحب رزیڈنٹ بہادر قلعہ دار صاحب اور احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں ہر چہار اشخاص محل شاہی میں داخل ہوئے

حضور پُر نور:-

کیوں تھی یہ کیا فتنہ و فساد برپا ہو گیا۔ یہ مذہب کا جھگڑا کیسا اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ مقدمہ دین آئین کا ہے۔ تعصب مذہب بہت بُری شئے ہے۔ اس میں اکثر سلطنتیں معرض زوال میں آگئی ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کا کشت و خون ہو گیا ہے۔ اس فتنہ کا جلد انسداد ہونا واجب ہے

سر چشمہ شاید گرفتن بہ میل
چو پُر شد نشاید گذشتن بہ پیل

مبادا فتنہ و فساد ہندوستان میں عالمگیر ہو جائے اور لاکھوں آدمیوں کا کشت و خون ظہور میں آئے اور انتظام مالی و ملکی میں فرق واقع ہو جہاں تک ممکن ہو نرمی اور آشتی سے کام نکالنا چاہیئے۔ یہ لوگ جاہل ہیں۔ فرقہ سپاہ جاہل ہوتا ہے۔ ان سے تھپک کر کام نکالنا چاہیئے اور ان کو ہدایت کرو کہ یہ لوگ اس فتنہ و فساد سے باز آئیں۔ جائے تعجب ہے کہ تم کو اس معاملہ کی اب تک خبر نہیں۔

صاحب رزیڈنٹ بہادر:۔ حضور غلام کے پاس شب کے گیارہ بجے سوار نے چٹھی لاکر دی۔ مجھ کو چونکہ اس وقت نیند کا غلبہ تھا میں سمجھا کوئی معمولی چٹھی ہے اس وقت کچھ خیال نہ کیا پاکٹ میں ڈال کر سو رہا صبح کو جب حضوری سوار میرے پاس پہونچے اس وقت میں نے چٹھی پڑھی تو حال معلوم ہوا۔ حضور کچھ اندیشہ نہ فرمائیں خاطر جمع رکھیں۔ بلوائی لوگ

لہ فرقہ وارانہ مسائل اور مذہبی معاملات میں بہادر شاہ کے خیالات اس زمانہ میں خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ محمد میاں۔

کیا کرسکتا ہے حضور کے اقبال سے سب رفع دفع ہو جائیں گے۔ غلام
ابھی جا کر ان کو فہمائش کرتا ہے۔ خدا چاہے تو فساد بڑھنے نہ پائے گا۔

اس کے بعد ظہیر صاحب نے صاحب رزیڈنٹ کی تقریر نقل کی ہے۔ تقریر میں خوب سبز باغ دکھائے اور اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ فوج کے نمائندوں کا جواب یہ تھا۔

آپ نے جن احسانات کا ذکر کیا درست ہے۔ مگر ہماری قربانیوں کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہم نے ہر موقع پر ہر حکم کی تعمیل کی۔ یہاں تک کہ برما سے افغانستان تک پورا ملک فتح کر کے آپ کے حوالہ کر دیا مگر ہماری ان تمام قربانیوں کا بدلہ ہمیں یہ ملا کہ سرکار ہمارے دین کے درپے ہے۔ چربی لگے کارتوس دانتوں سے کٹوانے کا اصرار ہے تو

"ہم لوگ اپنے دین آبائی کو چھوڑ کر کس طرح بیدین ہو جائیں
ہم کو مرجانا قبول ہے مگر دین سے بے دین نہ ہوں گے، اب
سرکار جو چاہے ہمارا کرے ہم سب مرنے کو تیار ہیں اور
ہم اپنے کو اسی وقت مُردہ تصور کر چکے ہیں جب ہم نے
جیلخانہ کو توڑ کر افسروں کو برآمد کیا تھا۔"

ریزیڈنٹ نے اس تقریر کا بھی جواب دیا اور یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک گولی فریزر صاحب کے پاس سے سنناتی ہوئی گذری۔ حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے جب دیکھا کہ معاملہ قابو سے باہر ہے تو فریزر کو پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے آئے۔ فریزر یہاں سے روانہ ہوا کہ فوج کو آمادہ کر کے باغیوں کا مقابلہ کرے۔ بادشاہ نے جاتے ہوئے کہا کہ شاہی باڈی گارڈ کے کچھ سپاہیوں کو ساتھ لے لیجئے تو فریزر نے بے پروائی سے مسکرا کر جواب دیا۔ کہ

"دربار کی سوبھا کے آدمی ہیں۔ ڈیوڑھی کی حفاظت کو رہنے دیجئے۔
حضور کا اقبال کافی ہے۔ حضور خاطر جمع رکھیں۔"

مگر فریزر کا یہ استغنا کام نہ آیا وہ باہر نکلا تو قتل کر دیا گیا اور پھر ڈگلس قلعدار (قلعہ سے متعلق پولیس کا افسر) بھی قتل کر دیا گیا۔ هچن سن کلکٹر بھی یہاں پہونچ گیا تھا وہ بھی ختم کر دیا گیا۔ کپتان ڈگلس کے یہاں ایک پادری مہمان تھا۔ اس کی لڑکی بھی سا نھ تھی اسی افراتفری میں یہ بھی قتل کر دیئے گئے۔

اعلان آزادی۔ ہمکنار نشانات ناکامی

قلعہ میں جواب وسوال ہو چکے۔ تو فوج نے شہر کا رُخ کیا۔ ایک طرف دریا گنج میں (جہاں انگریزوں کے بنگلے تھے) انگریزوں کا قتل عام کر کے کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ دوسری جانب قلعہ سے مغربی سمت میں چاندنی چوک کے قریب سرکاری بینک تھا اس پر یورش کر کے روپیہ لوٹا۔ کاغذ پھاڑے۔ رجسٹر پھینکے۔ عمارت کو آگ لگادی۔ منیجر بینک۔ بیرس فورڈ بیوی بچّوں کو لیکر بینک کی چھت پر چڑھ گیا۔ مگر بے سود۔ باغیوں کے ہاتھوں جب بینک کی عمارت ڈھیر ہوئی تو یہ خاندان بھی ختم ہو گیا۔

دہلی گزٹ۔ پریس اور گرجا مظلوم فوج کو انگریزی نسل ہی سے نہیں بلکہ انگریز کی ہر چیز سے نفرت تھی۔ جوش غضب انگریز کے ایک ایک نشان کو ختم کر دینا چاہ رہا تھا۔ چنانچہ کشمیری گیٹ کے قریب دہلی گزٹ کا پریس تھا اس پر حملہ کر کے پریس کو تباہ کیا گیا۔ عیسائی کمپوزیٹر جو یہاں کام کر رہے تھے اُن کو ختم کیا۔ پھر گرجا گھر

۵۱ داستان غدر صہ ۵۴

کا رُخ کیا - اوپر کی صلیب کو گولیوں سے چھلنی کر دیا - گھنٹے کی رسیاں کاٹ دیں - دیواروں پر جو صلیبیں لگی ہوئی تھیں اُن سب کو اُکھاڑ پھینکا -

میگزین قلعہ کی شمالی دیوار سے تقریباً تین فرلانگ کے فاصلہ پر کشمیری گیٹ کی جانب جہاں آجکل شہر دہلی کا بڑا ڈاکخانہ ہے[51] بہت بڑا میگزین تھا جس میں ہر قسم کا سامان جنگ بافراط موجود[52] تھا - انقلابی فوج کے ہوشمند افسروں نے بادشاہ کو راضی کرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کرنا چاہا کہ بادشاہ کے ذریعہ میگزین حاصل کر لیں چنانچہ شاہی شقہ میگزین کے افسر کے نام بھجوا دیا گیا کہ میگزین حوالہ کر دیا جائے فوج کا ایک دستہ بھی بھیجدیا گیا کہ میگزین کو اپنی تحویل میں لے لے

اُدھر انگریزی افسروں کی قومی غیرت پوری طرح بیدار تھی۔ لفٹنٹ ولوبی[53] (Willoughby) میگزین کا افسر اعلیٰ اور اس کے ساتھی انگریز افسروں نے طے کر لیا کہ اپنی جانیں قربان کر دیں گے مگر میگزین پر قبضہ نہیں دیں گے

چنانچہ میگزین کے دروازے بند کر کے اندر کی طرف ریت کے بورے چُن دیئے گئے زمین پر گوکھرو اور بارود کی سُرنگیں بچھا دی گئیں - دیواروں پر توپیں نصب کر دی گئیں اس طرح حفاظت اور بچاؤ کا انتظام مکمّل کر لیا گیا - انگریزوں کو یقین تھا کہ باغی فوج کے پیچھے پیچھے میرٹھ سے انگریزی فوج بھی آ رہی ہوگی - اُس وقت تک حفاظت کے لئے

---

۵۱ بڑے ڈاکخانہ کے سامنے سڑک کی دوسری جانب ایک پھاٹک اب تک قائم ہے جو محکمہ آثار قدیمہ کی زیر نگرانی ہے - اس پر ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس میں میگزین کے اُڑنے اور اُس کے افسروں کا تذکرہ ہے - ۵۲ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو اس میگزین میں نو لاکھ کارتوس - دس ہزار رائفلیں موجود تھیں - بہت سی توپیں تھیں - توپ گاڑیاں تھیں اور سینکڑوں من بارود تھی -

۵۳ ان کی تعداد آٹھ تھی اور بشمول ولوبی نو -

یہ انتظام کافی تھا۔

لیکن میرٹھ کی فوج کا پہونچنا تو درکنار کئی ہفتہ بعد تک اُس کو دہلی کا رُخ کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ ادھر خود میگزین کے ہندوستانی ساتھیوں سے برگشتگی کے آثار محسوس ہونے لگے۔ اب صرف انگریز افسر ہم خیال تھے جن کی تعداد لِشبول و لوبی نو تھی نہایت نازک صورت جس نے انگریز افسران کو فوری کارروائی پر مجبور کر دیا' یہ پیش آگئی کہ انقلابی فوج کے افسروں نے بادشاہ سے درخواست کر کے وہ بڑی سیڑھیاں حاصل کر لیں جن سے اونچی دیوار پر چڑھا جا سکتا تھا۔ اب انگریز افسروں کے لئے آخری اقدام کے بغیر چارہ نہیں تھا یعنی میگزین کو تباہ کر دینا۔ جس کے ساتھ خود اُن کی ہلاکت بھی یقینی تھی چنانچہ فتیلہ روشن کر دیا گیا۔ فوراً ہی شرارے بلند ہوئے۔ ایسا دھماکہ ہوا گویا سینکڑوں توپیں ساتھ چلی ہیں۔ پُورا شہر دہل گیا۔ میگزین کی دیواروں کے ٹکڑے اور پتھر کئی فرلانگ تک دور تک جا کر پڑے۔ حملہ آور سپاہی اور پبلک جو آس پاس جمع تھی وہ سب ختم ہو گئی مرنے والوں کی تعداد سات سو تک بیان کی جاتی ہے۔ نو انگریز جنھوں نے جان پر کھیل کر یہ اقدام کیا تھا اُن میں سے پانچ ختم ہو گئے اور چار بچکر نکل گئے۔ ولوبی۔ بھی انہیں بچنے والوں میں سے تھا جس کا صرف چہرہ جھلس کر سیاہ ہو گیا تھا۔ مگر غازی آباد کے دیہات میں یہ پہچان لیا گیا اور وہ ہیں ختم کر دیا گیا۔

اگرچہ میگزین کے اُڑنے سے اتنا نقصان نہیں پہونچا جتنا پہونچانا مقصود تھا کیونکہ ہزاروں کی تعداد میں بندوقیں اور رائفلیں۔ اسی طرح اور سامان بہت کافی باقی رہ گیا جو انقلابی فوجیوں کے کام آیا۔ تاہم انگریزوں کی قومی غیرت ایثار اور رفاقت کی ایک مثال سامنے آگئی جس سے انگریز کی کامیابی کے آثار نمایاں تھے۔

اور ظاہر ہے ہزاروں من بارود کا ذخیرہ جو بھک سے اُڑ گیا وہ انقلابی فوجوں کے لئے نشان ناکامی تھا۔

لفٹنٹ ولوبی افسر اسلحہ خانہ کی طرح ٹیلیگرام آفس[۱] کے دو نوجوان سنگلروں کا کارنامہ بھی وہ کارنامہ ہے جس نے انگریزوں کی شکست کو فتح سے بدلا' یہ دو نوجوان ولیم برنڈس[۲] اور جے۔ ڈبلیو بلینگٹن تھے جنھوں نے حاضر جوابی سے کام لے کر ٹھیک وقت پر پنجاب گورنمنٹ کو بیدار کر دیا جس کے نتیجہ میں نہ صرف پنجاب (انگریزوں کے حق میں)

---

[۱] کلکتہ دروازہ سے نصف میل کے فاصلہ پر جو دتی کا قدیم ڈاک بنگلہ تھا وہیں صدر تار گھر تھا اس کے سامنے ایک ستون ان عہدہ داران محکمہ تار کی یادگار میں کھڑا کیا گیا ہے جو اس ہنگامہ میں کام آئے اور جس سے ان کی تیز ان کم عمر سنگلروں کی یاد تازہ کرنی مقصود ہے جو اس معرکۂ عظیم میں جب کہ موت سامنے کھڑی تھی ذرا بھی ہراساں نہیں ہوئے اور انبالہ کو وہ مشہور تار برقی دوڑایا جس کی بدولت ملک پنجاب بال بال بچ گیا۔ تختی کے سامنے جو عبارت درج ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کے ہولناک دن دو نوجوان سنگلر ولیم برنڈس اور جے۔ ڈبلیو۔ بلینگٹن جب تک اُن کو چلے جانے کا حکم نہیں دیا گیا اس وقت تک اپنی ڈیوٹی پر مستعد رہے۔ دہلی میں جو کچھ گذر رہا تھا اُس کی اطلاع انبالہ کو دینے سے انھوں نے پنجاب گورنمنٹ کی انمول خدمت گذاری کی بمطابق رابرٹ منٹگمری کے الفاظ میں۔ اس تار برقی نے ہندوستان کو بچا لیا۔ یہ تار دتی سے انبالہ پہونچا۔ اسی دن دوپہر کے بعد اس کی نقل میجر جنرل سر ایچ برنارڈ سی۔ بی کمانڈنگ افسر ضلع سرہند کو بھیج دی۔ پھر وہاں سے متعلقہ افسران کو اطلاع دی گئی جس کے نتیجہ میں فوراً تیاری کرلی گئی جس کا تذکرہ پنجاب کے سلسلہ میں آئے گا۔ انشاء اللہ۔ بہادر شاہ ظفر صفحہ ۲۱۔

[۲] یہ اور اُن کے ساتھی جنھوں نے غیر معمولی جرأت اور دلیری سے کام لیا' پورے ہنگامہ میں محفوظ رہے اور پھر ڈبلیو برانڈس یکم ستمبر ۱۸۹۶ء کو پنشن لے کر سبکدوش ہوا اور ڈبلیو بلینگٹن کو اگرچہ باغیوں نے قید کر لیا تھا مگر وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور رڑکی میں ۲۴ مارچ ۱۸۶۷ء کو انتقال کیا۔

محفوظ رہا۔ بلکہ دہلی کا فیصلہ بھی انگریزوں ہی کے حق میں ہوا
تار کا ترجمہ یہ ہے۔

"۱۱ مئی ۱۸۵۷ء۔ ہمیں دفتر سے چلا جانا چاہیئے۔ میرٹھ کے سپاہی سارے بنگلے جلا رہے ہیں۔ یہ لوگ آج صبح یہاں پہونچے۔ ہم جا رہے ہیں۔ آج گھنٹی نہ بجانا۔ ہمارا خیال ہے کہ مسٹر سی ٹاڈ مر گئے۔ کیونکہ آج صبح باہر گئے تھے اور اب تک واپس نہیں آئے۔ ہم نے سنا ہے تو یورپین قتل کر دیئے گئے۔ اچھا رخصت۔

دہلی چھاؤنی دہلی چھاؤنی میں کوئی انگریزی رجمنٹ نہیں تھی۔ ہندوستانی فوجیں تھیں جن کے افسر انگریز تھے۔

ان فوجوں کی تیوریاں صبح ہی سے بدلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ جب اُن کو انقلابی فوجوں پر حملہ کے لئے کہا گیا تو اس کی تعمیل نہیں کی گئی۔ تاہم انھوں نے بغاوت کا اعلان نہیں کیا تھا۔ لیکن میگزین کے دھماکہ سے ہندوستانی فوجوں کو یقین ہو گیا کہ یہ انگریزوں نے انقلابی فوجوں کو توپ دم کیا ہے۔ اس یقین کے ساتھ اُنھوں نے کُھلے طور پر بغاوت کا اعلان کر دیا انگریز افسران کو قتل کرنے لگے۔ کچھ مارے گئے۔ کچھ نے بھاگ کر جان بچائی۔ کسی نے انبالہ کرنال کا راستہ لیا۔ کوئی میرٹھ پہونچا اور کوئی راستہ ہی میں ختم کر دیا گیا

انگریزوں کا قتل مذکورہ بالا اہم واقعات کے علاوہ آج کے دن انقلابی فوجیوں کا تمام دن انگریزوں کو تلاش کر کر کے قتل کرنے میں صرف ہوا کچھ انگریز اور اُن کے اہل و عیال گرفتار کر کے پہلے حرم شاہی کے ایک حصہ میں قید کئے گئے اور چند روز بعد سر بھرے فوجیوں نے اُن کو بھی گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔

علمار کے فتوے بھی سُنائے گئے۔ سنجیدہ رہنماؤں نے بھی سمجھایا کہ عورتوں اور بچوں کا قتل جائز نہیں مگر جنون انتقام کچھ اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ نہ فتوے کارگر ہوئے نہ نصیحتیں۔

یہ دارفتگی ناکامی کا نامبارک نشان تھی جو پہلے ہی قدم پر ظاہر ہوئی

لوہاروں کا کارخانہ اور جیلخانہ

جب میگزین پر یورش ہورہی تھی تو اس کے قریب لوہار خانہ پر بھی حملہ کیا گیا۔ یہاں ہلکے اوزار بنتے تھے اس کو لوٹا گیا جیلخانہ غالباً اسی جگہ تھا جہاں اب ہے۔ یعنی دہلی دروازہ سے باہر۔ اس پر حملہ کرکے قیدیوں کو رہا کرادیا گیا اور جو خزانہ یہاں تھا وہ بادشاہ کے پاس پہونچا دیا گیا۔

اعلان آزادی

شمس العلمار ذکار اللہ خاں کے الفاظ میں قصہ مختصر۔ جب دیوان خاص میں تلنگوں[۱] کا ہجوم ہوا تو بادشاہ دیوان خاص میں کرسی پر آکر بیٹھا اور اُن سے پوچھا کیا مانگتے ہو۔

تلنگوں نے عرض کی۔ ہماری زندگی کا مدار حضور کی پرورش پر ہے۔ ہماری پرورش کیجئے نہیں تو ہم آپ اپنے لئے انتظام کرلیں گے۔ پھر اُنھوں نے بادشاہ کے قدموں پر سر جھکاکر نذریں دیں اور عرض کیا جہاں پناہ ہمارے سر پہ ہاتھ رکھیں۔ بادشاہ نے اُن کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ اُنھوں نے بادشاہ کو دعائیں دیں۔

---

[۱] یہ لفظ پہلی مرتبہ فرخ سیر کے زمانہ میں دہلی کی زبان میں داخل ہوا۔ اس سے تلنگی زبان بولنے والے مرہٹے مراد ہوتے تھے۔ پھر اس زمانہ میں مشرقی یوپی اور بہار کے رہنے والے فوجیوں کو بھی تلنگا ہی کہا گیا۔ بس ۱۸۵۷ء کے واقعات میں تلنگوں سے بہار اور مشرقی یوپی کے سپاہی مراد ہوتے تھے۔

سلامی | جب رات کو سب باغی سپاہ قلعہ میں جمع ہوگئی تو انھوں نے اپنے توپ خانہ سے ۲۱ توپیں سر کیں۔[1]

زندہ دلان دہلی نے انقلابی فوجوں کا استقبال کس طرح کیا۔

۱۱ مئی کو دہلی میں پہونچنے کے بعد

جب سوار جاتے تھے تو وہ دین دین پکارتے جاتے تھے اس لئے اُن کے ساتھ مسلمانوں کی بھیڑ ہو جاتی تھی دھرماتما ہندو بھی اُن کو اولوں اور بتاسوں کا شربت لیٹوں میں پلاتے جاتے تھے۔

سارے شہر میں ہڑتال تھی۔ ایک سناٹے کا عالم تھا اس سے ڈرتے تھے کہ دیکھئے شہر سے انگریز کیا معاوضہ لیں گے ....

باغی سپاہی شہر کے مالک ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ چھاؤنی میں جتنی پلٹنیں ہیں اُن میں سے ایک سپاہی بھی ایسا نہیں ہے کہ انگریزوں کی حمایت کے لئے اپنی بندوق کا گھوڑا چڑھائیگا۔ یا تلوار چلائے یا توپ کو پلیتہ لگائے۔[2]

دہلی میں قتل و غارت۔ اس تاریخ کی صبح ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ تینوں ہندوستانی رجمنٹیں اور توپخانہ جو دہلی کی چھاؤنی میں تھا وہ میرٹھ

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۲۶۱ [2] ماخوذ از تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۲۶۱

کے سواروں سے اُن کے پہونچنے سے پہلے مل گیا تھا میگزین جس میں
اسباب جنگ بہت موجود تھے وہ بادشاہ کے اختیار میں آگیا تھا
اور شہر کے ڈیڑھ لاکھ باشندے فرنگیوں کے مرد و عورت بچوں کے قتل
عام کرنے کے لئے اور اُن کے مال و اسباب کو لوٹنے کے واسطے مدد کرنے
کو تیار تھے۔[۱]

حضرت راقم الدولہ ظہیر دہلوی اپنا مشاہدہ بیان فرماتے ہیں۔

جس وقت چھوٹے دریبے کے پھاٹک سے باہر انقلابیوں کو دیکھا کہ تین
چار سوار کرتے پہنے دھوتیاں باندھے ہوئے سر سے ایک چھوٹا سا
انگوچھا لپٹا ہوا۔ فقط ایک کرچ داب میں اور وہ پیپل کے درخت کے
سائے میں نہر کی دیوار سے لگے کھڑے ہیں اور ہندو لوگ ان کی سربراہی
کر رہے ہیں۔ کوئی پوریاں لے آیا ہے کوئی مٹھائی کا دونا لئے آتا ہے
کوئی لوٹا پیتل کا پانی سے بھر کر لا دیتا ہے۔ الخ[۲]

اس کے بعد مسلمانوں میں جہاد کے ولولے تھے۔ علماء کرام مسجدوں میں جہاد کے وعظ کہتے
تھے۔ لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ

"ہندوؤں کے پنڈت مسلمانوں کے مولویوں کی نسبت انگریزوں سے
عداوت کرنے میں کچھ کم نہ تھے۔ کئی دفعہ اُنھوں نے پتروں کو دیکھ بھال کر
لڑنے کی شبھ مہورت نکال کے تلنگوں کو بتلائے اور اُن کو یقین دلایا کہ
اُن میں اگر لڑنے جاؤ گے تو فتح پاؤ گے چنانچہ وہ ان مہورتوں میں جاکر

---

[۱] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۴۰۵ [۲] داستان غدر ص۶۵

خوب لڑے۔

پنڈتوں نے تلنگوں کو یقین دلایا تھا کہ انگریزی راج پھر نہیں ہوگا ان ہی کا راج ہوگا۔

ایک عجیب تماشا چاندنی چوک اور بازاروں میں یہ دیکھنے میں آتا تھا کہ پنڈتوں کے ہاتھ میں پوتھیاں ہیں اور وہ ہندوؤں کو دھرم شاستروں کے حکم سنا رہے ہیں کہ انگریز ملکشوں سے لڑنا چاہیئے۔ جب لڑائیوں میں سے تلنگوں کی لاشیں چارپائیوں پر اُن کے سامنے آتیں تو وہ ہندوؤں کو اُپدیش دیتے کہ ان سرگباشیوں کی طرح سرگ میں چلے جاؤ جن کے لئے نہ ارتھی کی ضرورت ہے نہ کریا کرم کی۔ مگر ہندوؤں پر ان اُپدیشوں کا ایسا اثر نہیں ہوتا تھا جیسا مسلمانوں پر جہاد کے وعظ کا ہوتا تھا۔

ل۱ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۷۶

دہلی شہر کی حالت اور اس کا نظم و نسق
زمانۂ جنگ میں
بادشاہ کی طرف سے شاہی اختیارات منتقل کرنے کا اعلان

چند سال پہلے تک ہندوستان پر برطانیہ کا "یونین جیک" لہرا رہا تھا جس کی تہذیب اور تنظیم کے نام پر نہ صرف بہادر شاہ اور اُس کے دور کو بلکہ تمام ہندوستانی حکومتوں، اُن کے نظم و نسق اور آئین و دستور کو دوسروں نے تو بدنام کیا ہی تھا اپنوں نے بھی بدنام کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔

خاص اسی مہذب اور متمدن برطانیہ کے دور کی بات ہے کہ امن و امان کے زمانہ میں جب فوجوں کے تبادلہ کا وقت آتا تھا اور کوئی فوج ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی کو کوچ (مارچ) کرتی تھی تو شاہراہ کے قریب جو قصبے اور گاؤں آباد ہوتے تھے، فوجی مارچ کی خبر اُن کے باشندوں کے لیے ایک مصیبت اور پریشانی کا اعلامیہ ہوا کرتی تھی۔ اگر مصیبت کی انتہا یہ ہوتی کہ بیل گاڑیاں اور چھکڑے بیگار میں لیے جاتے، منگے تب بھی پریشانی خاص خاص افراد تک محدود رہتی۔ لیکن اصل مصیبت تو یہ ہوتی تھی کہ اس علاقے کے باشندوں کی کوئی چیز یہاں تک عورتوں کی عصمت بھی محفوظ نہیں رہتی تھی دیہات کی عورتیں گھروں کے دروازے بند رکھتی تھیں۔ کیونکہ آگ لینے کے بہانہ سے فوجی گھروں کے اندر چولھوں تک پہونچ جاتے تھے۔ پھر اُن سے مقابلہ وہی کر سکتا تھا جس میں پوری فوج سے مقابلہ کی طاقت ہو۔[1]

[1] قصبہ دیوبند جو راقم الحروف کا وطن مالوف ہے۔ شاہراہ اعظم کے کنارے پر (باقی ص ۱۱۶ پر)

پھر جب فوجوں کی نقل و حرکت ٹرینوں کے ذریعہ ہونے لگی تو زمانہ جنگ میں ہم نے خود دیکھا ہے کہ فوجی اسپیشل کی آمد کی خبر خونچوں اور اسٹال والوں پر کس طرح ہیبت طاری کر دیا کرتی تھی۔ اسٹالیں بند کر دی جاتی تھیں اور خونچے والے اپنے خونچے لیکر اسٹیشن سے باہر چلے جاتے تھے اور اگر بدقسمتی سے کوئی خونچہ یا اسٹال کسی پلیٹ فارم پر فوج والوں کی نظر پڑ جاتا تو وہ پورا کا پورا اُن کی بے تکلفی کی نذر ہو جاتا تھا۔

اس تمہید کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جن فوجوں نے علم بغاوت بلند کیا تھا اُن کی تربیت انگریزی سامراج کے اسی ماحول میں ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ یورپ کی وہ بڑی لڑائیاں جو اسی نصف صدی میں یعنی (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء رو ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) میں ہو چکی ہیں، ان لڑائیوں نے یہ مشاہدے بھی پیش کئے کہ جنگ کے وقت شریف اور امن پسند باشندے تو دہشت زدہ ہو کر اپنی جانوں کی فکر میں ہوتے تھے اور آوارہ گرد اوباش لوگوں کی بہار آ جاتی تھی۔ وہ لوٹ مار سے لیکر عصمت دری تک من مانی کاروائیاں کرتے تھے۔ اس بنا پر رضا کار (والنٹیر) بھرتی کر کے اُن کو ٹریننگ دی جاتی تھی اور اسپیشل اختیارات دیدیئے جاتے تھے کہ ایسے موقع پر وہ شہریوں کی حفاظت کر سکیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد زمانہ جنگ میں شہر دہلی کے حالات کا جائزہ لیجئے

(بقیہ حاشیہ ص۱۱۵) ہے۔ قصبے کے باشندے اس آزمائش میں بارہا مبتلا ہوئے ہیں۔ ہمارا محلہ پیرزادگان فرودگاہ (ریتی کنڈ اور جنگل شاہ عباس) سے تقریباً چار فرلانگ ہے۔ احقر نے مصیبت کی یہ داستانیں اپنے بزرگوں سے سنی ہیں۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جب میرٹھ کی فوجیں عوام کے ہجوم کے ساتھ بھوکی پیاسی
تھکی ماندی شہر میں داخل ہوئیں اور انگریزوں کو قتل کرنا، انگریزی سامانوں
کو تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا تو کسی قدر افراتفری لازمی تھی۔ اس پریشان
حالی میں نزاکت اس لئے بھی پیدا ہوگئی کہ سامان رسد کہیں بھی فراہم نہیں تھا،
اس نازک صورتِ حال کے باوجود جو کچھ ہوا اس کے متعلق راقم الدولہ ظہیر
دہلوی کی چشم دید شہادت ملاحظہ فرمایئے۔

راقم الدولہ کا انقلابی فوج سے کوئی تعلق نہیں وہ اس کے سخت مخالف تھے
اسی بنا پر اُن کے بیانات نہ صرف طنز آمیز بلکہ انقلابیوں کے حق میں سخت توہین آمیز ہیں مگر ایک حقیقت نگار
واقعہ کو طنز اور توہین کا جامہ تو پہنا سکتا ہے اصل واقعہ کی واقعیت کا انکار نہیں کر سکتا۔
ظہیر صاحب فرماتے ہیں:

۱۱ مئی کو جب میرٹھ کے فوجی آئے تو دو چار دستوں کو تو بادشاہی گھوڑوں
کے دانہ کے چنے دیدیئے گئے۔ ان کے بعد جب مزید فوجی آئے جن کی
تعداد کئی ہزار تھی تو بادشاہ کی طرف سے امن کا اعلان ہوا اور ہر جگہ چوکی
پہرے بٹھا دیئے گئے کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ حلوائیوں اور بقالوں کو بلوا کر دوکانیں
کھلوائی گئیں۔ پھر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے خود (راقم الدولہ ظہیر دہلوی
صاحب) اور اُن کے ساتھ صوفی اشرف بیگ صاحب رسالدار کو بھیجا
کہ جا کر دیکھیں کہ اعلان امن پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے۔ یہ لال قلعہ سے
مسجد فتحپوری تک گئے۔ ہر جگہ امن پایا۔ خال خال دوکانیں بھی کھلی ہوئی
تھیں۔ ہر دوکان پر پہرہ تھا کہ کوئی نقصان نہ پہونچا سکے[1]

---

[1] داستان غدر صا ۶۲

(انقلاب کے ساتھ ساتھ اس طرح امن ایسے دور میں کہ نہ تیز رفتار پولیس ویگنیں ہیں، نہ ریڈیو اور لاسلکی۔ انقلاب پسندوں کے لئے درس عبرت ہے)

یہ گیارہ مئی کی فوری کارروائی تھی۔ اگلے روز کے متعلق ظہیر دہلوی صاحب کے ہمنوا جن کو برطانوی سامراج نے شمس العلماء کے خطاب سے بھی نوازا ہے اُن کی شہادت ملاحظہ فرمائیے

"تلنگے[1] (انقلابی فوجی) ابھی شہر و گلی کوچوں سے نابلد تھے۔ چوڑے چوڑے بڑے بڑے بازاروں کو جانتے تھے۔ ان میں ان کو اپنی ضرورت کی چیزیں ملتی نہ تھیں۔ انھوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ حضور سوار ہو کر بازار کی دوکانیں کھلوا دیں۔ بادشاہ نے اُن کی درخواست کے موافق سواری کا حکم دیا[2]۔

بادشاہ عماری میں ہاتھی پر سوار تھا۔ اُس کے نقیب احکام سناتے جاتے تھے........

غدر سے پہلے ڈھنڈورا اس طرح پیٹا جاتا تھا کہ نقارہ پر چوٹ لگا کے ڈھنڈورچی اوّل یہ کہتا کہ

خلقت خدا کی۔ ملک بادشاہ کا۔ حکم سرکار کمپنی بہادر کا۔ پھر آگے وہ بات کہتا تھا جس کا مشتہر کرنا منظور ہوتا تھا۔ ۱۲ مئی کو ڈھنڈورے پر سے "حکم سرکار کمپنی بہادر کا" اُڑ گیا اس کی جگہ بادشاہ کا حکم ہو گیا[3]"

---

[1] شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب نے شاہی جلوس کا نقشہ بھی بنایا ہے جو سراسر مضحکہ خیز اور توہین آمیز ہے۔ ہم اس کو نقل کرنا بیکار سمجھتے ہیں جو صاحب ضرورت سمجھیں ص۶۶۲ تاریخ عروج عہد انگلشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ [2] تاریخ عروج عہد انگلشیہ ص۶۶۲۔

اس اعلان کے بعد اس روز تو یہی ہوا کہ

ادھر کوئی دوکان کھلی اور ادھر بند ہوئی۔[1]

لیکن ۱۲ر کے بعد کاروبار بدستور جاری ہوگیا۔ بلکہ کچھ اضافہ کے ساتھ چنانچہ خود شمس العلما کی شہادت ہے۔

"جس تاریخ سپاہ آئی۔ دوسرے روز قلعہ میں اکابر شہر کی ایک مجلس مقرر ہوئی کہ شہر کا اور سپاہ کی رسد رسانی کا انتظام کیا جائے۔ اگر رسد کا بندوبست نہیں ہوگا تو وہ سارے شہر کو لوٹ کر کھا جائیں گے۔ اس کام کا اہتمام، محبوب علی خاں اور میر نواب پسر سید تفضل حسین وکیل کو سپرد ہوا۔

شہر میں انگریزوں کی طرف سے رسد آنے کا انسداد تو کسی جانب سے نہیں ہوا تھا چاروں طرف سے صبح سے شام تک سب طرح کی اجناس ضرورت کے موافق آتی تھیں۔ بیلوں، گدھوں، ٹٹوؤں، خچروں، گاڑیوں، چھکڑوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ شہر میں جابجا یہ اجناس بکتی تھیں کسی کا مقدور نہیں تھا کہ ان پر ہاتھ ڈال سکے۔ تلنگے رسد کے قواعد سے خوب واقف تھے جنس کی قیمت نرخ کے موافق خوب دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ہم قیمت کم دیں گے تو رسد بند ہوجائیگی پھر ہم بھوکے مریں گے۔ غرض تلنگوں نے خود اپنی رسد کا انتظام ایسا رکھا کہ ان کو بادشاہی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی کوئی جنس کم ہوجاتی تھی تو وہ بادشاہ سے اس کو بہم پہنچانے کی درخواست کرتے وہ ان کو منگا دیتا۔ ایک دفعہ افیون کا توڑا ہوگیا تھا تو بادشاہ

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۹۶۲

نے راؤ تلارام کو لکھا کہ دو من افیون بھیج دے۔ قیمت دیدی جائے گی
جب وہ میدان جنگ میں جاتے تو بادشاہی اہل کار حلوائیوں سے مٹھائی
وغیرہ بنوا کر چھکڑوں میں اُن کے پاس بھیجتے۔

کہیں ایسا اتفاق دو تین ہی دفعہ ہوا ہوگا کہ شہر میں سپاہ کو یا
اہل شہر کو ضروری چیزوں کے میسر ہونے میں تکلیف ہوئی ہو[51]

سونے چاندی کی خرید و فروخت

عام اجناس کے علاوہ سونے چاندی اور زیورات کی خرید و فروخت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

[52] بعض تلنگوں کے پاس روپیہ اتنا تھا کہ وہ اُس کو اٹھا نہیں سکتے تھے
وہ شہر میں سونا خریدتے پھرتے تھے۔ اُن کی خریداری کے سبب سے
سونے کا بھاؤ سولہ سترہ روپے سے ستائیس اٹھائیس روپے تولہ ہو گیا

---

[51] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۷۹۔ اس موقع پر ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۵ء کا زمانہ بھی یاد رکھنا چاہیئے جب گیہوں کا آٹا تولوں کے حساب سے ملتا تھا عجیب و غریب بات یہ تھی کہ تانبہ کے پیسے اور ایک دو آنے کے سکے نا پید ہو گئے تھے۔ کہیں ڈاک خانہ کے ٹکٹ اور کہیں اور طرح کی پرچیوں سے لوگ اپنا کام نکالتے تھے۔ محمد میاں۔ [52] شمس العلماء تحریر فرماتے ہیں۔ دہلی میں جو سپاہ داخل ہوتی تھی وہ روپیہ کے اعتبار سے بڑی مختلف الحال تھی۔ اُن میں بعض پلٹنیں تھیں کہ خزانہ اُن کو چھ ہاتھ لگا تھا اس میں سے اول تو انھوں نے اپنا دامن خاطر خواہ پُر کیا جو بچا وہ بادشاہ کے حوالہ کیا۔ جیسا کہ علی گڈھ۔ بلند شہر کی رجمنٹوں نے کیا بعض نے خزانہ اپنے قبضہ میں رکھا جیسا کہ بریلی بریگیڈ نے۔ بعض کو خزانہ ہاتھ ہی نہیں لگا تھا۔ جیسا کہ میرٹھ کی سپاہ کو۔ پس بعض تلنگوں کے پاس روپیہ اتنا تھا کہ وہ اس کو اٹھا نہیں سکتے تھے مگر مفلس بہت تھے۔ الخ ص ۶۶۷ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ۔

دلال بازاروں اور گلی کوچوں میں اُن کو لئے پھرتے تھے اور اُن کو ہندوؤں[1]
کے گھروں سے سونے کے زیور مول لے دیتے تھے مسلمانوں نے اکثر
اپنی ضرورتوں کے سبب سے اور ہندوؤں نے اپنی طمع کے سبب سے سونے
کے زیور اُن کے ہاتھ بہت بیچ ڈالے۔

سناروں کی دوکانوں پر تلنگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی وہ اُن سے
کڑے ہاتھوں کے اور رانوں کے بنواتے تھے بعض تلنگوں کی رانوں پر
پانچ پانچ ایسے کڑے چڑھے ہوئے تھے[2]

نظم ونسق بہرحال ۱۲ مئی کو شاہی جلوس اور اعلان کے بعد رفتہ رفتہ کاروباری
حالت معمول پر آگئی۔ بلکہ نفع اندوزوں کے لئے اچھے مواقع مہیا ہو گئے
یہاں تک کہ سونے کی قیمت دوگنی سے بھی زیادہ کردی گئی۔[3]
غذائی نظم ونسق کے لئے ۱۲ مئی ہی کو قلعہ میں اکابر شہر کی ایک مجلس مقرر ہوگئی تھی
میر محبوب علی خاں اور میر نواب پسر سید تفضل حسین وکیل کو فراہمی رسد کی خدمت سپرد ہوئی
یعنی فوڈ منسٹر بنائے گئے۔ اُن کی کارگذاری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس غیر معمولی
ہنگامی دور میں دہلی کی پوری آبادی جو پہلے سے تقریباً دوگنی ہو گئی تھی غذائی بحران سے

---

[1] مثل مشہور ہے۔ اپنی عقل دوسرے کا مال زیادہ معلوم ہوا کرتا ہے بظاہر یہی مثل یہاں بھی
صادق ہے۔ ورنہ کم از کم اس زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی حالت میں فرق نہیں تھا۔ ہاں
اس کے بعد جب انگریزی تسلط دوبارہ بحال ہوا تو ہندو چونکہ اصل مجرم نہیں قرار دیئے گئے اُن کے
ساتھ رعایتیں ہوئیں اس وقت بیشک ہندوؤں کو نیلام وغیرہ خریدنے کے مواقع میسر آئے
جس سے اُن کی مالی حیثیت بلند ہوگئی۔ [2] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ۔ [3] ایضاً ص ۹۷۹
[4] ایضاً ص ۹۸۰

محفوظ رہی اور کبھی بھی کسی کو خوراک کے سلسلہ میں پریشانی نہیں ہوئی۔[۱]

عدلیہ | قانونی کاموں کے لئے:۔

"بہادر شاہ نے یہ حکم جاری کیا کہ سلطنت اور عدالت کے کاموں میں شاہزادے اور سپاہ مداخلت نہ کرے۔ عدالت کے سارے کام صرف مفتی اور صدر الصدور کیا کریں۔ نہ سپاہ نہ مال کے حکام اس عدالت میں دخل دیں۔[۲]

مولوی فیض احمد مولانا فیض احمد صاحب) آگرہ میں صدر بورڈ کا سررشتہ دار تھا اور باغی ہو کر دہلی میں آیا تھا۔ اس کو اور مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کو عدالت کا کام سپرد ہوا۔[۳]

پولیس | شہر میں پہلا کوتوال معین الدین حسن خاں مقرر ہوا جو نواب قدرت اللہ خاں کا بیٹا تھا۔[۴]

---

[۱] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۸۹۔ ایضاً ص۶۸۷ شمس العلماء نے اس کے بعد یہ بھی فرمایا ہے کہ مگر بادشاہ کے اس حکم کی کبھی تعمیل نہیں ہوئی۔ شاہزادے سپاہ کے زور سے ہمیشہ ان کاموں میں دخل دیتے تھے۔ مگر اگلے اقتباس سے اس کی تردید ہو جاتی ہے کیونکہ مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کی مداخلت سپاہ کے زور سے نہیں ہوئی تھی بلکہ اس لئے کہ عدلیہ ان کے سپرد تھا۔ دیکھو ص۶۸۸ کا اقتباس [۳] ایضاً ص۶۸۸ [۴] ایضاً ص۶۸۸۔ گلی قاسم جان۔ جہاں آجکل جمعیۃ علماء ہند کا دفتر ہے اور اس کی مسجد آپ کے والد نواب قاسم جان کے نام سے منسوب ہے۔ اس مسجد کے متولی آجکل محترم خسرو مرزا صاحب ہیں۔ اس خاندان کی آمد اور سلسلہ نسب کے متعلق نواب خسرو مرزا صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ سہراب جنگ نواب قاسم جان معہ اپنے دو برادران حقیقی عارف خاں و عالم بیگ خاں بخارا سے ۱۷۰۰ء میں ہندوستان آئے بخارا میں محلہ پشنہ شکن میں ان کا (باقی صفحہ ۱۲۳ پر)

یعنی پہلے یہ تھانہ پہاڑ گنج میں انچارج تھانیدار تھے۔ ۱۱ رمئی کے انقلاب کے بعد جیسے ہی بادشاہ کی طرف سے تقررات شروع ہوئے یہ جست لگا کر آگے بڑھے اور شہر کے کوتوال (یعنی سپرنٹنڈنٹ پولیس) ہو گئے۔

یہ دل سے انگریزوں کے حامی تھے۔ ۱۱ رمئی کے قیامت خیز ہنگامہ میں سر تھیوفلس مٹکاف مجسٹریٹ دہلی کو تھانہ میں چھپا کر انقلابی گروہ سے بچاتا۔ پھر رقم خرچ کر کے معتبر آدمی کے ذریعہ اُن کو جھجر پہونچانا انہیں کا کام تھا[1] اس وقت کوتوال کا عہدہ سنبھالنے کا مقصد بھی یہ تھا کہ :۔

مکان تھا اور وزیر بخارا کے عہدہ پر متمکن تھے۔ خواجہ عبدالرحمٰن لیسوی کی اولاد میں تھے اور خواجہ عبدالرحمٰن لیسوی خواجہ احمد لیسوی کے سلسلہ میں تھے یعنی اُن کی اولاد میں تھے۔ یہ خواجہ احمد لیسوی خواجہ یوسف ہمدانی کے خلیفہ تھے۔ اُن کا وصال ۵۶۲ھ میں ہوا۔

نواب قاسم خاں کے نام پر گلی قاسم جان آباد ہے اور مسجد موجودہ ۱۱۹۳ھ میں تعمیر کرائی
عارف خاں کی اولاد میں نواب احمد بخش خاں پہلے فرماں روا ریاست فیروزپور جھرکہ اور لوہارو ہوئے

نواب قاسم خاں

- نواب محمد بخش خاں
- نواب فیض محمد خاں
- نواب قدرت اللہ بیگ خاں
  - معین الدین حسن خاں عرف بڑے مرزا۔ لاولد
  - محمد حسن خاں
    - مرزا محمد حسین خاں عرف منصور شاہ لاولد
  - امتیاز زمانی بیگم عرف حاجی بیگم صاحبہ پرنانی راقم خسرو اہلیہ نواب ضیاء الدین احمد خاں
    - نیر رخشاں

[1] ۱۸۵۷ء صفحہ ۱۶۳ و ۱۷۱

"انگریزوں کی خیر خواہی اس بدخواہی کے لباس میں کروں۔"[۹۱]

اُن کی اس دورویہ پالیسی کے ساتھ امن کا قائم رہنا ناممکن تھا۔ چنانچہ چند روز بعد اُن کو الگ کر دیا گیا۔[۹۲]

اس کے بعد خواجہ وحید الدین خاں کی سفارش سے قاضی فیض اللہ کوتوال شہر اور قاضی عبدالرحیم نائب کوتوال مقرر ہوئے۔ قاضی نے استعفیٰ دیدیا۔[۹۳] اس کے بعد سید مبارک شاہ رام پور کا باشندہ کوتوال مقرر ہوا اور آخر غدر تک وہی کوتوال رہا۔ نجف گڈھ۔ مہرولی۔ شاہدرہ پہاڑ گنج۔ بدرپور اور شہر میں جہاں جہاں پہلے تھانے تھے تھانہ دار مقرر ہوئے۔ ان کاموں میں سوار شاہزادوں کے بخت خاں بھی دخیل تھا۔ بادشاہ نے تھانہ داروں اور کوتوال کے نام حکم جاری کر دیا تھا کہ وہ بخت خاں کے حکم کی تعمیل کیا کریں۔[۹۴]

سکّہ

قدرت اللہ خاں سو سواروں کو لیکر اودھ کی کل سپاہ کی عرضی لایا۔ بخت خاں نے بادشاہ سے ملاقات کرائی۔ قدرت اللہ نے بادشاہ کی خدمت میں مندرجہ ذیل چیزیں نذر کیں۔

(۱) نئے سکّے کی اشرفیاں جن پر نقش تھا

بزر زد سکّہ نصرت طراز
سراج الدین بہادر شاہ غازی

---

۹۱ ؛ ۹۲ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۸۸ ۹۳ لیکن استعفا دینے پر بھی پھانسی سے نہیں بچے۔ ۹۴ ایضاً ص۶۸۸

(۲) دو گھوڑے (۳) دو ہاتھی (۴) کلاہ جس میں بیش بہا موتی ٹکے ہوئے تھے

(۵) ایک جوڑی بازو بند الماس پیوند[1]

بادشاہ کی طرف سے شاہی اختیارات منتقل کرنے کا اعلان۔ پارلیمنٹری حکومت اور کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی

منشی جیون لال جی۔ بادشاہ سے زیادہ انگریزوں کے وفادار ہیں مگر اس کارروائی کی شہادت دینے پر مجبور ہیں کہ ۴ ستمبر ۱۸۵۷ء جے پور۔ جودھ پور۔ بیکانیر اور الور کے راجگان کے نام بادشاہ کی دستخطی چٹھیاں بھیجی گئیں جس میں لکھا تھا کہ مجھے فوج کی ضرورت ہے اور یہ کہ میں انگریزوں کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن چونکہ اس وقت میرے امور سلطنت کا انتظام کرنے کے لئے قابل اعتماد آدمی موجود نہیں ہیں اس لئے میں ریاستوں کی ایک مجلس بنا دینی چاہتا ہوں اور اگر وہ ریاستیں جن کے نام خط بھیجے جا رہے ہیں اس غرض کے لئے مجلس بنالیں گی تو میں نہایت خوشی سے اپنے شاہی اختیارات اُن کے ہاتھ میں دیدوں گا۔[2]

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ۔

[2] غدر کی صبح و شام ص ۲۴۲ و ص ۲۴۳

لوٹ مار کیوں ہوئی اور کتنی ہوئی

قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی نازیبا حرکتیں اور بادشاہ کے تاثرات

شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ خاں جو ایک طرف شکایت کرتے ہیں۔

"جس وقت سے کہ انگریزی عملداری شہر سے کافور ہوئی تو چوبیس گھنٹہ کے اندر شہر میں کوئی گناہ اور پاپ ایسا نہ تھا جو انسان کر سکتا تھا وہ نہ ہوا ہو[۵۱]"

لوٹ مار کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

غرض کوئی مہینہ خالی نہیں گیا کہ دو چار آدمیوں کی کم بختی اس طرح تلنگوں کے ہاتھ نہ آئی ہو[۵۲]

لیکن یہی شمس العلماء یہ بھی اعتراف کرتے ہیں۔

لوٹ اور شیہ میں قتل کے واقعات دس بارہ سے زیادہ نہیں ہوئے[۵۳]۔

غرض جیسی اس لوٹ مار کی شہر میں شہرت ہوئی تھی اُس کا سواں حصہ بھی صحیح نہیں ہوتا تھا۔ صدہا محلے تھے جن میں ایک کوڑی کا مال بھی نہیں لُٹا۔[۵۴]

۱۱ مئی کو کھاری باؤلی۔ چاندنی چوک۔ دریبہ اور چاوڑی میں دوکانیں بند ہوگئیں اگرچہ اُن میں سے بہت تھوڑی لُٹیں تھیں[۵۵]۔

---

۵۱ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۶۱ ۵۲ ایضاً ص۶۶۵ ۵۳ ایضاً ص۶۶۵ اوسط وہی ہے یعنی دو چار آدمی ایک ماہ میں۔ ۵۴ ایضاً ص۶۶۶ ۵۵ ایضاً۔

تھوڑی سی مقدار بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔

دریبہ میں صراف کی ایک دوکان لُٹی تھی۔ اور صرافوں نے اپنا زر و زیور اور روپیہ گھر چلتا کر دیا تھا اور اپنی دوکانوں کے آگے واویلا مچانے کھڑے ہو گئے تھے ہائے ہم لُٹ گئے۔ اگرچہ اور گلی کوچوں میں اس لوٹ کا کچھ بھی اثر نہیں تھا۔ سب سودا سلف بدستور بک رہا تھا۔ اگر کوئی بدمعاش گلی کوچے کے دوکاندار سے ٹرپیش کرتا تو اہل محلہ اس کو درست کر دیتے اپنے پرانے دوکانداروں پر ذرا ظلم و ستم نہ ہونے دیتے۔ [۱]

مختصر یہ کہ چار ماہ کی غیر مطمئن سلطنت میں جس کو ایک لمحہ کا اطمینان بھی نصیب نہ ہوا جو بیرونی دشمنوں اور اندرونی جاسوسوں سے گھری ہوئی تھی لوٹ مار اور قتل کے واقعات دو چار ماہانہ کے اوسط سے کل دس بارہ ہوئے۔ افسوس شمس العلماء کو یہ خبر نہیں تھی کہ جس حکومت کی عظمت سے ان کا قلم سرنگوں ہے اسی کے دورِ سطوت جبروت میں ایسا زمانہ بھی آنے والا ہے کہ امن و امان کے زمانہ میں بھی قتل و خون اور لوٹ مار کا تناسب اس سے کہیں زیادہ ہوگا۔ بہرحال ان واقعات کی کل تعداد دس بارہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ واقعات کیوں ہوتے تھے۔ اس سوال کا جواب شمس العلماءؔ کی زبان سے ہی اچھا معلوم ہوگا۔

آپ صرف یہ غور فرمائیے کہ جن وجوہات کی بنا پر تلنگے آپے سے باہر ہو کر یہ اقدام کرتے تھے آیا وہ ایسے ہی اشتعال انگیز نہیں کہ ایک غیور باحمیت جماعت کو ان پر مشتعل ہونا چاہیئے تھا یا کسی ذاتی غرض اور مالی منفعت کے سبب سے وہ یہ حرکتیں کرتے تھے۔

---

[۱] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ صـ۶۶۱

اگر یہ وجوہات فی الحقیقت اشتعال انگیز ہوں تو پھر جرم اور الزام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ قانونی اعدام یعنی کارروائی کے بجائے قانون اپنے ہاتھ میں لیکر بے آئین حرکت کی۔

شمس العلماء فرماتے ہیں۔ "تلنگے کئی سبب سے لوگوں کو قتل کرتے تھے۔ مثلاً"

(۱) جن کو کرشان جانتے تھے۔ اس سلسلہ میں دو واقعے پیش آئے۔ ایک سیٹھ بدری چند ڈپٹی انسپکٹر مدارس دہلی جو بڑا کٹر سرادگی ہندو تھا مگر وہ انگریزی کپڑے پہنتا تھا اس لئے لوگ اس کو کرشان جانتے تھے اس کو ایسا زخمی کیا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔

دوسرے کشمیری پنڈت منشی موہن لال جس نے مسلمان ہو کر اپنا نام آغا حسن جان رکھا تھا۔ وہ کوٹ پتلون پہنتا تھا اس کو بھی کرشان سمجھ کر قتل کرنا چاہا مگر میاں نظام الدین آڑے آگئے انھوں نے صفائی دی جس سے اس کی جان بچ گئی۔ پھر اس کو ولی داد خاں اپنے ساتھ مالاگڈھ لے گئے۔ وہاں سے وہ میرٹھ چلا گیا۔

(۲) جس کے متعلق یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے یہاں کوئی انگریز عورت یا بچہ پوشیدہ ہے۔

اس الزام میں ۱۱ رمئی کو قاضی پنو کو قتل کر دیا گیا اور لطف یہ ہے کہ خود قاضی صاحب کے بھانجوں نے کسی عداوت کی بناء پر قاضی کے خلاف تلنگوں کو مشتعل کیا تھا۔

شمس العلماء بھی فرماتے ہیں کہ اس الزام میں قاضی صاحب کے علاوہ اور کوئی قتل نہیں ہوا۔

۱۲ رمئی کو نواب حامد علی خاں کو اسی الزام میں گرفتار کر کے قلعہ میں لائے وہاں محبوب علی خاں وزیر نے سفارش کر کے ان کو رہا کرایا۔ نواب صاحب کا مکان لٹنے کی بہت شہرت ہوئی مگر اس شہرت کی حقیقت یہ تھی کہ بہت معمولی سا سامان خرد برد ہوا تھا۔

۱۴ مئی کو نرائن داس نہر والے کے متعلق بھی شبہ ہوا۔ یہ شبہ صحیح ثابت ہوا دو انگریز اس کے مکان سے گرفتار کئے گئے جو قتل کر دیئے گئے اور لالہ کا مکان لوٹ لیا۔ اس طرح شہر میں اور دو چار غریب آدمیوں کے گھروں کی کمبختی آئی۔ ایک درزی کے گھر میں سے تین فرنگی نکالے۔

(۳) جن کے متعلق شبہ ہوتا تھا کہ وہ انگریزوں سے سازش رکھتے ہیں اُن سے خط و کتابت ہے یا اُن کے لئے سامان رسد فراہم کرتے ہیں۔

بد نصیبی ملاحظہ کیجیے جن پر جاسوسی کا شبہ سب سے زیادہ تھا وہی سب سے زیادہ بادشاہ کے مقرب تھے یعنی حکیم احسن اللہ خاں صاحب۔ زینت محل (بادشاہ بیگم) اور بہادر شاہ کا وزیر محبوب علی خاں، چنانچہ بار بار اس کے چرچے ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں صاحب کو دو تین مرتبہ گھیر بھی لیا۔ مگر ان سب کو وہ تقرب حاصل تھا کہ اُن کے حیلے بہانے بھی حقیقت سمجھے جاتے اور اُن کا جھوٹ بھی سچ مان لیا جاتا تھا۔ ان میں صرف حکیم احسن اللہ خاں صاحب کو کچھ مالی نقصان اُٹھانا پڑا کہ وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر تھے اور پیچھے مکان لُٹ گیا۔ ان کے علاوہ اور کسی کو نقصان نہیں اُٹھانا پڑا۔ حالانکہ انقلابی فوج کا اس عرصہ میں بہت نقصان ہوا یعنی چوڑی والان[۲] میں جو اسلحہ کا کارخانہ اور میگزین تھا وہ اُڑا دیا گیا۔ تلنگوں کو یقین تھا کہ حکیم احسن اللہ خاں نے آگ لگوائی ہے[۳] اسی اشتعال میں یہ حملہ آور ہوئے تھے۔

مان سنگھ اور تراب علی کے متعلق شبہ بالکل صحیح تھا۔ اُن کو ایک مرتبہ گرفتار کر کے قلعہ میں پہونچا دیا گیا۔ مگر قلعہ کے قریب خود شاہزادے ان دشمنوں کے دوست تھے

---

[۱] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ۔ صفحہ ۶۶۴ [۲] شمرو کی بیگم کے مکان میں [۳] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ صفحہ ۶۶۴

انھوں نے بلا تکلف اُن کی دوستی نمایاں کر کے اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود لی اور ان کو رہا کرا دیا۔

مہاراجہ پٹیالہ انگریزوں کا سب سے بڑا دوست اور اگر انگریزوں میں جذبۂ احسانمندی ہوتا تو اس وقت سب سے بڑا محسن تھا۔ اُس کا چچا راجہ اجیت سنگھ دہلی میں رہتا تھا ایسے شخص کو نظر بند کر دینا اور حراست میں رکھنا حزم و احتیاط اور دستور و آئین کا تقاضا ہے "تلنگوں نے اُن کو گرفتار کیا تو بالکل بجا اور درست تھا مگر وہ مغل بادشاہ جن کا عقیدہ یہ تھا۔ " درعفو لذتیست کہ در انتقام نیست"

اس گرفتاری کو کب گوارا کر سکتا تھا۔ اس کو رہا کرادیا کہ یہ تو مہاراجہ پٹیالہ سے ناراض ہیں اور عرصہ سے یہاں رہتے ہیں۔

اسی طرح رائے رام سرن داس ڈپٹی کلکٹر کے رشتہ دار دہلی میں رہتے تھے اُن پر بھی جاسوسی کا الزام تھا۔ اُن پر بھی فوجیوں نے یورش کی اور سامان و اسباب لوٹ لیا غالباً جنرل بخت خاں کے بعد اس پالیسی میں شدت آئی۔ چنانچہ چند آدمی جاسوسی کے الزام میں قتل کئے گئے۔ مثلاً بلدیو سنگھ جو شہر میں کوڑیا پل پر رہتا تھا اُس کا بھائی لچھمن سنگھ علی پور میں تھانہ دار تھا۔ انگریزوں کا ساتھی تھا۔ بلدیو سنگھ کو دو مرتبہ جاسوسی کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ پہلی دفعہ چھوڑ دیا گیا مگر دوسری مرتبہ معافی نہیں دی گئی بلکہ گولی مار کر اُس کی لاش کوتوالی کے سامنے ٹانگ دی گئی۔

پیارے لال مدرس تحصیل مظفر نگر دہلی میں رخصت پر آیا ہوا تھا وہ اسی الزام میں گرفتار رہا اور توپ سے اُڑا دیا گیا۔

(۴۱) جن کے متعلق رسد یا سامان جنگ پہونچانے کا شبہ ہوتا تھا۔ کشمیری اور

موری دروازہ کے کچھ نان بائی پہاڑی پر ڈبل روٹی پہونچایا کرتے تھے وہ اسی جُرم میں قتل کیے گئے۔

حکیم احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں وزیر اس الزام سے بھی نہیں بچے۔ ایک مرتبہ اناج کے چھکڑوں میں گولے اور بارود برآمد ہوئی اس کا الزام بھی ان ہی دونوں پر لگایا گیا۔ مگر انھوں نے حلف اٹھائے اور شبہ سے پاک ہو گئے

(۵) جن کے متعلق توڑ پھوڑ اور انقلابی فوج کے سامان کو نقصان پہونچانے کا الزام ہوتا جیساکہ چوڑی والان کے میگزین کو تباہ کرنا جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے ایسے ہی ایک مرتبہ سلیم گڈھ کی توپوں میں اینٹیں اور پتھر بھرے ہوئے نکلے۔ دوسری مرتبہ ان میں میخیں ٹھکی ہوئی نکلیں ان سب کا الزام ان ہی دو بڑوں پر لگایا گیا یا حکیم احسن اللہ خاں مشیر خاص بہادر شاہ و محبوب علی خاں وزیر۔ مگر اُن کو قسمیں کھانی خوب آتی تھیں۔ قسمیں کھا کر جان بچالی۔ لطف یہ ہے کہ محبوب علی خاں لب گور تھا۔ استسقا کا مریض تھا چنانچہ اسی اثنا میں اُس کا انتقال ہو گیا۔ مگر آخری وقت میں بھی وہ ایسا کردار اختیار نہ کر سکا جو شک و شبہ سے بالا ہوتا۔ باقی رہے حکیم احسن اللہ خاں صاحب تو اُن کی انگریز دوستی آج ضرب المثل ہے۔

مختصر یہ کہ وہ تمام اسباب اور وجوہات جن کی بنا پر لوٹ مار یا قتل کے واقعات پیش آتے تھے وہ بلاشبہ سخت سے سخت اقدام کے مستحق تھے۔ البتہ خرابی صرف یہ تھی کہ اس سے پیشتر کہ فوجی عدالت میں معاملہ پیش ہو کر قانونی طور پر سزا کا فیصلہ ہو۔ تلنگے اور دوسرے فوجی قانون کو خود اپنے ہاتھ میں لیکر مجرموں کو سزا دے دیا کرتے تھے۔ ایسے ہنگامی حالات میں جو اس وقت درپیش تھے ممکن ہے تلنگوں کو معذور قرار دیا جائے اور کہہ دیا

جائے کہ شدتِ اشتعال میں یہ لوگ بے قابو ہو جاتے تھے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ فوجیوں کا شدتِ اشتعال میں بے قابو ہو جانا خود ایک کمزوری ہے۔

بادشاہ کے تاثرات

اب بہادر شاہ کا ایک طویل خط ملاحظہ فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیے۔ یہ خط مرزا مغل کے نام ہے۔ اس میں بہادر شاہ نے بدنظمی اور ہنگامہ آرائی کا شکوہ کیا ہے۔ جس زمانہ میں انگریزوں کے نام کی تسبیح پڑھی جاتی تھی اور برطانوی اقتدار کو سایۂ رحمت بتایا جاتا تھا تو ہندوستانی فوجوں کی جبر و تعدی اور ہندوستانیوں کی نااہلیت کے لئے سب سے بڑی دستاویز کے طور پر یہ خط پیش کیا جاتا تھا۔

مگر جبکہ مذکورہ بالا واقعات میں اس خط کا پس منظر آپ کے سامنے آچکا ہے تو خود آپ کی انصاف پسندی کا فیصلہ یہ ہوگا کہ یہ خط ہندوستانیوں کی نااہلیت کے بجائے اُن کی امن پسندی۔ باہمی محبت و رواداری اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کا بین ثبوت ہے اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ اہل وطن کی عافیت اور راحت و آرام کے بارے میں مغل بادشاہ کا احساس کس درجہ نازک ہے کہ اس کو وہ خلفشار بھی برداشت نہیں جو ان حالات کا لازمی تقاضا تھا۔ رعایا کی معمولی تکلیف بھی اس کے دل کا درد اور اس کی روح کے لئے سوز و گداز ہے۔ جس سے وہ یہاں تک بے چین اور مضطرب ہو کر چاہتا ہے کہ اقتدار کے اس جامۂ زریں کو اُتار پھینکے اور شاہی کے بجائے گدائی اختیار کر لے۔ یہ مخلوق جو برائے نام رعایا تھی اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کے سامنے مذہب کا سوال قطعاً نہیں۔ وہ ہندو اور مسلمان ہر ایک کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ دونوں کو یکساں درجہ دیتا ہے۔

اس کا عقیدہ یہ ہے کہ بادشاہ اور رعایا کا تعلق محبت، دوستی اور خیر خواہی کا تعلق ہو وہ جبر و تعدی اور خلفشار کو اپنی بادشاہی کی کسرِ شان سمجھتا ہے اور جب اس پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے کہ یہ خط ہنگامۂ انقلاب شروع ہونے سے صرف دس روز بعد کا ہے[۱] تو یہ خط اُن تمام منظم اور باضابطہ حکومتوں کے لئے سبق بن جاتا ہے جو ہفتے اور مہینے نہیں بلکہ پانچ سات سال گذر چکنے پر بھی عوام کے جذبات پر خاطر خواہ کنٹرول نہ کر سکیں۔

مرزا مغل کے نام بادشاہ نے یہ حکم لکھا ہے کہ :۔

"ہمارے فرزند کو معلوم ہو کہ جب سپاہ پیدل اور سوار اول ہی میرے پاس آئے ہیں تو میں نے اُن سے خود اپنی زبان سے کہہ دیا تھا کہ میرے پاس خزانہ اور مال اسباب نہیں ہے جس سے میں اُن کی مدد کر سکوں لیکن اگر میری جان اُن کے کام آئے تو اس میں مجھے دریغ نہیں۔ میرے اس کہنے سے وہ سب خوش اور راضی ہو گئے اور اُنھوں نے اقرار کیا کہ وہ میری فرماں برداری و اطاعت میں اپنی جانیں قربان کر دیں گے میں نے اُن کو ہدایت کی کہ اُن کا اوّل کام یہ ہے کہ میگزین اور خزانہ کا انتظام ایسا کریں کہ وہ آئندہ اُن کے اور میرے کام آئے۔ اس کے بعد اُنھوں نے دیوان خاص و دیوان عام و مہتاب باغ میں اور اور مقامات میں جہاں اُن کی خوشی میں آیا قیام کیا۔ میں نے اُن کی جملت و آسائش و آرام کی خاطر سے اپنے نوکروں کو منع کر دیا کہ وہ اس کام میں اُن کے مزاحم نہ ہوں اگرچہ میں نے اُن سے اقرار نہیں کیا تھا مگر روپیہ قرض لیا گیا کہ پیادہ و سوار کو روزینہ دیا جائے میں نے بار بار یہ حکم

---

۱ جیسا کہ اسی مکتوب کے ایک جملہ سے معلوم ہوتا ہے جس پر خط کھینچ دیا گیا ہے۔

دیا کہ وہ شہر میں جبر و تعدی و غارت گری نہ کریں مگر اس سے کچھ کام نہ نکلا آج دس روز گذرے ہیں اب تک وہی خرابیاں چلی جاتی ہیں۔ دیوان خاص نہ دیوان عام میں سے رجمنٹیں چلی گئی ہیں۔ میں نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ شہر سے باہر جا کر مقیم ہوں اور کوئی پیدل اور سوار شہر میں ہتھیار باندھ کر نہ پھرے اور شہر کے باشندوں پر زیادتی نہ کرے مگر ایک رجمنٹ دہلی دروازہ میں اور دوسری اجمیری دروازہ میں اور تیسری لاہوری دروازہ میں شہر کی فصیل کے اندر رہتی ہیں اور بعض بازاروں کو انھوں نے بالکل لوٹ لیا ہے۔ نہ رات کا خیال کریں نہ دن کا۔ وہ لوگوں کے گھروں میں یہ بہانہ بنا کر کہ گھر میں کوئی فرنگی ہے گھس کر لوٹ لیتے ہیں دوکانوں کے قفل توڑتے ہیں کواڑ نکال لیتے ہیں اور ان کے اندر کا اسباب بے حجاب لوٹتے ہیں وہ سواروں کے گھوڑے کھول لے جاتے ہیں باوجودیکہ یہ دستور چلا آتا ہے کہ جو شہر حملے و تیغ زنی سے پہلے لئے جاتے ہیں وہ لوٹ مار سے بری کئے جاتے ہیں مگر اس پر وہ کچھ خیال نہیں کرتے چنگیز خاں و نادرشاہ بھی جو بڑے ظالم مشہور ہیں وہ شہروں کو پناہ و امن دیتے تھے جو اپنے تئیں بغیر مقابلہ کے ان کو سپرد کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ سپاہی میرے ملازموں اور اہل شہر کو ڈراتے و دھمکاتے ہیں۔ باوجودیکہ میں نے پیدلوں کو فراش خانہ کے اور سواروں کو مہتاب باغ خالی کرنے کا بار بار حکم دیا ہے مگر وہ خالی نہیں کرتے۔ یہ وہ مقامات ہیں جن میں نہ نادرشاہ نہ احمد شاہ اور نہ کوئی گورنر جنرل ہند گھوڑے پر سوار ہو کر اب

تک آیا تھا۔ سپاہ نے اول درخواست کی کہ شہزادے ان کے افسر اعلیٰ مقرر ہوں ہم سب ان کی فرمانبرداری واطاعت کریں گے۔ یہ کام اُن کی مرضی کے موافق کیا گیا۔ پھر انھوں نے اس بات پر زور ڈالا کہ اس میں ہمارا اعتبار بڑھ جائے گا اگر ان شہزادوں کو ان کے عہدوں کے خلعت مرحمت ہوں جس سے وہ مستقل ہمارے حاکم معلوم ہوں اور تمام قیدی فرنگی ایک ہی دفعہ میں مارے جائیں۔ یہ کام بھی ان کی مرضی کے موافق کیا گیا اور اسی دن اشتہار عام دیا گیا جن پر مہر شاہی لگی ہوئی تھی کہ شہر میں عدالت کی کچہریاں مقرر کی گئیں لیکن اہل شہر پر اُن کا کچھ اثر نہیں ہوا ان باتوں سے قطع نظر یہ لکھا جاتا ہے کہ جب برٹش گورنمنٹ کا کوئی اعلیٰ افسر قلعہ میں آتا تھا تو وہ دیوان عام کے دروازہ پر گھوڑے سے اُترتا تھا اور پیدل پھرتا تھا۔ لیکن یہ سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے دیوان خاص اور جلو خانے تک آتے ہیں جن کا لباس نامناسب ہوتا ہے سر پر دستار نہیں ہوتی۔ وہ شاہی آداب کو بجا لانا جانتے نہیں۔ دربار میں سپاہ کے افسر اپنے لباس کی پرواہ نہیں کرتے۔ سروں پر ٹوپیاں بجائے پگڑی کے ہوتی ہیں۔ انگریزی عملداری میں اس کے کسی افسر نے ایسا نہیں کیا۔

انھوں نے بے فائدہ میگزین کے کل اسباب کو خرچ کیا اور خزانہ کے روپیہ کو اڑا دیا سب بڑا غل مچا مچا کے اپنا روزینہ اتنے آدمیوں کا جتنے وہ ہیں نہیں مانگتے ہیں۔ پھر دوکانداروں پر طرح طرح کے ظلم

کرتے ہیں۔ اُن سے اجناس لے لیتے ہیں اور قیمت دیتے نہیں اب شہر کے باہر کا یہ حال ہے کہ سپاہی شہر سے باہر انتظام کرنے کے لئے تو جاتے نہیں اس لئے سیکڑوں آدمی مارے جاتے ہیں اور ہزاروں آدمی لوٹے جاتے ہیں۔ ملک کے نظم و نسق کی صورت یہ ہے کہ شاہی سپاہ کافی نہیں کہ وہ کل اضلاع کے بندوبست کو سنبھالے تحصیلدار اور پولیس افسر مقرر نہیں ہو سکتے۔ قلعہ و شہر سے باہر نہ کوئی پیدل نہ کوئی سوار باہر قدم رکھتا ہے کہ انتظام ہو۔ ایسی حالتوں میں رسد کا آنا اور مال گذاری کا وصول ہونا سخت مصیبت ہے۔ ان سب حالتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ شہر اور ملک کے بالکل تباہ و غارت ہونے کے سوا کچھ اور اُمید نہ ہو سکے۔ ان باتوں پر یہ اور طرہ ہے کہ وہ بادشاہی ملازموں پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ ہمارے مخالف ہیں اور اپنا روزینہ اُن سے بڑی حکومت سے گستاخانہ مانگتے ہیں۔ میرے حکم کے موافق میرے بہ ملازم اُن سے بہ لجاجت و خوشامد و بہ منت پیش آتے ہیں مگر اس پر بھی وہ راضی نہیں ہوتے۔ ایسی صورتوں میں کب اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ یہ سپاہی ملک کی صلاح و فلاح چاہتے ہیں یا حکومت شاہی کی اطاعت کے خواستگار ہیں۔

اب ایک اور بات خیال کرنے کی ہے کہ خزانہ میں تو روپیہ نہیں ہے۔ شہر کے مہاجن و سوداگروں میں لٹ جانے اور تباہ ہونے کے سبب سے استطاعت نہیں رہی کہ وہ روپیہ قرض دیں۔ پس کس طرح سے

اُن کو کسی وقت تک روزینہ تقسیم ہو سکتا ہے ! جب اُن کا یہ روزینہ بند ہو جائے اور ملک سے جو رسد آتی تھی بند ہو جائے گی تو کیا حالت ہو گی پھر تماشا یہ ہے کہ سپاہی خود یہ کرتوت کرتے ہیں جس سے ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کا الزام ملازمان شاہی پر لگاتے ہیں اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب سپاہ کا یہ حال ہو تو ظاہر ہے کہ میری پادشاہی بالکل غارت و تباہ ہو جائے گی میری بےکسی و بےچارگی کی نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ میں نے عہد کر لیا ہے کہ اپنی باقی زندگی یادِ الہٰی میں بسر کروں اور بادشاہی کو سلام کروں جس میں سراسر تکالیف و مصائب ہیں اوّل خواجہ صاحب کی درگاہ میں جاؤں اور وہاں سے اپنا انتظام کر کے مکہ چلا جاؤں۔ یہ بھی خیال کرنا چاہیئے کہ جب سپاہ آئی تو پادشاہی ملازموں نے اور اہل شہر نے ان کا کسی طرح کا مقابلہ نہیں کیا نہ کوئی کام دشمنی کا ان کے ساتھ کیا اس لئے اہل شہر مستحق نہیں ہیں کہ اُن کی جان و مال و عزت و مال و اسباب تلف ہوں میں اپنی رعایا کی طرف سے قائم مقام ہو کر سپاہ کو سمجھاتا ہوں کہ پھر کیوں ہم ان کے کام میں شریک ہوں اپنی اولاد کو اُن کے کاموں میں شریک و معاون بنائیں جو ظلم و تعدی و جبر و جور ہو رہا ہے اس کو میں اپنی پادشاہی کی کسرِ شان سمجھتا ہوں کہ بادشاہ ہو کر سپاہ کا رفیق بنوں اور اُن کو قتل و غارت کرنے کو پسند کروں یہ بات سوچنے

کی ہے کہ ایک طرف بادشاہ اور رعیت کے مابین محبت و دوستی و نیک خواہی ہو دوسری طرف سپاہ کے ایسے افعال ہوں کہ وہ اپنے کاموں کو جو دشمن کی سپاہ بھی نہیں کرتی اپنی نیک کرداری جاتے۔ سپاہ کے لئے قابل تعریف یہ ہوشیاری و دانائی کا کام سزاوار تھا کہ وہ رعایا کی پرورش اور محافظت کرتی اور ملازمان شاہی کے ساتھ یگانگی قائم رکھتی ہے اور اپنے تئیں بادشاہ کے دل پسند بنانے کے لیے غور کرتی۔ ہم کو توقع تھی کہ اگر وہ اس طرح عمل کرتی تو امن و امان رہتا۔

میرے فرزند تم پیدل اور سواروں کے افسروں کو بلا کر اُن کے سامنے ان باتوں کو خوب توضیح کے ساتھ بیان کردو اگر وہ حقیقت میں میری سلطنت کی خدمت کرنی چاہتے ہیں تو ایک تحریری اقرار نامہ لکھیں جس کا مسودہ اُن کے پاس بھیجا جائیگا اور ان کی دل جمعی کے لئے ہم بھی ایک تحریری اقرار نامہ لکھدیں گے اُن کو چاہیئے کہ وہ اپنے جبر و تعدی و ظلم و ستم و ناسزا کاموں کو چھوڑیں جو اب تک کر رہے ہیں اور آج ہی پیدل سپاہ اپنے خیموں کو شہر سے باہر لے جائے اگر کوئی سپاہی کسی باشندہ کو قتل کرے گا یا لوٹے گا تو جرم ثابت ہونے کے بعد اس کو مناسب سزا دی جائے گی تاکہ اور آدمیوں کو عبرت ہو اور وہ جانیں کہ ایسے بُرے کاموں کے کرنے سے سزایابی سے وہ بچ نہیں سکتے اور ایک رجمنٹ کو یا کئی رجمنٹوں کو احکام شاہی دیئے جائیں کہ وہ جاکر ملک میں سے فسادوں کو دور کریں اور سینہ زوری کے ساتھ میگزین اور سامان رسد

کی نامعقول درخواستیں نہ کریں یہ رجمنٹیں اس حالت میں مراجعت کرنے کا اختیار رکھتی ہیں جب یہ امر تحقیق ہو جائے کہ انگریزی سپاہ قریب آگئی ہے تو پھر وہ جس ترتیب و انتظام سے لڑنا چاہیں لڑیں - سپاہ اس امر کا فیصلہ کرے کہ کس قدر سپاہ جُداگانہ مختلف مقامات میں رکھی جائے اور اُن کی تقسیم کس طرح ہو۔ شہر میں بھی سپاہ کے رہنے کی ضرورت ہو گی لیکن بالفعل ضرورت نہیں ہے شہر و ملک دونوں یکساں غارت و تباہ ہو رہے ہیں اور سپاہ شہر سے باہر نکل کر ذرا بندوبست نہیں کرتی یہ ایک اور بات اُن کے سامنے اچھی طرح بیان کرو کہ اگر وہ بادشاہ کی ان خواہشوں اور ارادوں کے بر لانے میں خوشی و رضامندی سے سعی نہ کرے گی تو ہم فقیر ہو کر خواجہ صاحب میں جا بیٹھیں گے ہمیں کوئی اس کام کے کرنے میں روکے نہیں وہ شہر و قلعہ و ملک کے خود مالک ہو بیٹھیں۔ قدیم زمانہ کے بادشاہوں میں سے کسی نے، نہ جنگ آزماؤں میں سے جو اُن کے بعد آئے کسی نے اس زمانہ تک اس شخص پر ظلم کیا ہے جس نے اُن سے پناہ مانگی اور امن چاہا ہو - اُنھوں نے اس کو آزادانہ اختیار دیا کہ وہ اپنا طریقہ اختیار کرے ۔ تم سپاہ سے کہو کہ اوپر جو دو باتیں بیان کی گئی ہیں اُن میں سے وہ ایک بات اختیار کر کے اپنی عرضی میں بیان کر دیں اور اس پر افسر اپنے دستخط و مہریں کریں اور وہ عرضی ہمارے پاس بھیجدو۔ تم اس بات کو خفیف معاملہ نہ جانو - پیرانہ سالی و ضعف حالی کے سبب سے ہیں ان افکار

سکا بار نہیں اٹھا سکتا۔ کسی قوم پر سلطنت کرنی اور سپاہ کو قابو میں رکھنا لڑکوں کا کھیل نہیں ہے۔

ذبیحہ گاؤ ذبیحہ گاؤ کے بارے میں مغل بادشاہوں کی پالیسی عموماً نرم رہی ہے مغل بادشاہ اپنے آپ کو ہندو مسلمانوں کا مشترک بادشاہ مانا کرتے تھے۔ مذہبی تقریبات میں بھی اس اشتراک کا لحاظ رکھا کرتے تھے۔ اسی بنا پر بقر عید کو اونٹ کی قربانی سے اس فرض کی ادائیگی ہوا کرتی تھی۔ اس سال یکم اگست کو مسلمانوں کی بقرعید اور ہندوؤں کی دوج تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں اپنے اپنے متبرک دنوں کی برکتوں سے کامیابی مقصد کا فائدہ حاصل کرنا چاہ رہے تھے۔ چنانچہ۔

برہمنوں اور مسلمانوں نے فتح کی دُعائیں مانگیں اور بڑے جوش و خروش سے حملے کئے۔[1]

اس اشتراک و تعاون اور یک جہتی کے موقع پر قربانی گاؤ کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ چنانچہ دُنبوں اور بکریوں کی قربانی کی گئی اور بادشاہ نے حسب معمول اونٹ کی قربانی کی۔[2]

یہ ہے واقعہ جس کو شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب نے متعدد بار مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ہر ایک پیرایہ میں انگریزی کی چشم نیلگوں کا رنگ نمایاں ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

۱؎ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۱۳ ۲؎ ایضاً ص۶۱۳

ایک جگہ ارشاد ہے ۔ (لب ولہجہ ملاحظہ ہو)

بادشاہ عید کو عیدگاہ میں جا کے نماز پڑھتا تھا اور اونٹ کی قربانی کرتا تھا۔ مگر آج اگر وہ وہاں جاتا تو خود اُس کی قربانی ہوتی۔ (کیونکہ یہاں انگریزوں نے ایک مورچہ بنا رکھا تھا۔)

تلنگوں نے مسلمانوں کو گائے کی قربانی نہیں کرنے دی۔ اُن کو سمجھایا کہ گائے کے بجائے فرنگیوں کی قربانی کرو۔ مگر اُن کی قربانی کرنے میں تو اپنی قربانی ہوتی تھی۔ الخ [1]

دوسرے موقع پر ارشاد ہے۔

مولوی صاحب (مولانا فضل حق خیرآبادی) نے بادشاہ کے لیے ایک دستور العمل سلطنت کا لکھا تھا جس کی دفعہ اوّل یہ مشہور ہوئی تھی کہ گائے کہیں بادشاہی عملداری میں ذبح نہ ہو۔ [2]

ایک اور جگہ پوری رنگ آمیزی کے ساتھ تحریر ہے اور اس میں بادشاہ کو مجبور ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے [3]

اوّل حکم بادشاہ کا جو صادر ہوا وہ یہ تھا کہ گائے ذبح نہیں کی جائے گی

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۱۳ [2] ایضاً ص۶۸۶ [3] اگرچہ شمس العلماء بادشاہ کے مخالف ہیں۔ مگر چونکہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد مسلمانوں کے جس طبقہ نے انگریزوں کو اپنی اُمیدوں کا مرکز بنا لیا تھا اُن کی کوشش یہ بھی ہوئی کہ مسلمانوں پر جو بانیٔ انقلاب ہونے کا الزام لگایا گیا ہے اس کو اٹھایا جائے اس لیے وہ بہادر شاہ کو مجبور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال شمس العلماء کی یہ تحریر ہے۔

۹ جولائی کو ڈھنڈورا پٹوایا کہ جو گائے ذبح کرے گا وہ توپ کے مونہہ اڑایا جائے گا۔ بقرعید کو گائے کی قربانی منع کی گئی ہے[۵۱]

اگر بادشاہ کو اختیار ہوتا تو وہ کیوں ہندو راجہ جیسے احکام دیتا مگر تلنگوں کے ہاتھ سے وہ مجبور تھا جو اُس نے اپنی مرضی اور مذہب کے خلاف یہ حکم دیئے ہے[۵۲]

گائے قصاب چار مہینے تک اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے رہے، اگر باہر نکلتے تو تلنگے اُن کو اسی طرح ذبح کرتے تھے جیسے وہ گائے کو ذبح کرتے تھے۔ پانچ چار مسلمان قصائی ہندو قصائیوں کے ہاتھ سے ذبح ہوئے۔

پھر تلنگوں نے دوسرا حکم بادشاہ سے صادر کرایا کہ شہر کے ڈلاؤ اور کوڑا جو بیلوں پر لاد کر شہر سے باہر کھیتوں میں ڈالنے کے لیے جاتا ہے وہ گدھوں پر لد کر جایا کرے۔ بھنگیوں کے ہاتھ جب تک گدھے لگے شہر میں ڈلاؤ کے ڈھیر لگے۔ مگر بہت دن نہیں لگے کہ حلال خوروں نے اپنے بیل بیچکر گدھے مول لے لئے پھر کبھی ایام غدر میں بیلوں کی پیٹھ پر ڈلاو لدا ہوا دیکھنے میں نہیں آیا۔

---

[۵۱] ابھی گذر چکا ہے کہ بقرعید یکم اگست کو ہوئی تھی۔ اب یہ سوال حل طلب ہے کہ جو اعلان ۹ جولائی اور یکم اگست کو ہوا وہ بادشاہ کا سب سے پہلا حکم کس طرح ہو سکتا ہے۔

[۵۲] خود شمس العلماء بار بار فرما چکے ہیں کہ بادشاہ اونٹ کی قربانی آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے کیا کرتا تھا اس کے لئے کس تلنگے نے مجبور کیا تھا؟

مسلمانوں کو یہ بادشاہی احکام ناگوار گذرے اور انھوں نے کہا یہ اسلام کی بادشاہی نہیں یہ تو ہندوؤں کا راج ہے۔ لچے۔ شہدے ذلیل یہ مسلمانوں نے ایک دفعہ اپنا محمدی جھنڈا ہندوؤں پر جہاد کے لئے لگایا۔ دوسری دفعہ مولوی محمد سعید نے جامع مسجد میں یہ جھنڈا کھڑا کیا تو بادشاہ نے اُن سے کہا یہ کس کے لئے ہے انگریز تو شہر میں باقی نہیں تو انھوں نے کہا کہ ہندوؤں کے لئے لگایا گیا ہے۔ بادشاہ نے اُن کو یہ سمجھا کر اس جھنڈے کو اکھڑوا دیا کہ سارے تلنگے[۱] ہندو ہیں اُن سے بیچارے مسلمان کیا لڑیں گے[۲]

---

[۱] اس سے زیادہ کوئی جواب تعجب انگیز نہیں ہو سکتا۔ سارے تلنگے ہندو نہی مگر جو سپاہ یہاں پہونچی ہوئی تھی جس کی تعداد جولائی اور اگست میں تقریباً پچاس ہزار تھی نہ وہ سب کی سب ہندو تھی نہ اُس کے افسر ہندو تھے اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو بادشاہ نے یہ کہا ہوگا ان بیچاروں سے مسلمان کیا لڑیں گے۔ شمس العلماء نے صرف لفظ "بیچارے" میں تقدیم تاخیر کردی۔

بادشاہ کی شخصیت و عظمت

ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات بادشاہ سے ارادت و عقیدت یا مخالفت۔ خاندان تیمور کے متعلق ہندوستانیوں کی رائے

۱۸۵۷ء کی داستان میں بادشاہ کی شخصیت کا عنوان بھی بہت دلچسپ ہے اس عنوان کے ذیل میں متعدد تاریخی حقیقتیں سامنے آسکتی ہیں اس لئے اس موضوع پر بھی سیر حاصل بحث بہت ضروری ہے۔

سرسید اور شمس العلماء ذکاء اللہ خاں کی رائے

سرسید احمد صاحب کو بادشاہ سے سخت اختلاف ہے وہ ان کا تذکرہ کرتے وقت اپنے قابو میں نہیں رہتے زیادہ سے زیادہ رکیک الفاظ استعمال کرتے ہیں بادشاہ کے متعلق اُن کی رائے ملاحظہ فرمایئے۔

دلی کے معزول بادشاہ کا یہ حال تھا کہ اگر اُس سے کہا جاتا کہ پرستان میں جنوں کا بادشاہ آپ کا تابعدار رہے تو وہ اُس کو سچ سمجھتا اور ایک چھوڑ دس فرمان لکھ دیتا۔

دلی کا معزول (بادشاہ) کہا کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اڑ جاتا ہوں اور لوگوں کی اور ملکوں کی خبر لے آتا ہوں اور اس بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا اور درباریوں سے تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے[1]

[1] اسباب بغاوت ہند ص ۲۲

پھر ارشاد ہے۔

دلی کے معزول بادشاہ کی سلطنت کا کوئی بھی آرزو مند نہ تھا۔ اس خاندان کی لغو اور بے ہودہ حرکات نے سب کی آنکھوں میں اُس کی قدر و منزلت گرا دی تھی۔ ہاں بیرونجات کے لوگ جو بادشاہ کے حالات اور حرکات اور اقتدار و اختیار سے واقف نہ تھے۔ بلاشبہ بادشاہ کی بڑی قدر سمجھتے تھے اور اُس کو ہندوستان کا بادشاہ اور آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتظم ہندوستان جانتے تھے۔ اِلّا خاص دلی کے اور اُس کے قرب و جوار کے رہنے والے بادشاہ کی کچھ بھی وقعت خیال میں نہ لاتے تھے۔ باوجود ان سب باتوں کے ہندوستان کے سب آدمیوں کو بادشاہ کے معدوم ہونے سے کچھ بھی رنج نہ تھا۔[1]

اس کے بعد تحریر ہے۔

دلی میں ایک بڑا گروہ مولویوں کا اور اُن کے تابعین کا ایسا تھا کہ وہ مذہب کی رو سے معزول بادشاہ کو دلی کا بہت بڑا اور بدعتی سمجھتے تھے۔ اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ دلی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبض و دخل اور اہتمام ہے ان مسجدوں میں نماز درست نہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جامع مسجد میں بھی نماز نہیں پڑھتے تھے اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے اس معاملہ میں موجود ہیں۔[2]

لہ اسباب بغاوت ہند ص۸ ۔ ۲ہ ایضاً ص۹

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں کا ارشاد ہے۔

دہلی کے مولوی اور اکثر مسلمان خاندان تیمور کو ایسا خوار خبطہ جانتے تھے کہ وہ ناممکن سمجھتے تھے کہ اس خاندان کی بادشاہی ہندوستان میں ہو۔ مگر اس کے ساتھ جاہل مسلمانوں کا یہ یقین تھا کہ انگریزی سلطنت کے بدن میں یہ ایسا پھوڑا نکلا ہے کہ وہ جانبر نہیں ہوگی۔[۵۱]

دوسرے موقع پر تحریر ہے :-

دلی میں وہابی مولویوں کا گروہ بہادر شاہ کو بڑا بدعتی جانتا تھا اور ان مسجدوں میں نماز پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتا تھا جن میں بادشاہ کی طرف سے امام مقرر ہوتا اور اُن کا اہتمام ہوتا۔

بادشاہ کا میلان شیعہ مذہب کی طرف دیکھ کر وہ اس سے زیادہ متنفر ہوتے۔

جملہ معترضہ ان اقتباسات سے نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس زمانہ کی اصطلاح میں وہابی کا مطلب تھا،

"پابندِ شریعت"

خود شمس العلماء شاہزادہ مرزا فخرالدین کے تذکرہ میں فرماتے ہیں۔

"مرزا فخرالدین اپنے مذہب کا بڑا پابند تھا۔ اُس نے اپنا ختنہ[۵۲] کرایا تھا

---

۵۱ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۷۵ ۵۲ اکبر کے زمانہ سے شاہزادوں کی ختنہ بند ہو گئی تھی۔ اکبر کا نیا قانون یہ تھا کہ ساقط الاعضاء بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ ختنہ کرانے سے ایک عضو ساقط ہو جاتا ہے۔ لہذا بادشاہت کے قابل نہیں رہتا (معاذاللہ) (دیکھو شاندار ماضی جلد اول)

شہزادے اس کو متشرع ہونے کی وجہ سے وہابی کہتے تھے۔[۵۱]

بادشاہ کی وجہ سے علماء میں اختلاف

سر سید مرحوم اور شمس العلماء نے بہادر شاہ بادشاہ کے متعلق جو شہادتیں پیش کی ہیں ان کے متعلق مبالغہ آمیزی کا فیصلہ تو کیا جا سکتا ہے مگر اُن کو سرے سے غلط اور بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ اور خاندان تیموریہ کے انہیں اطوار کے سبب سے اس جنگِ آزادی کے بارے میں بھی ایک گونہ اختلاف ہو گیا تھا۔

اوّل تو خود ملوکیت علماء کرام کے لئے ناقابل برداشت تھی پھر ایسے خاندان کی ملوکیت جس کی حالت یہ ہو کہ

"دہلی میں خاندان تیموریہ کی سبک... نااہل حرکتوں کے سبب سے خواص کی نگاہ میں کچھ عزت باقی نہیں رہی تھی"۔[۵۲]

"قلعہ جو بجائے خود شہر تھا سب قسم کی برائیوں کا گھر تھا جس میں عورت مرد ایسی بدکاریاں کرتے تھے کہ وہ اپنے لئے اور اَوروں کے لئے خدا کی طرف سے لعنت کا مستحق کرتے تھے۔ مشرق میں جس قدر برائیاں ہیں وہ سب اس قلعہ میں موجود تھیں جن کا حساب سوا اللہ تعالیٰ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ شہر کے مقدس اور متبرک آدمی کہا کرتے تھے کہ اگر کسی مکان میں قلعہ کی اینٹ بھی لگ جائے تو اُس میں رہنا حرام ہے"۔[۵۳]

جب یہ مقدس اور متبرک آدمی اپنے مکان کی کسی دیوار میں قلعہ کی ایک اینٹ کے روادار بھی نہیں تھے تو وہ اپنے اوپر قلعہ کی حکومت کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ لیکن سیاسی

---

۵۱ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۳۷۰ ۵۲ ایضاً ص۳۹۱ ۵۳ ایضاً ص۳۶۹

نقطۂ نظر سے ایک دوسری قباحت بھی اس موقع پر درپیش تھی جس کی تعبیر یہ ہے کہ:۔

" عوام الناس اس کو (بہادر شاہ کو) اپنا بادشاہ جانتے تھے اور کیوں نہ جانتے جب ہر روز ڈنکہ کی چوٹ، ڈھنڈوروں میں یہ سنتے تھے کہ "خلقت خدا کی اور ملک بادشاہ کا حکم سرکار کمپنی کا" تو بادشاہ سے مراد بہادر شاہ ہی جانتے تھے اُن کا ذہن کب اس پر پہونچتا تھا کہ انگلینڈ میں ہندوستان کا بادشاہ رہتا ہے۔

سارے ہندوستان کے شہروں میں اُس کے نام کا خطبہ، عیدین اور جمعہ کی نمازوں میں پڑھا جاتا تھا۔

جب مجسٹریٹ ضلع ایسے احکام جاری کرتا جس سے کوئی فریق ناراض ہو کر اپنے پیشہ اور کام کی ہڑتال کر ڈالتا تو وہ گروہ۔ جھروکوں میں۔ ریتی میں بادشاہ کے آگے فریادی ہو کر جاتا۔

دھوبیوں۔ بھنگیوں و قصائیوں نے یہی کیا تھا کہ اپنے کاموں کو سب نے بند کر کے بادشاہ سے فریاد کر کے اپنی داد چاہی۔ دلّی میں بہت سے آدمیوں کو قلعہ سے ایسا تعلق تھا کہ جب شاہ دلی کی شان کے خلاف گورنمنٹ انگریزی کی کوئی حرکت دیکھتے تھے تو بہت ناخوش ہوتے تھے سر طامس مٹکاف صاحب کو بادشاہ فرزند ارجمند شُقّوں میں القاب لکھا کرتا تھا۔ جب اُن کے انتقال کے بعد" ہاروے صاحب" ایجنٹ ہو کر دلّی میں آئے تو اُنھوں نے بادشاہ کو لکھ دیا کہ ہم کو آپ کا فرزند بننا منظور نہیں۔

پہلے بادشاہ کی سواری کے جلوس کا یہ ادب کیا جاتا تھا کہ کوئی انگریز جلوس کی قطار کو کاٹ کر اپنی سواری میں نہیں جاتا تھا۔ مگر انگریز اب اس قاعدے کے پابند نہ تھے۔ ایسی باتوں کو دیکھ کر دلّی کے سلمان ناخوش ہوتے تھے کہ اُن کے بادشاہ کی کچھ عزّت باقی نہیں رہی۔[ف۱]

پچاس برس سے دہلی کی لال حویلی کا مالک انگریزوں کے تخمینہ میں ایک "جھوٹی نقل" اور خالی "نمائشی سانگ" باقی تھا لیکن اس جھوٹی نقل اور خالی نمائشی سانگ اور نام نے اپنا زندہ اثر سلاطین اور رعایا ہند۔ پر کبھی نہیں موقوف کیا تھا۔ زمانہ حال تک ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے نام کے سکے چلتے تھے۔ اور ہندوستان کے سلاطین خواہ مسلمان ہوں یا ہندو ہوں اپنے جانشینوں کے لئے بڑے نام شاہی فرمان مانگتے تھے اور اُن کو سرکار کمپنی کے فرمان سے زیادہ باوقعت و مستحکم جانتے تھے گو دہلی کے بادشاہ کا افسانہ ہی باقی تھا۔ مگر یہ افسانہ ع

عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

رعایا کے دلوں میں اور زبانوں پر یہ افسانہ بڑا معزز وظیفہ تھا جس کو وہ جپا کرتی تھی۔[ف۲]

مختصر یہ کہ خاندان تیموریہ اور خود بہادر شاہ ظفر کی جملہ ناکارگیوں اور نااہلیوں کے باوجود عام ہندوستانیوں کو حتیٰ کہ صاحب اقتدار نوابوں اور راجاؤں (سلاطین)

[ف۱] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ صفحہ ۲۹۱ [ف۲] ایضاً صفحہ ۲۶۴

کو اس خاندان سے ایک خاص تعلق تھا جو صرف محبت کی حد تک نہیں بلکہ مذہبی عقیدہ کی حیثیت حاصل کر چکا تھا کیونکہ مسلسل دو سو برس تک (از بابر تا اورنگ زیب عالمگیر) ایک ہی خاندان کی پرشوکت شاہنشاہیت کے سایہ میں کم و بیش دس نسلیں سکون و اطمینان اور خوش حالی کی زندگی گذار چکی تھیں اور اس بنا پر ہر آنے والی نسل کے دل و دماغ پر اس عقیدہ کا رنگ پوری طرح جم چکا تھا کہ ہندوستان میں بادشاہت کا حق صرف مغل خاندان کو ہے وہی مالک ملک ہے اور اسی کو حق پہونچتا ہے کہ کسی کو حکومت و فرماں روائی کی سند عطا کرے اسی عقیدہ کی پختگی کا یہ رعب تھا کہ سو سال بلکہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) سے لیکر آج تک (ڈیڑھ سو سال تک) روز افزوں تنزل، پستی اور لاچارگی کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی کے شاطر و چالاک خداوندان بست و کشاد کو لال حویلی (لال قلعہ) میں یہ نمائشی سانگ باقی رکھنا پڑا تھا۔

بیشک آج (۱۸۵۷ء) سے تقریباً تیس سال پہلے انہیں علماء کی جماعت (جن کو آج وہابی کہا جا رہا تھا) حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی زیر قیادت اس ملوکیت اور شاہنشاہیت سے دامن جھاڑ کر خلافت راشدہ کے نمونہ پر شمال مغربی سرحدی علاقہ میں ایک حکومت قائم کر چکی تھی اور آج بھی انہیں علماء کرام کا ایک دستہ مغل شاہنشاہیت اور برطانوی سامراج دونوں کے برخلاف علم جہاد بلند کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا لیکن جب خود "قلب ہندوستان" میں انقلاب کی شکل پیدا ہو گئی۔ اور کم از کم شمالی ہند کے چپہ چپہ سے اس کی حمایت کے لئے بے نظیر و بے پناہ جذبات اُبلنے لگے۔ گراں قدر قربانیاں پیش کی جانے لگیں۔ اور یہ سرزمین جو ایک مدت سے انگریزی مظالم کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ایک ذرّہ ان سفید فام درندوں کے خون کا پیاسا معلوم ہونے لگا تو

اب قدرتی طور پر یہ سوال ہر ایک کے سامنے تھا کہ انگریزی سامراج بہتر ہے یا مغل بادشاہت۔

خاندانِ تیمور اور مغل بادشاہ کا تعلق عام ہندوستانیوں سے

یہ درست ہے کہ خاندانِ تیمور خواہ خبطہ، لاپرواہ الڑ مزاج ہو گیا تھا۔ بادشاہ مذہبی عقائد میں بہت ڈھیلا، اوہام پرست، آرام طلب اور سادہ لوح تھا۔ لیکن رعایا پروری جو اس خاندان کی فطرت تھی، بہادر شاہ ظفر اس سے بیگانہ نہیں تھا۔ وہ ہندوستانی تھا، ہندو اور مسلمانوں کے مزاج سے واقف۔ ان کی دلچسپیوں میں برابر کا شریک اور تمام بے بسی اور لاچاری کے باوجود غریبوں اور زیردستوں کا ہمدرد۔ اس کی ہمدردیوں کے بہت سے قصے آج تک مشہور ہیں۔ مثلاً

سرکار انگریزی نے گھوسیوں کو حکم فرمایا کہ تم اپنی گائیں بھینسیں لیکر شہر سے نکلو اور بیرون شہر پناہ جاکر آباد ہو۔ تمام شہر میں غلغلہ برپا ہو گیا۔ تمام گھوسی اپنے بال بچوں اور مویشی کو لیکر ریتی[1] میں آپڑے۔ اب یہ حال ہوا کہ ادھر تو مویشی حیران پریشان گھبرائے ہوئے ادھر فریادیوں کے بال بچوں کی گریہ زاری کی یہ پکار۔ یہ حال دیکھتے ہی بادشاہ رعیت پناہ کو کہاں تاب تھی بمجرد سنتے زارنالے اُن غریبوں کے حکم دیا کہ ہمارا ڈیرہ خیمہ بھی ریتی

---

[1] یعنی وہ ریتلا میدان جو دریا جمنا کے کنارے لال قلعہ تک تھا۔ جہاں برسات میں سیلاب کا پانی بھر جاتا تھا۔ یہ میدان اب باقی نہیں رہا کیونکہ دریا جمنا قلعہ سے فاصلہ پر پہونچ گئی ہے اور اس میدان میں کچھ عمارتیں بن گئی ہیں۔ بیلا روڈ اسی میدان میں ہو کر گذرتی ہے اور اسی میدان کے ایک کنارہ پر گاندھی جی کی سمادھی ہے۔

ہیں لب دریا جمن ان کی برابر لگادو۔ جو حال رعیت کا وہ ہمارا شاگرد پیشگان نے بمجرد اصدار حکم بارگاہ سلطانی لیجا کر لب دریا ایستادہ کرئیے یہ خبر صاحب ریزیڈنٹ بہادر کو ہوئی وہ خبر سنتے ہی بادشاہ کی خدمت میں دوڑے ہوئے آئے اور حضور میں عرض کی کہ حضور یہ کیا کرتے ہیں حضور کے ہمراہ تمام رعیت شہر سے نکل کھڑی ہو گی۔

بادشاہ سلامت۔ بھئی جہاں میری رعیت وہاں میں۔ رعیّت میرے بال بچے ہیں۔ میں ان کو کیونکر اپنے سے جُدا کردوں۔ کہیں گوشت سے ناخن بھی جُدا ہوتے ہیں۔ آج تو گھوسیوں کو شہر بدر کرنے کا حکم ہوا ہے۔ کل کو کسی اور قوم کو ہوگا۔ پرسوں کسی اور قوم کے واسطے حکم جاری کیا جائے گا۔ رفتہ رفتہ سب شہر خالی کرالیا جائے گا۔ اگر تم صاحبوں کو شہر خالی کرانا منظور ہے۔ تو صاف مجھ سے کہہ دو۔ میں شہر کی رعیت کو ہمراہ لیکر خواجہ صاحب میں جا بیٹھتا ہوں۔ شہر کا تم کو اختیار ہے جو چاہے وہ حال کرو۔

صاحب ریزیڈنٹ بہادر۔ حضور ہرگز ہرگز ایسا خیال نہ فرمائیں۔ اسی وقت ان فریادیوں کی دادرسی کرتا ہوں اور سب کو شہر میں آباد کئے دیتا ہوں۔ حضور اپنا ڈیرہ خیمہ اُٹھوا منگوائیں۔ چنانچہ فوراً گھوسیوں کو اپنے گھروں میں بسنے کی اجازت دے دی گئی اور سابق حکم منسوخ کر دیا گیا۔ [1]

---

[1] داستان غدر از ظہیر دہلوی۔

ایک مرتبہ قصائیوں کے متعلق سرکاری حکم ہوا کہ وہ اپنی دکانیں شہر سے باہر لے جائیں۔ اُنھوں نے فریاد کی یہی صورت اختیار کی۔ ریتی پر اپنے گھر بار کو لیکر پہنچ گئے اور بادشاہ کی دُہائی دینی شروع کر دی۔ بادشاہ سلامت نے اب بھی اپنا خیمہ ریتی میں بھجوا دیا۔ جب ریزیڈنٹ کو خبر ہوئی تو وہ آیا۔ بادشاہ کی خوشامد کی اور اپنا حکم منسوخ[1] کیا

---

[1] جب بادشاہ کو رعیت سے یہ تعلق ہو تو ظاہر ہے رعایا کو بھی بادشاہ سے یہی تعلق اور ایسی ہی گرویدگی ہوگی۔ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ اور مشہور ہے "الانسان عبد الاحسان" انسان تو درکنار ظہیر صاحب دہلوی نے ایک ہاتھی کا عجیب و غریب قصہ تحریر فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ سے خاص تعلق اور گرویدگی انسانوں ہی کو نہیں بلکہ خاص خاص جانوروں کو بھی تھی۔ ظہیر صاحب ہی کے الفاظ میں یہ دلچسپ داستان ملاحظہ فرمائیے اور دلی کی پرانی زبان سے لطف اندوز ہوجیے۔ ظہیر صاحب فرماتے ہیں۔

مولا بخش ہاتھی کا عجیب واقعہ

"مولا بخش نامی ایک قدیمی ہاتھی معمر تھا۔ کئی بادشاہوں کو سواری دی تھی۔ اس کی عادتیں بالکل انسان کی تھیں۔ قد و قامت میں ایسا بلند و بالا ہاتھی ہندوستان کی سرزمین پر نہیں تھا اور نہ اب ہے۔ یہ ہاتھی بیٹھا ہوا اور ہاتھیوں کے قد کی برابر ہوتا تھا۔ خوبصورتی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ دوازدہ ماہ مست رہتا تھا۔ کسی آدمی کو سوا ایک خدمتی کے پاس نہیں آنے دیتا تھا۔ جس دن بادشاہ کی سواری ہوتی تھی اُس سے ایک دن پیشتر بادشاہی چوبدار جاکر حکم سنا دیتا تھا۔ میاں مولا بخش کل تمہاری نوکری ہے ہوشیار ہو جاؤ۔ نہا دھو کر تیار ہو رہو۔ بس اسی وقت سے ہوشیار ہیں۔ فیلبان تھان سے کھول کر جمنا میں لے گئے اور لیجا کر لٹا دیا اور جھانوں سے میل چھڑانا شروع کیا۔ پھر دوسری کروٹ لٹا کر دوسری طرف سے پاک صاف کر کے تھان پر لے آیا۔ نقاش نے مستک پر نقش و نگار کھینچ دیے۔ وقتِ سواری گدیلا کس کر کارخانہ میں لے گئے۔ گہنا پہنایا۔ جھول ڈالی۔ عماری کسی۔ نقارخانہ کی ڈیوڑھی پر لا کر ایستادہ کر دیا۔ برابر اور ہاتھیوں کی قطار کھڑی ہے جس وقت ہوادار سواری پر بادشاہ (باقی صفحہ ۱۵۴ پر)

بادشاہ سلامت نے ریزیڈنٹ سے گفتگو کرتے ہوئے ایک دردانگیز عبرت آموز جملہ یہ بھی فرمایا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نقارخانہ کے دروازہ سے برآمد ہوا۔ چیخ مار کر تین سلام کئے اور خود ہی بیٹھ گیا جس وقت تک بادشاہ سوار نہ ہولیں اور خواص نہ بیٹھ لے کیا مجال کہ جنبش کر جائے جب بادشاہ سوار ہولئے اور فوجدار نے اشارہ کیا فوراً استادہ ہوگیا۔ ایک خوبی اور تھی کہ وقت سواری دو کمانیں اُس کے کانوں میں پہنائی جاتی تھیں۔ دو ترکش تیروں کے کانوں کے پیچھے آویزاں کئے جاتے تھے اور بہت بڑی سپر فولادی مستک پر نصب کی جاتی تھی اور بہت بڑا حقہ چاندی کا مع چلم و چنبر نقرہ اس کے سر پہ رکھا جاتا تھا اور پیچوان کی نَے فوجدار خاں اپنے کندھے پر رکھتے بادشاہ ٹھنڈا حقہ پیتے جاتے تھے اور سواری رواں ہوتی تھی۔ کیا مقدور ہے کہ حقہ گرنے پائے یا چلم گرے۔ ایسا سبک رفتا تھا، بڑی متحمل رفتار تھی۔ قصہ مختصر جب سواری سے رخصت پائی پھر ویسا ہی مست ہے جیسا پہلے تھا۔ یہ کمال اس ہاتھی کو تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور وصف بھی تھا کہ تمام دن خورد سال بچے جو بارہ برس کے سن سے کم سن بچے معصوم ہوتے تھے اس کے گرد بیٹھے رہتے تھے اُن سے کھیلا کرتا تھا اور اپنے ہاتھ سے گنوں کی پوریاں توڑ کر صاف کر کے ان کو دیا کرتا تھا دن بھر بچے اُسے گھیرے رہتے تھے۔ بچے اس سے کہتے "مولابخش بچی آوے" تو وہ اپنا ایک اگلا ہاتھ زمین سے اٹھا لیتا تھا اور ہلایا کرتا تھا اور بچے جتنی دیر کی تعداد لگا دیتے کہ گھڑی بھر یا دو گھڑی اُسی قدر ہاتھ اٹھائے رکھتا تھا۔ جب بچے کہتے ٹیک۔ وہ ہاتھ ٹیک دیتا تھا۔ پھر آپ یوں کہتا بچے ایک پاؤں سے کھڑے ہو جاتے۔ اگر نہ گھڑی بھر سے پہلے کہہ دیتے کہ گھڑی ہوگئی تو سر ہلا دیتا کہ ابھی پوری نہیں ہوئی ہے اور جب گھڑی پوری ہو جاتی تو خود ہی یوں کہہ دیتا بچے پاؤں ٹیک دیتے تھے۔ جس دن بچے نہ آتے تو چیخیں مار کر بلا لیتا۔ بچوں کو گنے کھلاتا تھا۔

حیرت انگیز واقعہ | جب فیل خانہ شاہی اور اصطبل پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو اسپ ہمدم اور مولابخش ہاتھی نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ "اسپ ہمدم" (باقی ص ۱۵۵ پر)

دیکھو بھئی تم میری موجودگی میں رعیت کو گھر سے بے گھر نہ کرنا۔ اور بعد میرے
تم کو اختیار ہے۔ دلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا۔
اس کے بعد ظہیر دہلوی کا تاثر بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ وہ بھی رقت انگیز ہے۔ ظہیر صاحب

(سلسلہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بہت بڑا شاندار گھوڑا۔ ڈورکا۔ یہ نہایت خوشرنگ اور خوبصورت تھا۔ سواری میں سب کوتلوں سے آگے چلتا تھا۔ زمانہ ولیعہدی سے بادشاہ کی سواری میں تھا۔ اب اس کی عمر چالیس سال کی ہوئی تھی۔ تمام جسم اس کا منقش تھا اور چھوٹے چھوٹے گلاب کے پھول کی برابر سرخ رنگ کے پھول تھے۔ جب ان دونوں نے آب ودانہ ترک کر دیا تو مولا بخش کے فیلبان نے جا کر "سانڈرس" صاحب کو اطلاع دی کہ "ہاتھی نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ کل کلاں کو نیکی بدی ہو جائے گی تو سرکار مجھے پھانسی دیگی"۔ سانڈرس صاحب کو باور نہ آیا۔ فیلبان کو گالیاں دیں اور کہا کہ ہم چل کر خود کھلوائیں گے۔ اور پانچ روپیہ کے لڈو اور پوریاں ہمراہ لوا کر ہاتھی کے تھان پہ پہونچے اور ٹوکرہ شیرینی کا ہاتھی کے آگے رکھوا دیا۔ ہاتھی نے جھلا کر ٹوکرا کھینچ کر مارا۔ اگر کسی آدمی کے لگتا تو کام تمام ہو جاتا۔ وہ ٹوکرا دور جا کر پڑا اور تمام شیرینی بکھر گئی" "سانڈرس" بولے ہاتھی باغی ہے اسے نیلام کر دو۔ اسی روز صدر بازار میں لا کر ایستادہ کیا اور نیلام کی بولی بولی۔ کوئی خریدار نہ ہوا۔ "بنسی" پنساری یک چشم جس کی دوکان کھاری باؤلی میں تھی۔ اس نے ڈھائی سو روپیہ کی بولی دی۔ اسی بولی پر صاحب نے نیلام ختم کر دیا۔ فیلبان نے ہاتھی سے کہا۔ لے بھائی تمام عمر تو تو نے اور میں نے بادشاہوں کی نوکری کی اور اب میری اور تیری تقدیر پھوٹ گئی کہ ہلدی کی گرہ بیچنے والے کے دروازہ پر چلنا پڑا۔ یہ سنتے ہی ہاتھی کھڑے قد سے دھم دھیلی زمین پر گر پڑا اور جاں بحق ہو گیا اور اسی دن اسپ ہمدم کا بھی خاتمہ بخیر ہوا۔ اس کے بعد ظہیر صاحب فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ ایسے نمک حلال جاں نثار رفیق کہاں پیدا ہوتے ہیں ایسا حیوان۔ انسان ناسپاس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ خدا انسان کو بھی ایسی ہی توفیق عطا فرمائے۔
صفحہ ۲۳ تا ۲۶ داستان غدر۔

فرماتے ہیں:۔

چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ کابلی دروازہ سے لیکر قلعہ تک، اور دریبہ سے لیکر قلعہ تک اور جامع مسجد سے لیکر دلی دروازہ تک۔ بُلاقی بیگم کا کوچہ۔ خانم کا بازار۔ خاص بازار۔ خان دوراں خاں کی حویلی سے دریا گنج تک ہزارہا مکانات منہدم اور مسمار کر کے دلی کا چبوترہ بنا دیا گیا اور چٹیل میدان کر دیا گیا۔ [۱]

اس تمام شرح و بسط کے بعد پھر اصل موضوع کی طرف رجوع فرماتے ہیں۔ ارباب فکر۔ اور اصحاب بصیرت علما۔ کے سامنے

(۱) ایک طرف مسئلہ ملوکیت تھا کہ کیا اس کو زندہ کیا جائے اور شاہیت کو برقرار رکھا جائے۔

(۲) دوسری طرف انگریزی سامراج کا عفریت تھا۔

(۳) ہندوستانی عوام اور خواص کی مغل بادشاہ سے عقیدت۔

(۴) مغل بادشاہ کی وہ شفقت جس نے رعایا کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

(۵) مغل بادشاہ اور رعایا کا ایسا تعلق کہ رعایا یعنی ہندوستانی بادشاہ کو اپنا سمجھتے تھے اس کے اقتدار کو اپنا اقتدار اور اس کی حکومت کو اپنے ملک کی حکومت سمجھتے تھے۔

ان تمام حالات کا لحاظ کرتے ہوئے عام علماء کرام اور حریت نواز ارباب فکر نے مغل خاندان، مغل بادشاہ اور ملوکیت و شاہنشاہیت کی قباحتوں کو نظر انداز کیا اور یہی ضروری سمجھا کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر وطن عزیز کو اجنبی عنصر سے پاک کر لیا جائے لیکن

---

[۱] داستان غدر ص ۳۷

کچھ علماء پھر بھی ایسے رہے کہ جو ملوکیت سے انتہائی نفرت کی بنا پر یا اس بنا پر کہ اُن کو کامیابی کی توقع نہیں تھی۔ اس تحریک سے علیحدہ رہے اور انھوں نے خاموشی کو[۵۱] بہتر جانا۔

پس منظر کی مذکورہ بالا وضاحت کے بعد اس مناسبت سے کہ یہ کتاب علماء ہند کے شاندار ماضی کی چوتھی جلد ہے ایک ایسے انقلابی عالم کے چند فقرے ملاحظہ فرمائیے جو اپنے اعلیٰ فکر و دانش کے ساتھ اس دور کے حالات کا سب سے بڑا واقف اور ماہر تھا۔ یہ مجاہد جلیل حضرت مولانا عبیداللہ سندھی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی واجب التعظیم شخصیت ہے جس کی تحقیق یہ ہے

الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلویؒ کی نئی تنظیم پر[۵۲] پورے تیس برس نہیں گذرے تھے کہ دہلی کے آخری بادشاہ کی انگریزی کمپنی سے لڑائی ہوئی

---

۵۱ یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نظریہ کسی بھی عالم دین اور مفتی کا نہیں تھا جو سر سید صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ مسلمان اس حکومت کے مستامن ہیں (زیر پناہ ہیں) اور مستامن (زیر پناہ) کی حیثیت سے حکومت متسلطہ کا مقابلہ ناجائز ہے۔ ۵۲ اس تنظیم کی وضاحت کے لئے ہم اس سلسلہ کی (علماء ہند کے شاندار ماضی کی) دوسری اور تیسری جلد کے مطالعہ کی درخواست کریں گے۔ ان جلدوں میں واضح کیا گیا ہے کہ سیدنا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سیاسی نظریات کی بنیاد پر کس طرح حضرت شاہ عبدالعزیز نے دماغوں کی تربیت فرمائی۔ پھر حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہید رح کے زیر قیادت اس تربیت یافتہ جماعت نے کس طرح علم جہاد بلند کیا اور بے نظیر قربانیوں کی زندہ جاوید تاریخ صفحات گیتی پر نقش کی۔ حضرت سید احمد شہید کی شہادت کے بعد اس جماعت کے سربراہ حضرت مولانا اسحاق صاحب نے جن کو مولانا سندھی "الصدر الحمید" فرماتے ہیں ایک جماعت کی تشکیل کی۔ نئی تنظیم سے یہی جماعت مراد ہے۔ اس کی قیادت پہلے مولانا مملوک العلی رح کے سپرد تھی اُن کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ العزیز اس کے امیر قرار دیئے گئے۔

(الف) سلطان دہلی اگرچہ بظاہر ایک وظیفہ خوار رئیس کی صورت میں نظر آتا تھا۔ مگر عام لوگوں کی نظروں میں وہ ابتک سارے ہندوستان کا موروثی سلطان مانا جاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی چونکہ اسی کے نام سے عوام پر حکومت کرتی تھی۔ چنانچہ ڈھنڈورے میں کہا جاتا تھا "خلق خدا کی۔ ملک بادشاہ کا۔ حکم کمپنی بہادر کا" اس لئے عوام الناس کی رائے اسے ملک کا حقیقی مالک ماننے میں تامل نہیں کرتی تھی۔

(ب) اس داہیہ کبری میں مولانا محمد اسحاق کی نئی جماعت پھر دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ الصدر الحمید (مولانا محمد اسحاقؒ) نے جس طائفہ کو نئی تنظیم میں مرکزی اختیارات دیئے تھے وہ طائفہ تو سلطان دہلی کا طرفدار ہوگیا اور سلطانی تحریک کی شکست کے بعد مولانا محمد اسحاق کی طرح حجاز پہونچ گیا۔ چنانچہ امیر امداد اللہ اور مولانا عبدالغنی مولانا محمد یعقوب دہلوی کے ساتھ حجاز میں بیٹھ کر اپنی ہندوستانی تنظیمات کی رہنمائی کرتے رہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد اسحاق کے متبعین کی پہلی صف میں سے علماء اور صوفیہ کا کثیر[۱] حصہ

---

[۱] اس موقع پر لفظ کثیر کا مطلب یہ ہے کہ اس جماعت میں بھی بہت سے افراد شامل تھے ورنہ عددی لحاظ سے اکثریت اسی جماعت کو حاصل تھی جو سلطان دہلی کی حامی اور اس جنگ آزادی میں شریک کار تھی۔ مبصرین تاریخ کے نزدیک یہ حقیقت ناقابل انکار ہے۔

سلطان دہلی کی لڑائی میں غیر جانبدار[1] بن گیا۔
اس کا حاصل یہ سمجھنا چاہیئے کہ الصدر الحمید (مولانا محمد اسحاق)
کی تنظیم کے بالمقابل اگر پٹنہ میں پارٹی[2] قائم ہو چکی تھی تو اب خود
الصدر الحمید کے اپنے فرقہ میں سے ایک مخالف جماعت دہلی میں
بھی پیدا ہو گئی۔ مولانا سید نذیر حسین دہلوی اور مولانا شیخ محمد
تھانوی اس دوسری جماعت کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں[3]

---

[1] غیر جانبدار اس بنا پر نہیں کہ وہ انگریزوں کے حامی تھے بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے خیال میں کامیابی ممکن نہیں تھی جس کی تشریح شمس العلماء ذکاء اللہ خاں نے ان الفاظ میں کی ہے۔

ہیں اس وقت تک ان کافروں کی اطاعت کرنی چاہیئے جب تک اُن سے سرکشی
میں کامیابی کی اُمید نہ ہو" (ص ۳۰۶ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ)

انہیں میں سے ایک بزرگ (مولانا محبوب علی صاحب) کا قصہ مشہور ہے کہ کامیابی کے بعد انگریزوں نے ان کو کسی گاؤں کی جاگیرداری دی تو آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمادیا کہ میری غیر جانبداری انگریزوں کی خوشنودی کے لئے نہیں تھی بلکہ میرے نزدیک مسئلہ ہی اس طرح تھا۔

[2] یہ علماء صادق پور کی پارٹی ہے۔ تشریح کے لئے ملاحظہ فرمایئے شاندار ماضی جلد سوم

[3] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۲۰۱

محاذِ جنگ اور طاقتوں کا موازنہ

انگریزوں کی تیاری۔ اقدام۔ بہتر مواقع۔ امداد و تعاون کی راہیں۔ دہلی کا شہری ذوق۔ شہر دہلی محاذِ جنگ کے لحاظ سے۔

میرٹھ کا واقعہ۔ دونوں کے حق میں اچانک تھا۔ انگریز رنگ رلیوں میں مست۔ فتوحات کے نشہ میں چور تھے۔ اور مجاہدین حریت ۱۳ مئی سے پہلے وفاداری کی نمائش کو شک و شبہ کے ہر ایک گرد سے پاک رکھنا چاہتے تھے۔ بس جس طرح اس ہنگامہ سے انقلابی جماعت کے لئے فائدہ اٹھانا مشکل تھا ایسے ہی انگریز کے لئے فوری تدارک بھی ناممکن تھا۔

پھر جیسے جیسے میرٹھ اور دہلی کے ہنگامہ کی خبریں پھیلتی رہیں۔ جذبات کے ہیزم خشک میں بغاوت کے شعلے بھڑکاتی رہیں۔ اس نے ہر جگہ کے انگریزوں کو اور بھی زیادہ حواس باختہ بنا دیا۔ وہ باغیوں کی سرکوبی کیا کرتے۔ اُن کو خود اپنی جانوں کے لالے پڑ گئے اور ہر جگہ نفسی نفسی کا عالم بپا ہوگیا۔ دہلی میں کچھ افسر قتل ہو گئے کچھ فرار ہوئے باقی ماندہ فوج نے ایک پہاڑی کو اپنا مرکز بنا لیا۔

ترقیات کے سو سالہ نشیب و فراز نے اگرچہ اب اس پہاڑی کو دہلی کا ایک محلہ بنا دیا ہے۔ مگر اس وقت دشوار گذار راستہ کی وجہ سے یہ پہاڑی ایک محفوظ مقام تھی جنگی نقطۂ نظر سے اس کی بلندی ایک عظیم منفعت تھی جو انگریزوں کے لئے مخصوص ہوگئی تھی اس پہاڑی پر نہ خنکی ہے نہ آبِ رواں کی شادابی۔ مگر دہلی کی سنگین عمارتیں جب

مئی جون میں گرمی کی شدت، حبس اور گھٹن کا مظاہرہ بڑھ چڑھ کر کرتی ہیں تو یہ پہاڑی اس مظاہرہ میں شریک نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی اونچی چٹانیں ہلکی ہلکی ہوا کے کچھ سانس سمیٹ لیتی ہیں جو اپنے مہمانوں کی خاطر مدارات میں صرف کر دیتی ہیں۔ یہ مہمان نواز پہاڑی۔ آخر تک سفید فام مہمانوں کی پوری مدارات کرتی رہی۔ بارہا ان مہمانوں کو یہاں سے نکالنے کی کوشش[۵۱] کی گئی۔ مگر اس کی چٹانیں گرداگرد گھنے درخت اور جھاڑیاں سینہ سپر ہو کر سامنے آتی رہیں۔ انتہا یہ کہ اسی پہاڑی سے فتح کا پرچم لہرایا گیا۔ انگریزی دور میں اس پہاڑی کا نام فتح گڈھ تھا اور آزاد بھارت میں اس کو جیت گڈھ کہا جانے لگا ہے۔ اس طرح کی پہاڑیوں کا سلسلہ دہلی کے تین طرف تھا اور اس ایک پہاڑی کے سہارے ان سب پہاڑیوں پر انگریزی فوجوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ جب ہنگامہ کا شباب تھا تو سبزی منڈی کی یہ پہاڑی جاسوسی کا کام بھی کر رہی تھی۔ کیونکہ اس کی بلندی سے وہ سب کچھ نظر آجاتا تھا جو شہر میں ہوتا تھا۔ اب بھی جب اس پہاڑی کے اوپر سے گذر ہوتا ہے تو شہر کی پانچ اور چھ منزلہ عمارتیں بھی زیر پا نظر آتی ہیں حالانکہ شہر کی عمارتیں اور شہر کی سڑکیں اس پہاڑی کی بہت سی اونچی چٹانوں کو اس سو سال کے اندر ہضم کر چکی ہیں۔

اس انقلاب کے لئے ۳۱ مئی اس لئے طے کی گئی تھی کہ یہ موسم انگریزوں کے لئے بہت سخت ہوتا ہے۔ لیکن ابھی جدوجہد انقلاب ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی کہ کم از کم اس علاقہ میں معاملہ برعکس ہو گیا۔ کیونکہ برسات کی بارشوں میں یہ پہاڑی تو ہر دفعہ نہا

---

[۵۱] ایک مرتبہ انقلابی فوجیں اس پہاڑی کے عقب تک پہونچ گئیں۔ مگر خاص اس وقت جب وہ دشمن کے سر پر پہونچی ہوئی تھیں گولہ بارود ختم ہو گیا۔

دھوکر تازہ دم ہوتی رہی اور اپنا تمام پانی سیلاب بنا کر نشیبی حصوں میں پہونچاتی رہی جہاں بعض اوقات انقلابی فوجوں کے خیمے اور مورچے ہوتے تھے۔ یہ قدرتی ذرائع تھے جو دونوں مقابل فوجوں کے لئے شکست و فتح کے اسباب بن گئے تھے۔

اس کے علاوہ لفٹننٹ ڈیولی نے جس طرح بر وقت اسلحہ خانہ اڑا کر دشمن کو بہت بڑے سامان جنگ سے محروم کردیا تھا۔ اسی طرح تار گھر کے دو نوجوان سنگلروں نے انبالہ تار بھیجکر انقلاب کے پہلے ہی لمحہ میں حکومت پنجاب اور اس کے ذریعہ مرکزی حکومت اور فوجی مرکزوں کے لئے جنگ کا بگل بجا دیا تھا۔ چنانچہ انگریزی فوجوں کے کمانڈر انچیف جنرل آنسن کو (جو شملہ میں مقیم تھا) فوراً ہی گورنر جنرل لارڈ کیننگ کی ہدایت پہونچ گئی کہ وہ دہلی پر حملہ آور ہوں۔

جنرل آنسن نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پہلا کام یہ کیا کہ پٹیالہ۔ نابھ اور جیند وغیرہ ریاستوں کی وفاداری کو پختہ کیا۔ اُن سے فوجیں حاصل کیں اور پھر کالی اور گوری فوجوں کے ساتھ دہلی کی طرف مارچ شروع کردیا۔

حالات کی ناسازگاری اُن کے بھی دامنگیر تھی۔ چنانچہ جگہ جگہ رکاوٹیں پیش آئیں خود جنرل آنسن کی سرگذشت یہ ہے کہ وہ ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کو انبالہ سے روانہ ہوا۔ اور ابھی کرنال تک ہی پہونچا تھا کہ ۲۷ مئی ۱۸۵۷ء کو ہیضے کا شکار ہوکر راہی ملک عدم ہوگیا لیکن اس منظم اور باضابطہ فوج کے لئے کمانڈروں کی کیا کمی تھی فوراً ہی "ہنری برنارڈ" نے کمان سنبھال لی۔ راستہ میں کشت و خون کرتا ہوا دہلی پہونچا لیکن حالات اس درجہ تلخ اور صبر آزما تھے کہ بہت جلد اس کے جسمانی ڈھانچہ کی ایک ایک چول ہل گئی اور ابھی ایک چلّہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ۵ جولائی کو ہیضے کی موت سے اس کا بھی بستر گول ہوگیا۔ اب تیسرے

کمانڈر جنرل ریڈ نے کمان سنبھالی لیکن اس دوران میں انقلابی فوجوں کے پے در پے حملے اتنے شدید رہے کہ استعفا دیکر ذمہ داری کا جُوا اُتار پھینکنے ہی میں اُس نے اپنی کامیابی سمجھی۔ اب یہ وقت تھا کہ انگریزی فوج کی ہمتیں پست ہو رہی تھیں۔ مگر اسی فوج میں کچھ ایسے جانباز بھی تھے جو شکست کے مقابلہ میں موت کو پسند کر رہے تھے جنرل ولسن ایسا ہی بہادر کمانڈر تھا۔ جنرل ریڈ کے ہٹتے ہی اُس نے فوج کی کمان ہاتھ میں لی۔ کہا جاتا ہے ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ قدرت نے اس کی ہمت کی مدد کی اور فوراً ہی ایک اور کمانڈر دو ہزار فوج لیکر اُس کی امداد کو پہنچا۔ اس کمانڈر کا نام "نکلسن" تھا۔ جو تنہا دو ہزار کی برابر مانا جاتا تھا جس کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ اُس نے اپنے خون کی بھینٹ چڑھا کر دلی حاصل کی۔

اسی طرح جنرل "ہڈسن" انگریزی فوج کو میسر آگیا جس کی تفریح گاہ میدانِ جنگ، اور زخمیوں کی آہ و بکا جس کے لئے باعث سرور تھی جس کی پیاس صرف خون کے گھونٹوں سے بجھتی تھی جس نے نہ صرف نادر شاہ کی یاد کو تازہ کیا بلکہ اُس پر پانی پھیر دیا۔

اس کے علاوہ پٹیالہ، نابھ وغیرہ ماورار ستلج کی ریاستیں جو انگریز دوستی کا تاریخی پس منظر رکھتی تھیں جنھوں نے رنجیت سنگھ کے زمانہ میں بھی متحدہ سکھ یونین کے مقابلہ میں انگریز دوستی کو ترجیح دی تھی جن کی پرانی دوستی کو جنرل "آنسن" نے بغاوت کی خبر پاتے ہی از سرِ نو تازہ اور مضبوط کر لیا تھا۔ اس مصلحت اندیش دوستی نے نہ صرف انگریز کی کمر مضبوط کر دی تھی بلکہ انگریزی فوجوں کو رسد وغیرہ کی ضرورتوں سے مستغنی کر کے اُن کے عقب کو ہر ایک خطرہ سے محفوظ کر دیا تھا۔ پنجاب کے اس زرخیز فوجی خطہ کی مخلصانہ امداد کے علاوہ فیض محمد خاں والی رامپور اور نواب بہادر خاں کی باہمی چشمک نے رُہیلو

کو خانہ جنگی میں مبتلا کر کے انگریزوں کو وہ مدد پہونچائی کہ اتنی مدد جنرل بخت خاں بہادر شاہ کو نہیں پہونچا سکا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جو حکومت کے ساتھ مہاجنی کاروبار بھی کرتی چلی آتی تھی اس کے بھرپور خزانوں میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ تاہم زمینداروں اور ساہوکاروں نے جس طرح دل کھول کر اس کی امداد اس موقع پر کی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ضلع بجنور کے صرف دو گاؤں سے مبلغ دس ہزار روپے انگریز دوستی کے نذر کر دیئے گئے جبکہ انقلابی فوجوں کی مالی امداد کسی اور طرف سے تو کیا ہوتی خود انقلابی فوجیں جو روپیہ سرکاری خزانوں کو ضبط کر کے قبضہ میں لایا کرتی تھیں وہ بھی صحیح مصرف میں صرف نہیں ہوتا تھا۔

انقلابی محاذ اور دہلی کا شہری مزاج!

انگریزی محاذ کی مختصر کیفیت یہ تھی۔ اس کے بالمقابل میرٹھ کی جلد باز فوج جس شخصیت کے گرد جمع ہوئی تھی وہ عظمت ہندوستان، ہمدردی خلق اور تاریخ رعایا پروری کی ایک تصویر ضرور تھی مگر حسرت زدہ۔ عزم و ہمت سے خالی تجربہ سے تہی دامن مزید براں پیرانہ سالی نے حوصلوں اور ولولوں کی رہی سہی دیواروں کو بھی ہلا ڈالا تھا۔

دہلی جس کو انقلاب کا مرکز بننا پڑا تھا۔ قرون وسطیٰ کے سب سے زیادہ خوشحال بادشاہ شاہجہاں کا بسایا ہوا وہ نازک اور خوبصورت شہر تھا جو پہلے ہی دن سے فوجی کرختگی کے بجائے تہذیب، شائستگی۔ نفاست اور ناز و نعم کا گہوارہ تھا وہ نادر شاہ کی بربریت کے بعد بھی محمد شاہ کی راجدھانی بنا رہا تھا جہاں جنگی اور فوجی رعب داب کے بجائے شعر و سخن کی بزم آرائی تھی یا علمی موشگافیوں کی گرم بازاری۔ بقول مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ:-

اُن[۱] کے (شاہ ولی اللہ۔ المتوفی ۱۷۶۳ء) کے زمانہ کی دہلی ایک

---

[۱] سیدنا شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اپنے زمانہ کی دلی کا تذکرہ ایک عربی قصیدہ میں کیا ہے۔ اس کے چند اشعار ترجمہ سمیت پیش کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ان البلاد اماء وھی سیدۃ — وانھا درۃ والکل کالصدف

تمام شہر باندیاں ہیں اور دہلی اُن کے مقابلہ میں ملکہ ہے۔ دہلی ایک موتی ہے باقی تمام شہر گویا سیپ

فاقت بلاد الوری عزّاً و مرتبۃ — غیرالحجاز و غیرالقدس والنجف

دہلی عزت و منزلت میں سب شہروں پر فوقیت رکھتی ہے۔ باستثناء حجاز شریف۔ بیت المقدس اور نجف کے

ایسا مرکز تھی جس میں اقوام عالم کے سب نمونے ملتے تھے۔ دہلی میں یہ
استعداد تھی کہ اُس کے توسط سے یہ تعلیم سارے ہند اور پھر ساری دنیا
میں پھیل سکے۔

اس زمانہ کی دہلی میں ایک طرف خرابی پیدا ہوگئی تھی تو اس کے ساتھ ابھی تک ایک خوبی بھی یقیناً باقی تھی۔ طبقہ امرا میں آصف جاہ جیسا فرزانہ اور طبقہ صوفیا میں مرزا محمد جان جاناں۔ اسی زمانہ کی یادگار رہیں۔ شہر میں مختلف کتب خانے اور باکمال اساتذہ موجود تھے۔ گویا ایک مفکر کے لئے کافی وسیع میدان موجود تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵)

سکّانہا خیر اہل الارض قاطبۃ خلقا و خلقا بلا عجب ولا صلف

دہلی کے باشندے دنیا بھر میں سب سے بہتر ہیں۔ صورت میں سیرت میں۔ اسمیں نہ تعجب کی بات ہے نہ حیرت کی بات

بہامدارس لو طاف البصیر بہا لم تفتتح عینہ الا علی الصحف

دہلی میں بیشمار مدرسے ہیں جو تعلیمی فرائض کی انجام دہی میں ایسے منہمک رہتے ہیں کہ اگر کوئی سیاح ان مدرسوں کا چکر لگائے تو کتابوں اور صحیفوں کے علاوہ کسی اور چیز پر اس کی نظر ہی نہ پڑ سکے

کم مسجد زخرفت فیہا منارتہ لو قابلتہ الشمس الضحو تنکسف

کتنی ہی حسین اور خوبصورت مسجدیں ہیں اُن کے منار ایسے مزین اور بارونق کہ اگر دوپہر کے وقت آفتاب اُن کا مقابلہ کرے تو اس کو گہن لگ جائے۔

لا عزو ان زانت الدنیا بزینتہا کم من اب قد علا بابن ذوی شرف

آج دہلی پوری دنیا کے لئے وجہ زینت ہے اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیٹے کی عزت اور نام آوری سے باپ عزت وعظمت کی بلندیوں پر بالانشین ہو جاتا ہے

وماء جون جری من تحتہا فحکی انہار خلد جرت فی اسفل الغرف

دریائے جمنا دہلی کے نیچے جاری ہے وہ نمونہ پیش کر رہا ہے جنت الفردوس کی نہروں کا جو جنت کے عالیشان محلات اور بالاخانوں کے نیچے بہ رہی ہیں۔

محمد شاہ کے بعد احمد شاہ رنگیلے کی طبع رنگین نے فنون لطیفہ اور مجلسی تکلفات کی رنگینیوں میں اور اضافہ ہی کیا۔ انتہا یہ کہ مرہٹوں کی چیرہ دستی اور پھر انگریزوں کی خوں آشام پالیسی کے بعد بھی بہادر شاہ کے دور حکومت میں اس نازک اور خوش مزاج شہر کی حالت یہ تھی۔

"چیزیں سستی تھیں، روپے کی کمی نہ تھی۔ حرفت وصنعت فروغ پر تھی۔ لوگ خوش حال اور زندہ دل تھے۔ شہر فصیل کے اندر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی۔ خاص کر چاندنی چوک میں جس کے بیچوں بیچ نہر بہتی تھی وہ رونق تھی کہ نظر لگتی تھی۔ ہندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح ایسی صلح و آشتی سے رہتے تھے کہ آجکل اس کا یقین کرنا مشکل ہے ایک دوسرے کی غمی شادی اور تہواروں میں بلا تکلف شریک ہوتے اور کسی قسم کی غیریت نہیں برتتے تھے۔ بادشاہ اگرچہ نام کے بادشاہ تھے

لہ قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان کا لق و دق میدان جو ۱۹۵۰ء تک تقریباً ایک میل لانبا اور ایک میل چوڑا تھا۔ پھر جانب شمال میں کشمیری گیٹ تک اور جانب جنوب میں دہلی دروازہ تک چوبیس پچیس برس پہلے تک سنسان علاقہ تھا یہ سب فصیل شہر میں داخل تھا۔ جو ۹ ستمبر ۱۸۵۷ء تک کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس میں سات بازار تھے۔ بیشمار مسجدیں اور مندر، چوک اور مزارات، ۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کے بعد تقریباً دس روز تک اس علاقہ میں چپہ چپہ زمین پر خونریز جنگ ہوئی۔ ہر ایک مکان مورچہ تھا جس کے نتیجہ میں وہ گولوں اور گولیوں کا نشانہ بنا اور پھر جب انگریزی قبضہ مکمل ہوا تو مسمار کر کے یہ پورا علاقہ چٹیل میدان اور بقول راقم الحروف ظہیر دہلوی چبوترہ کر دیا گیا۔ اب دہلی کی آزاد حکومت اس علاقہ کو دوبارہ آباد کر رہی ہے۔ مگر پوری طرح آباد کرنے کے لئے اربوں روپیہ کی ضرورت ہے۔

لیکن کیا ہندو کیا مسلمان سب اُن سے محبت کرتے اور اُن پر جان فدا کرتے تھے۔ بادشاہ کا برتاؤ بھی دونوں سے یکساں تھا۔ چنانچہ مسٹر ٹیلر (سابق) پرنسپل دہلی کالج اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ "قلعہ معلّی میں عجیب ماجرا تھا۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ اگرچہ قدرتاً ہمدردی تھی لیکن اس کے باوجود جتنے ملازمین شاہی تھے (ایسی خدمات پر جہاں فارسی اُردو کی ضرورت رات دن پڑتی تھی) سب کے سب ہندو تھے۔ اگرچہ تعلیم آج کل کی طرح عام نہ تھی لیکن تہذیب اور ذوق جو تعلیم کی غایت ہے عام طور پر پایا جاتا تھا یہاں تک کہ اَن پڑھ بھی اہل ذوق کی صحبت سے صاحب ذوق نظر آتے تھے۔ خوش اطواری اور سلیقہ دلّی کا جوہر تھا۔ زبان کی تو ٹکسال ہی تھی جس نے "دلّی" نہیں دیکھی یا جو "دلّی" نہیں رہا وہ زبان داں ہی نہیں۔ گویا جامع مسجد کی سیڑھیاں "دبستان زبان" تھیں۔ شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ خود بادشاہ شاعر تھے۔ شعر و سخن کے قدر دان تھے۔ قلعہ معلّی کی زبان فصاحت کی جان تھی۔[1]"

ہندوستان کے مشہور۔ اصلاح پسند اور ہمدرد قوم شاعر مولانا الطاف حسین حالی مرحوم جنھوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد کے دونوں زمانے دیکھے ہیں۔ انھوں نے حکیم محمود علی خاں صاحب مرحوم کا مرثیہ لکھتے ہوئے دہلی کے متعلق بھی چند شعر کہہ دیئے ہیں۔ یہ اشعار گویا دہلی کا مرثیہ ہیں ان میں انھیں خوبیوں پر ماتم کیا ہے جو اد یر کی

[1] بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد ملخصہ تذکرہ دہلی کالج۔

سطروں میں آپ نے مطالعہ فرمائیں۔ مولانا حالی فرماتے ہیں

خاک سے اُٹھے ہیں تیری جیسے جیسے نکتہ ور
اک جہاں شیوہ بیانی سے ہے اُن کی باخبر

راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر
سرو کو ہوگی نہ راس اتنی ہوا ئے غاتفر[1]

حسن صورت میں اگر ضرب المثل تو شاد تھا
حُسن معنٰے تیرا حصّہ اے جہان آباد تھا

لے کے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم
جن میں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں دھوم

دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم
کھیتیوں پر تیری ابر آتے تھے اُن کے جھوم جھوم

آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصل خزاں
تیری سرحد میں رہا ہر علم و دانش کا سماں

جس طرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام
تھے تمدن میں بھی پیرو تیرے جمہور انام

آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام
شہری و بدوی[2] تری تقلید کرتے تھے مدام

---

[1] غاتفر سمرقند کے قریب ایک قطعہ زمین ہے جہاں کا سرو خوبی۔ زیبائی اور راستی میں ضرب المثل ہے۔ [2] بدوی۔ دیہاتی۔

رسم میں، آئین میں، اوضاع میں، اطوار میں
طرز میں انداز میں رفتار میں گفتار میں
رہ گیا باہر سے آکر جو کہ تجھ میں چند سال
ڈھل گئے سانچے میں گویا اُس کے عادات و خصال
آکے بن جاتا تھا یاں نقصان انسان کا کمال
تیری پرچھائیں سے موتی بن کے جاتے تھے سفال
آتے ہی انسان کی کایا پلٹ جاتی تھی یاں
چار دن میں اور ہی صورت نکل آتی تھی یاں
تیرا معمورہ تھا اک عالم میں مرجع اور مآب
آن کر لیتے تھے یاں ٹھیکی جہاں کے انتخاب
بستے تھے اطراف سے آ آکے تجھ میں شیخ و شاب
کر دیا تھا تیری آبادی نے ملکوں کو خراب
جمگھٹا تھا تجھ میں ترک و فرس روم و زنگ کا
دستہ تھا گویا کہ تو گلہائے رنگا رنگ کا

(ماخوذ از مرثیہ حکیم محمود علی خاں مرحوم)

یہ عجیب بات ہے کہ اسی سرزمین نازک کی اسی نازک فضا میں علماء کی وہ جماعت پیدا ہوئی جس کی جفاکشی۔ صبر آزمائی جس کے عزم و ہمت اور جس کی ایثار و قربانی نے اس دور کی تاریخ کو انقلاب آفریں بنایا۔ جس نے مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحیٔ اور مولانا نصیر الدین قدس اللہ اسرارہم جیسے کوہ وقار اور پیکر استقلال پیدا کئے۔ جنھوں نے

ہزاروں میل کی سیاحت و مسافت کے بعد سرحدِ کشمیر کی گھاٹیوں میں پہونچکر جام شہادت نوش کیا۔ مگر یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ دہلی کے ہزاروں ارادتمندوں میں سے جو اس جادہ سرفروشی و جان بازی پر گامزن ہوئے وہ انگلیوں کی گنتی سے بھی کم تھے وجہ یہ تھی کہ وہ مصنوعی تہذیب جس کو آجکل کی تہذیب میں "فن لطیف" کہا جاتا ہے جس کے ساتھ بہت سے اخلاقی مرض جن کو "فن کثیف" کہنا چاہیئے ساتھ ساتھ رہتے ہیں ان فنون لطیفہ اور کثیفہ نے باشندگانِ دہلی کو رزم سے ناآشنا۔ بزم کا دلدادہ بنادیا تھا[۵۱]

بہادر شاہ بادشاہ جو اسی دہلی کا رہنے والا تھا اسی کی آب و ہوا میں اس کا نشوونما ہوا تھا۔ وہ گویا ایک آئینہ تھا جس میں دہلی کے اسی مزاج کی عکاسی ہوتی تھی۔ مزاجوں کی اس ہم آہنگی کا یہ اثر تھا کہ تمام کمزوریوں اور بے چارگیوں کے باوجود بہادر شاہ دلی والوں کا محبوب تھا اور دلی والے بہادر شاہ کی آنکھ کے تارے۔

بہر حال اس امن پسند۔ راحت طلب۔ پُر تکلف۔ باوضع اور خوش طبع شہر دہلی پر پہلی مصیبت خود انقلابی فوجوں کی آمد تھی۔ یہ فوجیں جذبات انقلاب سے خواہ کتنی ہی سرشار ہوں مگر اپنی طبیعتوں، مراسم اور معاشرت کے لحاظ سے دہلی والوں سے قطعاً اجنبی اور نامانوس اور وہ بھی ہزار دو ہزار نہیں بلکہ ساٹھ ہزار۔ اس نامانوس ہجوم کو اگر کوئی چیز مانوس بنا سکتی تھی تو وہ صرف مقصد کا متحد ہونا تھا۔

مقصد کے اس اتحاد نے بیشک تعاون پر آمادہ کیا۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے دہلی والوں نے ان فوجوں کی آؤ بھگت خوب کی۔ مگر اوّل تو خود دہلی والوں کی طبیعت جنگجو نہ تھی۔

---

[۵۱] چنانچہ طوائف کے بازار گرم تھے۔ اور جان بازی کے علاوہ کوئی بھی بازی ایسی نہ تھی جس سے دہلی کے شوقین مزاجوں کو دلچسپی نہ ہو۔

جو یہ موافقت پائیدار ہوتی۔ اس پر طرہ یہ کہ انگریزوں کے خفیہ حامی اس تعاون میں رخنے پیدا کرتے رہتے تھے جس کی بنا پر جان سے نہیں بلکہ صرف مال سے مدد کرنا جو اخلاقی فرض تھا۔ بسا اوقات باشندگان دہلی کو جبر اور تاوان معلوم ہونے لگتا تھا۔

جہاں تک فوجی نظام کا تعلق تھا تو سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ یہ تمام سپاہی وہ تھے جنھوں نے دوسروں کی زیر کمان کام کیا تھا اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اپنی کمان میں کام لے سکے

ان ناتجربہ کاروں کے خیال میں بادشاہ تمام خوبیوں کا حامل اور بادشاہ زادے افسری اور جرنیلی کے فطرتاً مستحق تھے۔ حالانکہ ان شاہزادوں میں اس کے سوا اور کوئی خوبی نہ تھی کہ وہ بہادر شاہ کے فرزند یا اُس کے ہم جد تھے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ خود فوجیوں کی خواہش کے مطابق بادشاہزادوں کو فوجوں کی کمان سپرد ہوئی ناتجربہ کار قیادت کا نتیجہ شکست کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔ چنانچہ مئی اور جون کا وہ مہینہ جو پراگندہ حال انگریزوں کو ختم کرنے کا سب سے بہتر زمانہ تھا۔ ناتجربہ کار۔ ناز پروردہ۔ عیش پرست، شاہزادوں کی طفلانہ اور خفیف حرکتوں کی نذر ہوگیا۔

۲ر جولائی کو جنرل بخت خاں ایک منظم اور باضابطہ فوج لیکر دہلی پہنچا۔ مگر اس وقت تک ایک طرف باشندگان شہر اور ڈیڑھ دو ماہ سے آئی ہوئی فوجوں میں بددلی کا مرض سرایت کرچکا تھا[1] اور دوسری جانب انگریز اپنی پراگندگیوں کو ختم کرکے مقابلہ کے لئے پوری

---

[1] شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب فرماتے ہیں۔ اوّل اوّل جب شہر میں باغی سپاہ داخل ہوئی ہے تو وہ دین دین پکارتی تھی اور اپنی بغاوت کا سبب فقط یہی بتاتی تھی کہ انگریزان کو بے دین کرنا چاہتے تھے۔ مگر دو مہینے کے بعد اس بات کا ذکر سننے میں نہیں آتا تھا۔ ہر ایک رجمنٹ (باقی صفحہ ۲۴۳ پر)

طرح تیار ہو چکے تھے۔

جنگی نقطۂ نظر سے شہر دہلی کا محل وقوع بھی قطعاً غیر موزوں تھا۔ ایک طرف جمنا اور تین طرف پہاڑیاں اس کی محافظ بن سکتی تھیں جبکہ پہاڑیوں پر اپنی فوجوں کا قبضہ ہوتا۔ لیکن معاملہ برعکس تھا۔ اور اس بنا پر دہلی کا پورا رقبہ توپوں کی زد میں تھا۔

مالی نظام اور مالی امداد

دہلی اور قرب وجوار کے رؤسا و نواب جو ہمنوا ہو گئے تھے بادشاہ کی طرف سے اُن کو احکام بھیجے گئے کہ وہ مالیہ وصول کر کے شاہی خزانہ میں بھیجیں۔ مگر اول تو وہ خود ضرورت مند تھے۔ اس کے علاوہ جو جو صلے انگریزوں کی امداد کے لئے فراخ اور وسیع ہو جاتے تھے اس مصیبت زدہ بادشاہ اور انقلابی فوجوں کے حق میں اُن کی تمام بلندیاں پست ہو جاتی تھیں۔ مثلاً دہلی کے مہاجن جن سے روپیہ وصول کرنے کا بہت شور رہے جیون لال صاحب نے اپنے روزنامچہ میں اُس کی تفصیل یہ لکھی ہے۔

"۱۳ رمئی ۱۸۵۷ء گردہار سنگھ اور گردہاری لال مہاجن نے دو لاکھ اور چند ہزار روپے شاہی خزانے میں جمع کیے۔

۴ رجون ۱۸۵۷ء۔ بادشاہ کے احکام کے مطابق ایک جلسہ ہوا جس میں ایک لاکھ روپیہ جمع ہوا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۲ اور رسالہ میں تلنگے اور سوار ایسے اشراف اور بھلے مانس تھے کہ وہ کہتے تھے کہ یہ دنگا فساد مچانا اور افسروں کو قتل کرنا ہم میں سے صرف تھوڑے سے آدمیوں کا کام ہے۔ ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم نے ان کو یہ کام کرنے دیا۔ اس خیال میں وہ سب متفق تھے کہ اس جرم کے سبب سے انگریز ہم کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اُن کے افسر اکثر پژمردہ رہتے تھے اُن کو اپنی تنخواہوں، اپنی عزت اور آخر عمر میں اپنی پنشنوں کا خیال آتا تھا۔ سپاہی اُن کے حکم نہیں مانتے تھے اور اُن کو ایسی باتیں سُنا دیتے تھے جن سے وہ شکستہ خاطر ہوتے تھے۔ (تاریخ عروج عہد انگلیشیہ صفحہ ۶۹۹)

۳۱ اگست۔ فوجی عدالت کے ممبروں نے مہاجنوں کو بلایا اور ان سے روپیہ مانگا۔ (حکماً طلب نہیں کیا) مہاجنوں نے جواب دیا کہ شاہزادگان ہم سے تین لاکھ ستر ہزار روپیہ لے چکے ہیں۔ اب ہم میں مزید روپیہ دینے کی طاقت نہیں۔

دوسری جانب اُن کی دراز دستی ملاحظہ فرمائیے جن کے پاس کروڑوں کے خزانے محفوظ تھے۔ پٹیالہ، کشمیر، رام پور اور حیدرآباد جیسے راجاؤں اور نوابوں کی ہر طرح کی امداد بھی اُن کو حاصل تھیں۔ یہاں تک کہ پٹیالہ اور رام پور نے تو اس جنگ کو خود اپنے اسٹیٹ کی جنگ تصور کر لیا تھا۔ یہی جیون لال جی اپنی ڈائری میں رقمطراز ہیں:۔

۲ جون ۱۸۵۷ء۔ متھرا کے مشہور معروف مہاجن لکشمی چند کے گماشتہ نے محل میں یہ خبر دی کہ انگریزوں نے جنگی اخراجات کے لئے سیٹھ لکشمی چند سے ۲۵ لاکھ روپے قرض مانگے ہیں۔

۶ جون ۱۸۵۷ء۔ انگریزوں نے پانی پت اور کرنال کے مہاجنوں سے تین لاکھ روپے وصول کئے۔

۷ جون۔ خبر ملی مہاراجہ پٹیالہ (نریندر سنگھ) نے جو پانچ لاکھ روپے انگریزی فوج کے لئے بھیجے تھے۔ وہ انگریزی لشکر میں بحفاظت تمام پہونچ گئے

۲۲ جولائی۔ خبر ملی کہ لالہ چونی پرشاد نے لفٹنٹ گورنر سے وعدہ کر لیا ہے کہ جس قدر روپیہ کی ضرورت ہوگی میں دوں گا۔ خبر ملی کہ مہاجن روزانہ خاصہ لیکر انگریزی کیمپ میں پہونچا کرتا ہے۔

یہ رضا کارانہ امداد آگرہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ انگریزوں کے

اور بھی بہت سے وفادار تھے جو منھ مانگے سے زیادہ پیش کر دینا اپنے مستقبل کے لئے فال نیک سمجھتے تھے۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا جگہ جگہ ہندو مسلم سوالات کھڑے کر کے جلب منفعت کی کامیاب کوشش کی جانے لگی۔ چنانچہ بقول سر سید صاحب مرحوم ضلع بجنور میں فرقہ وارانہ سوال پوری شدت سے اٹھا مسٹر الیکزنڈر شکسپیر ضلع بجنور کے کلکٹر اور مسٹر جارج پامر جوائنٹ مجسٹریٹ تھے ان کے فرار کے بعد نواب محمود علی خاں[1] نے زمام حکومت سنبھال لی تھی ایک پرگنہ کے ہندوؤں کو جارج پامر صاحب نے اشارہ کیا اور انھوں نے دو قسطوں میں دس ہزار روپیہ ان انگریزوں کے پاس بھیجدیا جو نینی تال میں پناہ گزیں تھے۔

ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

بادشاہ نے متعدد راجاؤں۔ نوابوں اور زمینداروں سے امداد کی اپیل کی بہت سے راجاؤں اور نوابوں اور ذی اقتدار افراد کے نام انقلابی فوج کے افسروں کی فرمائش پر بادشاہ نے خطوط لکھے۔ مگر راجہ بلب گڑھ (ضلع گوڑگانوہ) نواب جھجر یا نواب مالاگڈھ جیسے چند زمینداروں کے علاوہ نامور راجاؤں اور مہاراجوں نے جواب دینا بھی پسند نہیں کیا اور جنھوں نے جواب دیا انھوں نے خود امداد کی درخواست کی۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے امداد کا وعدہ کیا مگر یہ وعدہ آخر تک شرمندہ وفا نہ ہو سکا۔

پہلے ہی روز میگزین کی تباہی انگریزوں کے لئے نشان کامرانی اور انقلابی فوجوں کے بڑے منصوبہ کی ناکامی تھی۔ اس کے بعد جد و جہد کر کے چوڑی والان میں دوسرا میگزین بنایا گیا جسکو انگریز کے خفیہ خیر خواہوں نے تباہ کر کے مفلوک الحال بادشاہ اور

---

[1] نواب محمود علی خاں صاحب کے حالات مضافات دہلی کے باب میں ملاحظہ فرمایئے۔

اس کے انقلابی ساتھیوں کی رہی سہی توانائی بھی ختم کر دی۔ شہر کے بڑے لوگوں کی مجلس بادشاہ نے ۲۷ رمئی ہی کو بنا دی تھی۔ خوراک اور رسد وغیرہ کے جملہ انتظامات اس کے سپرد کر دیئے تھے۔ پھر جنگی کونسل اور فوجی عدالت بھی قائم کر دی پھر ۴ر ستمبر کو جے پور، جودھپور، الور اور بیکانیر کے راجاؤں کو یہ بھی لکھ دیا کہ وہ مجلس بنالیں شاہی اختیارات اُن کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔[۱] مگر افسوس صدائے برنہ خاست۔

خرچہ جنگ

انقلابی فوج کی تعداد دہلی میں پچاس ہزار کے قریب تک پہونچ گئی تھی۔ اوسطاً فوج کا ماہانہ خرچ پانچ لاکھ تہتر ہزار[۲] روپیہ ماہانہ تھا۔ اس طرح چار ماہ دورِ حکومت میں تقریباً[۳] تیئس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ دہلی شہر کے علاوہ متعدد فوجیں اپنے ساتھ کچھ خزانے لائی تھیں۔ بہت تھوڑی رقم محصولات کے ذریعہ وصول ہوئی بہادر شاہ کے پاس جو کچھ[۴] تھا یہاں تک کہ سامان آرائش اور فرنیچر وغیرہ وہ بھی فروخت کیا گیا تب یہ مصارف پورے ہو سکے اور وہ شاہزادے جن کی چیرہ دستیوں اور استحصال بالجبر کے قصے آجتک بیان کئے جاتے ہیں۔ بقول شمس العلماء ذکاء اللہ خاں اُن پر ایسے وقت بھی گذرے کہ لوگ اُن کو مبارکباد دیتے تھے کہ بادشاہت اُن کے گھر آئی۔ وہ مبارکباد کے جواب میں کہتے کہ اس بادشاہت سے وہ غلامی بہتر تھی کہ دو وقت کھانے کو مل جاتا تھا اب تو اس کے بھی لالے پڑے ہوتے ہیں۔

بہر حال جب حالات یہ ہوں تو شکست کے یقینی ہونے میں کس کو تامل ہو سکتا تھا۔ بس وہ شکست اور تباہی جو ماہ ستمبر میں پیش آئی حیرت انگیز نہیں۔

---

[۱] غدر کی صبح و شام ص۲۴۲ و ص۲۴۳ [۲] ایضاً ص۲۳۸ [۳] ایضاً ص۲۴۲ وغیرہ

البتہ حیرت انگیز یہ ہے کہ چار ماہ مسلسل ایسی شان سے مقابلہ ہوتا رہا کہ بار بار انگریزی فوجوں کے چھکے چھوٹ گئے ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ انہیں پریشانیوں اور رات دن کی گھٹن میں دو کمانڈر جان سے گئے۔ ایک نے استعفا دیکر جان بچائی۔ مگر انگریزوں کا اقبال سامنے تھا کچھ غیر معمولی ہمت اور حوصلے کے کمانڈر میسر آتے رہے بلکہ آگے بڑھکر کمان سنبھالتے رہے تازہ دم فوج کی بھیڑ کے ساتھ بیشمار سامان جنگ سے پوری دہلی کا محاصرہ کر لیا گیا۔ پھر تقریباً ایک ماہ تک جس شدت سے دہلی شہر پر گولہ باری اور حملے ہوتے رہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے ایک چشم دید شاہد کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔

راقم الدولہ ظہیر دہلوی کا بیان ہے:۔

ادھر پہاڑی پر فرنزیر کی کوٹھی سے باڈنے رفلیگ اسٹاف تک انگریزی فوج کے مورچے تھے۔ ادھر کشمیری دروازہ کے برج سے کابلی دروازہ کے سیاہ برج تک اور لاہوری دروازہ کے برج سے فراش خانہ کی کھڑکی کے برج تک توپیں چڑھی ہوئی تھیں اور باہم شبانہ روز گولہ باری ہوتی تھی اور شیل اور بم کے گولے شہر پر پڑتے تھے۔ بم کا گولہ۔ خدا پناہ میں رکھے۔[۱] جس وقت پھٹتا تھا اور صدہا ٹکڑے اس کے اڑ جاتے تھے

۱؎ مگر دہلی والوں کی خوش طبعی کا یہ رنگ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس حالت میں جس سے ظہیر صاحب پناہ مانگ رہے ہیں، ان کی تفریح اور خوش مزاجی ختم نہیں ہوئی تھی بقول خواجہ حسن نظامی مرحوم و مغفور انگریزی توپوں کی گولہ باری ان کے لئے شب برات کی آتش بازی کی طرح تماشا ہو گئی تھی۔ مکانوں کی چھتوں پر لوگ چڑھ جاتے اور گولوں کی سیر دیکھتے۔ جب گولہ آتا تو غل مچاتے وہ آیا وہ آیا۔ گرتا تو شور مچاتے وہ مارا۔ کہیں قریب میں گرتا تو سیکڑوں دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے۔ خواجہ حسن نظامی رحمۃ اللہ علیہ کے والد مرحوم ہمایوں کے مقبرہ کی چھت پر چڑھ کر تماشا دیکھا کرتے تھے اس تماشے ہی میں ان کو اس کا بھی احساس ہوا کہ آواز کی رفتار سے روشنی کی رفتار زیادہ تیز ہے کیونکہ گولہ چھوٹنے کے وقت

اگر سات درجے کے مکان پر پڑا تو تہ کو اُتر گیا اور سب کا ستیاناس
کر دیا۔ اگر زمین پر گرا تو دس گز زمین میں پیوست ہوکر پھوٹا۔ اور تمام
مکان کو اڑا دیا۔ غرض ایک قہر خدا تھا۔ دس دس گولے برابر کاغذ کے
پرچوں کی طرح رات کو اڑتے چلے آتے تھے۔

۱۴ ستمبر کو کشمیری دروازہ اڑایا جا چکا تھا۔ انگریزی فوجیں شہر میں گھس چکی تھیں اور چار حصوں میں تقسیم ہوکر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ مگر دہلی کے گلی کوچوں میں اس شدت سے مدافعت جاری تھی اور وطن عزیز کے ایک ایک چپہ پر محبان وطن اس طرح جانیں قربان کر رہے تھے کہ انگریزی فوج پھر ایک مرتبہ ہیبت زدہ ہوگئی۔ کیونکہ بڑے بڑے فوجی افسر کام آچکے تھے۔ اور وہ بہادر جرنیل "نکلسن" جو تنہا دو ہزار کی برابر مانا جاتا تھا ۱۴ ستمبر کو زخموں سے چور ہوکر ہسپتال میں داخل اور زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔

آج ۱۵ ستمبر ۱۸۵۷ء کی صبح ہے۔ انگریزی جرنیل "ولسن" "شش و پنج میں پڑا ہوا ہے کہ فوجوں کو پیش قدمی کا حکم دے یا پسپائی کا۔ مگر انگریزوں کی خوش قسمتی سے ابھی تک اپنی قوم پر قربان ہونے والے بہادر "نکلسن" کے بدن میں جان باقی تھی اس کے ہوش و حواس درست اور جذبات زندہ تھے۔ اسے معلوم ہوا کہ "ولسن" "شش و پنج میں پڑا ہوا ہے اور بہت ممکن ہے فوجوں کو واپسی کا حکم دیدے وہ اپنی تکلیف بھول گیا۔ زخموں سے کراہنے والی آواز غصہ اور جوش سے بھر آگئی اور اس نے دانت پیس کر کہا۔

"ابھی مجھ میں اتنی طاقت باقی ہے کہ "ولسن" کو گولی سے اڑا دوں"

مرنے والے کی اس گرج نے زندہ دلوں میں نئی زندگی پیدا کی ۔ شکست و رنج کے بجائے نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا اور فوجوں کو پیش قدمی کا حکم دیدیا گیا ۔ مگر دوسری طرف وطن عزیز کی حرمت پر قربان ہونے والوں کی حالت یہ تھی کہ انھوں نے دور دور تک پیش قدمی کو ناممکن بنائے رکھا ۔ اور جب شہیدوں کے پشتوں پر گذرتے ہوئے انگریزی فوجوں نے لال قلعہ کی طرف بڑھنا شروع کیا تو ایک ایک قدم پر وہ خونریز لڑائی لڑنی پڑی کہ کشمیری گیٹ سے لال قلعہ تک صرف ۶ فرلانگ کا راستہ پانچ دن میں طے ہو سکا اور وہ بھی اس لئے کہ بادشاہ لال قلعہ کو خالی کر چکا تھا ۔

دیوان خاص پر قبضہ اور ملکہ وکٹوریہ کا جام صحت

۱۹ ستمبر کو بادشاہ قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ گیر ہوا تو ۲۰ ستمبر کو بعد دوپہر "ولسن" نے قلعہ میں داخل ہو کر دیوان خاص کو اپنا صدر مقام بنایا اور تخت طاؤسی کے چبوترے پر بیٹھ کر بادۂ ناقرجام سے ملکہ وکٹوریہ کا جام صحت نوش کیا۔[۱]

جنرل بخت خاں کی آخری کوشش اور ناکامی

ابھی بادشاہ لال قلعہ سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ "جنرل بخت خاں" باریاب ہوا ۔ اس نے بادشاہ کو تسلی دی کہ یہ ناکامی فیصلہ کن نہیں ہے ۔ صرف ایک شہر ہاتھ سے نکلا ہے ۔ پورا ملک آپ کے لئے جان قربان کر رہا ہے ۔ دہلی شہر جنگ کے لئے موزوں مقام نہیں تھا ۔ دشمن کی فوجیں بلندی پر تھیں ۔ شہر نشیب میں ٹھیک

---

[۱] لال قلعہ ۱۶۴۸ء میں مکمل ہوا تھا ۔ دو سو نو سال کے بعد اس کے در و دیوار نے پہلی مرتبہ اجنبی حکمراں کا جام صحت تجویز ہونے کی صدا سُنی (غلام رسول مہر)

اُن کی توپوں کی زد میں تھا۔ سامان رسد اور اسلحہ کی فراہمی بھی مشکل تھی اور ابتدا ر میں ناواقف افسروں کی ناتجربہ کاری سے جو نقصان ہو چکا تھا اُس کی تلافی ناممکن ہو گئی تھی اور پھر مرزا مغل کی خود غرض ضدی طبیعت کی مداخلت نے آخر تک نظام کو درست نہیں ہونے دیا تھا۔ آپ ہرگز مایوس نہ ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ بادشاہ نے جنرل بخت خاں کی کسی دلیل کی بھی تردید نہیں کی۔ بظاہر اُس کا میلان بھی یہی تھا مگر اس وقت اُس نے کوئی جواب بھی نہیں دیا اور جنرل بخت خاں کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ کل کو ہمایوں کے مقبرے میں ملاقات کریں۔ فیصلہ اس وقت ہوگا۔

ادھر "گرگ باراں دیدہ" انگریزی افسر بھی یہ سمجھتے تھے کہ اگر بادشاہ نکل گیا تو اُن کی ساری کوششوں پر پانی پھر جائے گا اور پھر فتح اور کامیابی ناممکن نہ سہی تو مشکل ضرور ہو جائے گی۔ لہذا اپنے تمام ذرائع بادشاہ کو روک لینے میں صرف کر دیئے۔

منشی رجب علی، انگریزوں کی خفیہ کارروائیوں کا سب سے بہتر مہرہ تھا۔ مرزا الٰہی بخش۔ بہادر شاہ کا سمدھی جس کے دل میں مفاد پرست جذبات کی موجوں کے ساتھ یہ خلش بھی ہمیشہ رہتی تھی کہ پہلا ولی عہد جو صحیح معنیٰ میں ولی عہدی کے اہل تھا اس کا قابل داماد فخرالدین فتح الملک عرف "مرزا فخرو" تھا جس کی ناوقت موت کے بارے میں لوگوں کا گمان یہ بھی تھا کہ اس کو زہر دیدیا گیا تھا۔

غرض یہی الٰہی بخش جو اس خلش کے ساتھ یہ نیک نامی بھی لئے ہوئے تھا کہ انگریزوں کا تنخواہ دار رہے دوسرا مہرہ تھا۔ بادشاہ کی چہیتی بیگم زینت محل جس کی تمام تمنائیں اس پر منحصر ہو گئی تھیں کہ اُس کا لڑکا "جواں بخت" ولی عہد بنا دیا جائے۔

غرض جب یہ مختلف عناصر ہر طرف سے بوڑھے بادشاہ کو گھیرے ہوئے تھے جس کو

حوادث نے اب ضعیف الرائے بلکہ خفیف العقل بھی بنا دیا تھا تو ناممکن تھا کہ جنرل بخت خاں کی مخلصانہ درخواست منظور ہوتی۔

مرزا الٰہی بخش نے ایک چھبتی ہوئی بات بادشاہ کو یہ بھی بتائی کہ "بخت خاں" روہیلہ پٹھان ہے۔ پٹھان ہمیشہ مغلوں کے مخالف رہے ہیں۔ شیر شاہ نے ہمایوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تھا اور ابھی ساٹھ ستر برس پہلے کی بات ہے کہ غلام قادر روہیلہ نے جہاں پناہ کے دادا خلد آشیاں شاہ عالم بادشاہ کو کس طرح ذلیل کیا تھا۔ اور اُن کی آنکھیں نکال لی تھیں۔ غرض ۲۰ ستمبر کو جنرل بخت خاں بادشاہ سے ملا تو بادشاہ کا جواب یہ تھا۔ بیشک آپ کی رائے ٹھیک ہے مگر میرا بڑھاپا اس پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں۔ آپ اپنا کام کرتے رہیں۔

بخت خاں بادشاہ کا جواب سُن کر رخصت ہوا اور اپنی پوری فوج کے ساتھ جمنا پار کر کے روہیلکھنڈ پہونچ گیا۔ اس بہادر جرنیل کے جنگی کمالات جو کچھ بھی ہوں اس کے تدبر اور حُسن انتظام کی بہترین مثال یہ ہے کہ دو ماہ کی معرکہ آرائی کے بعد اپنی پوری فوج کو صحیح سالم نکال کر لے گیا۔ جب آیا تھا تو پوری فوج کی چھ ماہ کی تنخواہ پہلے ادا کر چکا تھا۔ مزید مصارف کے لیے مبلغ چار لاکھ روپیہ ساتھ لایا تھا۔ غرض وہ یا اس کی فوج کا کوئی فرد شاہی خزانہ یا باشندگان دہلی پر بار نہیں بنا۔ بخت خاں کی روانگی کے بعد تاخیر کی کیا ضرورت تھی۔ اگلے ہی روز بادشاہ گرفتار کر لیا گیا۔ جواں بخت کے علاوہ جو شاہزادے آج ہاتھ لگے وہ آج قتل کر دیئے گئے۔ خاندان شاہی کے باقی افراد کی تلاش جاری رہی۔ جہاں ملے قتل کر دیئے گئے۔ یا پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔

زینت محل کے علاوہ شاہی خاندان کی باقی خواتین جان بچانے کے لیے محلوں سے نکلیں

انہ رخدا جانے کتنی کتنی مصیبتیں اٹھاکر آخری انجام کو پہونچیں۔ اس داستان پارینہ سے عبرت لینی ہو تو خواجہ حسن نظامی مرحوم کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے اور ۱۹۵۷ء میں جو بہت سی تصانیف شائع ہوئی ہیں ان میں بادشاہ کی گرفتاری سے لیکر اس کی وفات تک کے حالات تحریر کئے گئے ہیں ان کو مطالعہ کر لیا جائے۔ احقر کی جانب سے کسی قدر تغیر کے ساتھ یہ معذرت قبول فرمالی جائے۔

نہ شہم نہ شاہ پرستم کہ حدیث شاہ گویم
من بندہ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

ایک سوال اور اس کا جواب

جنرل بخت خاں کے ساتھ بادشاہ کا جانا۔ اگر انقلابی فوجوں کے لئے حوصلہ افزائی کا سبب تھا تو انگریزوں کے حق میں دہلی کی فتح بھی کچھ کم حوصلہ افزا نہ تھی۔ کیونکہ یہ فتح انگریزوں کے حامیوں کے لئے "داس امید" تھی۔ جو ان کے عہد وفا میں صرف استحکام ہی نہیں بلکہ ولولے بھی پیدا کر رہی تھی ـــــ۔ جنرل بخت خاں نے دہلی سے واپس ہو کر روہیلکھنڈ کا مورچہ سنبھالا۔ وہ غالباً بادشاہ کو بھی یہیں لاتا۔ اس وقت لکھنؤ، کانپور اور روہیلکھنڈ کی حدود میں آزاد حکومت آسانی سے قائم ہو سکتی تھی۔ لیکن جبکہ جنوبی ہند اور پنجاب کا بیشتر حصہ انگریزوں کا ہمنوا اور مددگار تھا۔ بندرگاہوں پر انگریزوں کا قبضہ تھا جن کے راستے سے ہر قسم کی امداد انگریزوں کو دوسرے مقبوضات اور خود انگلستان سے پہونچ سکتی تھی اور انگریزوں کو بہترین جرنیل اور اپنے مضبوط و مستعد مرکزوں کی رہنمائی اور امداد بھی حاصل تھی تو شمالی ہند کی اس نوخیز مملکت کے لئے کامیابی تو پھر بھی قدرت کے کسی معجزہ پر موقوف رہتی۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ آپس کی مفاہمت سے خود مختار

ریاستیں قائم ہو جاتیں اور وہ بے پناہ جانی و مالی نقصان جو ۱۸۵۷ء کے بعد سالہا سال تک ہندوستانیوں کو بالخصوص محبان وطن کو برداشت کرنا پڑا۔ اس سے پناہ مل جاتی ،

بہر حال یہ ماضی کے متعلق ایک قیاس لاحاصل ہے جس کو طویل کرنے کے بجائے مختصر کر دینا بلکہ ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

فتویٰ کی نوعیت اور اس کی ضرورت

جہاد۔ اور جب تک جہاد کی طاقت نہ ہو تو جہاد کی تیاری۔ یہ فتویٰ تو اسی وقت سے تھا جب نصف صدی پہلے دنیائے اسلام کے مفتی اعظم حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا تھا کہ

"اس اطراف میں اور یہاں سے لیکر کلکتہ تک نصاریٰ کا حکم جاری ہے وہ بلا روک ٹوک جو کچھ چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ عبادت گاہوں تک کو مسمار کر ڈالتے ہیں۔ مذہب کا کوئی احترام ان کی نظر میں نہیں ہے[1]

اس فتوی پر عمل کرتے ہوئے آپ کے مرید خاص اور آپ کی تحریک کے علمبردار حضرت سید احمد صاحب شہید نے مہاراجہ گوالیار سے امداد کی اپیل کی تھی اور شکوہ کیا تھا کہ

"بیگانگان بعید الوطن۔ ملوک زمین و زمان گردیده۔ و تاجران متاع فروش بپایہ سلطنت رسیده"

سات سمندر پار کے اجنبی۔ زمین و زمان کے بادشاہ بن گئے ہیں اور

---

[1] ماخوذ از فتاوی عزیزیہ۔ ملاحظہ ہو شاندار ماضی ج ۲

نیچنے والے سوداگر سلطنت کے مرتبہ پر پہونچ گئے ہیں۔ ؎۱

پس اگر آج دین اور دھرم کے نام پر ہندو اور مسلمان اٹھتے ہیں۔ اور ان "تاجران متاع فروش اور بیگانگان بعید الوطن" سے اپنے وطن عزیز کو پاک کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیتے ہیں تو اس کے لئے نہ مسئلہ پوچھنے کی ضرورت ہے نہ فتوے حاصل کرنے کی حاجت۔

چنانچہ نہ میرٹھ کے فوجیوں نے کسی سے مسئلہ پوچھا اور نہ جب دہلی کے باشندوں نے دہلی میں ان کا استقبال کیا تو ان کو کسی فتوے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رح کے فتوے کے بعد انگریزی ڈپلومیسی کا دارالافتار ؎۲ بھی برابر کام کرتا رہا۔ اس نے پہلے حضرت سید احمد شہید اور حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رح کو دہابیت زدہ اور معاذ اللہ لادین قرار دیا۔ پھر مسئلہ کو الجھانے اور کھلی ہوئی حقیقت کے چہرہ پر نقاب ڈالنے کے لئے انوکھا پہلو یہ پیش کر دیا کہ:۔

"انگریز حاکم وقت ہے، مسلمان اس کی پناہ میں ہیں (مستامن ہیں) پس اطاعت واجب ہے اور غدر حرام"

اس نظر فریب مغالطہ کو جس طرح مفاد پرست، سرکاری ملازموں اور خود غرض اقتدار پرستوں نے اپنے بچاؤ اور اپنی کرتوتوں کے جواز کے لئے سند بنایا تھا

؎۱ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شاندار ماضی جلد دوم

؎۲ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ہمارے ہندوستانی مسلمان (از ڈاکٹر ہنٹر) کا ضمیمہ بالخصوص ضمیمہ ۳

ایسے ہی کچھ سادہ لوح علماء اور مشائخ بھی اس فریب میں آ گئے تھے[۱]

سرسید مرحوم کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر بھی اس ڈپلومیسی کو کام میں لانے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ ایک فتویٰ مرتب کیا گیا کہ یہ ہڑبونگ اور فساد ہے، جہاد نہیں ہے لہٰذا اس میں شرکت حرام ہے۔

اس فتویٰ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی اشاعت نہیں ہو سکی اور اس کی اصل بھی ایسی ناپید ہو گئی کہ سرسید صاحب کو بھی دستیاب نہیں ہوئی صرف اس کی نقل مل سکی۔ اور وہ بھی کسی قابل اعتماد، باوثوق شخص کے ذریعہ نہیں بلکہ ایسے ذریعہ سے جو خود سید صاحب کے نزدیک بھی غیر قابل اعتبار تھا۔[۲]

---

[۱] حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ فرماتے ہیں۔ اس داھیہ کبریٰ (۱۸۵۷ء کے انقلابی حادثہ) میں مولانا محمد اسحاق صاحب کی نئی جماعت پھر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ الصدر الحمید (مولانا محمد اسحاق صاحب) نے جس طائفہ کو نئی تنظیم میں مرکزی اختیارات دیئے تھے وہ طائفہ تو سلطان دہلی کا طرفدار ہو گیا اور سلطانی تحریک کی شکست کے بعد مولانا محمد اسحاق کی طرح حجاز پہونچ گیا چنانچہ امیر امداد اللہ (حاجی امداد اللہ صاحب) اور مولانا عبدالغنی، مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی کے ساتھ حجاز میں بیٹھ کر اپنی ہندوستانی تحریک کی رہنمائی کرتے رہے

اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد اسحاق کے متبعین کی پہلی صف میں سے علماء اور صوفیہ کا کثیر حصہ سلطان دہلی کی لڑائی میں غیر جانبدار بن گیا۔ اس کا حاصل یہ سمجھنا چاہیئے کہ الصدر الحمید کی تنظیم کے بالمقابل اگر پٹنہ میں پارٹی قائم ہو چکی تھی تو اب خود الصدر الحمید کے اپنے فرقہ میں سے ایک مخالف جماعت دہلی میں بھی پیدا ہو گئی۔ مولانا سید نذیر حسین دہلوی اور مولانا شیخ محمد تھانوی کی اس دوسری جماعت کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۱۰۳)

[۲] کس قدر عجیب تماشہ ہے جن کو سرسید لچے شہدے جیسے الفاظ سے یاد کر رہے ہیں، ان کے پاس تو وہ فتوے موجود ہیں جن پر اس دور کے پر تقدس اور متقی و پرہیزگار علماء و مفتیان کرام کے دستخط ثبت ہیں اور سر سید صاحب کے ہمنوا جو سرسید صاحب کے ارشاد کے مطابق مقدس پرہیزگار با وقار اور سنجیدہ ہوں گے وہ......

بہرحال فتویٰ ہوا یا نہ ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ خود سر سید صاحب کا مسلک یہی تھا اور اسی وجہ سے وہ انگریز کی وفاداری میں یہاں تک بڑھے ہوئے تھے کہ اس کی حمایت میں اپنے ملک اور اپنی ملت کے کسی بھی بڑے آدمی کی کوئی وقعت اُن کی نظر میں نہیں تھی۔ انتہا یہ کہ مجاہدین حریت اور محبان وطن کے تذکرہ کے وقت وہ کچھ ایسے بے قابو ہو جاتے ہیں کہ دہلی کی روایتی تہذیب کا دامن بھی اُن کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور ایک ایسا انداز اختیار کر لیتے ہیں جس پر بازاری لوگوں کو بھی شرم آجاتی ہے۔

اچھا اب آپ اس انداز نگارش کو نظر انداز فرما کر سید صاحب کی تحریر ملاحظہ فرمایئے، جس سے فتوے کے مسئلہ پر روشنی پڑے گی۔ سر سید صاحب اسباب بغاوتِ ہند میں تحریر فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں کا بہت روزوں سے آپس میں سازش اور مشورہ کرنا اس ارادہ سے کہ ہم باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے لوگوں پر جہاد کریں اور اُن کی حکومت سے آزاد ہو جائیں، نہایت بے بنیاد بات ہے جبکہ مسلمان ہماری گورنمنٹ کے مستامن تھے کسی طرح[1] گورنمنٹ کی

---

[1] حضرت سید احمد شہید بالخصوص مولانا اسمٰعیل شہید جو اسی دہلی کے رہنے والے تھے سر سید صاحب نے اُن کے جہاد کی تاویل یہ کر دی کہ

"بیس تیس برس پیشتر ایک بہت بڑے نامی گرامی مولوی محمد اسمٰعیل نے ہندوستان میں جہاد کا وعظ کہا اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی اس وقت اُس نے صاف بیان کیا کہ ہندوستان کے رہنے والے جو سرکار انگریزی کے امن میں رہتے ہیں ہندوستان میں جہاد نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہزاروں آدمی جہادی ہر ایک ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے اور سرکاری عملداری میں کسی طرح کا فساد نہیں کیا اور غربی سرحد پنجاب پر جا کر لڑائی کی۔" اسباب بغاوت ہند ص۲۵۔ سر سید مرحوم کی اس تاویل کے متعلق محترم غلام رسول صاحب مہر کی تحقیق بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ مہر صاحب فرماتے ہیں۔ میں جہاں تک تحقیق کر سکا ہوں سب سے پہلے سر سید احمد خاں مرحوم نے سید صاحب شہید کے جہاد کا رُخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرا۔ سید احمد شہید ص۲۵۲ مزید تحقیق کے لئے اصل کتاب ملاحظہ ہو نیز شاندار ماضی ج۲ میں بھی اس پر کافی بحث گذر چکی ہے۔

عملداری میں جہاد نہیں کر سکتے تھے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

اور یہ جو ہر ضلع میں پاجی[1] اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا اگر ہم اس کو جہاد ہی فرض کریں تو بھی اس کی سازش و اصلاح قبل دسویں مئی ۱۸۵۷ء مطلق نہ تھی۔ غور کرنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں جن لوگوں نے جھنڈا جہاد کا[2] بلند کیا ایسے خراب اور بدرویہ اور بداطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ و رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ اُن کا نہ تھا۔ بھلا یہ کیونکر پیشوا اور مقتدا جہاد کے گنے جا سکتے تھے اس ہنگامے میں کوئی بات بھی مذہب کے مطابق نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ سرکاری خزانہ اور

لہ مولانا احمد اللہ شاہ۔ مولانا لیاقت علی۔ مولانا فیض احمد۔ مولانا کفایت علی۔ مولانا محمد قاسم صاحب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی۔ مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی جیسے اکابر علماء کو خدا جانے سید صاحب نے ان دونوں لفظوں کا مصداق سمجھا ہے یا کسی ایک کا (تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو) ہاں سر سید صاحب کی طرف سے یہ معذرت کی جا سکتی ہے کہ اُن کے پیش نظر مغل شاہزادے اور اطراف و جوانب کے وہ نواب اور ... تھے جو اگرچہ اس وقت تحریک انقلاب میں پیش پیش تھے مگر ان کی اخلاقی زندگی ہمیشہ خراب و خستہ رہی تھی۔ ۲ہ سید صاحب نے مسلمانوں کی طرف سے صفائی دیتے ہوئے یہ کتاب لکھی ہے سید صاحب صدر امین ضرور تھے مگر وکیل نہیں تھے۔ اگر سید صاحب قابل وکیل ہوتے یا صفائی دینے کے لئے کسی قابل وکیل سے مشورہ ہی کر لیتے تو علمبرداران حریت پر یہ غلط الزام نہ لگاتے شمس العلماء ذکاء اللہ خاں نے صرف جہادی وہابیوں پر اس بغاوت کی ذمہ داری ڈالی ہے جن کا ایک ایک فرد شہید ہو چکا تھا۔ سید صاحب بھی یہی طریقہ اختیار کرتے تو موجودہ مسلمانوں کی طرف سے صفائی ہو جاتی یعنی جہادی باغی شہید ہو چکے اور جو اس وقت موجود ہیں وہ ہمیشہ وفادار رہے مگر علماء اور اکابر دین کو دشنام دہی جو سید صاحب کا مخصوص ذوق تھا وہ تشنہ رہ جاتا۔ افسوس۔

اسباب جو امانت تھا۔ اُس میں خیانت[۱] کرنا۔ ملازمین[۲] کو نمک حرامی کرنی، مذہب کی رو سے درست نہ تھی۔ صریح ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل علی الخصوص عورتوں، بچوں اور بڈھوں کا۔ مذہب کے بموجب گناہ عظیم[۳] تھا۔ پھر کیونکر یہ ہنگامۂ غدر جہاد ہو سکتا تھا۔ ہاں البتہ چند بد ذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پورے کرنے اور جاہلوں کے بہکانے کو اور اپنی ساتھ جمعیت جمع کرنے کو جہاد کا نام لے دیا۔ پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرمزدگیوں میں سے ایک حرمزدگی تھی نہ واقع میں جہاد۔

---

[۱] یہ سید صاحب کا قصور فہم اور اُن کے نظریہ کی غلطی ہے۔ مجاہدین ان بعید الوطن بیگانوں کو حاکم اور امیر نہیں تسلیم کرتے تھے بلکہ ان کو غاصب بدعہد اور خائن سمجھتے تھے۔ سرکاری خزانہ اور اسباب، امانت نہیں تھا بلکہ مال مغصوبہ تھا اس کے اصل مالک ہندوستانی تھے۔ انگریزوں نے جبر و قہر سے جس کو قانون کی شکل دیدی گئی تھی ہندوستانیوں کا مال لوٹا تھا چھینا تھا۔ لہذا ہندوستانیوں کو اس مال کے واپس لینے کا حق تھا۔ انقلابی مجاہدین نے اپنا یہی حق حاصل کیا تھا۔ [۲] یہ ملازمت دفع الوقتی تھی۔ اپنی معاشی ضرورتوں کے لئے ہر وقت اس ملازمت کو ختم کر دینے کا حق تھا۔ مجاہدوں نے جو کچھ کیا ملازمت ختم کرنے کے بعد کیا۔ اور نمک حرام ہندوستانی ملازم نہیں تھے بلکہ انگریز تھے جنھوں نے شاہ عالم سے دیوانی حاصل کر کے اتنی بڑی نمک حرامی کی تھی کہ نمک حرامی کی پوری تاریخ میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

[۳] بیشک گناہ عظیم تھا بلکہ اس سے بھی بدتر لفظ اس کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نکتہ سنجان قضاء و قدر کا انکشاف تو یہ ہے کہ یہی بے عنوانی اس تحریک کی ناکامی کا سبب بنی۔ معاذ اللہ۔ باقی یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک ایک کے بدلہ میں سو سو اور کہیں اس سے بھی زیادہ کو قربان کرنا پڑا اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کو قتل اس بنا پر کیا کہ یہ جاسوسی کر رہے تھے البتہ اتنی کی ضرور ہوئی کہ مصنوعی عدالت میں ان کو پیش کر کے کورٹ مارشل نہیں کرایا گیا۔

پھر ارشاد ہوتا ہے۔

دلی میں جو فتویٰ جہاد کا چھپا وہ ایک عمدہ دلیل جہاد کی سمجھی جاتی ہے۔ مگر میں نے تحقیق سے سنا ہے اور اس کے اثبات پر بہت دلیلیں ہیں کہ وہ محض بے اصل ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جب فوج نمک حرام میرٹھ سے دلی میں گئی تو کسی نے جہاد کے باب میں فتوٰے چاہا۔ سب نے فتوٰے دیا کہ جہاد نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس پہلے فتویٰ کی میں نے نقل دیکھی ہے مگر جبکہ وہ اصل فتویٰ معدوم ہے تو میں اس نقل کو نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں تک لائق اعتماد کے ہے۔ مگر جب بریلی کی فوج دلی میں پہونچی اور دوبارہ فتویٰ ہوا جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا واجب لکھا ہے بلاشبہ اصلی نہیں۔ چھاپنے والے اس فتوے کے نے جو ایک مفسد اور بہت قدیمی بدذات آدمی تھا۔ جاہلوں کے بہکانے اور ورغلانے کو لوگوں کے نام لکھ کر اور چھاپ کر اس کو رونق دی تھی بلکہ ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا۔ مگر مشہور ہے کہ چند آدمیوں نے فوج باغی بریلی اور اُس کے مفسد ہمراہیوں کے جبر اور ظلم سے مہریں بھی کی تھیں۔

دلی میں ایک بڑا گروہ مولویوں اور اُن کے تابعین کا ایسا تھا کہ وہ

لہ درست ہے مگر اس سے فتویٰ جہاد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ جہاد اس لئے نہیں تھا کہ معزول کو دوبارہ بادشاہ بنا دیں بلکہ جہاد کی غرض انگریزوں کو نکالنا تھا جیسا کہ آئندہ فتوے کے سوال اور جواب سے ظاہر ہو گا۔ البتہ چونکہ اس وقت میرٹھ کی فوج نے بہادر شاہ کو بادشاہ بنا لیا تھا اس لئے اہل علم کی رائے میں اختلاف ضرور پیدا ہو گیا۔ جیسا کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے جو پہلے حاشیہ میں گذر چکی ہے۔

مذہب کی رو سے معزول بادشاہ دلی کو بہت[1] برا اور بدعتی سمجھتے تھے اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ دلی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبض و دخل اور اہتمام ہے اُن مسجدوں میں نماز درست نہیں چنانچہ وہ لوگ جامع مسجد میں نماز نہیں پڑھتے تھے اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے اس معاملہ میں موجود ہیں۔ پھر کبھی عقل قبول کر سکتی ہے کہ ان لوگوں نے جہاد کے درست ہونے میں اور بادشاہ کو سردار بنانے میں فتویٰ دیا ہو۔

جن لوگوں کی مہر اس فتویٰ پر چھاپی گئی ہے اُن میں سے بعضوں نے عیسائیوں کو پناہ دی اور اُن کی جان و عزت کی حفاظت کی۔[2] اُن میں سے کوئی شخص[3] لڑائی پر نہیں چڑھا۔ مقابلے پر نہیں آیا۔ اگر واقع میں وہ ایسا ہی سمجھتے جیسا کہ مشہور ہے تو یہ باتیں کیوں کرتے۔[4]

---

[1] مگر انگریزوں سے برا کوئی بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اسی بنا پر انہیں علماء کی اکثریت نے جہاد میں حصہ لیا اور جام شہادت سے سرشار ہوئے۔ رحمہم اللہ [2] دشمن اگر پناہ مانگے تو پناہ دینا فتویٰ جہاد کے خلاف نہیں بلکہ جس کلام پاک کی روشنی میں جہاد کا فتویٰ دیا جاتا ہے اس کا حکم ہے وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتیٰ یسمع کلام اللہ۔ اگر بر سرِ جنگ مشرکوں میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دیدو تاکہ اس کو توفیق ہو کہ اللہ کی بات سنے اور اس پر عمل کرے (سورۂ توبہ) بالخصوص عورت کا معاملہ تو بہت ہی نازک ہے حدیث میں خصوصیت سے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے قتل کی ممانعت ہے۔

[3] غلط ہے۔ مولانا محمد سرفراز علی صاحب جنرل بخت خاں کے پیر و مرشد جن کی سربراہی میں جنرل بخت خاں دہلی پہونچے اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی جیسے بزرگوں کے جہاد کا ہمیں علم ہے اور باقی کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ علاوہ ازیں جب ماہر جنگ سپاہ اور فوج موجود تھی تو لازم بھی نہیں تھا کہ جو جنگ کے ماہر نہ ہوں وہ میدان میں کود پڑیں "ہر کسے را بہر کارے ساختند" [4] اسباب بغاوت ہند ص ۱۰۱ تا ۱۰۲

سرسید صاحب کی اس طویل تحریر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے

(۱) مجاہدین حریت کے خلاف اس وقت بھی بدگمانیاں پھیلانے کی کوشش کی گئی اور نظام حکومت درہم برہم ہونے کے وقت جو حرکتیں عام شرارت پسند اور شہر کے اوباش کیا کرتے ہیں اور جو حرکتیں شاہی خاندان کے آوارہ منش ناتجربہ کار۔ نوجوانوں سے ہوئیں اُن کو بااخلاص مجاہدین اور شریف الطبع محبان وطن کے سر تھوپا گیا (معاذ اللہ)

(۲) ابتدا میں جہاد کا فتویٰ نہیں تھا۔ جنرل بخت خاں جب دہلی آئے تب فتویٰ مرتب کیا گیا۔

سرسید کے ہمنوا، شمس العلماء ذکاء اللہ خاں بھی یہی فرماتے ہیں اُن کی تحریر ملاحظہ ہو۔

"جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا جہاد کے فتوے کا چرچا[1] شہر میں بہت کم تھا، مساجد میں، ممبروں پر جہاد کا وعظ کمتر ہوتا تھا دلّی کے مولوی اور اکثر مسلمان خاندان تیموریہ کو ایسا خوار خبطہ جانتے تھے کہ وہ ناممکن سمجھتے تھے کہ اس خاندان کی بادشاہی ہندوستان میں ہو مگر اس کے ساتھ جاہل مسلمانوں کو یہ یقین تھا کہ انگریزی سلطنت کے بدن میں یہ ایسا پھوڑا نکلا کہ وہ جانبر نہیں ہوگی۔

یہ کام نچّے شہدے[2] مسلمانوں کا تھا کہ وہ جہاد جہاد پکارتے پھرتے تھے

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فتویٰ پہلے سے تھا لیکن اس کا چرچا نہیں تھا اور مسجدوں میں جہاد کے وعظ بھی کم ہوتے تھے۔

[2] خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

مگر جب "بخت خاں" جس کا نام اہل شہر نے "کم بخت[1] خاں" رکھا تھا دلی میں آیا تو اس نے یہ فتویٰ[2] لکھا یا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لئے فرض ہے کہ اگر کافروں کی فتح ہوگی تو وہ ان کے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالیں گے اس نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتوے پر دستخط و مہریں ان کی کرالیں اور مفتی صدر الدین نے بھی ان کے جبر سے اپنی جعلی مہر کر دی لیکن مولوی محبوب علی اور خواجہ ضیاء الدین نے فتویٰ پر مہریں نہیں کیں اور بیباکانہ کہدیا کہ شرائط جہاد موافق مذہب اہل اسلام موجود نہیں۔

اس فتویٰ کا اثر یہ تھا کہ جاہل مسلمانوں کا جوش مذہبی زیادہ ہو گیا جن مولویوں نے فتویٰ پر مہریں کی تھیں وہ کبھی پہاڑی پر انگریزوں سے لڑنے نہیں گئے۔ مولانا نذیر حسین جو وہابیوں کے مقتدا اور پیشوا تھے ان کے گھر میں ایک میم چھپی بیٹھی تھی اس فتویٰ پر کچھ مہریں اصلی اور کچھ جعلی تھیں۔ ایک مولوی کی مہر تھی جو غدر سے پہلے قبر میں سوچکا تھا۔[4]

(۳) سرسید اور شمس العلماء دونوں کے بیان اس پر متفق ہیں کہ فتوے پر کچھ دستخط اور مہریں فرضی تھیں کچھ نے اپنی رائے کے خلاف زور زبردستی سے دستخط کئے

---

[1] برعکس نہند نام زنگی کافور [2] یہ شمس العلماء کا خیال ہے فتوے کے الفاظ سے یہ نہیں معلوم ہوتا تفصیل آئندہ ملاحظہ فرمائیے [3] یعنی سرسید مرحوم کی طرح انگریزوں سے جہاد کو جائز نہیں کہا بلکہ یہ عذر کیا کہ جہاد کی شرطیں مثلاً مقابلہ کی پوری قوت وغیرہ موجود نہیں ہیں۔ یہی عذر حضرت شیخ محمد صاحب تھانوی نے بھی پیش کیا تھا [4] ملاحظہ ہو تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۷۵۔

مگر یہ نہیں فرمایا کہ ایسے بے کس و مجبور کون تھے جنھوں نے رعب میں آکر ایسے خطرناک فتوے پر جس کے نتیجہ میں موت سامنے تھی دستخط کر ڈالے اور جب کہ مولانا محبوب علی صاحب اور خواجہ ضیاء الدین مرعوب نہیں ہوئے انھوں نے کھلے بندوں مخالفت کی اور کوئی اُن کا بال بیکا نہیں کر سکا۔ تو اُن کے مرعوب اور مجبور ہونے کی کیا وجہ تھی۔

شمس العلماء نے مفتی صدرالدین صاحب کا نام لیا ہے کہ اُن کی مہر جعلی تھی اور دستخط مجبوراً ہوئے تھے اور ایک صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ مفتی صاحب نے ازراہِ ذکاوت دستخط سے پہلے لکھدیا۔ شہدت بالحر یعنی بالحر پہ نقطے نہیں لگائے تھے علماء نے بالخیر پڑھا۔ اور انگریزی تسلط کے بعد جب گرفتاری ہوئی تو مفتی صاحب نے اُس کو بالجبر پڑھ کر فرما دیا کہ میں تو پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ دستخط جبراً کئے ہیں۔ لیکن اول تو فتوے پر دستخط سے پہلے یا بعد میں یہ لفظ "شہدت بالخیر" بے معنیٰ ہے نہ یہ شہادت کا موقع ہے اور نہ "بالخیر" کا لفظ موقع اور محل سے کوئی مناسبت رکھتا ہے آخر اس کے کیا معنیٰ کہ میں نے گواہی دی خیر سے یا خیر کے ساتھ۔

اس کے علاوہ دوسری بات یہ کہ فتوے کی جو نقل صادق الاخبار میں چھپی ہے اُس میں مولانا کی مہر یا دستخط کے آگے پیچھے سرے سے کوئی عبارت ہی نہیں۔ پھر "جعلی مہر" بھی وضاحت طلب ہے۔ اگر مفتی صاحب نے دستخط کئے تھے تو مہر کی کیا ضرورت۔ اور اگر دستخط کے بجائے مہر لگا دی تھی تو وہ جعلی کیسے ہوئی۔

(۴) مولانا سید نذیر حسین صاحب کے متعلق بیانات مختلف ہیں۔ سر سید اور شمس العلماءٔ دونوں نے اُن کو مخالف قرار دیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کی تحقیق بھی یہی ہے کہ

حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ کے شاگردوں میں سے
مولانا سید نذیر حسین صاحب اور مولانا شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں
جو سلطان دہلی کی لڑائی میں غیر جانبدار رہے[۱]

منشی محمد جعفر تھانیسری نے تو ان کے متعلق بہت ہی سخت الفاظ لکھے ہیں بایں ہمہ اس موقع پر نہیں تو مقدمہ انبالہ کے سلسلہ میں راولپنڈی میں ایک سال تک یہ بھی نظربند رہے۔[۲]

بہرحال فتوی کے دستخطوں میں اس نام کے متعلق یہ بیان اہمیت اختیار کر لیتا ہے کہ کچھ دستخط جبراً ہوئے۔ اگرچہ ہمیں اب بھی اطمینان نہیں جس کی وجہ چند سطروں کے بعد ظاہر ہوگی۔

(۵) سرسید اور شمس العلماء دونوں کی تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علماء کرام بادشاہ کے حامی نہیں تھے اور شاہی خاندان کے متعلق بھی وہ اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ شمس العلماء کے الفاظ ہیں "وہ ان کو خواہ مخواہ خبطہ جانتے تھے"

(۶) ان باتوں میں اتفاق کے باوجود ایک نہایت اہم اور نازک مسئلہ میں سرسید اور شمس العلماء کی مذکورہ بالا تحریریں مختلف ہیں۔ سرسید صاحب فرماتے ہیں کہ "جبکہ مسلمان ہماری گورنمنٹ کے مستامن تھے کسی طرح گورنمنٹ کی عملداری میں جہاد نہیں کر سکتے تھے"

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان انگریزوں کو ہندوستان کا جائز حکمراں تسلیم کر چکے تھے۔ لہذا اس کی مخالفت غدر اور بغاوت تھی جو جائز نہیں ہو سکتی اور نہ اس کو جہاد کہا جا سکتا ہے۔

---

[۱] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ ۲ ملخصاً [۲] ملاحظہ ہو تواریخ عجیب عرف کالا پانی صفحہ ۲ شائع کردہ اقبال اکیڈیمی لاہور۔ [۳] تراجم علماء حدیث ہند صفحہ ۱۲۹

جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ انگریز ڈپلومیسی یہی سبق دے رہی تھی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء تک کم از کم دہلی کے علماء نے اس سبق کو ذہن نشین نہیں کیا تھا۔ وہ انگریزوں کو غاصب اور متغلب ہی سمجھتے تھے۔ سرسید کی تحریر کے خلاف شمس العلماء نے ایک جگہ اختلاف کی وجہ یہ تحریر کی۔

"شرائط جہاد موافق مذہب اہل اسلام موجود نہیں"

شمس العلماء کے بیان کے بموجب مولانا محبوب علی صاحب اور خواجہ ضیاء الدین صاحب نے یہی وجہ بیان کی تھی۔

اس توجیہہ اور استدلال کا مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کو جائز حکمراں تو نہیں مانا جاتا مگر چونکہ مقابلہ کی طاقت نہیں ہے اس لئے جہاد کا فتویٰ بھی نہیں دیا جاتا۔

اصل حقیقت

(۷) مذکورہ بالا تفصیلات کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ابتداء میں اسی نظریہ پر اتفاق رہا جو پچاس سال پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے پیش کیا تھا جس کی کامیابی کے لئے حضرت سید احمد صاحب شہید اور مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور اُن کے پاکباز رفقاء نے جانیں قربان کی تھیں اور جو مسلمانوں کے دماغوں میں راسخ ہو چکا تھا کہ

"ہم ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ سات سمندر پار سے انگریز سوداگری کی غرض سے ہندوستان آئے۔ حکومت ہند نے اُن کو تجارت کی اجازت دی۔ ان غیر ملکیوں نے غیر ملکی رہتے ہوئے رفتہ رفتہ ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ یہ قبضہ بالجبر اور یہ تسلط غاصبانہ ہے۔ باشندگان وطن کا فرض ہے کہ اس بیرونی طاقت سے وطن عزیز کو آزاد کرائیں"

اس نظریہ کی بنا پر جب یہ موقع آیا کہ کچھ فوجیں برگشتہ ہوئیں اور ملک کو آزاد کرانے کے لئے انھوں نے جان کی بازی لگا دی تو اب پس وپیش کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اور نہ اس واضح مقصد کے لئے فتوے کی ضرورت تھی۔

لیکن آغاز تحریک (یعنی ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء) سے چند روز بعد ہی یہ صورت پیش آئی کہ ایک طرف جن کو زمام قیادت سپرد کی گئی تھی اُن میں قیادت وسیادت کی صلاحیت نہیں تھی اور دوسری جانب انگریز کے خفیہ حامی جو نہایت خاموشی سے شہر میں کام کر رہے تھے۔ اُن کی طرف سے یہ دل کو لگنے والا سوال اٹھا دیا گیا کہ ہماری طاقت غیر قابل اعتماد ہے اور ممکن ہے بادشاہ کی اہلیت وصلاحیت کا سوال بھی پیدا کر دیا گیا ہو۔ تب لامحالہ علماء کی رائے میں اختلاف ہو گیا اور مان لیجئے کہ حضرت شاہ اسحاق صاحب اور حضرت مولانا عبدالغنی صاحب رحمہما اللہ سے تعلق رکھنے والے علماء جو بادشاہ کو بدعتی ضعیف الرائے اور نا اہل سمجھتے تھے وہ کنارہ کش ہونے لگے۔ لیکن چند روز بعد جب ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو جنرل بخت خاں فوج۔ اسلحہ اور نقد رقم لیکر مولانا سرفراز علی صاحب اور دوسرے علماء کے ساتھ دہلی پہونچ گیا اور بادشاہ نے کمانڈر انچیف اور نائب السلطنت کی حیثیت دیکر اختیارات اُس کے سپرد کر دیئے یہاں تک کہ بیرون دہلی انقلابی افواج کو بادشاہ کی جانب سے ہدایات جنرل بخت خاں ہی دینے لگے۔ تو جہاں تک بادشاہ کی نا اہلیت وغیرہ کا سوال تھا وہ خود بخود ختم ہو گیا۔ کیونکہ جنرل بخت خاں اور اس کے پیرو مرشد مولانا سرفراز خاں اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے جس کو بادشاہ کے متعلق اعتراض تھا جنرل بخت خاں مولانا سرفراز علی صاحب کے معتقد تھے اور مولانا سرفراز علی صاحب حضرت سید صاحب سے وابستہ تھے اور گورکھپور کے علاقہ میں حضرت سید صاحب کے نام پر بیعت لیتے رہے تھے

اب صرف ایک سوال باقی رہ گیا یعنی کیا ہم میں طاقت، مقاومت اور قوت مقابلہ اس درجہ کی ہے کہ ہم فتح پاسکیں یا نہیں۔ اسی پر غور کرنے کے لئے جامع مسجد میں اجتماع کیا گیا۔ مولانا محبوب علی صاحب کی رائے اس وقت بھی یہی رہی کہ ہم میں قوت مقابلہ نہیں ہے۔ لہٰذا شرط جہاد اسلامی اصول کے مطابق نہیں پائی جاتی اور وہ اسی رائے پر آخر تک باقی رہے۔ مگر خواجہ ضیاء الدین صاحب نے پہلے مخالفت کی پھر آپ بھی متفق ہو گئے۔ چنانچہ فتوے پر آپ کے دستخط بھی موجود ہیں۔

بہرحال دستخط کے وقت نہ مرعوبیت تھی نہ جبر و قہر۔ بلکہ سوچ سمجھ کر بحث تمحیص کے بعد دستخط کئے گئے۔ ہاں ناکامی کے بعد جب دارو گیر کا سلسلہ شروع ہوا تو ممکن ہے کچھ علماء نے جبر کا عذر پیش کر دیا ہو۔

اب آپ وہ فتوے ملاحظہ فرمایئے جس کی تمہید کا طویل سلسلہ چند صفحات سے چل رہا ہے۔ سوال و جواب کی عبارت پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت ارباب فتویٰ اور اہل علم کے سامنے نہ یہ تصور ہے کہ انگریز حاکم ہے اور ہم اس کی مستامن رعایا۔ نہ بادشاہ اور خاندان تیموریہ کی اہلیت یا نا اہلیت کا مسئلہ پیش نظر ہے اور نہ یہ بات سامنے ہے کہ انگریز اگر قابض ہو گئے تو زن و بچہ کا استیصال کر دیں گے یہ سب نکتے بعد کو اور ان مصنفین کے تصنیف فرمودہ ہیں جو بارگاہ انگریز میں خطابات سے سرفراز ہوئے۔ سوال اس وقت صرف ایک تھا کہ آیا ہم میں مقابلہ کی طاقت ہے یا نہیں چنانچہ عبارت سوال یہ ہے۔

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہل

اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں اور لوگ جو اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں اُن کو بھی جہاد چاہیئے یا نہیں۔ بیان کرو۔ اللہ تم کو جزا خیر دے۔

جواب

درصورت مرقومہ فرض عین ہے۔ اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے۔ اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقتِ مقابلہ اور لڑائی کی ہے۔ بسبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے۔ تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا اور اطراف وحوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں اُن پر بھی فرض ہو جاوے گا۔ اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہوگا اور جو عدو اور بستیوں پر ہجوم اور قتل و غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض عین ہو جاوے گا بشرط اُن کی طاقت کے۔ العبد المجیب احقر نور جمال عفی عنہ۔

اس فتوے کا عکس جو سوتنتر دہلی[1] اور نوائے آزادی[2] میں شائع ہوا ہے اُس

---

[1] یہ ڈاکٹر اطہر عباس صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کی لکھی ہوئی ہندی زبان کی کتاب ہے جسکو حکومت یوپی نے ۱۸۵۷ء کی یادگار میں شائع کیا ہے۔ اس کے آخر میں بہت اہم کاغذات کے عکس بھی چھاپ دیئے گئے ہیں۔ اُن کے منجملہ صادق اخبار دہلی مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کا فوٹو بھی ہے۔ اس کے ایک صفحہ پر فتوے جہاد بھی موجود ہے۔ مدیر اخبار نے اس فتوی کی سرخی یہ دی ہے

[2] نقل استفتا، از اخبار الظفر دہلی اُردو ۵۲ مرتبہ شائع کردہ ادبی پبلشرز شعبہ اشاعت انجمن اسلام بمبئی ضمیمہ ص ۵

ہیں اس جواب کے نیچے مندرجہ ذیل علماء کے دستخط اور مہریں بھی ہیں۔
(۱) سید محمد نذیر حسین (۲) رحمت اللہ (۳) مفتی محمد صدرالدین (۴) مفتی اکرام الدین معروف سید رحمت علی (۵) محمد ضیاء الدین (۶) عبدالقادر (۷) فقیر احمد سعید احمدی (۸) محمد میر خاں (یا میر محمد خاں یا میر خان محمد) (۹) محمد عبدالکریم (۱۰) فقیر سکندر علی (۱۱) محمد کریم اللہ (۱۲) مولوی عبدالغنی (۱۳) خادم العلماء محمد عبدالغنی (۱۴) فریدالدین (۱۵) محمد سرفراز علی (۱۶) سید محبوب علی جعفری (۱۷) ابواحمد محمد حامی الدین (۱۸) سید احمد علی (۱۹) الہی بخش (۲۰) محمد مصطفیٰ خاں ولد حید شاہ نقشبندی (۲۱) محمد انصار علی (۲۲) مولوی سعیدالدین۔ (۲۳) حفیظ اللہ خاں۔ (۲۴) محمد نورالحق عفی عنہ (۲۵) سراج العلماء ضیاء الفقہاء مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی خاں (۲۶) داللہ الغنی وانتم الفقراء (۲۷) حیدر علی (۲۸) سیف الرحمٰن (۲۹) سید عبدالحمید عفی اللہ عنہ (۳۰) محمد ہاشم (۳۱) یا حافظ (۳۲) محمد امداد علی عفی عنہ (۳۳) خادم شرع شریف رسول الثقلین قاضی القضاۃ محمد علی حسین
نیچے تحریر ہے۔ حسب فرمان واجب الاذعان شاہی در جمیع المطابع دہلی سید جمیل الدین خاں مہتمم طبع نمودہ
دستخطوں یا مہروں میں جو الفاظ لکھے ہوئے ہیں وہ بجنسہ سطور بالا میں درج کر دیے گئے ہیں۔ لہٰذا احباب مولانا مفتی صدرالدین صاحب کے متعلق جو روایت مشہور ہے کہ آپ نے دستخط سے پہلے شہدت بالجبر بھی لکھ دیا تھا اور ناکامی تحریک کے بعد جب آپ سے بازپرس کی گئی تو آپ نے اپنی معذرت میں پیش کر دیا کہ میں نے خود ہی لکھا ہے۔ شہدت بالجبر یعنی یہ دستخط جبراً کئے ہیں۔ پس یہ معذرت قبول ہوئی اور آپ بری

کر دیئے گئے ۔ صرف کچھ جائداد ضبط ہوئی ۔

مذکورہ بالا عکس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بے حقیقت ہے ظرافت یا کسی رقابت کی بنا پر اختراع کی گئی ہے

شمس العلمار ذکاء اللہ خاں صاحب نے مولانا رحمت اللہ صاحب کے متعلق تحریر فرمایا ہے ۔ اس دانشمند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامہ فساد برپا تھا" شمس العلمار کا یہ خیال بھی غلط ہے

حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کے دستخط بھی اس فتوے پر نہیں ہیں کیونکہ مولانا موصوف اس فتوے کی ترتیب اور جامع مسجد کے اجتماع سے کئی ہفتہ بعد وسط اگست میں دہلی تشریف لائے تھے ۔

نظم و تنظیم ۔ انقلابی جماعتیں

تحریک حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کے باقیات ۔ اور وہابی مجاہدین

نظم و تنظیم یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جو انقلابی معرکے ہوئے اُن میں نظم نہیں رہا تھا۔ نظم و ضبط سے محرومی کا پہلا نشان تو یہ ہے کہ طے شدہ وقت سے تقریباً تین ہفتہ پہلے یہ آتش فشاں میرٹھ میں پھٹ گیا۔ اس کے بعد جہاں جہاں شعلے بھڑکے اُن کا وقت ایک نہیں تھا۔

مثلاً تحریک کے ابتدا کے لئے ۳۱ مئی کی تاریخ مقرر تھی اور یہ بھی طے تھا کہ جہاں جہاں اقدام ہوگا ایک ہی تاریخ میں ہوگا۔ مگر جذبات اس طرح بے قابو ہوگئے کہ ۳۱ مئی کا انتظار ناممکن ہوگیا۔

پھر میرٹھ میں اگر ۱۰ مئی کو یہ بے قابو جذبات برافروختہ ہو گئے تھے تو کانپور لکھنؤ وغیرہ میں ڈیڑھ دو ماہ تک افسردہ پڑے رہے اور جب وہ شعلہ بار ہوئے تو اس طرح کہ وحدت مقصد اور غائبانہ ہمدردیوں کے علاوہ ضابطہ کا کوئی رابطہ آپس میں قطعاً نہ تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ بے ربطی اس بنا پر تھی کہ یہ تحریک ابتدا ہی سے نظم و ضبط اور باہمی ربط سے ناآشنا تھی یا جذبات کی فراوانی اور ناتجربہ کاری نے نظم و ضبط

کے دھاگے توڑ ڈالے تھے۔ انگریز مورخین کا اصرار یہی ہے کہ یہ تحریک نظم و ضبط سے قطعًا ناآشنا تھی۔ اُن کے نزدیک اس تحریک کی حقیقت سرکش فوجوں کی وقتی ہنگامہ آرائی سے زیادہ نہ تھی۔ اُن کو یہ اصرار اس لئے بھی ہے کہ پہلے سے کسی تنظیم کا اعتراف انگریزی افسروں کی نااہلیت کا ثبوت بن جاتا تھا اور انگریز افسروں کا تکبر و غرور اس کو گوارا نہیں کرتا تھا کہ پہلے سے کسی خفیہ تنظیم کا اعتراف کر کے اپنی نااہلیت اور غفلت کو تسلیم کریں اور خود اُن کے ہم رنگ و ہم نسل ہزاروں انگریز جوان معرکوں میں ہلاک ہوئے تھے اُن کے خون کا بار اپنی گردن پر لیں۔ اسی بنا پر وہ تمام واقعات جو تنظیم کا کھلا ہوا ثبوت ہیں انگریز افسروں (اور اُن کی تائید کرتے ہوئے انگریز مورخین) نے اُن کی توجیہہ کر دی مثلاً۔

چپاتیوں اور کول کے پھول وغیرہ کی تقسیم کو ہندوستانیوں کی اوہام پرستی کا نتیجہ قرار دیا اور آٹے میں ہڈیوں کی راکھ ملا دینے کے الزام یا اس قسم کے اور پروپیگنڈہ کو جو بانیان کی تحریک کی طرف سے ملک میں پھیلائے گئے تھے۔ اُن کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

تنظیم کا اعتراف

ونائک دامودر ساورکر غالبًا سب سے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے انگریزی اثرات سے آزاد رہ کر اس تحریک کی تاریخ مرتب کی۔ آپ کی رائے یہی ہے کہ خفیہ تنظیمات نے اس تحریک کی پرداخت کی تھی۔ آپ نے ایک مستقل باب میں خفیہ تنظیمات کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

ڈھونڈو پنت نانا اور اُن کے مشیر خاص عظیم اللہ خاں نے اس تحریک

کی داغ بیل ڈالی۔

عظیم اللہ خاں جو یورپ کا سفر کر چکے تھے اور روس پہونچکر ایک میدان جنگ کا مشاہدہ بھی کر چکے تھے انھوں نے بیرونی ممالک سے بھی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ناناصاحب نے اپنے خاص قاصد ہندوستان بھر میں بھیجے۔ بہت سے آدمیوں کو فقیروں، پنڈتوں اور سنیاسیوں کے بھیس میں ملک کے فوجی اور غیر فوجی حلقوں میں بھیجا۔ مسلمانوں کے لئے علمار کرام کا تعاون حاصل کیا۔

ساورکر کی یہ رائے اُن واقعات پر مبنی ہے جو اس زمانہ میں ظہور پذیر ہوئے جن کا اقرار وہ بھی کرتے ہیں جنھیں خفیہ تنظیمات سے انکار ہے۔ مثلاً لارڈ رابرٹس نے لکھا ہے کہ عظیم اللہ خاں کے متعدد خطوط میں دو خط عمر پاشا کے نام تھے جو قسطنطنیہ کا ایک فوجی افسر تھا۔ ناناصاحب واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد لکھنؤ گئے جہاں اُن کا پُرتپاک استقبال کیا گیا۔

میرٹھ میں ایک فقیر پہونچا اُس کے ساتھ اُس کے پیرو بھی تھے اور سفر کے لئے ہاتھی گھوڑے اور بہت سی سواریاں تھیں۔ اُس کے پاس فوج کے سپاہی بھی جاتے رہتے تھے پولیس کو اس کے متعلق شبہ ہوا تو اُس نے میرٹھ سے چلے جانے کا حکم دیا۔ وہ میرٹھ سے چلا گیا۔ مگر اپنے اثرات چھاؤنی کے سپاہیوں میں چھوڑ گیا۔

مدراس میں ایک برہمن پکڑا گیا۔ اُس کو پھانسی کی سزا دی گئی کیونکہ وہ فوجیوں کو اکسا رہا تھا۔ علی گڈھ میں بغاوت کی آگ ایک برہمن کو پھانسی دینے سے بھڑکی۔ اس کا جرم بھی یہی تھا۔ جب اس کو پھانسی دی جا چکی تو ایک سپاہی نے پکار کر کہا یہ "دین

کی خاطر شہید ہوا۔ اس پر دوسروں کے جذبات بھی بھڑک اُٹھے۔ یہاں تک کہ انگریز علی گڈھ سے فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔

شمس العلماء ذکاراللہ خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"ہندوؤں کے پنڈت مسلمانوں کے مولویوں کی نسبت انگریزوں سے عداوت کرنے میں کچھ کم نہیں تھے۔ کئی دفعہ انھوں نے پتروں کو دیکھ بھال کر لڑنے کی شبھ مہورت نکال کر تلنگوں کو بتلائے اور اُن کو یقین دلایا کہ ان میں اگر لڑنے جاؤ گے تو فتح پاؤ گے۔ ایک عجیب تماشا چاندنی چوک اور بازاروں میں یہ دیکھنے میں آتا تھا کہ پنڈتوں کے ہاتھ میں پوتھیاں ہیں اور وہ ہندوؤں کو دھرم شاستروں کے احکام سنا رہے ہیں کہ انگریز ملکشوں سے لڑنا چاہیئے۔ جب لڑائیوں میں تلنگوں کی لاشیں چار پائیوں پر اُن کے سامنے آتیں تو وہ ہندوؤں کو اُپدیش دیتے کہ ان سرگ باشیوں کی طرح سُرگ میں چلے جاؤ جن کے لئے نہ ارتھی کی ضرورت ہے نہ کرم کریا کی

(تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۷۶)

شمس العلماء پنڈتوں کے اس اشتغال کا سبب یہ بتلاتے ہیں کہ انگریزی تعلیم اور اُن قوانین سے جو متعدد رسومات کے متعلق وضع کئے جا چکے تھے پنڈتوں کے وقار اور اُن کی عزت و عظمت میں کمی آ رہی تھی۔ لیکن ظاہر ہے اس سے کسی تنظیم کی نفی نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ بانیان تنظیم نے پنڈتوں کے اس اشتغال سے فائدہ اُٹھا کر اُن کو آمادہ کار کر دیا ہو۔

ان کے علاوہ آٹے میں ہڈیوں کی راکھ ملانے کا پروپیگنڈہ اور اس قسم کے اور

واقعات سادر کرکے خیال کی تصدیق کرتے ہیں کہ ایک خفیہ تنظیم کام کر رہی تھی۔

جہادی تنظیم کے اثرات

یہ ایک ایسی تنظیم کی بحث ہے جس کو ۱۸۵۷ء کی تحریک اور اس سلسلہ کے پروپگینڈے کا ذمہ دار قرار دیا جا سکے لیکن اس کے علاوہ ملک میں دو تنظیمیں اور تھیں جنھوں نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس تحریک کو مدد پہونچائی۔ مگر ان دونوں کا تعلق مسلمانوں کے علماء اور مذہبی طبقہ سے تھا جس کو بد قسمتی سے اس زمانہ میں وہابی کہا جاتا تھا اور یہ جہاد آزادی کی مناسبت سے لفظ جہادی کا اور اضافہ کر دیا گیا تھا۔ شمس العلماء ذکاءاللہ خاں صاحب اور دوسرے مورخین جگہ جگہ وہابی جہادیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مثلاً شمس العلماء کا ارشاد ہے۔

۱ سو دو سو کے قریب وہابی جہادی بن کر ٹونک سے آئے۔

۲- جے پور، ہانسی حصار، بھوپال سے بھی جہادی آئے۔ تین چار سو جہادیوں کا مجمع ہو گیا۔

۳- دہلی میں جب باغی سپاہ کے افسر اعلیٰ بخت خاں و غوث محمد خاں و مولوی امام خاں رسالدار جمع ہوئے اور اُن کے ساتھ مولوی عبدالغفار اور مولوی سرفراز علی آئے تو پھر وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کے میرلشکر اور بخت خاں اس کا معاون ہوا[۵۱]

۴- الہ آباد سے مولوی لیاقت علی خاں جہادیوں کے سرغنہ کی عرضی آئی[۵۲]

۵- غلام معین الدین رسالدار نے بادشاہ کو عرضی دی کہ فدوی ٹونک سے تقریباً پانچسو آدمیوں کے ساتھ آیا۔ اُن کو سپاہ کی صورت میں مرتب کیا

---

۵۱ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ صفحہ ۶۷۵ ۵۲ ایضاً صفحہ ۶۷۰

اور پندرہ سو اور جہادی۔ غازی یا شہید بننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔[1]

منشی جیون لال کے روزنامچہ میں بار بار جہادیوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً

۲۵ر جون ۱۸۵۷ء۔ گوڑگاؤں اور قرب وجوار کے دوسرے علاقوں سے چار سو مجاہدین دہلی میں آئے

۳۰ر جون ۱۸۵۷ء۔ پانچ سو مجاہد انگریزوں کے پاس سے ایک ہاتھی چھین کر لائے اور اُسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔

۲ر جولائی ۱۸۵۷ء۔ بخت خاں نے اطلاع دی کہ شہر کے باہر میں حسب ذیل فوج کے ساتھ لڑنے کی تیاری کر رہا ہوں۔

چار پیدل فوجیں، سات سو سوار۔ چھ بھاری توپیں جنھیں کھینچنے کے لئے گھوڑے استعمال کئے جاتے ہیں۔ تین میدانی توپیں۔ ایک سو مجاہدین۔

۹ر جولائی ۱۸۵۷ء۔ جنرل بخت خاں نے سواروں اور پیدل فوج کے سپاہیوں کے ساتھ انگریزی کیمپ میں گھسکر حملہ کیا اور بہت سے افسروں اور سپاہیوں کو تہ تیغ کر دیا کہتے ہیں توپچیوں نے جنرل بخت خاں کو پہچان لیا۔ اس معرکہ میں جہادی بھی شریک تھے

۲۱ر جولائی ۱۸۵۷ء۔ ٹونک سے ۶ سو مجاہد آئے۔ اور آج بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ اُنھوں نے اطلاع دی کہ ابھی دو ہزار مجاہد اور آنے والے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا میرے پاس تم لوگوں کے رسد کا انتظام نہیں ہے۔

۲۴ر جولائی ۱۸۵۷ء۔ نجیب آباد سے تقریباً دو سو جہادی آئے اور شہر کے باہر قیام پذیر ہوئے۔

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۸۶۔

۳۱ر جولائی ۱۸۵۷ء۔ جہادیوں کا ایک قائد اعظم ٹونک سے آیا اور بادشاہ کی خدمت میں نذر پیش کی۔

۳۱ر جولائی ۱۸۵۷ء۔ میر فیاض علی نے معروضہ پیش کیا کہ جہادی بھوکے مر رہے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا انھیں کھلانے کے لئے میرے پاس روپیہ نہیں رہا۔ فیاض نے کہا شہر والوں کو حکم دیجئے کہ وہ اُن کے کھانے کا بندوبست کریں۔

۲ر اگست۔ نصیر آباد سے چند جہادیوں کا معروضہ موصول ہوا کہ چھ ہزار سپاہی ایک دل ایک جان ہو رہے ہیں۔

۵ر اگست۔ جہادیوں نے شکایت کی کہ صرف ہم ہی ایسے ہیں جو انگریزوں سے نہایت جوش کے ساتھ لڑتے ہیں اور فوج کے آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔

۹ر اگست۔ مولوی صدرالدین خاں کے مکان پر آج پچاس سپاہیوں نے یورش کر دی لیکن یہ دیکھ کر کہ وہاں ۷۰ جہادی مقابلہ کے لئے تیار ہیں واپس ہو گئے۔

۲۰ر اگست۔ محمد میر خاں کے صاحبزادے بڈھن نے آج جہادیوں میں دو ہزار روپے کی رقم تقسیم کی۔

۲ر ستمبر۔ خبر ملی کہ چند ہزار جہادی مولوی جلال الدین کی سرکردگی میں کھلے میدان میں لڑنے کے لئے نکلے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی اور اُن کے کئی سو ساتھی مارے گئے

۱۴ر ستمبر۔ گوروں اور سکھوں کی فوج ہمت کر کے جامع مسجد پہونچ گئی۔ جامع مسجد میں پردیسی مسلمان جمع تھے اُنھوں نے انگریزوں پر حملہ کیا اور اُن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ (اس واقعہ کی تفصیل آئندہ آئے گی۔ انشاء اللہ)

مذکورہ بالا اقتباسات سے جن میں جہادی مجاہدین یا وہابی جہادی کے الفاظ آئے ہیں، ثابت ہوتا ہے ۔

(۱) دہلی کے بھی کچھ مسلمان ایسے تھے جن کو وہابی جہادی کہا جا سکتا تھا ۔

(۲) باہر سے جہادیوں کی آمد ۲۵ رجون سے شروع ہوئی ۔

(۳) ان کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی تھی ۔

(۴) بادشاہ نے اُن کے مصارف کی ذمہ داری نہیں لی ۔

(۵) یہ وہابی جہادی مولانا مفتی صدرالدین صاحب سے خاص تعلق رکھتے تھے ۔ یہاں تک کہ اُن کی حمایت وحفاظت میں لڑنے کے لئے آمادہ ہو گئے ۔

(۶) یہ جہادی زیادہ تر گوڑگانوہ کے قرب وجوار ہانسی حصار نیز جے پور، بھوپال نصیر آباد، نجیب آباد اور ٹونک سے آئے تھے ۔

ان اقتباسات اور ان کے نتائج ملاحظہ کرنے کے بعد دو باتیں قابل توجہ ہیں ۔

(۱) مولانا نصیرالدین صاحب دہلوی کا ذکر پہلے گذر چکا ہے ۔

اب آپ اس طرف توجہ فرمایئے کہ جب مولانا موصوف ہجرت کر کے سندھ تشریف لے گئے تو آپ نے کہاں کہاں قیام فرمایا تھا ۔

پہلے گذر چکا ہے کہ مکان سے روانہ ہو کر عرب سرائے میں قیام رہا پھر آپ ریواڑی تشریف لے گئے ۔ عیدالضحیٰ کی نماز آپ نے ریواڑی میں ادا کی ایک ہفتہ سے زیادہ قیام فرما کر ۱۵ رذی الحجہ کو یہاں سے روانہ ہوئے ۔ یہی علاقہ ہے جس کو گوڑگانوہ کے قرب وجوار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ ہانسی حصار اور رہتک بھی اسی علاقہ کے خاص خاص مقامات ہیں ۔

حضرت مولانا نصیر الدین صاحب کے راستہ کی منزلوں میں جے پور، ٹونک اور اجمیر کے نام بھی خاص طور پر ذکر کئے گئے ہیں۔ جے پور میں ایک ہفتہ اور اس سے بھی زیادہ ٹونک میں قیام رہا۔ یہاں کے قیام کی مختصر روئداد یہ ہے

نواب وزیر الدولہ (فرمانروائے ٹونک) نے اعلیٰ پیمانہ پر مہمان نوازی کی۔ ایک روز دعوت میں اپنے اعزا و اقارب، عمائدین ریاست اور بہت سے احباب کو شریک کیا۔ پھر سب نے صفیں باندھکر مولانا سید نصیر الدین صاحب کے دست حق پرست پہ بیعت کی اس موقع پر (والی ٹونک) نواب وزیر الدولہ نے فرمایا حضرت امیر المومنین (حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ) ٹونک تشریف لائے تھے تو میں تحصیل علوم سے فارغ نہیں ہوا تھا آپ تشریف لے گئے۔ مجھے ہوش آیا تو اپنی محرومی پر حد درجہ افسوس ہوا۔ میں نے بہت سے درویشوں کو دیکھا جو فیض سید صاحب سے پایا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے حاصل نہیں ہوا۔ مولانا سید نصیر الدین صاحب میں اسی فیض کا پرتو نظر آتا ہے۔

مولانا سید نصیر الدین صاحب ٹونک سے روانہ ہوئے تو بہت سے اسلحہ، باربرداری کی سواریاں، اونٹ، خچر اور اعلیٰ قسم کے متعدد گھوڑے پیش کئے گئے۔

یہی ٹونک ہے جہاں سے مجاہدین کی آمد کا تانتا بندھا ہوا ہے یہاں تک کہ اُن کی تعداد دو ہزار یا دو ہزار سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ نصیر آباد۔ جہاں سے ایک فوج باغی ہو کر پہلے پہونچ چکی ہے اور

چھ ہزار مجاہدین بادشاہ کی اجازت کے منتظر بیٹھے ہیں۔

یہاں حضرت مولانا سید نصیر الدین صاحب۔ یا اُن کے شیخ حضرت سید احمد شہید نہیں تشریف لے جا سکے اور غالباً اس علاقہ میں جانا ممکن بھی نہیں تھا کیونکہ یہ تمام علاقہ فوجی تھا۔ البتہ اس کے مرکزی شہر "اجمیر شریف" میں حضرت مولانا سید نصیر الدین صاحب نے ایک مہینہ کے قریب قیام فرمایا تھا۔

ان تفصیلات کے بعد اس دور کی تاریخ کے دقیق النظر محقق و مبصر حضرت مولانا عبید اللہ سندھی قدس اللہ سرہ العزیز کے مختصر ارشادات ملاحظہ فرمائیے۔

اپنی مشہور تصنیف "شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک" میں فرماتے ہیں۔

"الصدر الحمید (مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب) مکہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک علی صاحب کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی مولانا مظفر حسین کاندھلوی، مولانا عبد الغنی دہلوی کو ملاکر ایک بورڈ بنادیا جو اس نئے پروگرام کی اشاعت کرکے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے گا۔ ص ۱۹۱ [۵۲]

مولانا مملوک علی سرکاری مدرسہ کے ملازم تھے اُن کی نگرانی میں یہ کام شبہات سے بالا رہ کر چل سکتا تھا۔ ورنہ ریزیڈنٹ کی نظر نہایت تیز تھی۔ اب مولانا مملوک علی صاحب کو آزادانہ کام کرنے والے ساتھیوں کی ضرورت تھی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب جو حضرت

[۵۲] توفی الشیخ ۱۲۶۷ھ ودفن فی مقبرۃ الامام ولی اللہ الدہلوی۔ سیاسی تحریک ص ۱۸۲

شاہ اسحاق صاحب کے مدرسہ کے پُرانے طالب علم اور اُن کے
(شاہ اسحاق صاحب کے) داماد مولانا سید نصیر الدین صاحب کے
شاگرد تھے۔ اُن کی طبیعت عالمانہ رنگ کی نہ تھی۔ امیر شہید
(حضرت سید احمد صاحب شہید) سے ملتی جلتی طبیعت رکھتے تھے
اس لئے وہ سید صاحب کا نمونہ تھے۔ مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید
احمد اُن کے ساتھ اس طرح کام کرتے رہے جیسے امیر شہید کے ساتھ
مولانا عبد الحیٔ اور مولانا شہید (مولانا اسمٰعیل صاحبؒ) تھے، (ص ۱۸۲)

اس جماعت کی صدارت سب سے پہلے اُستاذ اساتذہ الہند
مولانا مملوک علی صدر مدرس دہلی کالج کے لئے مخصوص رہی اُن کے
بعد مولانا محمد اسحاق صاحب نے (جو بقول مولانا سندھی مکہ معظمہ میں
بیٹھ کر ہندوستانی تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے (ص ۱۸۴)
مولانا امداد اللہ کو اس کام کے لئے مقرر کیا۔ (ص ۱۸۴)

یہ دہلوی جماعت اس وقت تک اپنے گھر میں کام کرتی رہی
جب تک دہلی کا شاہی اقتدار بحال رہا۔ (ص ۱۸۵)

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ نے دیوبندی نظام کی حقیقت اور اس کی
سیاسی مصلحت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ اشارات کئے ہیں۔ اس لئے اُنھوں نے
صرف وہی نام یہاں ذکر کئے ہیں جو دار العلوم دیوبند کے بانی اور معمار تھے۔ اور
اس بنا پر یہ واضح نہ ہو سکا کہ دوسرے مقامات کے جن علماء کرام نے ۱۸۵۷ء کی
تحریک میں حصہ لیا اُن کا تعلق حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ یا اس

نظام سے لیا تھا لیکن اتنی بات واضح ہے کہ جن علمائے کرام نے اس تحریک میں حصہ لیا اُن میں سے اکثر و بیشتر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز یا حضرت سید احمد شہید رح سے عقیدت یا تلمذ کا رابطہ رکھتے تھے۔

مثلاً مولانا سرفراز علی صاحب جن کو ذکاء اللہ خاں صاحب نے بخت خاں کا سرپرست و مُربّی قرار دیا ہے جو امیر جہاد بنائے گئے تھے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے داعی تھے۔ ایک عرصہ سے گورکھپور کے اطراف میں انگریزوں کے خلاف خفیہ طور پر بیعت جہاد لے رہے تھے۔ ؎

مولانا لیاقت علی صاحب جن کو الٰہ آباد کا امیر اور گورنر بنایا گیا تھا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے بالواسطہ تلمذ رکھتے تھے۔

اسی طرح مولانا فضل حق خیرآبادی مفتی صدرالدین صاحب۔ مولانا پیر محمد صاحب (پٹنہ) مولانا فیض احمد صاحب فیض اور دوسرے سربرآوردہ علماء مجاہدین حضرت شاہ اسحاق صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز یا حضرت شاہ عبدالعزیز یا حضرت سید احمد صاحب شہید یا مولانا نصیرالدین صاحب سے رابطہ اور تعلق قائم کئے ہوئے تھے (تفصیلات کتاب کے دوسرے حصہ میں ملاحظہ فرمائیے)۔ بہرحال یہ ایک تنظیم تھی جس کے اثرات دور دور پھیلے ہوئے تھے۔ یہ ١٨٥٧ء کے جہاد حریت کی محرک تو نہیں تھی۔ لیکن تحریک شروع ہونے کے بعد جان کی بازی لگا کر اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتی رہی یہاں تک کہ اس کے اکثر افراد شہید ہوگئے جو باقی بچے وہ ہجرت پر مجبور ہوئے۔ ورنہ حبس دوام اور قید و بند کی سنت یوسفی پر عمل کرنے کے بعد ابدی سرفرازی حاصل کی۔

؎ ابوظفر بہادر شاہ از مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی ص ١٤٢۔

دوسری تنظیم

جو اس تحریک کے زمانہ میں موجود تھی وہ تنظیم ہے جس کو وہابی تحریک کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے جس کا مرکز "صادق پور" تھا۔ یہ تنظیم بہ حیثیت تنظیم تحریک سے الگ رہی۔ بلکہ اگر مولانا عبدالرحیم صاحب مصنف "الدر المنثور" کا قول صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ تنظیم ۱۸۵۷ء کی تحریک کی مخالف رہی لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کے کچھ افراد نے انفرادی طور پر اس تحریک میں حصہ لیا اور یہ تنظیم بہ حیثیت تنظیم ہندوستان میں نہیں تو اس کی سرحد پر وہ سب کچھ کرتی رہی جو انقلابی فوجوں نے ہندوستان کے اندر کیا۔ تفصیلات شاندار ماضی کی تیسری جلد میں بیان کی جا چکی ہیں جو قابل مطالعہ ہیں یہاں صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ جب جانبازان حریت حدود ہند میں چپہ چپہ کو خون شہادت کا لالہ زار بنا رہے تھے تو خاص اس وقت یا اس سے کچھ پہلے اور بہت بعد تک اس تنظیم کے سرفروش مجاہد کس طرح اپنی قربانیاں پیش کرتے رہے۔ مسلمانان ہند کی سیاسیات کے ریسرچر۔ ڈاکٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر کا ارشاد ہے۔

> میں ان بے غیرتیوں حملوں اور قتل و غارت کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا جو ۱۸۵۶ء میں سرحدی جنگ کا باعث ہوئے۔ اس دوران میں مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا۔ ایک ہی بات سے حالات کا بڑی حد تک اندازہ ہو جائے گا یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ سولہ فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۰ء تک ان فوجی مہموں کی گنتی بیس

تک پہونچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تک ہوگئی تھی۔
بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔ اس اثنار میں ستیانہ کیمپ
جو ہر وقت ہمارے خلاف سرحد میں تعصب کے جذبات کو ابھارتا رہتا
تھا۔ نہایت عقلمندی سے ہماری فوج کے ساتھ براہ راست مقابلہ
کرنے سے گریز کرتا رہا۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں انھوں نے ہمارے خلاف عام
اتحاد کی بنا ڈالی جس میں قبیلہ یوسف زئی اور قبیلہ پنج تار نے خاص طور
پر حصّہ لیا۔ اس سال ان لوگوں نے یہاں تک گستاخانہ دلیری سے کام لیا
کہ اس علاقہ میں معین سرکاری افسران سے تخویف مجرمانہ میں مدد کرنے کا
مطالبہ کرنے لگے۔ انکار کرنے پر وہ اس قدر برانگیختہ ہوگئے کہ ہمارے
علاقہ پر چڑھ دوڑے اور لفٹنٹ ہوان کے کیمپ پر شبخون مارا جو اس
علاقہ کا اسسٹنٹ کمشنر تھا اور اس نے بڑی مشکل سے جان بچائی۔ اب ہمارے
لئے زیادہ دیر کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ سر سڈنی کوٹن پانچ ہزار فوج کی
معیّت میں پہاڑی علاقہ میں داخل ہوا۔ الخ (ماخوذ از ہمارے ہندوستانی
مسلمان تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے شاندار ماضی جلد ۳)

بہر حال۔ اس تنظیم سے تعلق رکھنے والے مجاہدین نے جو کچھ قربانیاں پیش کیں
وہ اپنی جگہ قابل قدر اور واجب الاحترام ہیں۔ مگر یہاں بحث ان مجاہدین سے ہے جنھوں
نے اندرون ہند تحریک میں حصّہ لیا۔ بالخصوص وہ مجاہدین ذی احترام جو محاذ دہلی پر
شہید ہوئے آئندہ صفحات میں اُن کے متعلق کچھ تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

وہابی مجاہدین کا کردار۔ اور شان جان بازی

یادش بخیر۔ سرسید احمد خاں صاحب کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔

اس زمانہ میں جن لوگوں نے جھنڈا جہاد کا بلند کیا۔ ایسے خراب اور بدرویہ اور بداطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ و رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ اُن کا نہ تھا۔ [۱]

چند بد ذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پُورے کرنے کو اور جاہلوں کو بہکانے اور اپنے ساتھ جمعیت جمع کرنے کو جہاد کا نام لے دیا۔ [۲]

پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرمزدگی تھی نہ واقع میں جہاد۔ [۳]

یہ دہلی کے علمبرداران حریت کے متعلق ارشاد ہے۔ کیونکہ دہلی کے علاوہ اور مقامات کے محبان آزادی کے متعلق ایک سطر اوپر یہ گوہر افشانی ہو چکی ہے۔

اور یہ جو ہر ضلع میں پاجی اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا۔ [۴]

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب کا ارشاد ہے۔

یہ کام لُچّے شہدے بسلمانوں کا تھا کہ وہ جہاد جہاد پکارتے پھرتے تھے۔ [۵]

محبان حریت۔ اور کشتگان خنجر آزادی کے لئے جو الفاظ بلا استثناء ان ناموران

---

[۱] اسباب بغاوت ہند ص۔ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] ایضاً۔

[۵] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۷۶

قوم نے استعمال فرمائے ہیں۔

ممکن ہے سر اور شمس العلماء جیسے خطابات کی تمنائیں اس کے بغیر پوری نہ ہوتی ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طرز و انداز نہ صرف ان کی عزت و عظمت کے لئے بلکہ دہلی مرحوم کی روایتی تہذیب و شرافت کے لحاظ سے بھی باعث ننگ و عار ہے۔ یہ دونوں صاحب اسی شہر دہلی کے رہنے والے ہیں جو آج کچھ بھی ہو مگر اُس زمانہ میں ادب اُردو کا قلعہ معلّی تھا۔ کیا ادب اُردو کی متانت و سنجیدگی اس بے ادبی کو برداشت کر سکتی ہے۔

الفاظ کی کراہت و نکارت سے قطع نظر حقیقت کا جائزہ لیا جائے تو واقعات کا دامن ان الزامات سے سراپا پاک ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

بیشک اتنی بات صحیح ہے کہ بقول حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی رحمہ اللہ اس تحریک میں ایسے ناتجربہ کار سامنے آگئے تھے جن کی پوری زندگی عیش و عشرت میں گذری تھی جن میں نہ ہمت و جرأت تھی نہ استقلال و استقامت۔ غور و فکر و اصابت رائے سے محروم تھے اور ہر قسم کی نااہلیت کے ساتھ سب سے بڑی اہلیت یہ رکھتے تھے کہ بادشاہ سے اُن کا کوئی رشتہ تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہی نااہل و ناتجربہ کار جن کی بدکرداریوں کے باعث[1]

---

[1] شاہی خاندان کی بدکرداری جو اس درجہ عالم ہو چکی تھی کہ بقول شمس العلماء ذکاء اللہ خاں مشرق میں جس قدر برائیاں ہیں وہ سب اس قلعہ میں موجود تھیں۔ شہر کے معتدس اور متبرک آدمی کہا کرتے تھے کہ اگر کسی مکان میں قلعہ کی اینٹ بھی لگ جائے تو اس میں رہنا حرام ہے (تاریخ عروج عہد انگلیشیہ صفحہ ۳۶۹) جب اس بدکرداری پر نظر پڑتی ہے تو فوراً قرآن پاک کی آیت ذہن میں آجاتی ہے۔ وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً الخ

ہلاکت و بربادی اُن کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔ اس پوری تحریک کی ناکامی کا سبب بنے مگر اُن کی طرف لفظ جہاد کا انتساب، نہ صرف لفظ جہاد کی توہین ہے بلکہ حق و صداقت کی ایسی پردہ پوشی ہے جس کو فن تاریخ کی حقیقت پسندی ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتی

یہ لوگ جہاد کا جھنڈا تو کیا بلند کرتے جو "علمبرداران جہاد" تھے۔ خود سر سید صاحب اسی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ وہ مجاہدین ان کو بہت بُرا سمجھتے تھے۔ شمس العلماء کا ارشاد ہے کہ وہ ان کو خولہ خبطہ جانتے تھے۔

ستم رسیدہ فوجیں جنھوں نے اپنی اپنی چھاؤنیوں میں انقلاب برپا کر کے دہلی کا رُخ کیا۔ یا اپنی ہی جگہ جنگ آزادی میں معروف ہو گئیں۔ اُن کی قربانیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور جس بے جگری کے ساتھ عواقب و نتائج سے بے نیاز ہو کر عوام نے ان فوجیوں کا ساتھ دیا اور جس طرح ہر قسم کی تباہی اور بربادی کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ عوامی تحریکات کی تاریخ میں وہ بھی ایک انوکھی اور نادر مثال ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں بہت کم ملتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن کو وہابی جہادی کہا جاتا ہے وہ ان سب سے ممتاز گروہ ہے۔

پہلے باب میں تنظیم کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ دہلی کے اصل باشندوں کی تعداد بقول شمس العلماء تقریباً دو سو تھی یہ سرفروش فدائی زیادہ تر بیرونجات سے آئے ہوئے تھے جن میں "ٹونک" کو یہ خاص شرف حاصل تھا کہ وہاں سے کم و بیش دو ہزار آئے تھے۔

اس باب میں اُن کے کردار پر روشنی ڈالنی مقصود ہے۔ سب سے پہلے وجہ تسمیہ معلوم کر لیجئے وہ خود ایک روشنی ہے جس میں ان جانبازان صداقت کے

نورانی چہرے صاف نظر آجاتے ہیں۔

وہابی شاندار ماضی جلد دوم میں بہت تفصیل سے واضح کیا جاچکا ہے کہ یہ لفظ سب سے پہلے برطانوی پولیٹیکل ایجنٹوں اور ڈپلومیٹک ایجنسیوں نے حضرت سید احمد صاحب شہید حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور ان کے ساتھیوں کے لئے استعمال کیا تھا اور اسی کی غیر معمولی تاثیر سے آزاد قبائل کے سادہ لوح پٹھانوں کو مشتعل کر کے حضرت سید صاحب کے ہزاروں ساتھیوں کو ان کے ہاتھوں اچانک شہید کرادیا تھا۔ یہ ۱۸۳۰ء کا واقعہ تھا۔ ستائیس سال کے عرصہ میں اس لفظ کی اصطلاح میں عجیب و غریب انقلاب پیدا ہوگیا۔ اب عرف عام میں اس کے معنیٰ ہوگئے "پابند شریعت"

اس بارہ میں شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب سے بڑھ کر کس کی شہادت معتبر ہوسکتی ہے۔ شاہزادہ ولی عہد۔ یعنی مرزا فخر الدین کی ولی عہدی کا قصہ بیان کرتے ہوئے شمس العلماء فرماتے ہیں۔

مرزا فخر الدین اپنے مذہب کا بڑا پابند تھا۔ اس نے اپنا ختنہ کرایا تھا شہزادے اس کو متشرع (پابند شریعت) ہونے کے سبب سے وہابی کہتے تھے۔ [1]

یہ وہابی کی تشریح تھی، اب لفظ جہادی کی تغیر ملاحظہ فرمایئے۔

مجاہد یا جہادی یعنی "رضاکار"۔ تشریح یہ ہے کہ نہ وہ پیشہ ور سپاہی تھے نہ تنخواہ دار فوجی۔ نہ ان کے پیش نظر ملازمت تھی نہ بادشاہی تقرب، وہ اس ہنگامہ کو ایک مذہبی فرض سمجھ کر اس عزم کے ساتھ آئے تھے کہ۔

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

جیسا کہ غلام معین الدین رسالدار نے بادشاہ سے کہا تھا:۔

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۳۷۵

فدوی ٹونک سے تقریباً پانسو آدمیوں کے ساتھ آیا ہے۔ پندرہ سو اور جہادی غازی یا شہید بننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

یعنی اگر وہ زندہ رہے تو غازی فی سبیل اللہ اور مر گئے تو شہید فی سبیل اللہ۔

اسی دور کے مجاہد جلیل حضرت مولانا لیاقت علی صاحب نے فرمایا تھا۔

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمع بلاد
اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد

مال و اولاد کی اور گھر کی محبت چھوڑو ۔ راہ مولا میں خوشی ہو کے شتابی دوڑو
گر پھرے جیتے تو گھر بار میں پھر آؤ گے ۔ اور گئے مارے تو جنت کو چلے جاؤ گے

اقبال نے انہیں کے متعلق کہا ہے :۔

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم اُن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ اُن کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو — عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

کردار کے چند آثار و نشانات

حضرات مورخین معاف فرمائیں۔ اقتدار پرستی کو شجر ممنوع قرار دینے کے باوجود تحریر و تفصیل کے دامن اسی کی شاخوں اور کونپلوں میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ بادشاہ اور اُس کے حواریوں کی تو نقل و حرکت تک قلمبند ہے۔ گمر مجاہدین با اخلاص کے نام اور حسب نسب

ے۱ تاریخ بغاوت ہند ص۳۰

تو درکنار کسی مجبوری سے اُن کے کردار کا تذکرہ کرنا پڑتا ہے تو اس طرح کہ گویا روشنائی خشک ہو گئی اور جنبش قلم پر لرزہ طاری ہو گیا ہے۔ بہر حال انہیں منتشر جملوں اور بہکے بہکے فقروں سے مطلب کی باتیں سمجھنی ہیں۔ اب غور فرمائیے۔

استحصال بالجبر سے اجتناب فاقہ منظور

منشی جیون لال اور منشی ذکاء اللہ (شمس العلماء) دونوں محبّا ہدین کے مخالف ہیں دونوں نے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر دونوں کے انداز بیان جُدا جُدا ہیں۔ منشی جیون لال نے ۲۱ جولائی کے روزنامچہ میں لکھا ہے۔

> میر فیاض علی نے معروضہ پیش کیا کہ جہادی بھوکے مر رہے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ انہیں کھلانے کے لئے میرے پاس روپیہ نہیں رہا۔ فیاض نے کہا کہ شہر والوں کو حکم دیجئے کہ وہ اُن کے کھانے کا بندوبست کریں بادشاہ نے اس تجویز کو پسند کیا۔

اب منشی ذکاء اللہ خاں صاحب کا توہین آمیز اور دلخراش بیان ملاحظہ فرمائیے۔

> اکثر جہادی بھوکے مرتے تھے اُن کے بدن پر کپڑے بھی ثابت نہیں تھے مگر بغل میں تلوار یا کمر میں خنجر باندھے پر توڑے دار بندوق ضرور تھی بادشاہ سے یہ جہادی زیادہ کرتے کہ بھوکے مرتے ہیں تو وہ کہدیتا کہ خزانہ میں روپیہ نہیں مگر اُس نے اُن کے لئے یہ انتظام کرا دیا کہ اہل شہر خیرات کی روٹیاں کھلایا کریں۔ اور ثواب کمایا کریں۔ نواب محی الدین خاں عرف بڈھے خاں نے اُن کو دو ہزار روپے دیئے۔ [لہ]

[لہ] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۷۵

(۱) انداز بیان کے تفاوت کے علاوہ دونوں بیانوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ منشی ذکاء اللہ خاں نے ان پاک باز و پاک طینت بزرگوں کو بادشاہ کی خدمت میں بھوک کی خاطر فریادی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ مگر وقائع نگار منشی جیون لال کی درج روزنامچہ اطلاع یہ ہے کہ خوراک کا مطالبہ خود ان جہادیوں نے نہیں کیا تھا۔ بلکہ ایک صاحب نیز میر فیاض علی صاحب نے بادشاہ کو توجہ دلائی تھی جس پر بادشاہ نے تہیدستی کی معذرت کردی۔ اور پھر میر فیاض علی کی اس تجویز پر کہ "شہر والوں کو ان کی امداد کی طرف متوجہ کیا جائے" پسندیدگی کا اظہار کیا اور بظاہر عمل بھی کرلیا جس کے نتیجہ میں اہل شہر نے اُن کی امداد شروع کی حتیٰ کہ نواب محی الدین عرف بڈھے خاں نے دو ہزار رُپے دیئے۔

(۲) بہرحال یہ تو شمس العلماء کے نزدیک بھی مسلّم ہے کہ جس طرح اور فوجی تنخواہوں کے لئے طوفان برپا کرتے رہتے تھے۔ ان جہادیوں نے تنخواہ یا روزینہ کی فریاد نہیں کی صرف "بھوکے مرنے کی فریاد کی" اور وہ بھی ۱۴ جولائی کو جب کہ اُن کے پاس اپنا اندوختہ ختم ہوگیا تھا اور دہلی میں ایک طرح کا قحط رونما تھا۔

(۳) بادشاہ کا عذر اور میر فیاض علی صاحب کی تجویز بھی قابل توجہ ہے۔

فوجیوں کی تنخواہوں کا مطالبہ ہوتا تھا تو بادشاہ جنرل بخت خاں یا مرزا مغل وغیرہ کے حوالہ کردیا کرتے تھے کہ وہ انتظام کریں۔ لیکن جہادیوں کی خوراک کا معاملہ کسی گورنر یا جرنیل کے حوالہ نہیں کیا جا رہا۔

یہی ایک اہم نکتہ ہے جس سے ان مجاہدین کا کردار نمایاں ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیشہ ور فوجیوں کے سامنے حلال و حرام کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ بالخصوص زمانہ جنگ

ہیں وہ ہر مال کو جو اُن کے سامنے آجائے جائز سمجھتے ہیں۔

یہ تو بہت پُرانی بات ہے کہ شاہ سبکتگینؒ کی فوجیوں نے کچھ مرغیاں پکڑلیں تو حکم دیدیا کہ ان کے کان چھید دئے جائیں مگر جب سے مغربی تہذیب کا آفتاب سیاہ طلوع ہوا ہے ان روایات کہنہ کی تاریکی ختم ہوگئی ہے۔ نئی روشنی نے فوجیوں کے اختیارات میں بے پناہ وسعت پیدا کردی ہے۔ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ یورپ کی اسی جنگ عظیم کے دوران میں (جو ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک دنیا میں بموں کی بارش برساتی رہی تھی) ہم نے خود دیکھا ہے کہ اس مہذب اور متمدن زمانہ کی تربیت یافتہ فوجیں جب سفر کرتی تھیں تو اسپشل کی آمد کی خبر سنتے ہی اسٹیشن کے تمام اسٹال بند ہوجاتے تھے اور خونچے والے اپنے خونچے لیکر باہر بھاگ جاتے تھے۔ کیونکہ فوجیوں کی بے تکلفی کے سامنے نہ اُن کے خونچے باقی رہ سکتے تھے اور نہ اسٹالیں محفوظ رہ سکتی تھیں۔

اور اس سے پہلے زمانہ امن میں جب ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی میں تبدیل ہوتے والی فوجیں پاپیادہ مارچ کیا کرتی تھیں تو دیہات کے باشندے اپنے بیل اور چھکڑے تو اس لئے چھپا دیتے تھے کہ اُن کو بیگار کا خوف رہتا تھا جو صحیح ہوا کرتا تھا ساتھ ہی قیمتی سامان اور جوان عورتوں کو بھی چھپا دیا کرتے تھے۔ کیونکہ فوجیوں کے ذوق غارت گری و عصمت دری کے سامنے نہ کسی کے مال کی کوئی وقعت و حرمت ہوتی نہ کسی کی عزت و عصمت کی۔

دہلی میں آنے والی انقلابی فوجوں کی لوٹ مار کے جو قصے بیان کئے جاتے ہیں اُن کو مبالغہ سے پاک کرلیا جائے تب بھی اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جس طرح انگریزی فوجوں نے قہر و جبر سے روپیہ وصول کیا۔ انقلابی فوجوں کا دامن بھی اس سے پاک نہیں رہا

ؒ سلطان محمود غزنوی کے باپ۔

مگر یہ جہادی صرف اس مال کو حلال اور جائز سمجھ سکتے تھے جو غنیم سے میدان جنگ میں حاصل کیا گیا ہو۔ لیکن وہ مال جو خود اپنی رعایا سے جبراً و قہراً حاصل کیا گیا ہو اُس کے مقابلہ میں ناقہ کشی اور بھوکے مرجانے کو ہزار درجہ غنیمت جانتے تھے۔

راہِ خدا میں جان کھپا دینا اُن کا نصب العین تھا۔ وہ دشمن کی گولی سے ہو یا فاقہ اور بھوک سے۔ لیکن جن کو دشمن سے بچانے کے لئے نکلے تھے انھیں کو نوچنا۔ اُن کے بلند اور اعلیٰ نصب العین کے لحاظ سے خود کشی کے ہم معنیٰ تھا۔ بادشاہ اُن سے خواہ کتنا ہی ناراض ہو کہ یہ لوگ اس کو بدعتی سمجھتے تھے اور آئندہ بھی توقع نہیں تھی کہ وہ بہادر شاہ کی ذات کے ہیواخواہ بن کر رہیں گے۔ مگر اُن کے احساس کی نزاکتوں کو وہ سمجھتا تھا۔ اسی بنا پر اُس نے اُن کا معاملہ نہ کسی شہزادے کے سپرد کیا کہ اُن پر غبن و خیانت کے الزامات پہلے ہی سے لگے ہوئے تھے اور کسی جرنیل اور کرنیل کو بھی اُن کے لئے انتظام کا حکم نہیں دیا کیونکہ وہ استحصال بالجبر سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔

باقی رہا شاہی خزانہ تو اس کی بھی تمام رقمیں جہادیوں کی شرائط کے بموجب قابل استعمال نہیں تھیں۔ لہٰذا بادشاہ نے بلا رو رعایت روکھا جواب دیدیا۔ ذکاءاللہ صاحب اس پر طنز کر رہے ہیں۔ حالانکہ صاحب نظر کے نزدیک بھی یہ بات قابل قدر ہے

چشم حسود کہ بر کندہ باد
عیب نماید ش ہنرم در نظر

البتہ میر فیاض علی صاحب نے جو تجویز پیش کی وہ ان حضرات کے لئے قابل قبول تھی۔ کیونکہ بقول منشی ذکاءاللہ خاں خیرات ہی کی روٹیاں سہی۔ مگر برضا و رغبت اور بخوشنودی تمام ہوں۔ تو جبر و قہر اور لوٹ مار کے پلاؤ قورمے سے خیرات کی سوکھی روٹی

ہزار درجہ بہتر ہے۔

مختصر یہ کہ ان خانہ بانِ دین اور مجاہدین فی سبیل اللہ نے یہ کسی طرح پسند نہیں کیا کہ کسی سے جبر و قہر اور ظلم و جور سے کچھ حاصل کریں۔ البتہ یہ شکل اُن کے لئے ناقابلِ برداشت تھی کہ لوگ فی سبیل اللہ خود اپنی طرف سے اُن کے کھانے کا انتظام کریں۔

جنگجو بہادروں کے لئے رسد کی یہ مثال بالکل نئی تھی۔ تاریخ میں اس کی کوئی نظیر ملنی بہت مشکل ہے۔ مگر اس سے ان حضرات کے نظریات کی پاکیزگی اور اہل شہر کی ہمدردیاں ثابت ہوئی ہیں وہ یاد رکھنے کی بات ہے۔

جذباتِ ایثار کی سرمستیاں

ذوقِ فنا اور جذبہ فداکاری کی یہ عجیب و غریب تاثیر ملاحظہ ہو کہ ظالمانہ انتقام کی تیز نفسی نے اعضاء بدن کو چکنا چور کیا۔ فاتحانہ رعونت کی ستم نوازیوں نے گِدوں اور چیلوں کے نوچے ہوئے ڈھانچوں کو دربار دکیا تو صفحاتِ تاریخ نے بھی بے سوچے سمجھے خونِ شہادت کے ان پاک دھبوں کو اپنے دامنوں سے کھُرچ دیا۔ تاکہ فنائیت مکمل ہو جائے

عُریانیِ تن بود غبارِ رہِ دوست

آں نیز بہ تیغ از سرم واکردند

ہاں کہیں کہیں کچھ نشانات باقی ہیں جن کو ان سطروں میں پھر سے اُجاگر کیا جا رہا ہے۔

کم و بیش چار ہزار مجاہدین جو ٹونک اجمیر۔ جے پور۔ بھوپال۔ ہانسی۔ حصار اطراف گوڑگانوہ اور خود دہلی کے گلی کوچوں سے اکھٹے ہو گئے تھے، کہاں گئے؟

دیکھو کچھ نشانات ملتے ہیں۔ شاید وہ انھیں کے نقش پا ہیں۔

منشی جیون لال کے روزنامچہ کے اقتباسات پہلے گذر چکے ہیں اُن میں سے چند سطریں دہرائی جاتی ہیں۔

۲ر جولائی۔ بخت خاں نے اطلاع دی کہ شہر کے باہر حملہ کے لئے جا رہا ہوں ساتھ جانے والوں کی تفصیل میں ایک عدد یہ بھی ہے۔ ایک سو مجاہدین۔

۹ر جولائی۔ جنرل بخت خاں نے انگریزی کیمپ میں گھس کر حملہ کیا۔ اس معرکہ میں جہادی بھی شریک تھے۔

۵ر اگست۔ جہادیوں نے شکایت کی کہ حملہ کے وقت جہادی تو پورے جوش کے ساتھ لڑتے ہیں اور فوج کے آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔

حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی۔ جہادیوں کے اس گروہ میں شامل نہیں تھے مگر جہادیوں کے اس دعویٰ کی وہ بھی تصدیق فرماتے ہیں

منھم من کان یجالد ویجاذ — انھیں مجاہدین میں سے وہ تھے جو ہر طرح نصاریٰ پر حملہ کرتے

ویجاوب النصاری ویضارب[1] — اور اُن کا دفاع کرتے تھے۔

۲ر ستمبر۔ خبر ملی کہ چند ہزار جہادی مولوی جلال الدین کی سرکردگی میں کھلے میدان میں لڑنے کے لئے نکلے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی اور اُن کے کئی سو ساتھی مارے گئے۔

یہ ۲ر ستمبر تک کے دھندلے سے نشانات ہیں۔ ۷ر ستمبر ۱۸۵۷ء سے انگریزوں نے مورچے تیار رکھ کے بڑی بڑی قلعہ شکن توپوں سے گولہ باری شروع کی اور ایک ہفتہ کی شبانہ روز گولہ باری اور آتش افشانی کے بعد ۱۴ر ستمبر کو اس قابل ہوئے کہ کشمیری گیٹ دروازہ شگاف، سے فوج کا ایک

---

[1] الثورۃ الہندیہ باغی ہندوستان ص۳۶۷

کالم شہر کے اندر داخل کر سکیں جہاں ۱۹ ستمبر تک قدم قدم پر اتنا شدید مقابلہ ہوتا رہا کہ بارہا انگریزی فوجوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ ان دو ہفتوں میں انقلابی فوجوں کے متفرق دستوں نے جس طرح دادِ شجاعت دی وہ فراموش نہیں کی جا سکتی۔ مگر وطن عزیز کے پایہ تخت کے ایک ایک چپہ پر جنھوں نے اپنے سر کٹوائے، جانیں قربان کیں۔ شہر پناہ کی سنگین حصار میں شگاف پڑ جانے کے بعد جنھوں نے اپنے بہادر سینوں کی چٹانوں سے ان شگافوں کو بند کئے رکھا وہ کون تھے۔ اس کے لئے شاہد عینی کی شہادت کے الفاظ ملاحظہ کیجئے جو اس نے زندگی کے آخری لمحات میں قلمبند کئے تھے۔ جب وہ وطن سے بہت دور انگریزوں کی نظر عنایت سے قطعاً مایوس اور اپنے خالق و مالک کی بارگاہ میں سرخروئی کے ساتھ حاضری کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ شہید جفا مولانا فضل حق خیرآبادی کے الفاظ ہیں۔

فطفق النصاریٰ یحملون علی البلد وابوابه ویسطون علی دراببته وحجابه۔ و المجاهدون المشهود وفریق من الجنود یعوقونهم عن البلد ویصاولون ویجولون بینهم و بین مایحاولون یتجالدُ الفریقان لیلاً ونهاراً رکبانا ورجالاً۔

پھر نصاریٰ (انگریزی فوجیں) شہر اور اس کے پھاٹکوں پر دربانوں اور محافظوں پر حملے کرنے لگے۔ ادھر حالت یہ تھی کہ جہادی جو ہر وقت حاضر رہتے تھے اور انقلابی فوجوں کی ایک جماعت شدت سے اُن کو شہر سے روکتی بھی تھی اور اُن پر حملے بھی کرتی رہتی تھی اور نصاریٰ جو کچھ چاہ رہے تھے قدم قدم پر اُن کے آڑے آئی تھی۔ دونوں فریق کے پیدل اور سواروں کا شدید مقابلہ پوری قوت سے رات دن جاری رہتا تھا۔

یہ تو ان دو ہفتوں کی بات ہے۔ جب فتح و شکست کا آخری مرحلہ درپیش تھا اور جب باشندگان شہر کے دو گروہ اور عناصر جو اب تک انگریزوں کی حمایت خفیہ طور سے کر رہے تھے اب کھل کر سامنے آگئے تھے اور بڑی تعداد شکست کے آثار دیکھکر شہر سے نکلنے لگی تھی۔ اس سے پہلے خاص اس زمانہ میں جب شہر کا گوشہ گوشہ انقلابی فوجوں سے پٹا پڑا تھا اور شہر کے ایک ایک کوچہ سے انگریز دشمنی کے آوازے بلند ہو رہے تھے اس عینی شاہد کی شہادت خاص اس دور کے متعلق بھی یہ ہے

كانت الحرب بينهما اربعة
اشهر سجالاً ولم يجد العدى
في تلك المدة مع غاية الشدة
وكثرة العدة والعُدة - الى
دخول البلد سبيلاً ومجالاً -
بل كلما هجموا صُدوا ومهما
اقدموا رُدّوا - كان المجاهدون
الغزاة الحماة الكماة يدافعونهم
اشد دفاع - ويقارعونهم اشد
قراع يثبتون عند التحام الاقدام
ويتقدمون على كل مقدام -
لدى الاقدام - فذاق كثير
منهم شهد الشهادة - وسعدوا

چار ماہ تک برابر کی جنگ جاری رہی اور باوجودیکہ دشمن (انگریز) ہر طرح مضبوط تھا اس کے پاس فوجیں بھی زیادہ تھیں اور سامان جنگ بھی بہت تھا مگر کسی طرح بھی وہ شہر میں داخل ہونے کا موقع نہ پا سکا۔ اس کے حملوں کو روکا جاتا اور اس کے ہر اقدام کو پسپا کر دیا جاتا تھا۔ یہ غازی غیور و باحمیت مجاہد شدت سے جوابی کارروائی کرتے اور ڈٹ کر میدان جنگ میں مقابلہ کرتے تھے گھمسان کے وقت ثابت قدم رہتے جہاں بھی موقع ملتا پینترا بدلکر آگے بڑھتے۔ اسی میں ایک بڑی تعداد نے شربت شہادت نوش جان کیا اور سعادت ابدی اور اعلیٰ درجات پر فائز ہوئے اور

وصعدوا معارج السعادة و	قرآن پاک کی اس بشارت سے مشرف ہوئے کہ جن کے
للذین احسنوا الحسنیٰ و زیادة	کارنامے اچھے ہیں اُن کو اُن کے کارناموں سے بڑھ
وما بقی من المجاھدین الا	چڑھ کر اضافہ اور زیادتی کے ساتھ انعام دیا جائے گا
قلیل یبیتون جیاعا و یصبحون	ان سرفروش مجاہدین میں بہت ہی کم زندہ بچے جنکی حالت یہ تھی
الی الغزو سراعا۔ فیقارعون	کہ بھوکے پیٹ رات گذارتے اور جیسے ہی صبح ہوتی میدان جنگ
العدو قراعا فکانوا مع جمع	کی طرف دوڑ جاتے اور بڑی شدت سے جنگ کی کارروائی
من الجیش یحفظون السور و	شروع کر دیتے کبھی باضابطہ فوج (تلنگوں) کے ساتھ شہر پناہ
یسدون الثغور۔	کی حفاظت کرتے اور کبھی اپنی حدود کی ناکہ بندی کرتے۔

بقول مولانا خیرآبادی یہ تھوڑے سے مجاہدین جو باقی رہ گئے تھے اُنھوں نے اپنی جانیں کہاں قربان کیں اور بھوک پیاس کی یہ گرانی کس طرح رفع کی۔ اس کا قصہ بھی سُن لیجئے۔

جامع جہاں نما اور شہادت کی گرم بازاری

جامع جہاں نما یا شاہجہانی مسجد یعنی جامع مسجد دہلی جو اس پُوری صدی میں وقار ملت کے قبلہ نما کی حیثیت سے نمایاں رہی ہے۔ ۱۴ ستمبر کو اس کی سیڑھیوں کے نیچے کھلے میدان میں ایک معرکہ ہوا جس کا تذکرہ تمام مورخین نے کیا ہے۔

ہم اس معرکہ کی تفصیل خواجہ حسن نظامی مرحوم[۱] کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بہت سے واقعات اُنھوں نے شہر کے بڑے بوڑھوں سے

۱؎ یہ اقتباس خواجہ صاحب کی مشہور تصنیف "دہلی کی جاں کنی" سے ماخوذ ہے جو ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی تھی۔ ملاحظہ ہو دیباچہ ص۶

(جو ۱۸۵۷ء میں صاحب شعور تھے) زبانی دریافت کر کے قلمبند کئے ہیں۔ خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

فوج کا ایک حصہ سر طامس مٹکاف کے ماتحت تھا وہ شہر کے حال سے خوب واقف تھے کیونکہ وہ دہلی کے کلکٹر و مجسٹریٹ رہ چکے تھے۔ اس لئے وہ اپنی فوج کو ایسے راستوں سے لے گئے جہاں دشمنوں کی آتش باری بہت کم تھی۔ وہ جامع مسجد تک پہونچ گئے اور جہاں آج کل ڈفرن ہسپتال ہے (یعنی جامع مسجد کے شمالی جانب کے سامنے جہاں اس وقت میدان تھا) وہاں کھڑے ہو کر کمک کا انتظار کرنے لگے۔ اُن کو خیال تھا کہ اجمیری دروازہ کابلی دروازہ اور سبزی منڈی کی فوجیں حسب وعدہ یہاں پہونچ جائیں گی۔ اُنھوں نے آدھ گھنٹہ ٹھیر کر انتظار کیا۔ جامع مسجد میں اُس وقت ہزارہا مسلمان نماز کے لئے جمع تھے۔ اُن کو معلوم ہوا کہ انگریز مسجد کو بارود سے اُڑانا چاہتے ہیں۔ اُن سب کے پاس تلواریں تھیں۔ بندوقیں نہ تھیں۔ اُن کا ایک آدمی تکبیر پر چڑھا اور اُس نے مسلمانوں سے پکار کر کہا۔ تمہارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ دشمن سامنے کھڑا ہے جس کو مرنا ہو وہ میرے ساتھ شمالی دروازہ کی طرف آئے اور جسکو جان پیاری ہو وہ جنوبی دروازہ کی طرف چلا جائے کہ ادھر دشمن کی فوج نہیں ہے۔ یہ تقریر سُن کر مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اُن میں سے ایک بھی جنوبی دروازہ کی طرف نہیں گیا اُن سب نے تلواریں میانوں سے کھینچ لیں۔ سب سے پہلے میانوں کو کاٹ کر پھینکدیا۔ پھر شمالی دروازہ

کی طرف دوڑے۔ مٹکاف کی فوج نے بندوقوں کی ایک باڑھ ماری جس سے دو سو آدمی شہید ہو کر گر پڑے۔ مسجد کی سیڑھیاں اُن کی لاشوں سے بھر گئیں مگر مسلمان تڑپتی ہوئی لاشوں کو چھوڑ کر اس پھرتی سے آگے بڑھے کہ مٹکاف صاحب کو دوسرے گراپ مارنے کی مہلت نہ مل سکی اور تلواروں کی دست بدست لڑائی ہونے لگی مٹکاف صاحب اور اُن کی فوج کو اُن پرجوش آدمیوں کے مقابلہ سے، شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔ مسلمانوں نے کشمیری گیٹ کے گرجا تک اُن کا تعاقب کیا۔[1]

خواجہ صاحب کا ایک وضاحت طلب جُملہ

سطور بالا میں خواجہ صاحب کا یہ ارشاد خاص طور پر وضاحت طلب ہے کہ

"جامع مسجد میں اس وقت ہزارہا مسلمان نماز کے لئے جمع تھے"

خواجہ صاحب نے اس کی تصریح نہیں فرمائی کہ یہ مسلمان شہر کے باشندے تھے یا باہر سے آئے ہوئے تھے۔ جہاں تک شہری مسلمانوں کا تعلق ہے بیشک جمعہ کے روز وہ ہزاروں کی تعداد میں جامع مسجد میں حاضر ہوتے ہیں مگر یہ جمعہ کا دن نہیں تھا۔

یہ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے (۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ) ۱۴ ستمبر کو جمعہ نہیں بلکہ دوشنبہ (سوموار) تھا اور جیسا کہ چند سطر بعد معلوم ہوگا تقریباً ۱۲ بجے کا وقت ہے۔ یہ کسی نماز کا بھی وقت نہیں۔ پس ستمبر کی گرمی میں دوپہر کے وقت انتہائی خطرہ کی حالت

لہ دہلی کی جان کنی صفحہ ۳۳ و ۳۴

میں بال بچوں اور گھر بار کو چھوڑ کر جامع مسجد میں شہری مسلمانوں کا جمع ہونا قیاس میں نہیں آتا۔ اب ایک چشم دید گواہ کی شہادت ملاحظہ فرمائیے۔

یہ راقم الدولہ ظہیر دہلوی ہیں جو ۸ بجے صبح سے حالات کا جائزہ لینے کے لئے گھوم رہے ہیں اور اس حادثہ سے تقریباً ایک گھنٹہ بعد جامع مسجد پہونچے ہیں اور انھوں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ کوتوالی سے لیکر جامع مسجد تک لاشیں پڑی ہوئی ہیں اور خاص جامع مسجد کے قریب لاشوں کا ایسا انبار ہے کہ جیسے لکڑیوں کی ٹال لگی ہوئی ہو۔ان کا بیان یہ ہے کہ یہ "مسافر" تھے۔ اُن کے دلچسپ اور پُر از معلومات عینی بیان کا خلاصہ یہ ہے۔

صبح کے پانچ بجے سے سیکڑوں توپیں جن کی صحیح تعداد اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ دونوں طرف سے آگ برسا رہی تھیں۔ شہر کی زمین دہل رہی تھی مکان لرز رہے تھے دس بجے تک یہی قیامت برپا رہی میں (ظہیر) پانچ چھ آدمی لیکر تقریباً ۸ بجے صبح کو مکان سے نکلا۔ قلعہ کا ارادہ کیا۔ راستے بند تھے۔ بہرحال جوں توں کر کے ہم قلعہ کی حد میں پہونچے۔ دروازہ بند تھا۔ دروازہ پر ایک آدمی کھڑا ہوا میدان جنگ کے حالات دیکھ رہا تھا اور نیچے لوگوں کو بتا رہا تھا کہ کون سی فوج کس جگہ کیا کر رہی ہے۔ بہرحال قلعہ میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملا تو ہم مکان واپس ہوئے۔ راستہ میں کوتوالی کے قریب انگریزی فوج کے ایک دستہ نے ہم پر گولیوں کی باڑھ ماری مگر ہم سب

له داستان غدر ص۱۱۳

محفوظ رہے۔ ایک ساتھی کے گولی لگی مگر اُس کے گلے میں تقریباً چار اُنگل لمبا چوڑا چمڑا اور ایک مڑھا ہوا تعویذ پڑا ہوا تھا۔ گولی اس چمڑے اور تعویذ میں گھس کر اپنا زور ختم کر چکی تھی۔ تاہم اُس کے پیٹ پر ایک بالشت لانبی گہری خراش آ گئی تھی۔

بہرحال خدا خدا کر کے ہم گھر پہونچے (یعنی تقریباً دس بجے) اب میں (ظہیر) گھر پہونچ کر تشویش میں پڑ گیا کہ اب انگریزی فوج قبضہ کر لے گی اور باشندگان شہر کا قلع قمع کر دے گی۔ ایک ڈیڑھ گھڑی کا عرصہ گذرا کہ یکایک بہت قریب سے توپ چلنے کی آواز آئی (یعنی تقریباً ۱۱ بجے) میں چونک کر گھر سے نکلا۔ دو تین آدمیوں کو ساتھ لیکر گلی میں پہونچا۔ آمد و رفت برابر جاری تھی۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا ہوا مجھے بتایا گیا کہ انگریزی فوج کو مار کر بھگا دیا ہے۔ پھر میں وہاں سے چاوڑی بازار میں جا پہونچا تو دیکھا کہ واقعی ہزاروں آدمی۔ لاٹھی۔ پونگا تلوار۔ گنڈاسا وغیرہ لئے ہوئے شہر میں پھرتے ہیں۔

غرض کہ جامع مسجد کے نیچے ہو کر گلیوں کے بازار میں پہونچا۔ تو وہاں عجیب تماشا نظر آیا۔ لاشوں کا ایک ایسا انبار تھا جیسے لکڑیوں کی ٹال لگی ہوئی ہے اور یہ موقع ہے جہاں چار ماہ پہلے مجھے ایک مست درویش مجذوب نے بتایا تھا کہ یہاں کشت و خون ہوگا۔ وہاں سے آگے بڑھا تو اور لاشیں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے بازار کے لوگوں سے ماجرا پوچھا۔ لوگوں نے بتایا۔

"ایک برن (کالم) انگریزی فوج کا مسجد کی سیڑھیوں تک آپہونچا تھا اور کچھ لوگ فوج کے رعایا کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرنے لگے۔ ادھر فوجیوں نے یہ چاہا کہ جامع مسجد میں داخل ہو جائیں۔ مسجد میں جو مسلمان مسافر جمع تھے انھوں نے دیکھا کہ اب یہ خدا کے گھر میں آکر کشت و خون کریں گے۔ آؤ۔ بہتر تو یہ ہے کہ مسجد سے نیچے اُتر کر اُن سے سمجھ لیں۔ یہ کہکر وہ مسجد کے دروازہ سے باہر نکل کر سیڑھیوں سے اُترنے لگے۔ فوج والوں نے اُن پر بندوقیں سَر کیں۔ مگر جو زندہ رہے وہ سامنے چلے اور باہم جنگ مغلوبہ دست بدست ہونے لگی۔ ایک غل شور برپا ہوا۔ لوگ گھروں میں سے لکڑیاں پلنگ کی پٹیاں۔ تلواریں لے لے کر دوڑ پڑے۔ اس کالم کے کچھ آدمی مارے گئے جن کی لاشیں پڑی ہیں۔ باقی بھاگ کر اپنے لشکر کو چلے گئے۔ میں یہ تماشا دیکھتا ہوا بڑے دریبے میں ہو کر خونی دروازے سے نکل کر کوتوالی کے آگے پہونچا۔ میں نے جامع مسجد سے لگا کر کوتوالی تک لاشیں برابر پڑی دیکھیں۔[۵۱]"

بہر حال ظہیر صاحب کے بیان سے واضح ہو گیا کہ یہ مسلمان جس تعداد میں بھی تھے۔ شہر کے باشندے نہیں تھے بلکہ مسافر تھے لیکن یہ مسافر کون تھے "تازہ وارد تھے یا کچھ دنوں سے دہلی کی مسجدوں میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ کوئی ایسے بہادر مسافر تھے جو اس پر آشوب زمانہ میں جب کہ شہر میں داخلہ کی بھی ممانعت تھی اور کاروبار بھی بند پڑے تھے۔ سیر و سیاحت یا تماشا جنگ کے لئے دہلی پہونچے اور ایک دو نہیں خواجہ صاحب کے

۵۱ داستان غدر صنا۱۱ تا صـ۱۱۴

الفاظ ہیں ہزاروں۔

قیاس و وجدان کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ مسافر وہی وہابی جہادی تھے جن کا مسکن مسجد اور جن کا رصد ہر ایک مسلمان کا گھر تھا جن پر منشی ذکاء اللہ خاں نے طنز کرتے ہوئے بتایا تھا کہ بدن پر کپڑے ثابت نہیں تھے مگر کمر میں تلوار ضرور تھی جن کے کھانے کا انتظام بادشاہ نے کرا دیا تھا کہ اہل شہر خیرات کی روٹیاں کھلایا کریں اور ثواب کما یا کریں۔

یہ انھیں خیرات کی روٹیوں کی برکت تھی کہ اُن کے اقدام نے انگریزی فوج کے چھکّے چھڑا دیئے۔ مٹکاف کو جان بچا کر بھاگنا پڑا اور کشتوں کے پشتے پیچھے چھوڑ گیا۔

یہ اسی اکل حلال کی برکت تھی کہ جامع مسجد اس وقت محفوظ رہ گئی اور پھر برطانوی سامراج بھی اسے محفوظ رکھنے پر مجبور رہا۔ آج اگر اسکی بلند عمارت اور اونچے منارے ہستی مسلم کے لئے قبلہ نما ہیں اور اگر اس کی عظمت کے آگے نہ صرف وزیر اعظم جمہوریہ ہند بلکہ دہلی میں آنے والے ہر ایک وزیر اعظم کی گردن حیرت و استعجاب سے خم ہوتی ہے تو وہ صرف شاہ جہاں کی حسن نیت اور اعلیٰ صنعت کا نتیجہ نہیں بلکہ ان مجاہدین ایثار شیوہ کی قربانی اور اُن کے اس ذبح عظیم کی تجلی ہے جس نے اس کی منزلت کو دوبالا کر دیا ہے اور اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

خاکساران جہاں را بحقارت منگر ؛ تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

مختصر یہ کہ یہ مسافر وہی وہابی جہادی تھے جو دس گیارہ بجے تک دشمن کے مقابلہ پر لڑتے رہے اور اب جب انقلابی فوج شکست کھا کر پیچھے ہٹی۔ بزدل سپاہیوں نے راہ فرار اختیار کی۔ تو یہ مجاہدین با اخلاص اسی کے گھر آپڑے جس کے نام پر قربان ہونے کے لئے آئے تھے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بہت سوں نے قربان ہو کر اپنی تمنائیں پوری کر لیں۔

سر جدا کرد از تنم شوخے کہ با ما یار بود
قصہ کوتاہ کرد ورنہ دردِ سر بسیار بود

گر عاشقِ صادقی بکشتن مگریز
مردار بود سرِ آن کہ او را نکشند

زخمی مجاہدین کا دار الشفا

یاد رکھنے کی بات ہے شمس العلماء فرماتے ہیں۔ انگریزی غلبہ کے بعد جن کے لئے بلا تامل قتل یا پھانسی کا عمل جاری کر دیا جاتا تھا اُن کی چند قسمیں تھیں۔

(۱) زخمی جہادی۔ جو مسجدوں میں پڑے ہوئے ملتے تھے[۱] پہلے یہ زخمی ہوتے تھے اب دار و رسن کی سنت ادا کرتے تھے۔

عمرے ست کہ آوازہ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

باقی قسمیں بھی اسی وقت ملاحظہ فرمائیے۔

(۲) بادشاہی خاصہ بردار۔

(۳) میگزین کے ملازم جن کا سردار کریم بخش تھا جو میگزین پر انقلابی فوج کو قبضہ دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر میگزین اُڑنے کے وقت کسی صورت سے بچ گئے تھے

(۴) اجمیری دروازہ کے موچی۔ کیونکہ کچھ موچیوں نے مٹکاف کا تعاقب کیا تھا جب وہ ۱۱ مئی کو فرار ہو رہا تھا (۵) تلنگے جو کہیں سے چھپے ہوئے مل جاتے تھے[۱]

مختصر یہ کہ مجاہدین با اخلاص جنکو خود اُن کے بھائی "وہابی" کہا کر مطعون کرتے تھے جنہوں نے نہ کسی سرکاری خزانہ پر قبضہ کیا تھا نہ بہادر شاہ کے فوجی فنڈ نے اُن کی امداد منظور کی تھی نہ اُن کے پاس ڈیرے خیمے تھے نہ کسی دیوان خانے پر اُن کا قبضہ تھا صرف اللہ کے نام پر گھروں سے نکلے تھے۔ اسی کے لئے بال بچوں کو چھوڑا تھا اسی کے نام پر اُن کی زندگی تھی اور جب زندگی سے مایوس ہوئے تو اسی کے گھر کو اپنی پناہ گاہ بنایا یہی مسجدیں اُن کی دار الشفا تھیں کیا دنیا کے اسکاؤٹس، رضاکار اور والنٹیئر اس ایثار و قربانی، شوقِ فدائیت اور ولولۂ شہادت کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ رحمہم اللہ و رضی عنہ

اب چند سطروں میں ان عمارتوں کی سرگذشت بھی ملاحظہ فرمائیے جہاں یہ پناہ لیا کرتے تھے۔

---

[۱] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ - ص۱۱۷

دہلی کا تباہ شدہ علاقہ

راقم الدولہ ظہیر دہلوی۔

کابلی دروازہ سے لیکر قلعہ تک اور دریبہ سے لیکر قلعہ تک اور جامع مسجد سے لیکر دلی دروازہ تک۔ بلاقی بیگم کا کوچہ۔ خانم بازار۔ خاص بازار۔ خان دوراں خاں کی حویلی سے دریا گنج تک ہزار ہا مکانات منہدم اور مسمار کرکے دلی کا چبوترہ بنا دیا گیا۔ اور چٹیل میدان کر دیا گیا۔[1]

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں

بلاقی بیگم کا کوچہ۔ خانم کا بازار۔ خان دوراں خاں کی حویلی۔ گلیوں کا بازار دریا گنج کی گھاٹی۔ انگوری باغ۔ دیگر آبادی وغیرہ میں بعض بالکل بعض کے حصے منہدم کر دیئے گئے۔[2]

قلعہ کے نیچے میدان کرنے میں ایک بڑی عالیشان مسجد اکبر آبادی بالکل منہدم ہوئی اور بہت سی چھوٹی چھوٹی مساجد مسمار ہوئیں۔[3]

مسمار کرنے اور منہدم کرنے اور مسجدوں اور مندروں کو تباہ و برباد کرنے کا قصہ جتنا طویل ہے اتنا ہی دردناک بھی۔ مگر اب اس ماتم سے کیا فائدہ؟ ہم نے یہ ذکر یہاں اس لئے چھیڑا کہ اس تباہی کی وجہ دریافت کریں۔

بیشک ایک وجہ تو کھلی ہوئی تھی کہ انقلابی فوجوں کی بود و باش زیادہ تر اسی علاقہ میں رہی جو طول میں کشمیری گیٹ سے دہلی دروازہ تک تقریباً دو میل اور شرقاً غرباً عرض میں

---

[1] داستان غدر صفحہ ۳ ان کے علاوہ تباہ ہونے والے بازاروں میں فیض بازار اردو بازار کے نام بھی لئے گئے ہیں جو اسی علاقہ میں تھے [2] تاریخ عروج عہد انگلشیہ صفحہ ۷۲۰ [3] ایضاً صفحہ ۷۱۷

تقریباً ایک میل ہے۔ اسی علاقہ میں وہ بھی رہا کرتے تھے جن کا تعلق بادشاہ سے رہتا تھا اور یہی علاقہ ہے جہاں چپہ چپہ پر انگریزوں کا مقابلہ کیا گیا لیکن ان سب سے زیادہ انتقامی جذبات کو مشتعل کرنیوالی وجہ یہ ہے کہ ان وہابی جہادیوں کے مرکز انہیں محلوں اور یہاں کی مسجدوں میں تھے۔ شمس العلماء کا بیان ہے کہ

مولوی رحمت اللہ کرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے وہ قلعہ کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اُترے۔"

سرسید مرحوم کی مشہور تصنیف آثار الصنادید پہلی بار اس انقلاب سے دس سال پہلے ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ مصنفہ، سید احمد خاں مصنف۔ اسکی تاریخ ہے۔ سید احمد خاں صاحب اسی مسجد کے متعلق تحریر فرماتے ہیں

یہ مسجد ایسی آباد ہوگئی ہے کہ اب اس کو باعتبار کثرت عبادات اور وفور طاعات خیر المساجد اور افضل المساجد کہنا چاہیئے۔

زینت المساجد عرف گھٹا مسجد

شہید تو نہیں کی گئی۔ البتہ بیکری اور کچن وغیرہ کے استعمال میں اسکو عرصہ تک لایا جاتا رہا[1]۔ یہ مسجد دریا گنج میں ہے اسکی مشرقی جانب میں چند گز کے فاصلہ پر شہر پناہ کی دیوار اور ایک پھاٹک تھا جس سے دریائے جمنا کے گھاٹ پر جایا کرتے تھے اسی مناسبت سے اسکو گھٹا مسجد بھی کہتے ہیں اپنے طول وعرض اور خوبصورتی میں یہ مسجد بے نظیر ہے۔ جامع جہاں نما (جامع مسجد دہلی) کے بعد اسی کا نمبر ہے شاہدرہ سے دلی جاتے ہوئے صرف دو مسجدوں کے مینار نظر آتے ہیں۔ ایک جامع مسجد کے اور دوسرے اسی زینت المساجد کے۔ سرسید احمد صاحب مرحوم فرماتے ہیں اس مسجد کو مشہور شاہزادی زیب النساء بیگم دختر اورنگ زیب عالمگیر نے بنوایا تھا۔ اس کا مدفن بھی اسی مسجد کے صحن میں شمال کی طرف ہے اسکی قبر کے پاس ایک چھوٹا برج تبرکات رکھنے کا ہے اس کے نیچے دو حجرے ہیں ایک سنگ باسی کا اور دوسرا سنگ مرمر کا جس کا فرش بھی سنگ مرمر کا ہے۔"

---

[1] چند سال تک پامال کرنے کے بعد جب انگریزی فوج کا رسالہ یہاں سے منتقل ہوا تو بیکری اور کچن وغیرہ کی حیثیت ختم کرکے پھر مسجد کی اصل صورت بحال کی گئی۔ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ سابق صدر جمعیۃ علماء ہند کو اس مسجد سے بے حد انس تھا کیونکہ اُن کے والد ماجد نے اسی مسجد کی ایک صحنچی کو اپنا نشیمن بنایا تھا۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ کے بچپن کا ایک حصہ اسی مسجد میں گذرا تھا۔ پھر یہ مسجد آثار قدیمہ کی فہرست میں داخل ہوگئی۔

سرسیّد نے جس مجمر کا پتہ دیا ہو اب اس کا وجود باقی نہیں ہو صرف دو پختہ قبریں ہیں ان پر نہ کتبہ ہو نہ گنبد۔

مسجد کا قصور ایک قصور تو یہ ہو کہ یہ دریا گنج[1] میں ہو۔ شاہی محلات سے متصل اور اسی علاقہ میں سب سے پہلے انقلابی فوج نے انگریزوں کا خاتمہ کیا تھا (۲) ممکن ہو اس عام شہرت نے بھی جرم و قصور کی حیثیت اختیار کرلی ہو کہ حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ جب پیراکی کی مشق کیا کرتے تھے تو آپ کا فرودگاہ اور آرام گاہ یہی مسجد ہوا کرتی تھی۔

اکبری مسجد جو مسجدیں منہدم کی گئی ہیں اُن میں اکبری مسجد یہ خصوصیت رکھتی ہو کہ اسکو شہید کرکے اسکی جگہ ایڈورڈ کا مجسمہ نصب کیا گیا مجسمہ نصب کرنے سے پہلے جو پارک بنایا گیا اسکو یہ اعزاز حاصل ہو کہ اس کی بنیاد جارج پنجم نے رکھی تھی ایڈورڈ پارک جامع مسجد دہلی کی شرقی جانب تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر آج بھی موجود ہو جس وقت پارک کے لئے زمین ہموار کی جانے لگی تو مسجد کا چبوترہ اور بنیادیں جوں کی توں مثل گنج نہاں زمین میں مدفون تھیں ویسے ہی ڈھک دی گئیں۔ فیض بازار جس کا تذکرہ تباہ شدہ بازاروں کے سلسلہ میں گذرا یہ مسجد اسی بازار میں تھی۔ شاہ جہاں بادشاہ کی بیگم اعزاز النساء عرف اکبرآبادی محل نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ کرکے یہ عظیم الشان مسجد بنوائی تھی۔ مسجد کا مسقف حصہ ۶۲ گز لمبا اور سترہ گز چوڑا تھا۔ مسجد کے تین گنبد اور سات در تھے۔ دائیں بائیں خوبصورت اور بہت بلند مینار تھے۔ سامنے ۶۳ گز لمبا اور اتنا ہی چوڑا صحن تھا جو زمین سے تین گز اونچا تھا۔ اس کے گرد تین گز اونچا کٹہرا بنا ہوا تھا صحن کے سامنے ۱۲×۱۲ گز حوض تھا جس میں نہر سے پانی آتا تھا۔

دران صحن حوضے بصد آب و تاب ⁂ درخشندہ چوں چشمۂ آفتاب

---

[1] دریا گنج میں ہونے کے سبب سے اس مسجد پر دوسری افتاد تقسیم ہند کے زمانہ (۱۹۴۷ء) میں پڑی جب اس علاقہ میں مسلمانوں کے خلاف اشتعال کے شعلے بھڑکے تو اس مسجد میں شرنارتھیوں کے بہت سے خاندان آباد ہوگئے تقریباً چار سال بعد مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب نے جو سنی مجلس اوقات کے چیرمین بھی تھے، بہت مشکل سے اس مسجد کو خالی کرا کر پھاٹک بند کرا دیا اور آمد و رفت کے لئے غربی جانب ایک چھوٹا سا دروازہ باقی رکھا لیکن چونکہ آس پاس کئی کئی فرلانگ تک کوئی مسلمان اس علاقہ میں نہیں تھا۔ کچھ دنوں یہ مسجد ویران پڑی رہی۔ پھر جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے یہاں دینی تربیتی مرکز قائم کیا گیا۔ محلہ چوڑی والان کے ایک مشہور صاحب خیر حاجی محمد زین العابدین نے کئی سو روپیہ صرف کرکے بجلی کی فٹنگ کرائی اور بیت الخلاء تیار کرائے۔ مراد آباد کے مشہور بزرگ حضرت مولانا مظفر الدین صاحب کی مدد سے کئی ہزار روپیہ صرف کرکے اس کی ایک جانب کی صحنچیاں درست کرائی گئیں۔ الحمد للہ اب یہ مسجد آباد ہے۔

پوری عمارت سنگ سرخ کی تھی سامنے کی طرف سنگ مرمر کی بیلیں بنی ہوئی تھیں مسجد کے شمال جنوب اور مغرب میں تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر خوب کھلے اور صاف حجروں کی قطاریں تھیں حجروں کے سامنے برآمدے تھے گویا مسجد خاص طور پر اسی مقصد کیلئے بنائی گئی تھی کہ طلبہ حجروں میں رہیں اور مسجد میں درس دیا جائے۔ یہ مسجد کی ظاہر عمارت کی باتیں تھیں اب باطنی

یہ ہی مسجد تھی جہاں مترجم قرآن کریم حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب محدث اور اُن کے برادر محترم مولانا شاہ رفیع الدین صاحب درس دیتے رہے تھے۔ جماعت مجاہدین کے سالار قافلہ اور جہادی وہابیوں کے پیر و مرشد امیر المومنین حضرت سید احمد شہید جب عہد شباب میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی خدمت میں کسب فیض کے لئے حاضر ہوئے اور حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہٗ العزیز نے آپ کی تربیت حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے سپرد کی تب آپ کا قیام اسی مسجد میں رہا تھا[1] اس کے بعد جب آپ نواب امیر علی خاں کے یہاں سے رخصت ہو کر اپنے شیخ و مربی حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے تب بھی آپ کا قیام حسب معمول[2] اسی مسجد میں ہوا اور یہیں سے بیعت کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے حکم سے خاندان کے تمام متعلقین داخل ہوئے جن میں سے حضرت مولانا عبدالحئی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب شہید نے مشیر خاص، وزیر اور معتمد خصوصی کی حیثیت حاصل کی۔ یعنی قافلہ جہاد کی داغ بیل یہیں سے پڑی[3]

چند صفحات پہلے حضرت مولانا سید نصیر الدین صاحب کا ذکر خیر گذر چکا ہے۔ آپ نے حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کی شہادت کے بعد علم جہاد بلند کیا تھا ۱۸۵۷ء کے مجاہدین زیادہ تر آپ سے وابستگی رکھتے تھے جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ اس میں اتنا اضافہ اور

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص۳۷ [2] ایضاً ص۸۹ [3] محترم غلام رسول صاحب مہر کا ارشاد ہے تنظیم جہاد کا کاروبار اسی مسجد میں بیٹھ کر شروع کیا تھا۔ سرگذشت مجاہدین ص۱۳۷

کر لیجئے کہ جب تک آپ دہلی میں رہے آپ کا زیادہ وقت اسی مسجد میں گذرتا تھا اور یہی مسجد آپ کی دار المشورہ بھی تھی[۱]

محترم غلام رسول صاحب مہر نے اس مسجد کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد یہ شعر تحریر کیا ہے۔

آسماں سجدہ کند بر سر خاکے کہ بروے
یک دو تن یک دو نفس بہر خدا بنشینند

غالباً اس کی یہی عظمت تھی کہ برطانوی طواغیت نے اپنے عروج کے وقت دہلی کے تمام مجسموں میں اس جگہ سب سے بڑا اور سب سے اونچا مجسمہ قائم کرنا ضروری سمجھا۔ حالانکہ یہ مسجد ایسے موقع پر تھی کہ اگر اس کو باقی رکھا جاتا تو وہ اس وسیع میدان کے لئے جو مسجد اور لال قلعہ کے درمیان ہزاروں مکانوں کو منہدم کر کے بنایا گیا تھا زینت کا کام دیتی اور اس سے میدان کی خوبصورتی بہت بڑھ جاتی۔

دار البقاء اور دار الشفاء

شاہجہان بادشاہ نے جامع مسجد تعمیر کرائی تو اس کے دائیں بائیں روحانی اور جسمانی امراض کے علاج کے ادارے بھی قائم کر دیئے یعنی ایک پہلو میں مدرسہ دار البقاء اور دوسری جانب شفاخانہ دار الشفاء[۳]۔ ۱۸۵۷ء میں مدرسہ دار البقاء کے منتظم اور نگراں حضرت مولانا مفتی صدر الدین صاحب تھے جن کے یہاں جہادیوں کا جمگھٹا رہتا تھا چنانچہ ایک مرتبہ کچھ شرارت پسند نوجوانوں نے کسی غلط فہمی سے مفتی صاحب کے مکان پر یورش کر دی تو سنز جہادی جو وہاں موجود تھے مقابلہ پر آ گئے۔ جب مکان پر یہ جمگھٹا رہتا تھا تو مدرسہ دار البقاء میں کیا ممانعت ہو سکتی تھی۔ لہٰذا اکبری مسجد کی طرح یہ مدرسہ بھی مستحق ہدم تھا۔ دست انتقام نے اس حق کو ادا کر دیا۔

لقد صدق اللہ۔ ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا۔

---

[۱] سرگذشت مجاہدین صفحہ ۱۳۷ [۲] ایڈورڈ کا یہ مجسمہ ۱۹۱۱ء میں قائم کیا گیا گر اس کی تیاریاں بہت پہلے سے تھیں (ملاحظہ فرمائیے واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲) [۳] آثار الصنادید از سرسید مرحوم و واقعات دار الحکومت دہلی از بشیر الدین احمد صاحب۔ [۴] ایک روایت یہ ہے کہ ایک لاکھ مکان منہدم کئے گئے۔ (دہلی کی سزا صفحہ ۸۲)

نامور علماء و فضلاء

۱۸۵۷ء کی پوری تاریخ تو نہیں مگر بہت سی ضروری باتیں لکھی جا چکی ہیں۔ کچھ ایسے پہلو بھی سامنے آگئے ہیں جن پر اب تک ناواقفیت کی چادر پڑی ہوئی تھی یا بے اتفاقی اور لااعتنائی کے دھندلکوں میں وہ چھپے ہوئے تھے اب ایک نظر مضافات دہلی پر ڈالنی ہے لیکن اس مناسبت سے کہ یہ شاندار ماضی کی ایک جلد ہے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے اس تذکرہ کو علماء کرام کے ذکر خیر پر ختم کیا جائے لہٰذا چند ارباب فضل و کمال کے مختصر حالات سے کتاب کے اس حصہ کو متبرک بنایا جا رہا ہے۔ فتبارك الله احسن الخالقين

حضرت مولانا مفتی صدر الدین خاں آزردہ

حضرت مولانا مفتی صدر الدین صاحب ابن مولانا لطف اللہ صاحب کشمیری یعنی وہ جامع کمالات شخصیت جس کا ذکر آیا تو سرسید کے قلم کو گویا وجد آگیا۔ سب سے پہلے بے تحاشا یہ شعر تحریر فرمایا

هزار بار بشویم دهن زمشک و گلاب   هنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

قلم کو کیا طاقت کہ اُن کے اوصاف حمیدہ سے ایک حرف لکھے اور زبان کو کیا یارا کہ ان کے محامد پسندیدہ سے ایک لفظ کہے بقطع نظر اس کے کہ اس زبدہ جہان و جہانیان کی صفات کا احصا (پوری شمار) محال ہے اور کمالات کا حصر متعسر اسی لیے جو وقت قلم چاہتا ہے کہ کوئی صفت صفات میں سے لکھے یا زبان ارادہ کرتی ہے کوئی مدح مدائح میں سے کہے چونکہ ہر صفت قابلیت حال لکھنے کی اور مدح لیاقت پہلے بیان کرنے کی رکھتی ہے مدت تک یہی عقدہ بند زبان تحریر اور گرہ لسان تقریر رہتا ہے کہ کونسی صفت سے اور کونسی مدح سے ابتدا کرے۔ شعر

مجلس تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

بے شائبۂ تکلف و بے آمیزش مبالغہ، ایسا فاضل اور ایسا کامل کہ جامع فنون شتی (مختلف و متعدد) اور مستجمع علوم بے منتہا ہو اب سوا اس "سر گروہِ علمار روزگار" کے بساط عالم پر جلوہ گر نہیں (تقریباً ایک صفحہ میں آپ کے یکتا اور سر گروہ ہونے کے دلائل بیان کرنے کے بعد سرسید فرماتے ہیں۔)

راہِ حق میں تیز رو۔ اور سلک دنیا میں کاہل کوش لیکن تونگری ظاہری درویشی معنوی کی پردہ پوش ہے

کسانیکہ راہ خدا داشتند
چنیں خرقہ زیر قبا داشتند

اگر مولوی جامی زندہ ہوتے تو یہ بیت

چو فقر اندر لباس شاہی آمد
بہ تدبیر عبید اللّٰہی آمد

سوا اُس برگزیدۂ انفس و آفاق کے اور کسی کی شان میں نہ کہتے

آخر میں تحریر ہے۔

باوجود ان مراتب بلند اور اس منصب ارجمند کے خُلق محمدی اختیار کیا ہے۔ کہ افادہ علوم اور افاضۂ مسائل دین کے وقت ہر ادنیٰ کو اجازتِ سخن ہے[1]۔

---

[1] تذکرہ اہل دہلی ص۵۹۔

مولانا فقیر محمد صاحب جہلمی ثم الدہلوی مصنف حدائق الحنفیہ تحریر فرماتے ہیں۔

مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور تمام علوم صرف۔ نحو منطق حکمت۔ ریاضیات۔ معانی۔ بیان۔ ادب۔ انشار۔ فقہ۔ حدیث تفسیر وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور درس دیتے تھے۔ آباؤ اجداد آپ کے کشمیر کے اہل بیت علم و صلاح سے تھے۔ مگر آپ کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ علوم نقلیہ۔ فقہ۔ حدیث وغیرہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اور اُن کے بھائیوں سے حاصل کئے اور اُن کی سندیں لیں۔ اور فنون عقلیہ کو مولوی فضل امام خیرآبادی۔ والد مولوی فضل حق سے اخذ کیا اور شیخ (شاہ) محمد اسحاق دہلوی نے بھی آپ کو حدیث کی اجازت لکھ کر دی۔ آپ بڑے صاحب وجاہت و ریاضت اور اپنے زمانہ میں یگانہ روزگار اور نادرۂ عصر تھے۔ ریاست درس و تدریس خصوصاً افتائے ممالک محروسہ مغربیہ بلکہ شرقیہ و شمالیہ دہلی اور امتحان مدارس و صدارت حکومت دیوانی آپ پر منتہی ہوئی۔ بجز شاہ دہلی کے تمام اعیان و اکابر علماء و فضلاء خاص دہلی اور اُس کے نواح کے آپ کے مکان پر حاضر ہوتے تھے طلباء واسطے تحصیل علم اور اہل دنیا واسطے مشورۂ معاملات اور منشی لوگ (انشار پرداز) بغرض اصلاح انشاء اور شعراء واسطے مشاعرہ کے آتے

سلہ تاریخ ولادت چراغ (۱۲۰۴ھ)

تھے۔ اس اخیر وقت میں ایسا فاضل باایں جمعیتہ اور قوتِ حافظہ و حسن تحریر و متانت تقریر فصاحت بیان اور بلاغت معانی کے صاحب مروت و اخلاق اور احسان دیکھا نہیں گیا۔ طلبہ مدرسہ دار البقا[1] (جو جامع مسجد کے نیچے تھا) اکثر طعام و لباس و بعضے ماہوار جناب سے پاتے اور آپ سے اور دیگر علماء سے تحصیل علم کرتے تھے

۱۲۷۳ھ میں دہلی کے غدر میں آپ کو سخت زخم چشم پہونچا کہ تعلق روزگار بھی ہاتھ سے گیا۔ اور تمام جائداد و املاک بھی جو تیس سال کی ملازمت میں پیدا کی ہوئی تھی سرکار میں ضبط ہوگئی۔ بلکہ فتوی جہاد کے اشتباہ میں چند ماہ تک نظربند رہے۔ چونکہ اصل میں بے قصور تھے[2]۔ آخر کو رہائی پاکر لاہور میں تشریف لائے اور واسطے اپنے کتب خانہ مالیتی تین لاکھ روپیہ کے جو دہلی کی لوٹ میں نیلام

---

[1] سرسید رحہ آثار الصنادید میں تحریر فرماتے ہیں۔ شاہجہانی عہد سے زیر جامع مسجد مدرسہ دار البقا چلا آرہا تھا۔ وہ سلطنت کی تباہی کے ساتھ برباد ہوا۔ مفتی صاحب نے اپنے روپے سے دوبارہ بنوا دیا۔ عمارت درست کرائی۔ درس و تدریس کا اہتمام کیا۔ اساتذہ اور طلبہ کو اپنے پاس سے تنخواہ اور وظیفہ دیتے۔ منتہی طلبہ کو عدالت کے کام سے فارغ ہو کے اسباق خود پڑھاتے اور تعطیل کے دن سب کو لے کر باغات کی سیر کراتے اور لذیذ کھانے کھلاتے تھے۔

[2] محض حق تعالیٰ کا فضل یا سفارشوں کا اثر سمجھئے کہ پھانسی سے محفوظ رہے ورنہ ہزاروں بے قصور معمولی شبہ پر اور بہت سے محض تفریحاً تختہ دار پر لٹکا دیئے گئے۔

ہو گیا تھا حضور "لارڈ جان لارنس" صاحب کے پاس جو اُس وقت پنجاب کے چیف کمشنر تھے اور مولانا ممدوح کے دہلی میں بڑے مہربان رہ چلے تھے۔ مطالبہ کیا۔ لیکن چونکہ جائداد منقولہ کے نیلام کا واپس ہونا متعذر تھا اس لئے اپنے مطلب میں کامیاب نہ ہوئے لیکن اتنا ہو گیا کہ جائداد غیر منقولہ جو سرکار میں ضبط ہو گئی تھی واگذار ہو گئی اور مولانا موصوف دہلی میں واپس تشریف لیجاکر چند رے بستی حضرت نظام الدین اولیا اور پھر اپنی حویلی[لہ] خاص واقع دہلی میں خانہ نشین ہوئے اور اپنی حیات کے باقی ایام کو وظائف و عبادات اور تدریس علوم دینیہ میں بسر کیا۔

لہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنی عجیب و غریب تصنیف "دلی کی آخری شمع" میں تحریر کیا ہے چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدرالدین صاحب کا مکان تھا۔ اس کے نزدیک مٹیا محل میں نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے تھے ... مکان کوٹھی کے نمونہ کا ہے۔ انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا ہے صحن بہت بڑا نہیں۔ اس میں مختصر سی نہر ہے سامنے دالان در دالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن چبوترہ ہے۔ چبوترہ کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے۔ اُن پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوتے تھے۔ مفتی صاحب کی عمر کوئی ۷۵ سال کی تھی۔ گداز جسم۔ سانولا رنگ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں۔ بھری ہوئی داڑھی۔ بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی ہیں۔ ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں۔ بدن میں سفید ایک برکا انگرکھا۔ سفید پاجامہ سفید کرتا اور سفید ہی عمامہ تھا۔ (حاشیہ میں تحریر ہے) پُرانے زمانے میں شرفا گھر پر بھی پُورا لباس پہنے رہتے تھے زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے۔ ورنہ سارا وقت مردانے ہی میں گذرتا تھا ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا تھا۔ عالم ہوتے تو درس کا حلقہ ہوتا۔ شاعر ہوتے تو شعر کا چرچا ہوتا۔ غرض کوئی وقت بیکار نہ گذرتا۔ خاص خاص (باقی صفحہ ۲۴۶ پر)

مشاغل مفتی صاحب نے غالباً زمانہ اسارت میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو ایک خط لکھا تھا جس میں پچھلی زندگی کے مشاغل کا تذکرہ تھا۔ ملاحظہ فرمایئے۔

"شکر ہے اُس پروردگار عالم کا جس نے مجھے ایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اُس میں غرقاب تھا نکالا۔ کیسے علائق میں جکڑبند تھا کہ نکلنا اُن سے سوا اس صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا۔ مقدمات اصلی کا فیصل کرنا منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا۔ رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا۔ مقدمات کے دوران میں فتوے دینا کمیٹیوں میں حاضر ہونا طلبہ مدرسہ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا۔ احکام آخر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا۔ ہزارہا کاغذات پر دستخط کرنا۔ پھر گھر میں آکر طالب علموں کو پڑھانا[1] اور اطراف وجوانب کے سوالات شرعی کا جواب دینا۔ وہابیوں اور

---

[1] ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مفتی صاحب محکمہ نزول کے کام میں اتنے مشغول ہوئے کہ درس کے لئے کوئی وقت نہ نکال سکے۔ کئی دن تک درس بند رہا۔ ایک منچلے طالب علم نے ایک نظم لکھ کر مفتی صاحب کے پاس بھیجدی۔ نظم کا آخری شعر یہ تھا۔

ہاتف بدست چپ سر بینی فشردہ گفت ۔۔۔ بیماری نزول بہ صدر الصدور رشد

(غدر کے چند علماء ص ۴۹)

بقیہ ص ۲۴۵۔ دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی۔ ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لئے دیئے رہتے تھے۔ جہاں جاؤ یہی معلوم ہوتا تھا کہ دربار لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دوزانو مؤدب بیٹھا ہے۔ بے ضرورت نہ بات کی جاتی ہے نہ جواب دیا جاتا ہے۔ کوئی ہنسی کی بات ہوئی ذرا مسکرا دیئے کھل کھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا یا اونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا۔ ص ۳۹ و ص ۴۰ دہلی کی آخری شمع۔

بدعتیوں کے جھگڑے میں حکم (ثالث) ہونا۔ مجلس شادی و غمی اور اعراس میں جانا۔ شعر و شاعری کی صحبت گرم رکھنا، باغات کی سیر اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا

سیاسی بصیرت اور رئیس المجاہدین کی رہبری

ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے تقریباً دس سال پہلے جب رئیس المجاہدین حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب دہلی تشریف لائے تھے (تو جیسا کہ شاہ صاحب کے تذکرہ میں تفصیل سے بیان کیا جائیگا) یہی دانش مند فرزانہ روزگار۔ حضرت مولانا مفتی صدر الدین صاحب تھے جنھوں نے شاہ صاحب موصوف کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی جد و جہد کا مرکز دہلی کے بجائے آگرہ بنائیں، پھر آپ ہی نے اپنے خط کے ذریعہ شاہ صاحب کا تعارف آگرہ کے اُن زعماء اور علماء سے کرایا جو ایک طرف سرکاری حلقوں میں باوقار تھے تو دوسری جانب قومی اور ملی کارکنوں کا اعتماد ان کو حاصل تھا۔

جنوبی ہند کا ایک غیر معروف نوجوان جو دہلی میں ناکام ہو چکا تھا۔ اس نے اس دور بے آئین[۱] میں جو سیاسی لحاظ سے بہت ہی نازک[۲] تھا۔ پولیس اور سی آئی ڈی کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہتے ہوئے چند ہی مہینوں میں وہ غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی جس کی نظیر بہت ہی مشکل سے کہیں کہیں ملتی ہے۔ یہ بے شک حضرت شاہ صاحب کی غیر معمولی صلاحیت و قابلیت کی برکت ہے لیکن ایک منصف

---

[۱] اس دور کو کمپنی کی مادر گردی کا دور کہنا چاہیئے کہ نہ کوئی آئین تھا نہ آئین ساز مجلس۔ اظہار رائے کی معمولی آزادی بھی سلب کی جا چکی تھی۔

[۲] مولانا شاہ احمد اللہ صاحب کے حالات میں ان نزاکتوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

مزاج حقیقت پسند کو اس پر بھی قائل نہ ہونا چاہیئے کہ حضرت مفتی صاحب کے تعارفی خط نے بھی اساس اور بنیاد کا کام کیا ہے۔ دار الحکومت آگرہ کے اعلیٰ سیاسی طبقہ میں ایک غیر معروف شخص کے لئے رسوخ اور اعتماد حاصل کرنے کی کٹھن منزل جو سالہا سال میں طے ہوتی حضرت مفتی صاحب کا مکتوب گرامی اور سیاسی طبقہ سے مفتی صاحب کا گہرا تعلق ہی تھا جس نے اس کو نہایت آسانی سے چند لمحوں میں طے کرادیا۔

انقلابی سرگرمی سے خاموش دلچسپی

خاص اس ہنگامہ کے دوران مفتی صاحب کسی محاذ پر پیش پیش نظر نہیں آتے مگر تحریک انقلاب سے آپ کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ کا در دولت جس طرح عام حالات میں مرجع رہا کرتا تھا اُس وقت بھی انقلابی عناصر کا پناہ گاہ بنا رہا۔ انگریزوں کے سب سے زیادہ خطرناک دشمن جن کو مجاہدین کہا جاتا تھا جن کی انگریز دشمنی کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری کی بنا پر نہیں تھی۔ بلکہ اُن کی حریت پسند فطرت نے اس کو عقیدہ کی حیثیت دے رکھی تھی۔ ان سر کیف مجاہدین کا ہجوم جس کے در دولت پر رہتا تھا وہ مفتی صدرالدین صدر الصدور ہی تھے۔

چنانچہ ۹ر اگست ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے کہ کسی غلط فہمی کی بنا پر پچاس سپاہیوں کا ایک دستہ حضرت مفتی صاحب کے مکان پر چڑھ دوڑا اس پر منشی جیون لال کا تحریری بیان ہے کہ

یہ دیکھ کر کہ وہاں ستر جہادی مقابلہ کے لئے تیار ہیں وہ واپس آگیا۔[۱]

---

[۱] روزنامچہ منشی جیون لال اردو صـ ۲۱۲

ہندوستانی حکومت سے وفاداری

بلاشبہ مفتی صاحب صدر الصدور تھے۔ کمپنی کی حکومت کی طرف سے آپ کو تنخواہ ملتی تھی۔ مگر یہ صرف ایک ضابطہ کا تعلق تھا۔ آپ کے دل کا لگاؤ اور آپ کی حقیقی وفاداری سلطنت مغلیہ کے آخری نشان "بہادر شاہ ظفر" کے ساتھ مخصوص تھی اور اسی پر آپ کو فخر اور ناز تھا۔ جس کا اظہار آپ نے ایک مرتبہ دہلی کے کمشنر سے برملا کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ۔

"بادشاہ سلامت کے خزانہ سے مفتی صاحب کے منصب کے دو روپے آٹھ آنے ملتے تھے۔ محبوب علی خاں خواجہ جب وزیر ہوا تو اُس نے بند کر دیئے۔ مفتی صاحب نے بادشاہ کے یہاں ڈھائی روپیہ کا مقدمہ لڑ کر پھر جاری کرائے۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے مفتی صاحب سے کہا کہ آپکو ہماری سرکار ہزار روپیہ سے اوپر دیتی ہے۔ آپ نے ڈھائی روپیہ کے لئے اتنی کہیکڑ کیوں اُٹھائی۔ مفتی صاحب نے فرمایا آپکے ہزار بارہ سو روپیہ سے ڈھائی روپئے بھاری ہیں۔ یہ تبرک ہے اس پر ہمیں فخر ہے۔"[۵۱]

زمانۂ انقلاب میں دربار سے تعلق

یہ درست ہے کہ مفتی صاحب نے ابتداء میں کنارہ کشی مناسب سمجھی۔ چنانچہ انقلاب سے دو تین روز بعد ۱۴ مئی کو جب بہادر شاہ ظفر نے آپ کو شہر کا مجسٹریٹ مقرر فرمایا تو آپ نے عدم صحت کی بنا پر معذوری ظاہر کی[۵۲] مگر یہ وہ وقت تھا کہ ابتک بہادر شاہ؛

---

۵۱ لال قلعہ کی ایک جھلک از ناصر نذیر فراق ص ۴۷ بحوالہ "بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد"

۵۲ روزنامچہ منشی جیون لال۔

خود بھی مذبذب تھے اور اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوئے تھے جو انقلابی فوجوں نے آپ کے سر کردی تھی لیکن یہی مفتی صدر الدین صاحب ہیں جو دربار میں برابر حاضر ہوتے ہیں فرائض صدارت انجام دیتے ہیں اور اس خوبی سے کہ وہی باغی جن کی سرتابی اور سرکشی سے ہر ایک ابن الوقت لرز رہا تھا۔ یہاں تک کہ خود بادشاہ کو اُن کی شورہ پشتی کی شکایت تھی وہ شورہ پشت مفتی صاحب سے اس درجہ متاثر تھے کہ جو کام دوسرے نہیں کرا سکتے تھے بادشاہ کو یقین تھا کہ مفتی صاحب کرا سکتے ہیں۔ چنانچہ حکیم احسن اللہ خاں کا سامان لوٹ لیا گیا تو ۱۲ اگست کو بر سر دربار:۔

"بادشاہ نے مولوی صدر الدین خاں سے کہا کہ جب تک حکیم احسن اللہ خاں کا مال جسے سپاہیوں نے لوٹ لیا ہے واپس نہ کر دیا جائے گا اس وقت تک تمہیں دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی جائیگی"[۱]

ظاہر ہے انقلابی فوج مفتی صاحب سے اس درجہ متاثر اسی وجہ سے تھی کہ مفتی صاحب کی خاموش دلچسپی انقلابی سرگرمیوں سے وابستہ تھی

فتویٰ جہاد ۱۱ جولائی کو جنرل بخت خاں دہلی پہونچے اور چند روز بعد ہی علماء دہلی سے اس جدوجہد آزادی کی شرعی حیثیت مشخص و معین کرانی چاہی تو یہ بتانا تو مشکل ہے کہ فتویٰ مرتب کرنے میں حضرت مفتی صاحب کا کہاں تک دخل تھا البتہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جن بزرگوں نے فتویٰ پر سب سے پہلے دستخط کئے اُن میں حضرت مفتی صاحب کا اسم گرامی بھی آج تک زیب قرطاس[۲] ہے۔

---

[۱] روزنامچہ منشی جیون لال۔ روئداد ۱۲ اگست۔

[۲] لوگوں کا قاعدہ ہے کہ اہل کمال کے متعلق کچھ قصے اور کہانیاں گڑھ لیا کرتے ہیں۔ (باقی ص ۲۵۱ پر)

حضرت مفتی صدر الدین صاحب اور زمانہ دار و گیر

انگریزوں کے تعلقات حضرت مفتی صاحب سے خواہ کتنے ہی اچھے رہے ہوں۔ مگر ۱۸۵۷ء کی قیامت خیزی کے بعد ناممکن تھا کہ مفتی صاحب کی سیاسی دلچسپیاں نظر انداز ہو جائیں۔ چنانچہ بقول مولانا فقیر محمد صاحب آپ کو

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۰) حضرت مفتی صاحب اس درجہ تحریک سے وابستہ رہتے ہوئے سزا موت یا سزا عبور دریا شور سے محفوظ رہے۔ یہ بہت ہی عجیب و غریب واقعہ ہے۔ مورخین کو اس پر حیرت ہے غالباً اسی بنا پر ایک افسانہ گڑھ لیا گیا کہ حضرت مفتی صاحب کی ذکاوت و ذہانت نے دستخط کے وقت بھی تاریک پہلو سامنے رکھ کر تحفظ کی صورت پیدا کر لی تھی کہ آپ نے فتوے پر دستخط کئے تو یہ بھی لکھ دیا کہ "شہدت بالخیر" فتویٰ لینے والوں نے تو یہ سمجھا کہ آپ نے "شہدت بالخیر" لکھا ہے ("یعنی میں نے خیر کے ساتھ گواہی دی") اور اس کو "بالجبر" پڑھا جاتا تو اس کا مفہوم یہ ہوتا کہ میں نے مجبوراً شہادت دی۔ چنانچہ جب مقدمہ چلا تو مفتی صاحب نے یہ بتایا کہ یہ "شہدت بالجبر" لکھا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جبر و قہر کی بنا پر اس فتوی کی تصدیق کر دی ہے۔ یہ ظاہر ہے یہ افسانہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ اگر دستخطوں کے متعلق بالفرض عذر مان بھی لیا جاتا تو اس کا کیا جواب تھا کہ مفتی صاحب بہادر شاہ کی حکومت کے ایک رکن اور اعلیٰ عہدہ دار رہے تھے ان کا دیوان خانہ مجاہدین کی پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں افسانوی طور پر تو یہ ممکن ہے کہ کسی فتوی کی تصدیق و تائید کے لئے "شہدت بالجبر" لکھ دیا جائے۔ مگر جہاں تک ادبی ذوق اور اصحاب فتویٰ کے محاورات و اصطلاحات کا تعلق ہے۔ یہ لفظ قطعاً بے محل اور بے ربط ہے، مفتی صاحب جیسا ہر ایک زبان کا ادیب اس بے محل اور بے موقع لفظ کو استعمال نہیں کر سکتا تھا اور نہ فتوے پر دستخط کرنے والوں کا ذوق اس قدر ناقص اور معدوم تھا کہ وہ اس لفظ کو برداشت کر لیتے اور مفتی صاحب سے اس کی تصحیح کا مطالبہ نہ کرتے۔ پھر کسی تاویل و توجیہ سے "شہدت بالجبر" مان بھی لیا جائے تو شہادت بالجبر کا وہاں موقع کہاں تھا۔ متعدد علماء وہ تھے جنھوں نے اس فتوے پر دستخط نہیں کئے تھے اور وہ اس قیامت خیز دور میں بھی تحریک کے مخالف ہوتے ہوئے دہلی میں رہے (باقی صفحہ آئندہ پر)

سخت زخم چشم پہونچا کہ تعلق روزگار بھی ہاتھ سے گیا اور تمام املاک و جائداد بھی ضبط ہوئی اور چند ماہ نظر بند رہنا پڑا۔ مرزا غالب اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت مولوی صدر الدین صاحب بہت دنوں حوالات میں رہے کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف۔ جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فینانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے از راہِ ترحم نصف جائداد واگذاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ امداد (واگذاشت جائداد کی آمدنی) اُن کے گذارے کو کافی ہے۔ اس واسطے کہ ایک آپ اور ایک آپ کی بی بی۔ تیس چالیس روپیہ مہینہ کی آمدنی۔ لیکن امام بخش کی اولاد اُن کی "عترت" ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں فراغ بالی سے نہیں گذرتی ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرۂ ثامنہ کے اواخر میں ہیں۔ یعنی اسّی برس کے قریب عمر ہو گئی خدا

(بقیہ صـ۱۵۱) اُنھوں نے فتوے پر دستخط نہیں کئے اور نہ اُن کو مجبور کیا گیا۔
بیشک سر سید اور شمس العلماء نے ضرور لکھا ہے کہ کچھ علماء سے جبراً دستخط لیے گئے مگر ان دونوں کی تصنیفیں اس وقت کی ہیں جب ۱۸۵۷ء کو ختم ہوئے کئی سال گذر چکے تھے اور اب ہمارے زوالِ ملت کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کو انگریزوں کا وفادار ثابت کریں اور یہ ظاہر کریں کہ جو کچھ ہوا اُس کی ذمہ دار انقلابی فوج تھی جو ختم ہو چکی ہے اور جس کے افسر اور رہنما مارے جا چکے ہیں یا فرار ہو گئے ہیں۔ ان سب کے علاوہ نہایت ہی واضح بات یہ ہے کہ یہ فتوے جس اخبار میں پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا اُس کا عکس شائع ہو چکا ہے اس میں مفتی صاحب کا صرف نام لکھا ہوا ہے اس مفروضہ عبارت کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔

سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں۔[1]

جامع مسجد دہلی اور مفتی صاحب کا کارنامہ

جامع مسجد غدر میں انگریزی قبضہ میں آگئی تھی۔ یہ مقدس عمارت تقریباً دو سال تک فوجی استعمال میں رہی۔ مسلمانانِ دہلی فریضہ نماز کی ادائیگی سے محروم تھے جب دلی میں امن چین ہو گیا تو مفتی صاحب نے عمائد شہر کی ہمنوائی میں مسجد کی واگذاشت کی سعی کی۔ آپ کے شرکا میں شاہی خاندان کے مرزا الٰہی بخش بھی تھے۔ چنانچہ گورنمنٹ نے یہ مسجد مسلمانوں کے حوالہ کی اور مسلمان اکابر شہر کی ایک مختصر سی جماعت کی انتظامیہ کمیٹی بنا کر مسجد اس کو تفویض کی۔ اس منتظمہ جماعت میں مفتی صاحب اور مولوی اکرام اللہ خاں وغیرہ تھے۔[2]

زندگی کا آخری دور اور وفات

مولانا فقیر محمد صاحب مصنف حدائق الحنفیہ تحریر فرماتے ہیں۔ "یہ مؤلف بھی ۱۲۷۶ھ ۶۰-۱۸۵۹ء میں جب مولانا موصوف بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں اقامت گزیں تھے اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور تیرہ ماہ تک اُن کی خدمت میں مشرف رہ کر علوم عقلی و نقلی کا استفادہ کرتا رہا۔ اس وقت مولانا موصوف باوجودیکہ چوہتر سال کے تھے مگر ذوقِ شعر و سخن میں جوانان عاشق مزاج سے زیادہ مذاق رکھتے تھے۔ عربی۔ فارسی، اردو میں نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ آزردہ تخلص تھا اور بمقتضا اس کے کہ ہمیشہ فرطِ عشق اور ولولہ محبت سے آزردہ خاطر۔ افسردہ طبع

[1] غدر کے چند علماء۔ از مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی۔

[2] ایضاً ص۸۳

دیدہ گریاں، سینہ بریاں، رہتے تھے۔ اشعار کے پڑھنے میں نہایت دل شگاف آواز، لحن حزیں اور صوت دردانگیز رکھتے تھے۔ جس نے آپکی زبان سے سخن موزوں سُنا ہے وہی اُس کی کیفیت جانتا ہے کہ کیا انشاد شعر تھا یا ایجاد سحر۔

آخر عمر میں ایک دو سال مرض فالج میں مبتلا رہ کر اکاسی سال کی عمر میں یوم پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ میں فوت ہوئے [1]

مولوی ظہور علی صاحب، مخاطب بہ شمس الشعراء نے آپکی تاریخ وفات حسب ذیل لکھی ہے

جو مولانا ناصر الدین کہ در عصر	امام اعظم آخر زماں بود
زہے صدر الصدور نیک محضر	بعدل و داد چوں نوشیرواں بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت	کہ این عالم نہ جائے جاوداں بود
ربیع الاول و بست چہارم	وداع او سوے دار الجناں بود
ظہور افسوس آن اُستاد ذی قدر	پدر وارم ہمیشہ مہرباں بود
چراغش ہست تاریخ ولادت (۱۲۰۴)	کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود (۱۲ + ۶۹ + ۱۲۰۴)

---

[1] حدائق الحنفیہ ص ۴۸۲

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ

مسند آرا رجاہ و جلال ۔ زیب ۔ دہ مکنت و اقبال ۔ عمدہ اراکین دولت ۔ اسوۂ اساطین حشمت ۔ صاحب مرتبہ عالی ۔ مہبط انوار سعادت ازلی ۔ مورد انظار مراحم لم یزلی نبض شناس شخص سخن فہمی و سخن دانی ۔ قانون دان پردہ نکتہ سنجی و نکتہ دانی ۔ حاتم کرم عطارد رقم ۔ رستم توان ۔ نواب محمد مصطفٰے خاں بہادر ۔ (سر سید مرحوم)[1]

تعارف نواب مصطفٰے خاں صاحب خلف نواب مرتضٰے خاں[2] بہادر ۱۸۰۶ء دہلی میں پیدا ہوئے عظیم الدولہ سرفراز ملک ۔ آپ کے خطابات

---

[1] آثار الصنادید ۔ [2] نواب مرتضٰی خاں ۔ نواب محمد خاں بنگش رئیس فرخ آباد کے ہمجد تھے ۔ پہلے فرخ آباد ہی رہتے تھے ۔ عرصہ تک مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر کی فوج میں ممتاز عہدہ پر فائز رہے ۔ مہاراجہ جسونت راؤ اور نواب امیر علی خاں والی ٹونک کا جب "لارڈ لیک" سے مقابلہ ہو رہا تھا تو نواب مرتضٰی خاں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور پھر آپ ہی کی موقع شناسی اور اصابت رائے کی بدولت صلح ہوئی ۔ اس اثناء میں لارڈ لیک کو نواب مرتضٰی خاں کے جوہر قابل ہونے کا تجربہ ہوا ۔ تو پلول (جو دہلی سے ۵۴ میل گوڑگانوہ ضلع کی تحصیل ہے) کا علاقہ نواب صاحب کے حوالہ کر دیا جس کا سالانہ محصول تین لاکھ روپیہ تھا ۔ ۱۸۱۴ء میں آپ نے جہانگیر آباد کا علاقہ بھی جو پہلے راجہ کھودس رائے کی ملکیت تھا اور مالگذاری ادا نہ ہو سکنے کے باعث نیلام ہو رہا تھا نواب مصطفٰے خاں صاحب کے نام پر خرید لیا ۔ نواب صاحب کی رحلت کے بعد پلول کا علاقہ گورنمنٹ نے واپس لے لیا اور اس کے عوض اراکین خاندان کی پنشن کر دی جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہی ۔
(بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد صـ ۴۸۱)

تھے اور شیفتہ تخلص کرتے تھے۔

شیفتہ شاعرِ نش نواب زادہ ہی نہیں تھے بلکہ شعر و سخن میں اگر بقول سر سید مرحوم نبض شناس و سخن دان، نکتہ سنج و نکتہ دان، اخلاق و خصائل میں مہبط انوارِ سعادت۔ اور حاتم کرم، تہذیب و شائستگی میں زیب دہ مکنت و اقبال۔ خاندانی شرف و عظمت میں مسند آرار جاہ و جلال تھے۔ تو اسی طرح علمی قابلیت میں بدرِ منیر اور ماہ تاباں، تقویٰ طہارت اور خدا پرستی میں زاہد شب زندہ دار تھے

دہلی کے کامل فن اساتذہ سے عربی اور فارسی کی تکمیل کی مولانا حاجی نور محمد صاحب دہلوی سے حدیث و قرأت کی کتابیں پڑھیں۔ ذوق سخن کی اصلاح کے لئے مومن خاں مومن کے شاگرد بنے پھر اتنی ترقی کی کہ استاد اور شاگرد کا امتیاز مشکل ہو گیا۔

حج بیت اللہ ایک مخصوص سعادت جو اس زمانہ میں لاکھوں میں کسی کو نصیب ہوتی تھی وہ بیت اللہ شریف کی زیارت اور مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حاضری تھی۔ شیفتہ صاحب میاں جی مالا مال[1] کے شاگرد تھے تو جس طرح ریاست و دولتِ دنیا سے مالا مال تھے ۱۲۵۵ھ میں حج بیت اللہ شریف کی دولت سے بھی مالا مال ہوئے اور اس دولت کے ساتھ ایک اور دولت سے بھی دامن پُر کیا کہ وہاں کے مشہور محدثین شیخ عبداللہ سراج حنفی مکی اور شیخ محمد عابد سندھی مقیم مدینہ منورہ کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر اُن سے سندِ حدیث حاصل کی۔

---

[1] میاں جی مالا مال۔ دہلی کے مشہور استاد تھے شیفتہ صاحب نے فارسی عربی انہیں سے پڑھی۔

اخلاق ان تمام سعادتوں نے آپ کو مکارم اخلاق کا پیکر بنا دیا تھا آپ بے انتہا خلیق اور صاحب مروّت تھے۔ نہایت منتقل مزاج تسلیم و رضا کی دولت خصوصیت سے عطا ہوئی تھی۔ ہر حال میں خوش رہنا آپ کی زندگی کا نمایاں وصف تھا طبیعت میں استغنا بہت تھا۔ مہمان نوازی اور فیاضی میں مشہور تھے۔

روحانی خصوصیات آپ مجددی نقشبندی سلسلہ میں بیعت تھے۔ بہت پابندِ شرع۔ منہیات و منکرات سے حد درجہ مجتنب۔ آپ کے زمانہ میں نواب اور رئیس تو کیا مشائخ کے یہاں بھی سماع اور قوالی کا رواج تھا مگر آپکی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ترنم کے ساتھ اشعار سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ خود آپ کا قول ہے۔ ۵

ڈر ہے کہ نہ ہو شوق مزامیر شیفتہ
ورنہ کبھی سماع مجرد سنا کروں

آپ ہمیشہ رات کو تین بجے سے بیدار ہو جاتے۔ نماز تہجد کے بعد سنت

---

۵ باطنی خوبیوں کے ساتھ ظاہری خوبیوں میں بھی آپ کو فوقیت نصیب ہوئی تھی۔ بقول مرزا فرحت اللہ بیگ (مصنف دہلی کی آخری شمع) جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں مومن کے بعد دہلی میں نواب مصطفٰی خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا۔ اُن کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ لیکن ناک و نقشہ غضب کا پایا تھا اس پر نیچی سیاہ گول داڑھی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا۔ لباس میں بھی زیادہ تکلف نہیں تھا۔ تنگ مہری کا سفید پاجامہ سفید کرتہ۔ نیچی چولی کا سفید انگرکھا۔ اندر فیہ نما چوگوشیہ ٹوپی۔ یہ آپ کا حلیہ اور آپ کی وضع قطع تھی۔

کے مطابق کچھ لیٹتے۔ پھر سب سے پہلے مسجد میں حاضر ہو کر نماز صبح جماعت کے ساتھ ادا کرتے

صبر و استقلال | شمس العلماء ذکاء اللہ صاحب کی شہادت ہے کہ نواب شیفتہ جیسا صبر و استقلال میں نے کسی انسان میں نہیں دیکھا۔

تسلیم و رضا کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے کہ جب آپ گرفتار تھے تو ایک دن محافظ پولیس کے دستہ میں پا پیادہ سڑک پر جا رہے تھے۔ آپ نے آسمان کی طرف دیکھا پھر آپ کی زبان سے بیساختہ یہ فقرہ نکلا۔

تیری شان کریمی کے قربان کہ اتنی ہی سزا دی۔ میں تو اس سے بہت زیادہ کا مستحق تھا۔

مصائب سے لطف اندوز ہونا صوفیا کی اصطلاح میں اخص الخواص[1] کا صبر کہلاتا ہے۔ یہ تھے ۱۸۵۷ء کے دنیا دار نواب

تصنیف و تالیف | ترغیب السالک الی احسن المسالک تذکرہ گلشن بے خار وغیرہ آپ کی تصانیف آپ کی اعلیٰ قابلیت کی شہادت ہیں۔

سیاسی ذوق | استخلاص وطن کی امنگ نے آپ کو نواب ولی داد خاں رئیس مالاگڈھ سے وابستہ کر دیا تھا۔ بادشاہ سے خط و کتابت آپ ہی کے سپرد تھی

لیکن یہ وابستگی انگریز کی نظر میں ایک گردن زدنی جرم تھا۔ چنانچہ ہنگامہ فرو ہوا تو آپ گرفتار کر لئے گئے۔ مگر آپ کے ساتھ خاص رعایت کی گئی کہ پھانسی کے بجائے صرف سات سال کی قید تجویز ہوئی۔ پھر نواب صدیق حسن صاحب والی بھوپال نے آپ کی رہائی کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ نتیجہ میں کامیابی نصیب ہوئی یعنی قید سے رہا کر دیئے گئے

---

[1] مصیبت پر جزع فزع نہ کرنا عوام کا صبر ہے۔ راضی برضا رہنا خواص کا صبر اور مصیبت سے لطف اندوز ہونا اخص الخواص کا صبر کہلاتا ہے۔

لیکن وظائف سرکاری بند۔ اور ذاتی جائداد کا بھی نصف حصہ ضبط ۔

مرض الوفات اور وفات

آپکو ذیابیطس کا عارضہ تھا ۔ آخر میں سرطان بھی ہوگیا ۔ ڈاکٹر آپریشن کیا کرتا تھا اور ناقص گوشت کاٹا کرتا تھا جس سے سخت تکلیف ہوتی تھی ۔ اوپر والوں سے دیکھا نہ جاتا تھا چنانچہ ایک روز صاحبزادے محمد علی خاں بے اختیار رونے لگے ۔ آپ نے فوراً صاحبزادہ کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا ۔ اس جسم فانی کے زوال پر رونا بڑی کم ہمتی کی بات ہے ۔ بہر حال تریسٹھ سال کی عمر پاکر ۱۸۶۹ء میں وفات پائی ۔ حضرت شیخ سلطان المشائخ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کی درگاہ میں اپنے جد امجد کے مزار کے پاس دفن کئے گئے ۔ رحمۃ اللہ ۔

(ماخوذ از دار الحکومت دہلی ۔ غدر کے چند علماء ۔ دہلی کی آخری شمع اور تصانیف منشی ذکاء اللہ خاں)

صہبائی شہید

مولانا امام بخش صہبائی خلف مولانا محمد بخش تھانیسری۔ ایک غریب گھرانے کے فرد۔ بر خانوادہ علم کے چشم و چراغ محفل علم و ادب کے گوہر شب تاب۔ داستان جور و جفا کے شہید ستودہ صفات ۔ سرسید کے الفاظ ہیں

کمالات ظاہری اور جلائل باطنی حسن خلق اور حمائد اطوار میں پسندیدۂ خالق و مقبول خلائق ۔ خلق نوازش آپ کا آئینہ بہار۔ اور اوضاع حمیدہ آپ کے محمود روزگار۔ ایسا فرد زمان ایسی جامعیت کے ساتھ کم کوئی نظر سے گذرا ہے اور طرفہ یہ ہے کہ فنون متعارفہ و سخنوری مثل تحقیق لغت و اصطلاحات زبان دری اور تدقیق مقامات کتابی اور تکمیل عروض و قافیہ و استکمال فن معمہ وغیرہ میں ایسا کمال بہم پہنچایا ہے کہ ہر فن میں یک فنی کہنا چاہیئے۔

برِ بیرفتہ از ہر سنے روشنی
جداگانہ در ہر فنے یک فنی[۱]

خاندان اور نسب

مرزا قادر بخش صابر گورگانی گلستان سخن میں لکھتے ہیں۔ سلسلہ ان کے نسب کا اُن کے والد ماجد مرحوم و مغفور کی طرف سے تو فارق حق و باطل حضرت فاروق بن خطاب علیہ رضوان اللہ الوہاب تک۔ اور والدہ کی جانب سے بد

---

[۱] آثار الصنادید ص۹۵

عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہونچتا ہے۔ [۱]

آپ کے والد ماجد مولانا محمد بخش صاحب تھانیسر سے دلّی آئے اور کوچہ چیلان میں رہ پڑے۔ [۲]

حلیہ درمیانہ قد۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ۔ موہنہ پر چیچک کے داغ۔ مہندی سے رنگی ہوئی سرخ داڑھی۔ پُرانی وضع کا لباس۔ ایک بر کا سفید پاجامہ۔ سفید انگرکھا۔ کشمیری کام کا جبّہ۔ سر پہ چھوٹا سا سفید صافہ۔ دُبلے پتلے اور لاغر اندام۔ [۳]

ملازمت ڈاکٹر عبدالحق صاحب دلّی کالج میں آپ کے تقرر کے متعلق لکھتے ہیں:۔

اُن کے تقرر کا عجیب واقعہ ہے۔ ۱۸۴۰ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامسن لفٹنٹ گورنر بہادر مدرسہ کے معائنہ کے لئے آئے تو اُنھوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستعد فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہئے۔ مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور نے لفٹنٹ گورنر سے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے اُستاد صرف تین ہیں۔ ایک مرزا نوشہ (مرزا غالب) دوسرے حکیم مومن خاں تیسرے امام بخش صہبائی۔

لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے تھے انھوں نے تو انکار کر دیا۔ مومن خاں نے یہ

---

[۱] بحوالہ دلّی کالج اردو میگزین نمبر۔ قدیم دلّی کالج نمبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۶۸

[۲] ایضاً [۳] مضمون نگاری بحوالہ نمبر مذکور۔

شرط پیش کی کہ سو روپیہ ماہانہ سے کم کی قیمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ انھوں نے یہ خدمت چالیس روپیہ ماہانہ کی قبول کرلی۔ بعد کو پچاس روپیہ ہوگئے [1] لیکن کچھ عرصہ بعد پرنسپل بوترس کے عہد میں آپ مدرس اوّل کے عہدے پر سرفراز کئے گئے [2]

حادثۂ شہادت | مولانا صہبائی کے حقیقی بھانجے مولانا میر قادر علی صاحب جو مولانا صہبائی کے ساتھ مولانا ہی کے گھر میں رہا کرتے تھے بیان کیا کرتے تھے۔

میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہر پرور میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دَن دَن کرتے آپہونچے۔ پہلی رکعت تھی کہ امام کے مصلے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی اور دلّی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔ ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعیں سرکار میں دیدی تھیں اس لئے ہم سب گرفتار ہوکر دریا کے کنارے پر لائے گئے۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ موت تمہارے سر پر ہے۔ گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا تمہاری پشت پر ہے تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے

---

[1] اگر غلّہ کے نرخ کو معیار قرار دیا جائے تو اس وقت کے سو روپیہ آج کل کے سولہ سو روپے ہوں گے کیونکہ اس وقت ایک روپیہ من گیہوں تھا اور آج کل سرکاری نرخ سے سولہ روپے من اور غیر سرکاری دوکانوں پر بتیس ۳۲ روپیہ من تک گیہوں مل رہا ہے۔

[2] مرحوم دلّی کالج ص ۱۴۹ [3] دلّی کالج اردو میگزین۔

ہیں۔ وہ دریا میں کود پڑیں۔
میں بہت اچھا تیراک تھا۔ مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی اور اُن کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہیں جانتے تھے اس لئے دل نے گوارا نہ کیا کہ اُن کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا اس لئے میں دریا میں کود پڑا۔ پچاس یا ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور صف بستہ گر کر مر گئے۔[1]

وجہ شہادت

خواجہ حسن نظامی مرحوم فرماتے ہیں[2]
دہلی کے تمام محلوں سے زیادہ چیلوں کے کوچہ پر مصیبت آئی تھی اسی محلہ میں بڑے بڑے شرفا اور نامور علماء رہتے تھے۔ مولانا شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا گھرانا، اسی محلہ میں آباد تھا۔ سرسید خاں کا گھر بھی اسی محلہ کے ایک حصہ میں تھا مولانا صہبائی بھی اسی محلہ میں رہتے تھے۔ غرض یہ محلہ بڑے بڑے صاحب کمال لوگوں کا مخزن تھا۔[3] منشی ذکاء اللہ خاں بھی اسی محلہ کے باشندہ تھے منشی ذکاء اللہ خاں صاحب لکھتے ہیں۔ اس مصیبت خاص کا سبب یہ ہوا

[1] دلی کی آخری بہار صفحہ ۷۸ و ۷۹۔ [2] ملاحظہ ہو "دہلی کی جان کنی" مصنفہ خواجہ حسن نظامی مرحوم۔ [3] استاذ العلماء مولانا مملوک علی صاحب نے بھی اسی محلہ میں مکان لیا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند زمانہ طالب علمی اور اس کے بعد جب تک دہلی میں رہے اسی محلہ میں قیام فرما رہے۔ مفتی اعظم ہند حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب نے بھی اسی محلہ میں مکان بنایا تھا اور دور حاضر کے مشہور عالم سحبان الہند حضرت مولانا احمد صاحب (سابق) صدر جمعیۃ علماء ہند کا مکان بھی اسی محلہ کے ایک کوچہ (کوچہ ناہر خاں) میں ہے۔ رحمہم اللہ

کہ نواب شمشیر جنگ کے بیٹے محمد علی خاں نے اور یا حکیم فتح اللہ خاں نے کسی انگریزی سپاہی کو زخمی کر دیا تھا کیونکہ وہ اُن کے زنانہ مکان میں بُرے ارادہ سے جانا چاہتا تھا اس کی خبر انگریزی کمان افسر کو پہونچی۔ اُس نے حکم دیا کہ اس محلہ کے تمام مردوں کو قتل کر دو یا گرفتار کر کے لے آؤ۔

اس حکم کی تعمیل ایسی بے دردی سے ہوئی کہ محلہ میں کوئی مرد زندہ نہ بچا یا تو سپاہیوں نے گھروں میں گھسکر مار ڈالا یا گرفتار کر کے حاکم کے سامنے لے گئے حاکم نے اُن کو دیکھکر حکم دیا کہ سب کو دریا کے کنارے لیجاؤ اور گولی مار دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا

شہادت کا منظر ان لوگوں کو رسی سے باندھا گیا۔ دریا کی ریتی میں قطار بنا کر کھڑا کیا گیا اور گولیوں کی باڑھ اُن پر چلائی گئی جس سے سب مر کر گر پڑے۔ صرف دو آدمی زندہ بچے جن کے گولی نہ لگی تھی۔ جب سپاہی گولیاں مار کر چلے گئے تو یہ دونوں اُٹھ کر بھاگے ان میں ایک مرزا مصطفےٰ بیگ تھے جو بعد میں رسالہ میں نوکر ہو گئے تھے اور دوسرے مولانا صہبائی کے داماد اور بھانجے وزیر الدین نامی تھے۔ جو بعد میں کانپور میں ججی کے سر رشتہ دار ہو گئے تھے۔

شہدار میں آفتاب و ماہتاب ان شہدار میں آفتاب ہند مولانا صہبائی کے علاوہ دوسرے استاد فن سید محمد امیر عرف "میر پنجہ کش" بھی تھے جن کی خوش نویسی کا لوہا تمام ہندوستان مانتا تھا اور اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حرف سونے چاندی کے عوض خریدے جاتے تھے وہ بھکاری فقیروں کو ایک حرف لکھکر دیدیتے تھے جو ایک روپیہ کے نوٹ کی طرح ہر جگہ روپیہ کو بکتا تھا (افسوس کہ یہ صاحب کمال بھی دریا کی ریتی میں مارا گیا۔)

تعداد کوچہ چیلان کے اُن شہداکی صحیح تعداد کا علم کسی کو نہیں مگر اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف مولانا صہبائیؒ کے کنبہ کے اکیس آدمی اس قطار میں مارے گئے۔

راتم الدولہ ظہیر دہلوی نے انہیں دردناک حوادث کو نظم کا مختصر لباس پہنایا ہے

جہاں کی تشنۂ خون، تیغ آبدار ہوئی
سنانِ نیزہ ہر اک سینہ سے دوچار ہوئی
رسن ہر اک بشر کے گلے کا ہار ہوئی
ہر اک سمت سے فریاد گیرودار ہوئی
ہر اک دشت قضا میں کشاں کشاں پہنچا
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچا
ہر ایک شہر کا پیر و جوان قتل ہوا
ہر اک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک اہل زبان۔ خوش بیان قتل ہوا
غرض خلاصہ یہ ہے ایک جہان قتل ہوا
گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

اس کے بعد ظہیر صاحب رقم طراز ہیں۔

غرض کہ جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے اُن میں کئی اشخاص باکمال نامور فرد روزگار مارے گئے ہیں جو دہلی کی ناک اور یگانہ آفاق تھے جن کی نظیر آج تک پیدا نہیں ہوا اور نہ ہوگا میاں محمد امیر پنجہ کش خوش نویس جن کا ثانی روئے زمین پر نہیں، مولوی امام بخش

صہبائی اور اُن کے دو بیٹے اور میر نیاز علی واقعہ خواں اور چیلوں کے کوچے کے اور بہت سے شریف خاندان لوگ۔ سُنا گیا ہے کہ اس محلّہ کے چودہ سو آدمی گرفتار کر کے راجگھاٹ کے دروازہ سے دریا پر لیجا کر بندوقوں کی باڑیں ماردی گئیں اور لاشیں دریا میں پھینکوا دی گئیں۔ عورات کا یہ حال ہوا کہ گھروں میں سے نکل کر بچّوں سمیت کنووں میں جا گریں چیلوں کے کوچہ کے تمام کنوئیں لاشوں سے پٹ گئے تھے[۱]

حضرت آزردہ کا تأثر

مفتی صدرالدین آزردہ کو صہبائی کی شہادت کی خبر پہونچی تو بے اختیار زبان سے نکلا۔

کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

صہبائی کا مرثیہ۔

ندانم کجا رفت آں نعش پاک — فلک بُرد یا ماند بر روئے خاک
ندانم کسے داد او را کفن — و یا ماند چوں سایہ بر خاک تن
ندانم چہ کرد ست با او سپہر — ز جامہ کفن کرد یا تاب مہر
بخاکش نمودند او را نہاں — و یا مرتفع کردند سوئے آسماں
کسے فاتحہ ہم برو خواندہ است — بعطر گلابی برافشاندہ است
کدامی گل و بلبل و یاد و دشت — بخاکش بحسن عقیدت گذشت[۲]

---

[۱] داستان غدر ص۱۲۳ [۲] صحیفہ رحمانی

الٰہی بیا مرز مظلوم را
کلاہ شہی دہ بملک بقا
بفردوس اعلیٰ بود جا اداد
بہشت بریں باد ماوا ارا نہ[1]

دہلی کا مرثیہ

دلی مرحوم کے مرثیے بہت کچھ لکھے گئے۔ یہاں صرف مولانا حالی مرحوم کے چند اشعار پیش کرکے دہلی کا یہ جاں گداز تذکرہ ختم کیا جارہا ہے۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
چپہ چپہ پہ ہیں یہاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
غالب و شیفتہ نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ھرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لیگا کوئی دانا ھرگز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

---

[1] مفتی انتظام اللہ شہابی

مضافاتِ دہلی

ضلع میرٹھ۔ مظفر نگر۔ سہارن پور۔ بلند شہر علی گڑھ — اور — روہیل کھنڈ

ضلع میرٹھ

سرگذشت دہلی کا آغاز میرٹھ کے جرأتمندانہ مگر عاجلانہ اقدام سے ہوتا ہے۔ اس لئے میرٹھ۔ واقعات ۱۸۵۷ء کا سرنامہ اور ٹائیٹل پیج ہے۔ چنانچہ دہلی کے تذکرہ میں سب سے پہلے میرٹھ کی انقلابی فوج کا ذکر آچکا ہے اس موقع پر اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ہاں مضافات میرٹھ نے میرٹھ کی امداد کس طرح کی اس کے لئے یہ چند سطریں مطالعہ فرمائیے۔ ایک ریسرچ کرنے والے کے لئے بڑی قیمتی یادداشت ہے۔

(۱۰ مئی ۱۸۵۷ء) میرٹھ کی مسلح فوجوں نے اپنے فرائض کا احساس کر کے جنگ آزادی کی بسم اللہ شروع کر دی۔ میرٹھ اور اُس کے مضافات کے رہنے والے عوام کی جملہ امکانی امداد نے اُن آزادی پسند افواج کے حوصلے اور بھی بلند کر دیئے دیکھتے ہی دیکھتے تمام ضلع تحریک آزادی کا مرکز بن گیا۔ مضافات میں یہ مرکز محفوظ مقامات پر قائم تھے ایک مضافاتی مرکز سکوتی نام کے موضع میں قائم کیا گیا۔ اس زمانہ میں اس موضع میں سب سے با اثر و معزز ہستی مرزا انور بیگ نے پیرانہ سالی کے باوجود

اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر اُٹھایا (اگرچہ یہ موضع آج بھی اُن کے جدِّ امجد سخاوت مرزا جو ہمایوں کے بہنوئی مرزا خضر خواجہ کے خالہ زاد بھائی تھے، کے نام نامی سے موسوم ہے) وطن کے حریت نواز جوانمردوں کی جماعت اُن کے گرد اکٹھا ہوگئی سلاوہ کیلی، بھابنوری، سردھنہ سے شہباز خاں، کرم دین، ٹھاکر جنم جے سنگھ اور رنبیر سنگھ، دورالہ دادری روہاسہ اٹیرنہ وغیرہ سے ذلیل سنگھ، کرم سنگھ، شیودت، ہزاری لال، سید احسان علی، سعادت حسین، نصیر احمد، کرمو، عارف حسین گروہ در گروہ پہونچے، تقریبًا چھ سو افراد نے مرتے مارنے اور جاں نثاری کا حلف اُٹھایا، راجہ نین سنگھ کی شکستہ گڑھی کی مرمت کی گئی، فصیلوں پر پہرہ چوکیاں اور نواحی جنگلات میں حفاظتی دستے تعینات کئے گئے۔ آدھی جمعیت پنڈت شیودت، سید احسان علی رشید مرزا، قادر بیگ اور ٹھاکر رنبیر سنگھ کی قیادت میں پابلی، عارف پور، عابد پور، اور غازی آباد کے آزادی کے دیوانوں کو ساتھ لیتی ہوئی ظلِ سبحانی اعلیٰ حضرت بہادر شاہ کی فوجوں سے جا ملی۔ ان تمام گمنام شہیدوں نے اپنی لاشیں خاکِ دہلی کے قدموں میں پیش کر دیں۔ صرف قادر مرزا زخموں سے نڈھال بصد دقت کسی طرح بچ نکلے۔ مرزا انور بیگ، سکندر مرزا، حسین بیگ، کرم سنگھ ہزاری لال وغیرہ نے مظفر نگر اور میرٹھ کے قریبًا اٹھارہ مواضعات میں پرچم آزادی بلند کر دیا۔ مرزا وزیر بیگ نصیر احمد، ہری رام وغیرہ بڑھتے ہوئے سردھنہ کے قریب پہونچ گئے اس وقت یہ عالم تھا کہ انگریز جان بچانے کے لئے گرجا گھر اور قلعے کی سرنگوں میں چھپ گئے تھے۔ سردھنہ خاص میں علماء کرام کا ایک گروہ جو کہ وہابی تحریک میں پیش پیش تھا مقامی باشندوں کو لیکر جنگِ آزادی کے لئے برسرِ پیکار تھا، مولانا رحمت اللہ صاحب

کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اچانک شکستوں کی خبریں آنے لگیں۔ کمزور دل بھاگ کھڑے ہوئے، محاصرہ ہٹا لیا گیا اور پسپائی شروع ہوگئی۔ کیپٹن روبنس کی سرکردگی میں انگریزی فوجوں نے سکوتی کو گھیر لیا۔ گڑھی کو آگ لگادی گئی قدیر بیگ، نجم اللہ اور ہری رام وہیں جلکر راکھ ہوگئے جنم جے سنگھ، ننھو خاں اور دلا اور کو پیپل کے درخت میں پھانسی دیدی گئی انکی لاشیں تین دن تک بے گور وکفن لٹکی رہیں شہباز خاں کو گولی سے اڑا دیا گیا نور بیگ، ناظم مرزا، دیوان اور کریموں دست بدست کی جنگ میں شہید ہوگئے۔ اس علاقہ کے ایک "لوک گیت" میں رابنسن کے مظالم اور نور بیگ کی بہادری کی داستان کچھ اس پیرایہ میں بیان کی گئی ہے کہ آج سو سال بعد بھی اسے سُنکر خون کھولنے لگتا ہے ؎[1]

ضلع مظفر نگر و سہارن پور

دہلی سے شمال کی جانب تقریباً چالیس میل کے فاصلہ سے شروع ہونے والا وہ علاقہ جو کہیں (حضرت شاہ عبدالعزیز کی زبان میں) مارجون "آب جمنا سے سیراب ہوتا ہے اور کہیں اس کی سرسبز و شاداب وادیاں دریائے گنگ کی فیاضیوں سے ہم کنار ہوتی ہیں جس نے کبھی تاریخ میں اپنا کوئی مستقل نام پسند نہیں کیا۔ جس کی نشان دہی آجکل ضلع مظفر نگر اور ضلع سہارن پور سے کی جاتی ہے جس طرح وہ زرعی لحاظ سے زرخیز ہے ویسے ہی انسانیت کے نقطۂ نظر سے مردم خیز اور بلحاظ سیاست انقلاب انگیز واقع ہوا ہے۔ اس علاقہ میں مسلمان اگرچہ تعداد میں کبھی بھی زیادہ نہیں

---

[1] اختر چغتائی ۲۲۱ - احمد نگر جلی کوٹھی میرٹھ بحوالہ سنڈے ایڈیشن روزنامہ الجمعیۃ

ہوئے۔ مگر جہاں تک ڈھائی سو سال کی تاریخ کا تعلق ہے اخلاق، کردار اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ان کا درجہ ممتاز رہا ہے۔

تھانہ بھون، کیرانہ، کاندھلہ، شاملی، پھلت، کھاتولی، جانسٹھ، جھنجھانہ، بڈھانہ، دیوبند، نانوتہ، گنگوہ، منگلور، رڑکی، انبیٹھہ، رائے پور، رام پور منہیاران نکڑ۔ اس علاقے کے مشہور قصبے ہیں۔

سیدنا شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز جن کے تعمیر کردہ صراط مستقیم پر اس دور کے علماء احرار قدم بڑھاتے رہے۔ اُن کی دادھیال [۵۱] اگرچہ سونی پت میں تھی مگر ننہیالی رشتہ اسی علاقہ سے تھا اور قصبہ پھلت میں آجتک وہ مکان (بلکہ وہ کوٹھری) موجود ہے جو آپ کا مسقط راس تھا۔

حسن علی خاں اور عبداللہ خاں سے کون واقف نہیں جنھوں نے سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں وزارت ہی نہیں کی بلکہ بادشاہ گر رہے اُن کا اور اُن کے خاندان یعنی سادات بارہ کا مسکن یہی [۵۲] علاقہ رہا۔ اور پھر جب با احساس ہندوستانیوں کے سیاسی شعور نے تو وارد انگریزوں کے مقابلہ کے لئے تیر کمان درست کرنے شروع کئے تو یہی علاقہ تھا جس نے حضرت سید احمد شہید کے مجاہدانہ اقدام کے لئے سب سے پہلے اپنی حدود کو فرش راہ بنایا۔

حضرت سید احمد صاحب شہید کی تحریک کا تذکرہ شاندار ماضی کی جلد دوم

---

۵۱ انفاس العارفین ۔ شاندار ماضی جلد دوم

۵۲ قصبہ جانسٹھ ضلع مظفر نگر آجکل بھی سادات بارہ کا مرکزی قصبہ سمجھا جاتا ہے اگرچہ اس وقت ایک پس ماندہ قصبہ ہے جس کو ریلوے لائن بھی نصیب نہیں۔

میں گذر چکا ہے۔ آپ کا سب سے پہلا دورہ اسی علاقہ کے رہنماؤں کی دعوت پر ہوا تھا اور اس علاقہ سے خود سید صاحب کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے سردھنہ ضلع میرٹھ سے سہارنپور تک تقریباً چالیس میل کے خطہ کو اپنے اوقات عزیز کے تین ماہ عطا فرمائے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا عبدالحئی صاحب جو حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے نہ صرف مشیر خاص بلکہ اس تحریک کے لئے دماغ اور قلب کی حیثیت رکھتے تھے اُن کا وطن اسی علاقہ کا قصبہ بڈھانہ تھا۔ اس آفتاب رشد و ہدیٰ یعنی حضرت سید صاحب کے فیوض کی کرنیں اس علاقہ کے مسلمانوں نے کس طرح سمیٹیں اور اس کے سوز و حرارت کو کس طرح قلب و جگر میں پیوست کیا اس کے متعلق اپنے دور کے نبض شناس و صاحب بصیرت فاضل مورخ مولانا سید عبدالحئی صاحب[1] کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت سید صاحب کے دورہ سے تقریباً ایک صدی[2] بعد اس مبصر مفکر کا احساس یہ ہے۔

اس وقت تک سہارنپور کے جس قدر قصبوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے وہاں ہر فرد بشر کو سید صاحب کا دم بھرتے پایا ہے۔ جو ہے اُن کی محبت میں چور ہے ....
میں نے اپنی عمر میں سید صاحب کا اتنا چرچا کہیں نہیں دیکھا[3]

پھر جبکہ یہ معلوم ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب "اسیر مالٹا" جنھوں نے بیسویں صدی عیسوی کے پہلے عشرہ میں ریشمی رومال والی انقلابی تحریک کی بنیاد ڈالی جن کے فیضِ صحبت سے مولانا عبیداللہ سندھی۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری

---

[1] مولانا سید عبدالحئی صاحب مصنف ارمغان احباب و نزہۃ الخواطر وغیرہ ہمارے زمانہ کے مشہور عالم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب کے والد ماجد رحمۃ اللہ۔ [2] ۱۳۱۲ھ میں۔
[3] ارمغان احباب بحوالہ سید احمد شہید مصنفہ سید ابوالحسن علی صـ ۱۱!!۔

مفتی اعظم ہند مولانا محمد کفایت اللہ صاحب ۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمہم اللہ اور رہنمار سرحد خان عبد الغفار خاں صاحب جیسے جنگِ حریت کے سپہ سالاروں اور آسمان سیاست کے چاند تاروں نے جوش عمل اور نور بصیرت حاصل کیا ۔ یہ شیخ الہند اسی علاقہ کے رہنے والے تھے ۔

مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور انصاری رحمۃ اللہ علیہ جو اسی تحریک کے سلسلہ میں جلا وطن ہو کر افغانستان پہونچے اور تقریباً تیس سال جلا وطن رہ کر وہیں کی ڈھائی گز زمین کو ہمیشہ کے لئے آرام گاہ بنا لیا ۔ ان کا مولد و مسکن بھی اسی علاقہ کا مشہور قصبہ (انبیٹھہ) تھا جو گیارھویں صدی ہجری میں قطب وقت حضرت شاہ ابو المعالی[۵۱] کے فیوض و برکات کا مطلع انوار مرکز رہا تھا ۔

آزادئ ہند کی وہ غیر متشددانہ (نان وائلنس) تحریک جو مقاومت بالصبر کے اصول پر ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک تیس سال متواتر چلتی رہی، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اس تحریک کا مرکز یہی علاقہ تھا ۔

بیشک خان عبد الغفار خاں اور اُن کے ساتھیوں ۔ "خدائی خدمتگاروں" کی بیشمار قربانیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ یہی وہ جانباز تھے جن کے خون شہادت نے اضلاع صوبہ سرحد کے چپہ چپہ کو لالہ زار مظلومیت بنایا مگر کون نہیں جانتا کہ ان پٹھان سرمستوں کو جس میکدہ سے بے خودی اور وارفتگی کی یہ دولت نصیب ہوئی تھی وہ یہی دیوبند تھا جہاں علامہ انور شاہ[۵۲] کشمیری جیسا مجتہد وقت

---

۵۱ متوفی ۱۱۱۲ھ شاہ بھیک متوطن گھیکہ میر اں جی ضلع انبالہ جو محمد شاہ بادشاہ کے وزیر روشن الدولہ کے پیر تھے وہ انہیں حضرت شاہ ابو المعالی کے خلیفہ تھے دوسرے مشہور خلیفہ حضرت شاہ مدار صاحب تھے جو حضرت شاہ ابو المعالی کے جانشین ہوئے اور انبیٹھہ ہی میں ساری عمر گذاری اور یہیں ان کا مزار ہے تذکرہ الخلیل ص ۵ و ص ۶) ۵۲ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان میں سائمن کمیشن آیا تھا اسی کے بائیکاٹ سے کانگریس کی تحریک آزادی میں جو ۱۹۲۰ء کے بعد سرد پڑ گئی تھی دوبارہ گرمی آئی (باقی ص ۲۷۳ پر

بادۂ حریت کو شریعت کے جام زریں میں ڈھال رہا تھا اور قطب ارشاد مولانا سید حسین احمد جیسا مجاہد جلیل و علمبردار حریت، اپنے نقش پا سے جادۂ حریت کے نشانات اُبھار رہا تھا۔

کیا آپ بھول گئے "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کی برطانوی پالیسی کا پہلا حربہ "جداگانہ انتخاب" جب تقریباً چالیس سال تک کام کرنے کے بعد کند ہونے لگا اور اُس نے ایک نئے حربہ ۔ دو قومی نظریہ کو مقبول عام بنانے کے لئے نئے رنگروٹ بھرتی کئے۔ نئی انجمنیں اور نئی محفلیں آراستہ کیں تو جس مجاہد حق پرست نے سب سے پہلے اس سیاسی طلسم کو چیلنج کیا جس کی صدائے حق نواز نے ان انجمنوں اور ان محفلوں میں تہلکہ ڈال کر دہشت و اضطراب کی قیامت برپا کی اُس کے دائرہ عمل کا مرکز یہی علاقہ تھا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز و نور مرقدہٗ اپنے اُستاذ محترم حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ہمراہ ریشمی رومال کی تحریک کے سلسلہ میں چار سال تک نظر بند رہنے کے بعد جب مالٹا سے رہائی پاکر ہندوستان پہونچے تو یہی علاقہ تھا جس نے اپنی عظمت و برتری کی دستار آپ کے قدموں

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۳) اور ۱۹۲۹ء میں لاہور میں انڈین نیشنل کانگریس نے مکمل آزادی کی تجویز پاس کی جس کی حمایت کرتے ہوئے ۱۹۳۰ء میں بازار قصہ خوانی کا مشہور واقعہ پیش آیا جس میں تقریباً ایک ہزار سرحدی پٹھان (خدائی خدمتگار) بیک وقت برطانوی فوج اور پولیس کی فائرنگ سے شہید ہوئے۔ سائمن کمیشن کی آمد سے کچھ پہلے ۲ دسمبر ۱۹۲۷ء ۶ جمادی الاول ۱۳۴۶ھ پشاور میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس حضرت علامہ مولانا سید انور شاہ صاحب کی زیر صدارت ہوا تھا آپ نے اس اجلاس کے خطبہ صدارت میں ارشاد فرمایا تھا۔ آزادی عطا نہیں کی جاتی بلکہ وہ طاقت و ہمت سے حاصل کی جاتی ہے ص ۳۴ اگر ہندوستان اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ دوسروں سے کرانا چاہتا ہے... تو ابھی اس نے آزادی اور غلامی کے مفہوم ہی کو نہیں سمجھا

میں ڈالی۔ ایک معزز مہمان کی طرح آپکو سر اور آنکھوں پر بٹھایا اور آپ کی ہر ایک دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جنگِ آزادی میں آگے بڑھکر حصہ لیا۔ ملک میں دو قومی نظریہ کی ہوا چلنے لگی تو ڈٹ کے اس کی مخالفت کی اور جب سنہ ۴۵۔۴۶ء ۱۹ میں تقسیم ہند کے سوال پر الیکشن ہوا تو تقریباً ہر ایک سیٹ پر اس کو شکست دی۔

مختصر یہ کہ جب اس علاقہ کی تقریباً ڈھائی سو سالہ تاریخ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو جس طرح وہ عزم و ہمت۔ بلندیٔ فکر۔ روشن خیالی۔ وطن پروری اور حریت نوازی کی ایک سنہری زنجیر نظر آتی ہے جس کی کوئی بھی کڑی کہیں سے ٹوٹی ہوئی نہیں ہے تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے ۱۸۵۷ء کے انقلابی دور میں اس علاقہ کا کردار کیا رہا اور یہاں کے علماء و زعماء بالخصوص اُس طبقہ نے جو حضرت سید صاحب سے وابستہ تھا کیا خدمت انجام دی۔

اس موقعہ پر تاریخ کے ایک طالب علم کی حیرانی ناقابل بیان ہو جاتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ صفحاتِ تاریخ پر مالاگڈھ اور ترخ نگر جیسے گمنام مقامات کے نام موجود ہیں لیکن اس علاقہ اور اُس کے مجاہدین کا کوئی تذکرہ نہیں

۱۸۵۷ء کے دہلوی مورخ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں کی ایک دلچسپ تحریر

دہلی کے مشہور مورخ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ عروج عہد انگلیشیہ" کے تقریباً آٹھ سو صفحات ۱۸۵۷ء کی نذر کر دیئے ہیں تعجب ہے ان آٹھ سو صفحات میں سے کوئی ایک صفحہ تو درکنار ایک سطر بھی اس علاقہ کے مجاہدین کے حصہ میں نہیں آسکی ہاں اس کتاب کے صفحہ ۶۷۵ پر ایک عبارت ملتی ہے۔ سیاق و سباق سے بے جوڑ اور خود اپنے مفہوم کے اعتبار سے بھی ایک قسم کا معمہ ہے مگر ہمارے موضوع کلام سے اس کا تعلق

بہت گہرا ہے۔ لہذا آغازِ باب میں اس عبارت کو پیش کیا جا رہا ہے۔
شمس العلماء فرماتے ہیں:۔

"سب سے اول مولوی رحمت اللہ کیرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے۔ وہ بڑے عالم فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رد میں صاحبِ تصنیف تھے۔ وہ قلعہ کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اُترے۔ اس دانشمند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامہ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن چلا گیا۔"

یہ مولانا رحمت اللہ صاحب کون ہیں ان کی تشریف آوری کی کیا اہمیت تھی اور جب وہ تحریک میں حصہ لئے بغیر واپس تشریف لے گئے تو پھر کیا بات رہ گئی تھی کہ اُن کا تذکرہ شمس العلماء نے ضروری سمجھا

حقیقت یہ ہے کہ مولانا رحمت اللہ مجاہدین کی ایک جلیل القدر جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے حالات کا جائزہ لینے کے لئے تشریف لائے تھے۔ شمس العلماء نے کسی وجہ[1] سے اس جماعت کا نام لینا[2] یا اس کی طرف اشارہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر

---

[1] منشی ذکاء اللہ خاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کے بعد اگرچہ وہ پالیسی اختیار کی جس کے نتیجہ میں اُن کو انگریزی سرکار نے شمس العلماء کا خطاب دیا مگر اس علاقہ کی جماعت سے جو ہمدردی ان کو شروع میں تھی غالباً وہ اُس کو آخر تک ختم نہیں کر سکے۔ منشی ذکاء اللہ خاں صاحب دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے جہاں حضرت مولانا مملوک علی صاحب نے مدرس اور صدر مدرس کی حیثیت سے اپنی زندگی ختم کی تھی۔ تھانہ بھون کی اس جماعت کے تمام بزرگ اور رہنما مولانا مملوک علی صاحب کے شاگرد اور ان کے عزیز و قریب تھے یعنی شمس العلماء کے ہم سبق۔ شریک جماعت (باقی ص ۲۷۷ پر)

تاریخ کے ایک اہم واقعہ کی حیثیت سے نمائندہ جماعت کی تشریف آوری کو نظر انداز بھی نہ کرسکے۔

مجاہدین کی یہ جماعت وہی ہے جس نے شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی زیر قیادت اس علاقہ میں کام کیا جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آرہی ہے

بظاہر یہ صحیح ہے کہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے اُس وقت کے حالات دیکھکر یہی رائے قائم کی جو شمس العلماء نے تحریر فرمائی ہے لیکن آخر تک مولانا رحمت اللہ اور اُن

(بقیہ حاشیہ ص۲۷۶) اور دوست احباب۔ شمس العلماء کی یہ کتاب اگرچہ ۱۸۵۷ء سے تقریباً پندرہ سال بعد طبع ہوئی ہے جبکہ ۱۸۵۷ء کے مقدمات کی مسلیں داخل دفتر ہو چکی ہونگی۔ مگر دوسری تحریک یعنی علماء صادق پور کی زیر قیادت وہابی تحریک کے اثرات شدومد سے پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے جس کی وجہ سے شکوک وشبہات کا دور باقی تھا۔ اس علاقہ کے بزرگ خاص مقاصد کے پیش نظر ایک عظیم الشان ادارہ دیوبند میں قائم کرچکے تھے اور دوسری طرف انہیں حضرات نے حجاز مقدس میں بساط سیاست بچھا رکھی تھی۔ اور یہی مولانا رحمت اللہ قسطنطنیہ پہونچکر ترکی سلطان کے یہاں اعتماد حاصل کرچکے تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر شمس العلما نے اس پوری جماعت کے تذکرہ کو قصداً نظر انداز کیا اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے متعلق بھی جو بات لکھی وہ ان واقعات کے خلاف جو بعد میں نمودار ہوئے اس طرح تاریخ کے حق میں ایک کوتاہی ضرور ہوئی۔ مگر جماعتی مفاد کے پیش نظر اس کوتاہی کا ارتکاب قرین مصلحت اور نہایت ضروری تھا۔ محمد میاں

۲؎ جو صاحب حالات سے ذاتی طور پر واقفیت رکھتے ہیں انہیں اس بات کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہوگا کہ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں اور اسی طرح دوسرے مورخین نے صرف انہیں کے نام لئے ہیں جو پہلے ہی ریکارڈ پر آچکے تھے یا کسی طرح گرفت میں آچکے تھے اور جو لوگ محفوظ رہ گئے تھے اُن کو قصداً یا لاعلمی کی بنا پر نظر انداز کردیا اور تحقیق کی جائے تو صرف تھانہ بھون کے بزرگ ہی نہیں بلکہ ایسے افراد کی تعداد بہت زیادہ ملے گی جن کے نام نہیں لئے

کی جماعت اس تحریک سے کنارہ کش نہیں رہی۔ جہاد کا وہ فتویٰ جس پر اسی کتاب میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے اس پر ایک دستخط "رحمت اللہ" کے بھی ہیں۔ جانے پہچانے مولانا رحمت اللہ ہی ہیں اور اس دستخط کی شہادت یہ ہے کہ مولانا رحمت اللہ اور ان کی جماعت نے تحریک میں پوری سرگرمی سے کام کیا۔ البتہ یہ بھی صحیح ہے کہ شروع میں نہیں بلکہ اُس وقت جب جنرل بخت خاں اور امیر جماعت مولانا سرفراز علی صاحب نے دہلی پہنچکر تحریک کو منظم کر لیا اور انقلابی کارروائیوں میں باضابطہ جہاد کی شکل پیدا کر دی خود مولانا رحمت اللہ صاحب کے تحریک میں حصہ لینے اور شکست کے بعد ہندوستان سے ہجرت کرنے کی تفصیل مولانا موصوف کے پوتے مولانا محمد عارف الاسلام عثمانی الجلالی کے بیان سے واضح ہو گی جو بعد میں پیش کیا جائے گا۔

مولانا کے علاوہ دوسرے بزرگوں کے کارناموں کے متعلق ذیل کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

تذکرۃ الرشید جلد اوّل کے اقتباسات

اس کتاب کے مولف و مرتب مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی ہیں (رحمۃ اللہ) آپ ۱۸۵۷ء کے مشاہدین میں سے نہیں ہیں لیکن مشاہدہ کرنے والوں کو آپ نے قریب سے دیکھا ہے اور بہت سے مردان کار کے حالات خود اُن کی زبانی سُنے ہیں، مگر چونکہ تذکرۃ الرشید کی تصنیف و ترتیب کا وہ وقت تھا جب برطانوی سامراج کا نقطۂ عروج خط استوا پر پہونچا ہوا تھا اور نہ صرف زبان اور قلم بلکہ لوگوں کے ضمیر بھی اُس کی عظمت و ہیبت سے متاثر تھے تو آپ کو بھی اپنی تحریر میں وقت کے تقاضے کی تعمیل کرنی پڑی ہے، انتہا یہ کہ بعض چیزوں کے اعتراف و اقرار کے لئے

بھی انکار کا پیرایہ اختیار کرنا پڑا ہے۔

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات لکھتے وقت یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ۱۸۵۷ء اور اس کے نتائج و اثرات مابعد کا ذکر ہی نہ کریں اور شمس العلماء کی طرح دامن بچا کر نکل جائیں البتہ تقاضائے وقت یا اپنے طبعی میلان کے باعث آپ نے اپنے بزرگوں کو الزام سے بچانے کی کوشش زیادہ سے زیادہ کی ہے۔ چنانچہ اس علاقہ میں بغاوت کا اصل بانی اور علمبردار جناب قاضی عنایت علی[1] صاحب رئیس تھانہ بھون کو قرار دیا ہے اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے جو بیعت کی گئی تھی اس کی تاویل یہ کی۔

> اس بدامنی کی حالت میں عام باشندگان قصبہ (تھانہ بھون) کی حالت یہ ہوئی کہ گویا اُن کا مُربّی و منتظم بادشاہ سر سے اُٹھ گیا اور شرعی و طبعی ضروریات و مخصصات میں بھی کوئی خبر گیراں نہ رہا جس کی رائے پر عمل کریں۔ پس یہ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گزران دشوار ہے۔ کیونکہ گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اُٹھا لیا اور بذریعہ اشتہار عام اطلاع دیدی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہیئے اس لئے آپ جونکہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لئے دنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنے سر رکھیں اور امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی تصفیئے چکا دیا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت کو اُن کی درخواست کے موافق اُن کے سر پر

[1] قاضی صاحب کے حالات صفحہ ۔۔۔ پر ضمیمہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

ہاتھ رکھنا پڑا اور آپ نے دیوانی و فوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق چند روز تک تاسنی شرع بنکر فیصل بھی فرمائے اسی قصہ نے مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مخبروں کو جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا۔ حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی) قدس سرہٗ۔ دس برس ہوئے اعلیٰ حضرت کو اپنے دین و دنیا کا سردار بنا ہی چکے تھے۔ ہمیشہ آمدورفت رہتی ہی تھی۔ اب جبکہ ہر طرف بدامنی تھی۔ آپ کے لئے یہاں رہنے سے زیادہ بہتر کوئی جگہ دنیا میں نہ تھی۔ ادہر اعلیٰ حضرت (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) کو حکومت کے فیصلے اور شرعی قضا میں مولوی کی ضرورت تھی کہ حق بات میں اعانت کرتا رہے اس لئے آپ اور مولانا محمد قاسم صاحب مع دیگر خدام کے یہیں رہ پڑے۔ [۵۲]

مولانا عاشق الٰہی صاحب کی تاویل کی حقیقت کچھ بھی ہو مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ

(۱) تھانہ بھون ایک مرکز بنایا گیا۔

(۲) سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ امیر مقرر کئے گئے۔

(۳) اُن کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

(۴) ایک نظام حکومت قائم کیا گیا جس میں فصل خصومات یعنی عدالت جیسے محکمے حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے سپرد کئے گئے

---

۵۲ تذکرۃ الرشید جلد اول ص۷۴

تشکیل حکومت کے بعد وقت کے مناسب اور ضرورت کے عین مطابق ان بزرگوں نے جو اقدام کیا مولانا عاشق الٰہی صاحب کے ایک انکاری بیان میں اس کا اعتراف بھی ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا موصوف تحریر فرماتے ہیں (رحمہ اللہ)

سب بغاوت وفساد کا قصہ فرو ہوا اور رحمدل گورنمنٹ نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں، انھوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا اور یہ مخبری کی کہ تھانہ بھون کے فساد میں اصل اصول یہی لوگ تھے۔ اور شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا یہی گروہ تھا بستی کی دوکانوں کے چھپر تحصیل کے دروازہ پر انھوں نے جمع کیے اور ان میں آگ لگادی یہاں تک کہ جب آدھے کواڑ جل گئے تو ابھی آگ بجھنے بھی نہ پائی تھی کہ ان نڈر ملانوں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانۂ سرکار کو لوٹا تھا۔[1]

---

[1] تذکرۃ الرشید جلد اول ص۷۴ اس کے بعد مولانا عاشق الٰہی صاحب ان بزرگوں کی صفائی میں رقمطراز ہیں "حالانکہ یہ کمل پوش، فاقہ کش، نفس کش حضرات فسادوں سے کوسوں دور تھے ملک ومال کے جھگڑے اگر سر رکھتے تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی کوئی کہیں کا ڈپٹی ہوتا اور کوئی کہیں کا صدر الصدور کچہری کے عالی شان کمرے، اور عدالت کے وسیع اور اونچی چھتوں والے مکانات کو چھوڑ کر قبر کی تنگی یاد دلانے والے حجروں اور کھرے بوریہ کے فرش والے تاریک گوشوں میں کیوں پڑتے، مگر

کون سنتا ہے کہانی میری ؎ اور پھر وہ بھی زبانی میری۔ تذکرۃ الرشید جلد اول ص۷۶

یہ دو اقتباس مولانا عاشق الٰہی صاحب کی تصنیف سے پیش کئے گئے ہیں
ان میں ضرورت سے زیادہ اجمال اور اختصار سے کام لیا گیا ہے تب بھی یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اس علاقہ کے سرفروشان حریت نے "تھانہ بھون" کو مرکز بنا کر تحریک میں حصہ لیا اور جرأتِ مردانہ سے وہ سب کچھ کیا جو انگریزوں کی جڑیں اکھاڑنے کے لئے دوسرے مقامات پر کیا گیا تھا۔

اب اس مجمل اور مختصر کی کسی قدر تفصیل پیش کی جا رہی ہے اور ضرورت کے مطابق ذمہ دار بزرگوں کے مختصر حالات بھی لکھے جاتے ہیں۔

واقعات تھانہ بھون و شاملی اور تعارف رہنما

تعارف رہنما

حضرت حاجی امداد اللہ[۵۱] صاحب فاروقی تھانوی۔ جن کو امیر اور رہنما منتخب کیا گیا تھا جو بعد میں شیخ العرب والعجم اور قطب العالم تسلیم کئے گئے ۲۲ صفر ۱۲۳۳ھ ۲ جنوری ۱۸۱۸ء[۵۲] میں "نانوتہ" میں پیدا ہوئے جہاں آپکی نانہیال تھی آپکی فطری

---

۵۱ والدین کا رکھا ہوا نام امداد حسین تھا اور جب آپ سنہ ۱۲۶۱ھ میں جبکہ عمر تقریباً ۲۷ سال تھی حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ نے آپکا نام بدل کر امداد اللہ رکھ دیا۔ التمہید بحوالہ سیاسی تحریک صـ ۱۸۳

۵۲ روز چہارشنبہ ۱۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۱۷ھ تاریخ وفات ہے۔ عمر ۸۴ سال تین ماہ بیس دن (ضمیمہ جدیدہ کرامات امدادیہ از حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ) اس حساب سے تاریخ ولادت ۲۲ صفر ۱۲۳۳ھ ۲ جنوری ۱۸۱۸ء ہو گی دو سال پہلے سنہ ۱۲۳۱ھ میں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ اس علاقہ کا دورہ فرما چکے تھے۔

صلاحیتوں کے متعلق حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے ۔
آپ کی طبیعت عالمانہ رنگ کی نہ تھی ۔ امیر شہید (حضرت سید احمد
شہید رحمۃ اللہ علیہ) سے ملتی جلتی طبیعت رکھتے تھے اسی لئے وہ سید
صاحب کا نمونہ تھے [۵۱]

تعلیم | ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے وطن میں پائی ۔ پھر آپ [۵۲] دہلی تشریف لے گئے
دہلی کے بہت سے مکتبوں اور مدرسوں میں مولانا نصیر الدین صاحب
دہلوی کی بھی ایک درس گاہ تھی جہاں علم ظاہر کے ساتھ عشق و معرفت کا درس بھی دیا
جاتا تھا ۔ [۵۳]

---

۵۱ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے آپ کے اساتذہ میں شیخ محمد قلندر اور شیخ الٰہی بخش کاندھلوی رحمہما اللہ کا نام بھی لیا ہے آپ فرماتے ہیں اخذ عن الشیخ محمد قلندر والشیخ الٰہی بخش الکاندھلوی واخذ عن الشیخ نصیر الدین الدہلوی (التمہید بحوالہ سیاسی تحریک ص۱۸۳) ۵۲ خود حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے ہم نے ایک باب اور دیباچہ گلستان کا اور ایک باب بوستان کا اور کچھ مفید نامہ اور کچھ دستور المبتدی اور چند ورق زلیخا کے پڑھے تھے اور حصن حصین حضرت قلندر صاحب سے پڑھی ۔ بعد میں شوق ورد وظائف کا ہوا اور دہلی میں آکر حضرت شاہ نصیر الدین دہلوی سے بیعت کی بعد ان کے وصال کے پھر کسی کامل کی جستجو ہوئی (کرامات امدادیہ ص۵)

۵۳ چنانچہ نوجوان امداد اللہ نے جس طرح مولانا نصیر الدین صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ۔ سی پارہ دل کے اوراق بھی اسی اُستاذ کے سامنے کھول کر رکھ دیئے ۔ یہ تلمذ اور یہ بیعت جس جذبہ اور اخلاص کے ساتھ ہوئی تھی اس کا اندازہ خود آپ کے ایک بیان سے ہوتا ہے جس کے راوی حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ہیں ۔ مولانا تھانوی اپنے رسالہ کرامات امدادیہ میں تحریر فرماتے ہیں ۔ آپ نے (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے) فرمایا کہ ظاہر میں اول بیعت میری طریقہ نقشبندیہ میں حضرت نصیر الدین صاحب دہلوی (باقی ص۲۸۴ پر)

مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی کا ذکر خیر ابتدا میں گذر چکا ہے یہ حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے درس گاہ معرفت وسیاست کے فاضل تھے اور اپنی جھنڈے کو بلند کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو حضرت سید صاحب کی شہادت کے بعد سرنگوں ہو گیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صہ ۲۸۳) خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق صاحب سے ہوئی اور باطن میں بلا واسطہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ حضورؐ ایک بلند جگہ پر رونق افروز ہیں اور حضرت سید احمد شہید کا ہاتھ آپ کے دست مبارک میں ہے اور میں بھی اسی مکان میں بوجہ ادب کے دُور کھڑا ہوں۔ حضرت سید صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر حضور کے ہاتھ میں دیدیا۔

ایک اور روایت بھی ملاحظہ فرما لیجئے "تا کہ حضرت حاجی صاحب کے سلسلہ بیعت کی پوری پوری تفصیل سامنے آجائے۔ حضرت مولانا تھانوی، مولانا عبد الغنی صاحب علیم آبادی رحمہما اللہ کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت حاجی صاحب نے خواب میں دیکھا کہ مجلس اعلیٰ و اقدس سرور عالم مرشد اتم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وازواجہ واتباعہ وسلّم میں حاضر ہوں۔ غایت رعب سے قدم آگے نہیں بڑھتا ہے کہ ناگاہ میرے جدّ امجد حضرت حاجی حافظ بلاقی صاحب رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور میرا ہاتھ پکڑ کر حضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچا دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے میرا ہاتھ پکڑ کر حوالہ ایک بزرگ کے کر دیا اور اس وقت تک بعالم ظاہر حضرت میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی اور کسی طرح کا تعارف بھی نہیں تھا حاجی صاحب بیان فرماتے ہیں کہ جب میں بیدار ہوا عجیب انتشار و حیرت میں مبتلا ہوا کہ یا رب یہ کون بزرگوار ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا اور خود مجھکو اُن کے سپرد فرما دیا اسی طرح کئی سال گذر گئے۔ ایک دن حضرت استاذی مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی رحمۃ اللہ تعالےٰ نے میرے اضطرار کو دیکھ کر بکمال شفقت و عنایت فرمایا کہ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ موضع لوہاری یہاں سے قریب ہے وہاں جاؤ اور حضرت میانجی نور محمد صاحب سے ملاقات کرو شاید مقصود دلی کو پہونچو اور اس حیص بیص سے نجات پاؤ۔ چنانچہ میں نے فوراً پاپیادہ لوہاری کی راہ لی۔ آستانہ شریف پر حاضر ہوا اور جیسے ہی جمال باکمال جناب شان (باقی صفحہ ۲۸۵ پر)

نوجوان امداد اللہ نے بھی درجہ وسطی کی کتابیں پڑھ رہا تھا کہ حضرت مولانا نصیر صاحب دہلوی کے جہادی قافلہ نے اپنا کوچ شروع کر دیا (۲ رذی الحجہ ۱۲۵۰ھ ۲ر اپریل ۱۸۳۵ء)

حضرت اُستاد کے اس سفر نے دل و دماغ پر ایسا اثر کیا کہ کتابوں کی ورق گردانی بار معلوم ہونے لگی۔[1] البتہ بااحساس فطرت نے حضرت استاذ کے پاک اور مقدس جذبات سے جو سبق لیا تھا وہ عمر بھر فراموش نہ ہوا۔

مکتب عشق کا یہ دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی ہی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

صرف پانچ سال ہی گذرے تھے کہ حضرت سیّد نصیر صاحب دہلوی ۱۲۵۶ھ ۱۸۴۰ء

---

[1] آپ نے رواج کے مطابق درسی کتابوں کی تکمیل نہیں کی تھی مگر مطالعہ سے آپ نے وسیع معلومات حاصل کر لی تھیں احادیث پر آپ کی نظر بہت وسیع تھی اور اسرار شریعت و طریقت کے ماہر تھے جیسا کہ آپ کی تصانیف اور آپ کے ارشادات سے جو کمالات امدادیہ وغیرہ میں نقل کئے گئے ہیں معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو کرامات امدادیہ کرامت (۳۸)

حاشیہ بقیہ صفحہ ۲۸۴ - (حضرت میانجی نور محمد صاحب) ملاحظہ کیا صورت انور کو خواب میں دیکھا تھا بخوبی پہچانا اور محو وارفتگی ہو کر قدموں میں گر پڑا۔ حضرت میانجی صاحب نے میرا سر اُٹھایا اور سینہ نور گنجینہ سے لگا لیا اور بکمال رحمت و عنایت فرمایا کہ تم کو اپنی خواب پر کامل وثوق و یقین ہے یہ حضرت میانجی صاحب کی پہلی کرامت تھی جس نے میرے دل میں اُن کی محبت مستحکم کر دی ۱۲۴۲ھ کرامات امدادیہ۔ کرامت یہ ہے کہ ملاقات ہوتے ہی خواب پر تبصرہ فرما دیا حالانکہ اس سے پہلے اس کا کوئی تذکرہ نہیں آیا تھا۔ مختصر یہ کہ حضرت حاجی صاحب نے پہلے بیعت حضرت سیّد نصیر الدین صاحب سے کی تھی۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت میانجی نور محمد صاحب سے طریقہ چشتیہ میں بیعت کی آپکی زیر تربیت مراحل سلوک طے کر کے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ رحمہما اللہ۔

میں خدا کو پیارے ہوئے اور اُن کے خسر حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب دہلوی نے سفر ہجرت اختیار کر کے مکہ معظمہ کو تحریک کا مرکز بنالیا۔

مولانا عبیداللہ سندھی کی تحقیق کے بموجب اگرچہ اب مرکز مکہ معظمہ ہوگیا تھا جہاں ترکوں اور اُن کے حلیفوں سے مدد لیکر ہندوستان کی تحریک حریت کو کامیاب بنایا جا سکتا تھا لیکن ہندوستان کے سیاسی مرکز یعنی دارالسلطنت میں ایک نظام کے قائم رکھنے اور ترقی دینے کی پھر بھی ضرورت تھی جس کے لئے پہلے مولانا مملوک علی صاحب[1] کی زیر صدارت

---

[1] مولانا مملوک علی رحمۃ اللہ علیہ جن کے متعلق سرسید صاحب تحریر فرماتے ہیں "آپ کو علم معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے تو اُن کے لوح حافظہ سے پھر اُن کی نقل ممکن ہے (آثارالصنادید) اُن کا اصل وطن قصبہ نانوتہ (ضلع سہارنپور) ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت قاسم بن محمد ابن ابی بکر صدیق رضہ سے وابستہ ہے آپ سے چار پشت اوپر آپ کے مورث جناب شیخ محمد ہاشم صاحب رحمۃ اللہ نانوتہ تشریف لائے تھے سلطان عالمگیرؒ کی طرف سے آپ کو یہاں جاگیر بھی دیدی گئی تھی۔ آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا رشیدالدین صاحب، (شاگرد رشید حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہم) کا اسم گرامی خاص طور پر مستحق تذکرہ ہے۔ عرصۂ دراز تک دہلی کی عربی یونیورسٹی میں جو اُس وقت مدرسہ شاہجہان آباد یا مدرسہ غازی الدین کہلاتا تھا عربی علوم وفنون کا درس دیتے رہے۔ پھر یہاں شعبہ عربی کے صدر بنا دیئے گئے۔ اس دور کے بلند پایہ فضلاء اور علماء زیادہ تر آپ ہی کے شاگرد تھے۔ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی۔ امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی۔ سرسید احمد صاحب (بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی (صاحب ترجمہ) شمس العلماء ذکاراللہ خاں صاحب اور آپ کے فرزند رشید حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس بنائے گئے جو اپنے والد ماجد کی طرح علوم عقلیہ نقلیہ کے بہترین فاضل اور جامع ترین شخصیت تسلیم کئے جاتے تھے۔ تقویٰ، طہارت اور تزکیۂ باطن میں بھی آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ چنانچہ آپ جس طرح فقیہ شریعت تھے ایسے ہی شیخ طریقت بھی تھے یہ سب آپ کے شاگرد تھے (باقی ص ۲۸۷ پر)

ایک بورڈ بنایا گیا جس کے خصوصی ارکان مولانا قطب الدین صاحب [91] دہلوی۔

(حاشیہ بقیہ ص ۲۸۶) مولانا مملوک العلی صاحب کا چونکہ مستقل قیام دہلی میں رہتا تھا اس لئے آپ نے کوچہ چیلان میں مکان بھی خرید لیا تھا۔ سرکاری درسگاہ میں سالہا سال ملازم رہنے کے باوجود انگریز سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ ریزیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے تو آپ کے علم اور رتبے کے خیال سے ہاتھ ملایا جب تک صاحب بہادر وہاں رہے تو مولانا نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا (دہلی کی آخری شمع از مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب فرحت دہلوی) ۱۲۶۷ھ ۱۸۵۱ء میں آپ نے دہلی میں وفات پائی اور یہیں مہندیوں میں (جہاں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے فرزندان گرامی کے مزارات ہیں) آپ دفن کئے گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ (سوانح قاسمی جلد اول۔ سیاسی تحریک۔ آثار الصنادید۔ دہلی کی آخری شمع۔ وغیرہ)

۹۱ مولانا قطب الدین صاحب خلف نواب غلام محی الدین خاں بہادر ۱۲۱۹ھ ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئے ۶ نومبر ۱۸۴۶ء ذی الحجہ ۱۲۶۲ھ کو والد کی جگہ آپ کو بہادر شاہ بادشاہ نے خلعت اور خطاب عطا فرمایا۔ اب پورا نام یہ ہو گیا۔ فخر الاسلام نواب محمد قطب الدین خاں بہادر۔ آپ کے متعلق سرسید رح تحریر فرماتے ہیں "تحصیل علم و فضل خصوصاً فقہ و حدیث خدمت بابرکت مولانا اسحاق صاحب مرحوم و مغفور سے کی۔ اتباع شریعت میں سب پیش روان مسلک دین سے آپ کا قدم آگے بڑھا ہوا ہے وضع اور لباس میں اپنے استاد عالی نہاد سے ایسے مشابہ ہیں کہ جس نے ان کو نہ دیکھا ہو ان کو دیکھ لے اخلاق و علم کے علاوہ فضل و کمال علمی ایسا آپکی ذات میں جمع ہے کہ اوروں میں بہت کم پایا گیا۔ تقوی اور ورع (پرہیزگاری) کا تو حساب ہی نہیں۔ آپ کے اجداد و الا تبار اعلیٰ خاندان والا دودمان ہمیشہ پیشگاہ سلطنت سے مناصب جلیلہ رکھتے تھے اب اس حیز زمان میں بھی آپ کو تقرب حضرت سلطانی سے وہ عزت و جاہ حاصل ہے جو چاہیئے چہ تھے دن اپنے استاد کی پیروی اور خلق کی رہنمائی کے لئے مجلس وعظ منعقد فرماتے ہیں۔ اکثر رسائل زبان ریختہ میں (اردو میں) فوائد عوام کے لئے تحریر کئے اور ان میں مسائل ضروریہ ہر طرح کے مندرج فرمائے۔ اور حق یہ ہے کہ ان رسالوں سے خلق کو بہت فائدہ ہوا کہ ضروریات دین سے ہر شخص مطلع اور آگاہ ہو گیا۔۔۔ اللّٰھم زد فزد

(باقی ص ۲۸۸ پر)

مولانا[۹۱] مظفر حسین صاحب کاندھلوی اور مولانا[۹۲] عبد الغنی صاحب دہلوی تھے[۹۳]

(حاشیہ بقیہ صـ۲۸۷) اب جو شخص راہِ خدا پر چلے گا ثواب اس کا انہیں کے جریدہ اعمال میں درج ہوگا (تذکرہ اہل دہلی از سر سید صـ۸۳) آپ کے تراجم اور تصنیفات میں چند مشہور کتابیں جو آج تک مقبول ہیں یہ ہیں۔ مظاہر حق ترجمہ اردو مشکوٰۃ شریف۔ ظفر جلیل ترجمہ اُردو حصن حصین۔ جامع التفاسیر۔ خلاصہ جامع صغیر۔ وغیرہ وغیرہ تقریباً ۲۵ تصانیف (ملاحظہ ہو حدائق حنفیہ صـ۴۸۴) بہرحال قدرت کی فیاضیوں نے جس طرح آپ کو دین اور دنیا کی دولتیں عطا فرمائی تھیں تاریخ میں اس کی نظیریں بہت کم ہیں۔ آپ چوتھے پانچویں سال زیارت بیت اللہ شریف کے لئے تشریف لیجایا کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۵ سال بعد ۱۸۷۲ء ۱۲۸۹ھ میں مکہ معظمہ میں انتقال کیا۔ "مُرَوِّجِ احکام شریعت" تاریخ وفات ہے (حدائق الحنفیہ صـ۴۸۵)

[۹۱] مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی مولانا محمد بخش صاحب کے فرزند رشید اور اس دور کے مشہور عالم، مفتی اور مجاہد حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کے برادر زادہ ہیں (مولانا محمود بخش صاحب اور مفتی الٰہی بخش صاحب دونوں حقیقی بھائی ہیں) مفتی الٰہی بخش صاحب کا ذکر خیر شاندار ماضی جلد دوم میں گذرا۔ آپ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کی تحریک کے بہت بڑے حامی اور مددگار۔ علم و فضل اور تقویٰ طہارت غرض ہر لحاظ سے آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ مثنوی مولانا روم کے دفتر ہفتم کی تکمیل آپ نے ہی کی۔ مولانا مظفر حسین صاحب نے ابتدائی تعلیم انہیں مفتی صاحب سے حاصل کی۔ اُن کی وفات کے بعد آپ دہلی آئے اور حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں داخل ہو کر آپ نے تکمیل کی اور شاہ صاحب کے بھائی مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے بیعت ہو کر مراحل سلوک طے کئے۔

سادہ زندگی کے عادی تھے گاڑھے کا کرتہ پاجامہ اور نیلی لنگی آپ کا لباس تھا۔ ایک مرتبہ آپ کی صاحبزادی نے موٹی ململ کا کرتہ بنا دیا۔ آپ نے جمعہ کے روز با صرار پہنا اور نماز کے بعد اتار کر واپس کر دیا کہ اس سے طبیعت میں تکبر پیدا ہوتا ہے۔ آپ ہمیشہ پیدل سفر کرتے۔ سواری پر کبھی سوار نہ ہوتے تھے۔ لوٹا۔ لنگی۔ چھڑی اور ایک مشکیزہ رخت سفر ہوتا تھا۔ جہاں رات ہو جاتی (باقی صـ۲۸۹ پر)

(باقی صـ۲۸۹ پر)

اور رجب سنہ ۱۲۶۱ھ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب پہلی بار حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تو مولانا شاہ اسحاق صاحبؒ نے حاجی امداد اللہ صاحب کو اسی کام کے لئے مقرر فرما دیا۔[۵۱] مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور تصنیف "التمہید" میں فرماتے ہیں۔

جاء الامیر امداد اللہ الی الحرمین فی سنۃ ۱۲۶۱ ولقی الشیخ محمد اسحاق واخذ عنہ طریق الدعوۃ ثم عاد

امیر جماعت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب (جو سنہ ۱۲۶۱ھ میں وطن سے روانہ ہوئے تھے) سنہ ۱۲۶۱ھ میں مکہ معظمہ پہونچے۔ حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) رہیں قیام فرما لیتے۔ آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ نہیں رکھا۔ اصلاحی وعظ آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ آپ نے بہت سی اصلاحی خدمات بھی انجام دیں۔ یہ تبلیغی سلسلہ جس کی آجکل پورے ہندوستان بلکہ بیرون ہند میں بھی دھوم ہے اس کے بانی حضرت مولانا الیاس صاحبؒ انھیں مولانا مظفر حسین صاحب کی صاحبزادی کے نواسہ تھے۔ چھ مرتبہ آپ نے حج بیت اللہ کیا جب ساتویں مرتبہ آپ حج کے لئے تشریف لے گئے تو ۱۰ محرم الحرام سنہ ۱۲۸۳ھ ۲۵ مئی سنہ ۱۸۶۶ء کو مدینہ منورہ میں آپ کا انتقال ہو گیا جنت البقیع میں خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مزار شریف کے قریب آپکو خواب گاہ میسر ہوئی۔ کرتا۔ پاجامہ۔ لنگی۔ لوٹا اور مشکیزہ آپ کا کل ترکہ تھا جب وصیت لوٹا اور مشکیزہ بیت المال میں داخل کر دیا گیا۔ لنگی مریدین میں تقسیم کر دی گئی۔ کرتا پاجامہ صاحبزادیوں کے پاس بھیج دیا گیا جس سے پاجامہ معتقدین میں تقسیم کر دیا گیا۔ کرتا بطور تبرک صاحبزادیوں کے پاس رہا۔ ملاحظہ ہو تذکرۃ الخلیل مصنفہ مولانا عاشق الٰہی صاحب از ص۵۱ تا ص۵۶

۵۲ مولانا شاہ عبد الغنی صاحب محدث خلف حضرت شاہ ابو سعید صاحب جلیل القدر عالم حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب کے شاگرد رشید اور آپ کے جانشین۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد آپ نے ہجرت فرمائی اور تقریباً ۱۹ سال حجاز مقدس میں قیام کرنے کے بعد سنہ ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ میں آپ نے مدینہ طیبہ میں وفات پائی رحمۃ اللہ

۵۳ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص۱۸۱ و ص۱۸۳ ص۱۵ ایضاً۔

الی الھند فی سنہ ۱۲۶۲ھ و قصدہ الناس من اطراف البلاد واجتمع علیہ الاکابر اھل العلم مثل مولانا محمد قاسم ومولانا رشید احمد والشیخ فیض الحسن السہارنفوری وجمع کبیر من علماء الھند[۱]

تحریک کا لائحہ عمل اور پروگرام معلوم کیا پھر ۱۲۶۲ھ میں ہندوستان واپس ہوئے وہ لوگ جو اس سلسلہ سے وابستہ تھے اُنھوں نے حضرت حاجی صاحب کو اپنے تعلقات کا مرکز بنالیا اکابر اہل علم مثلاً حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی۔ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری اور ان کے علاوہ علماء ہند کی جمع کبیر (ایک بڑی جماعت) آپ کے گرد جمع ہوگئی۔

یہ جمع کبیر از جماعت کثیر جو حضرت حاجی صاحب کے گرد جمع ہوگئی تھی اگر اُس کے ناموں کا کوئی رجسٹر ہوگا تو ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں ضائع ہوگیا ہوگا۔ سو سال کے بعد تو اس کا کوئی پُرزہ بھی دستیاب نہیں ہوسکتا۔ البتہ جو بیانات چند سطروں کے بعد آپ کے سامنے آنے والے ہیں اُن کی بنا پر چار ناموں کا اضافہ اور کرلیجئے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی جن کا تذکرہ شمس العلماء نے دوسرے انداز سے کیا ہے۔ مولانا محمد مظہر صاحب۔ مولانا محمد منیر صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی۔

جہاد ۱۸۵۷ء یہاں دوبارہ اس بحث کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی ابتدا اربعیہ انگریزوں کے حق میں اچانک تھی ایسے ہی انقلابی جماعتوں کے حق میں بھی وہ دفعتہً تھی۔ لیکن جو لوگ کسی جماعت سے منسلک نہیں تھے اُن کے لئے آسان تھا

---

[۱] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک۔ ص ۱۸۳ حاشیہ۔

کر وہ پہلی ہی فرصت میں شرکت یا علیحدگی کا فیصلہ کرلیں لیکن جو اپنی زندگی کسی نظام سے وابستہ کئے ہوئے تھے اُن کے لئے یہ جلد بازی درست نہیں تھی کہ اپنے مرکزی نظام یا جماعت کے فیصلے سے پہلے ذاتی طور پر کوئی فیصلہ کرکے کام شروع کردیں۔

پس یہ جماعت جو شاہ ولی اللہ کی جماعت کہلانے کی صحیح طور پر مستحق تھی جیسے ہی رمضان شریف کے آخر میں اس کو دہلی کے انقلاب کی خبر پہونچی تو غور و خوض کا ایک اہم موضوع اس کے سامنے آیا جس کے لئے ہنگامی اجلاس ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو نانوتہ[1] اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب کو گنگوہ[2] سے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ان دنوں سہارن پور تھے اُن کو وہاں سے طلب کیا گیا[3]۔ اور اسی موقع پر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کو تحریک کی حقیقت و نوعیت معلوم کرنے کے لئے دہلی بھیجا گیا۔ مئی کے آخر یا جون کے شروع میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب دہلی پہونچے اس وقت تک تحریک بوڑھے بادشاہ اور ناتجربہ کار شہزادوں کی ناتجربہ کاریوں کے حوالہ تھی۔ انقلابی سپاہیوں نے بیشک زمام قیادت انھیں کے حوالہ کی تھی لیکن کسی سنجیدہ یا اصولی جماعت کے لئے ان پر اعتماد کرنا بہت مشکل تھا اس وقت جو بدنظمی اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی اس کو دیکھ کر مولانا رحمت اللہ صاحب کو وہی فیصلہ کرنا چاہئے تھا جو شمس العلماء نے بیان کیا۔

تنظیم نو یا تشکیل حکومت

لیکن یہ مردان احرار جو سالہا سال سے حریت کاملہ اور مکمل آزادی کی تمنائیں دلوں میں لئے ہوئے تھے جن کے دماغوں نے خدا جانے کتنے نقشے بنالئے اور بگاڑے تھے اُن کے لئے یہ بات بہت ہی

---

[1] سوانح قاسمی ص ۱۰۰ ج ۲ [2] تذکرۃ الرشید ص ۷۴/۱۷۰ [3] سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب از مولانا محمد یعقوب صاحب۔

تکلیف دہ اور افسوسناک تھی کہ ایسے وقت جب کہ فضا اس قدر ہموار اور ماحول اتنا سازگار ہو، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھے رہیں اور موسم کی خوشگوار تبدیلی سے کچھ بھی فائدہ نہ اُٹھائیں لیکن جس شریعت غرا اور جس پاک تعلیم کی روشنی میں وہ آگے قدم بڑھا سکتے تھے اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ جو قدم بھی بڑھایا جائے وہ ضبط و نظم۔ سنجیدگی اور قانون کی پوری پابندی کے ساتھ آگے بڑھے۔ بہرحال اس پہلے اجتماع میں اتنا کام تو کر لیا گیا کہ وہ جماعتی نظم جو اب تک ایک (اصلاحی یا سیاسی) پارٹی کی حیثیت رکھتا تھا اب اس کو نظام حکومت کی شکل دیدی گئی۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب "امیر" اور مولانا محمد قاسم صاحب۔ مولانا رشید احمد صاحب۔ حافظ ضامن صاحب اور مولانا محمد منیر صاحب جیسے زعماء اور اکابر کو توجہ۔ حفاظت۔ فصل خصومات اور عدل و قانون وغیرہ کے شعبے سپرد کئے گئے اور اس موقع پر یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ خود بادشاہ کو بھی ضبط و نظم قائم کرنے اور اس جیسے نظام میں داخل ہونے کا مشورہ دیا جائے۔ چنانچہ نواب شبیر علی[له] مراد آبادی کو جو بادشاہ کے موہنہ چڑھے اور

[له] ان کے صاحبزادے نواب محی الدین صاحب۔ جو عرصہ تک بھوپال میں عہدہ قضا پر فائز رہے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ تقریباً سنہ ۱۹۰۳ء میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کی زیارت کا شرف احقر کو بھی حاصل ہوا ہے۔ ان کے اخلاف اب بھی مراد آباد میں موجود ہیں مگر پریشان اور خستہ حال۔ اللہ تعالےٰ ان پر اپنا فضل و کرم فرمائے۔ محمد میاں۔

بے تکلف مصاحب تھے اسی مقصد کے لئے دہلی بھیجا گیا[۵۱]
شاہ حسن عسکری[۵۲]۔ جو بادشاہ کے پیر[۵۳] اور اس تحریک کے ایک ممتاز رکن بلکہ بانی

نے حضرت مولانا محمد طیب صاحب کے حوالہ سے (سوانح
۵۱ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی
قاسمی جلد دوم ص۱۳۷ پر) ایک روایت نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ نواب شیر علی صاحب کو اس
لئے بھیجا گیا تھا کہ بادشاہ کو (جہاد اور استخلاص وطن و ملت کی جنگ پر) آمادہ کریں۔ مولانا محمد
طیب صاحب کے حوالہ سے ایک دوسری روایت اسی صفحہ پر یہ بھی نقل کی گئی ہے کہ مولانا شیر علی صاحب
کو بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ دہلی سے شاملی کی طرف یلغار کریں اور یہ حضرات اس طرف سے
تو یہ پورا خطہ اس عنصر خبیث سے پاک ہو جائے گا۔ احقر کے خیال میں یہ دوسری روایت ہی
قابل اعتماد ہو سکتی ہے کیونکہ جہاں تک آمادگی بلکہ شرکت کا تعلق ہے تو بادشاہ استخلاص ملک و
ملت کی اس جنگ میں آج سے کئی ہفتہ پہلے شریک ہو چکے تھے جب ۱۲ مئی کو انقلابی فوجوں
کی قیادت کرتے ہوئے شاہانہ جلوس کے ساتھ بادشاہ نے شہر کا دورہ کیا تھا۔ بڑے بڑے
بازار کھلوائے تھے اور عوام کو امن و امان کا اطمینان دلایا تھا۔
۵۲ بہادر شاہ کے مقدمہ کے سلسلہ میں جاٹ مل سابق اخبار نویس لفٹنٹ گورنر آگرہ نے
ان کے متعلق یہ بیان دیا تھا کہ حیدر حسین خاں کمانڈر توپخانہ بادشاہ اور حسن عسکری نے
مل کر چند خطوط شیدی قنبر کے ذریعے ایران روانہ کئے (بہادر شاہ کا مقدمہ ص۲۶) عدالت نے
اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ شاہ حسن عسکری ایران سے ساز باز کر کے ہندوستان پر حملہ کرانا چاہتے تھے
۵۳ بادشاہ ان کے معتقد تھے۔ ان سے تعویذ لیا کرتے تھے۔ خوابوں کی تعبیر
پوچھا کرتے تھے اور دعائیں پڑھوایا کرتے تھے شاہی خاندان کی ایک خاتون ان کی بہت معتقد ہو گئی تھی۔ پھر اس
سے نکاح بھی کر لیا۔ اس نے شاہ صاحب کی پاکبازی کی بادشاہ سے تعریفیں کیں جن سے
بادشاہ، شاہ حسن عسکری سے عقیدت رکھنے لگے۔
(بہادر شاہ کا مقدمہ وغیرہ)

محرک اوّل کی حیثیت رکھتے تھے، اسی علاقہ[1] کے رہنے والے تھے اور ان بزرگوں سے خاندانی روابط بھی رکھتے تھے[2][3] اُن کے ذریعہ سے بھی تحریک کی باگ موڑی جا سکتی تھی

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے دہلی سے واپس آکر تحریک کی جو صورتِ حال بیان کی تھی اُس کے پیش نظر خیر خواہی ملک و ملت کے بلند جذبات کا بھی تقاضا یہی تھا کہ جس

---

[1] شاہ حسن عسکری کا آبائی وطن قصبہ رام پور منہیاران ضلع سہارن پور تھا۔ یہی رام پور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ کا بھی ددھیالی وطن ہے (تذکرۃ الرشید ص ۱۵/۱۷)

[2] شاہ مجید علی اور شاہ حبیب محمد قصبہ انبیٹھہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے حقیقی بھائی تھے والد ماجد کا نام شاہ احمد علی صاحب تھا۔ ان دونوں بھائیوں میں سے شاہ مجید علی صاحب حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کے داماد تھے اور شاہ حبیب محمد صاحب شاہ حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کے داماد تھے۔ وہ دو بزرگ جن کے علمی فیوض سے اس صدی کی پیشانی روشن ہوئی یعنی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب صدر مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور اور حضرت مولانا صدیق احمد صاحب صدر مدرس و مفتی ریاست مالیر کوٹلہ ان دونوں بزرگوں کے نواسے تھے۔ یعنی مولانا خلیل احمد صاحب حضرت مولانا مملوک العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رح کے بھانجے اور مولانا صدیق احمد صاحب شاہ حسن عسکری شہید کے نواسے۔

خود شاہ حسن عسکری کی شادی بھی قصبہ انبیٹھہ میں ہوئی تھی اُن کی وفات کے بعد ہی آپ نے دہلی میں مغل شاہزادی سے نکاح کیا۔ [3] اسی خاندانی رابطہ کی بنا پر ۱۸۵۷ء کے بعد شاہ حسن عسکری دہلی سے انبیٹھہ آکر روپوش ہوئے گو ان کی بیوی کا اگرچہ انتقال ہو چکا تھا مگر ان کی صاحبزادی امۃ اللہ اور داماد شاہ حبیب محمد صاحب زندہ تھے۔ داماد اور اُن کے پانچوں بھائیوں نے شرافت و مروت اور وفا پروری کا پورا ثبوت دیا جب پولیس آئی تو خود گرفتار ہو گئے اور پناہ پکڑنے والے پر آنچ نہ آنے دی۔ مگر پناہ لینے والے شاہ حسن کو خود احساس ہوا کہ میری وجہ سے عزیزوں پر مصیبت آپڑی ہے تو خفیہ طور پر انبیٹھہ سے نکل کر سہارنپور پہنچے اور عدالت میں حاضر ہو گئے۔ داماد اور اُن کے بھائی تو رہا کر دیئے گئے اور شاہ حسن عسکری کو پھانسی دیکر شہید کر دیا گیا۔ (تذکرۃ الخلیل ص ۱۰، ص ۱۱)

طرح ممکن ہو بادشاہ کو نیک مشورے دیئے جائیں اور ایسی باتوں کی فہمائش کی جائے جو غلبہ وکامیابی ورنہ کم از کم اخروی فلاح وبہبود کا ذریعہ بن سکیں۔

بہر حال مقامی یا علاقائی حیثیت میں آئین اور دستور کے مطابق حکومت کا ایک نظام زیر قیادت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رمضان شریف کے فوراً بعد مئی کے آخر یا اوائل جون میں تھانہ بھون میں قائم ہو گیا لیکن کوئی اقدام اس وقت مناسب نہیں سمجھا گیا جب تک

(۱) مرکز میں ایک صالح نظام وجود پذیر نہ ہو۔ اور

(۲) اس علاقائی نظام کا رابطہ اس مرکزی صالح نظام سے منسلک نہ ہو جائے

ممکن ہے جلد باز اور تہور پسند جوشیلی طبیعتیں اس کو پسند نہ کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ جذبات کی رو میں بہہ جانے والی طبیعتیں اس کو ٹال مٹول قرار دیں مگر دستور و آئین بالخصوص قوانین شریعت کے ماہرین ان دونوں باتوں کو اتنا ضروری اور لازمی سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ دونوں عمل میں نہ آجائیں کسی بھی اقدام کو مہذب اور صالح (اور شریعت کی زبان میں) جہاد نہیں قرار دے سکتے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ وغیرہ پر برطانوی حکومت نے فساد کا الزام لگایا اور ان بزرگوں نے اس سے انکار کیا۔ ان کا انکار بالکل صحیح تھا کیونکہ انھوں نے فساد میں قطعاً حصہ نہیں لیا۔ البتہ فساد کی صورت ختم ہونیکے بعد جب منظم جہاد کی شکل پیدا ہوئی تو اس جہاد میں ضرور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ جہاد فساد نہیں ہوتا بلکہ قاطع فساد ہوتا ہے۔

مئی کا مہینہ ختم ہو کر جون کا مہینہ گذر رہا تھا اور ابھی تک یہ کوشش بارآور نہ ہوئی

تھی کہ یہ سرفروشانہ تگ و دو منظم جدّوجہد کی شکل اختیار کر سکے۔ اسی اثناء میں رئیس تھانہ بھون قاضی عنایت علی صاحب کے بھائی[۵۱] کا حادثہ پیش آگیا کہ وہ ہاتھی خریدنے کے لئے سہارن پور تشریف لے گئے، کسی نے مخبری کردی اور مسٹر سپینکی (Mr. S. Spankie) مجسٹریٹ ضلع سہارن پور نے اُن کو گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکوادیا۔[۵۲]

---

۵۱ آپ کا اسم گرامی عبدالرحیم تھا۔ قاضی سعادت علی خاں پسر نجابت علی خاں کے یہ دونوں فرزند (قاضی عنایت علی و قاضی عبدالرحیم صاحبان) بہت سعید، شریف الطبع پابندِ مذہب تھے دونوں بھائیوں میں غیر معمولی محبت تھی اور بے حد اعتماد تھا۔ قاضی عبدالرحیم صاحب کے بارے میں "سپینکی" نے جو فیصلہ کیا ہمارے جذبات اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ الزام جو لگایا گیا تھا وہ صحیح تھا۔

۵۲ زمانہ اگرچہ ترقی کر رہا تھا مگر ہاتھی کی قدر اس وقت تک کم نہیں ہوئی تھی۔ سامان جنگ میں اس وقت تک ہاتھی کو وہی حیثیت حاصل تھی جو ہمارے زمانہ میں ٹینک، بکتر بند گاڑی یا فوجی ٹرک کو حاصل ہے۔ ۱۹۴۲ء میں جب گاندھی جی کی زیر قیادت کانگریس نے "کوئٹ انڈیا" "ہندوستان خالی کرو" کا نعرہ انگریزوں کے برخلاف لگایا اور کارپردازان تحریک نے ایک قدم آگے بڑھا کر بجلی اور ٹیلیفون کے تار کاٹنے۔ کھمبے اکھاڑنے اور ریلوے لائنوں کی توڑ پھوڑ شروع کی تو ایک معمولی اوزار جسکو پلاس کہتے ہیں، جس سے پیچ کھولے جاتے ہیں اس کی فروخت ممنوع ہوگئی تھی اگر تلاشی میں کسی کے پاس پلاس یا پیچ کش برآمد ہوجاتا تو وہ توڑ پھوڑ کا مجرم مان لیا جاتا تھا۔

۵۳ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے قاضی صاحب کو علمبردار بغاوت قرار دیا ہے اور حاجی صاحب اور اُن کے رفقاء کرام کا کوئی اقدام تسلیم ہی نہیں کیا۔ اس کی وجہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس زمانہ کے حالات کا بھی کچھ ایسا ہی تقاضا تھا اور خود مولانا عاشق الٰہی صاحب کا فطری ذوق بھی اپنے زمانہ میں انگریزوں کا حامی واقع ہوا تھا۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ بلند پایہ فاضل اور بہت بڑے مصنف اور اہل قلم تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے (باقی ص ۲۹۸ پر)

۲ر جولائی ۱۸۵۷ء کو جنرل بخت خاں اپنی منظم اور باضابطہ فوج لیکر دہلی پہونچ گئے۔ مولانا سرفراز علی صاحب امیر جماعت کی حیثیت سے اُن کے ساتھ تھے بلکہ جنرل مذکور کی سرپرستی اور رہنمائی فرما رہے تھے۔

(بقیہ حاشیہ ص۲۹۶) صدر دینیات کی حیثیت سے زندگی بسر کی۔ تصنیف و تالیف اور وعظ و پند کے سلسلہ میں آپ کی خدمات قابل قدر ہیں مگر سیاسیات سے ہمیشہ کنارہ کش اور سیاسی تحریکات سے متنفر رہے۔ یہ بات غالباً آپ کو بھی اچھی نہیں معلوم ہوئی کہ علماء کرام کی اس مقدس جماعت کو ایک سیاسی انقلابی تحریک کا علمبردار قرار دیں مگر روایات کا جو ذخیرہ آپ کے سامنے جمع ہوگیا تھا اس کو نظر انداز کرنا بھی آپ کے لئے ممکن نہیں تھا۔ پس آپ نے ایک نئی توجیہہ فرمائی کہ ان حضرات نے مظلوم قاضی عنایت علی صاحب کی اعانت وحمایت کے لئے شرکت فرمائی تھی (ملاحظہ ہو سوانح قاسمی جلد دوم ص۱۱۸ : ص۱۱۹ و ص۱۲۲)

بیشک اغاثۂ ملہوف - اعانۂ مظلوم اور ستم رسیدہ بھائی کی امداد بھی ایک مقدس فرض ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کو صرف قاضی عنایت علی اور اُن کے شہید بھائی کے واقعہ نے متاثر نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس قسم کے ہزاروں واقعات جو انگریز کی آمد کے بعد سے اس وقت تک سرزمین ہند میں پیش آچکے تھے ان سب نے ان بزرگوں کو متاثر کر کے اس بغاوت پر آمادہ کیا تھا جو سراسر اعلاء کلمۃ اللہ اور اعانت حق تھا۔ ان حضرات کی مقدس تاریخ پر اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہوسکتا کہ اس جہاد عظیم کا محرک صرف قاضی عنایت علی صاحب کے جزدی واقعہ کو قرار دیکر قاضی عنایت علی صاحب کو اصل اور ان بزرگوں کو تابع ظاہر کیا جائے۔ اس بارہ میں ان بزرگوں کی رائے اور تحقیق معتبر ہوگی جنھوں نے اس زمانہ کی تاریخ پر محققانہ نظر ڈالی۔ تحریکات اور ان کے اسباب کو سمجھا اور اُن کے تقاضوں کو پورا کرنے میں پُوری پُوری زندگیاں صرف کردیں۔ مثلاً مفکر مشرق مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاری رحمۃ اللہ علیہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہ العزیز۔

حضرت مولانا سندھی رحمۃ اللہ کی تحریر کے چند اقتباسات اس سلسلہ میں پہلے (باقی ص۲۹۸ پر)

جنرل بخت خاں نے صرف فوجوں کو ہی منظم نہیں کیا۔ بلکہ ضبط و نظم کو اس معیار پر لانے کی کوشش کی جو اسلامی تعلیم کے لحاظ سے ضروری ہے اور ایسے مواقع پر جو شرعی مطالبات ہو سکتے ہیں ان کو پورا کرنے کے لئے جامع مسجد دہلی میں علماء کرام کا اجتماع کیا ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ ہمارے یہاں کے (ضلع مظفر نگر سہارن پور یعنی علاقہ تھانہ بھون کے) علماء ۱۸۵۷ء کی تحریک کے سلسلہ میں دہلی تشریف لے گئے تھے وہاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۷) پیش کئے جا چکے ہیں یہاں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ کی تحریر مبارک کی چند سطریں ملاحظہ فرمالیجئے۔ نقش حیات میں حضرت شیخ الاسلام نے عنوان قائم کیا ہے " ہمارے اکابر کا ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لینا" اس عنوان کے تحت میں تحریر فرماتے ہیں :۔ ہمارے تمام اکابر (علماء دیوبند و سہارنپور و مظفر نگر) حضرت شاہ عبد العزیز صاحب اور اُن کے تلامیذ کے شاگرد اور خوشہ چین رہے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ حضرت شاہ صاحب اور اُن کے خاندان کے مسلک اور حکم کے خلاف چلیں چنانچہ جب سید صاحب کی تحریک جہاد شروع ہوئی تو حضرت حاجی عبد الرحیم صاحب شہید ولایتی (دادا پیر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی) اور حضرت شاہ نصیر الدین صاحب دہلوی سابق پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور بہت سے حضرات (اطراف سہارنپور و مظفر نگر وغیرہ کے) شریک تحریک ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ سرحد میں جاکر شہید ہوئے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے اعلیٰ جذبات حریت و جہاد اور ان کی تعلیمات روحانیہ سے ان حضرات کو انتہائی شغف اور حسن اعتقاد رہتا تھا سرحد کی ناکامی اور آپس کی غداریوں سے ان حضرات کے قلب میں انتہائی قلق اور اضطراب ہمیشہ محسوس ہوتا رہتا تھا۔ جب انقلاب ۱۸۵۷ء کی تحریک اطراف و جوانب ہند خصوصاً اطراف دہلی میں چلنی شروع ہوئی تو ان حضرات کے جوش حریت میں نئی حرکت پیدا ہوئی۔ ان بزرگوں نے محسوس کیا کہ اس انقلاب میں حصہ لینا فرض اور لازم ہے۔ انگریزوں کے افعال ماضیہ اور احوال حاضرہ پر بخوبی مطلع تھے۔ اس تمام جماعت میں حضرت حافظ ضامن صاحب قدس اللہ سرالعزیز زیادہ پیش پیش تھے۔ الخ نقش حیات جلد دوم ص۱۴ و ص۴۲)

جامع مسجد میں بادشاہ سے ملاقات کی اور اس سے عہد و معاہدے کئے ہیں اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں مل سکا۔ البتہ جو فتوائے جامع مسجد کے اس اجتماع میں مرتب کیا گیا تھا اس پر ایک دستخط 'رحمت اللہ' کے بھی ہیں بظاہر یہ "رحمت اللہ" وہی مولانا رحمت اللہ ہیں جو پہلے تحقیق حال کے لئے آئے تھے اور اب اپنی جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے اس اجتماع میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے اور غور و فکر کے بعد فتوے پر دستخط ثبت فرمائے تھے۔

اس وقت کے حالات کے بموجب "دہلی" میں ایک صالح نظام قائم ہوگیا۔ علمار کرام اور رہنمایان ملت نے غور و خوض کے بعد جہاد کا فتویٰ صادر کر دیا۔ تو اب تھانہ بھون والی جماعت کے لئے بھی راستہ صاف ہوگیا اور یہ ممکن ہوگیا کہ اس علاقہ کے امیر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اقدام کا فیصلہ صادر کردیں۔ تاہم مکمل احتیاط کے پیش نظر یہ مناسب سمجھا گیا کہ مجلس شوریٰ کا اجلاس کرکے ان تازہ حالات پر ایک دفعہ مزید غور کر لیا جائے۔ ارشاد خداوندی "وشاورھم فی الامر" کا مطالبہ بھی یہی تھا۔ اور اس طرح جملہ اراکین اور اعضاء کی ہم آہنگی اور خوشدلانہ حمایت بھی پوری سرگرمی کے ساتھ میسر آسکتی تھی۔

چنانچہ ایک اجتماع کیا گیا۔ اجتماع کا ایجنڈا مسئلہ اقدام تھا۔ بعنوان دیگر "اعلان جہاد"

اور موضوع بحث بعینہ وہ تھا جس پر دہلی کے اجتماع میں بحث ہوئی تھی۔ یعنی بحالت موجودہ ہم میں انگریزی منظم فوجوں سے مقابلہ کی طاقت ہے یا نہیں اور اس بناد پر اقدام کے متعلق شرعی فیصلہ کیا ہے۔

اجلاس شوریٰ میں تمام حاضر ارکان نے اقدام کا فیصلہ کیا یعنی دہلی کے فتویٰ جہاد کی تصدیق و توثیق کی۔ صرف ایک بزرگ مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کی رائے مخالف رہی۔ اس اجتماع کی ایک دلچسپ بحث ملاحظہ ہو۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے حضرت شیخ محمد صاحب سے خطاب کرتے ہوئے نہایت ادب[1] کے ساتھ عرض کیا۔

"حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے"؟

حضرت مولانا شیخ محمد صاحب محدث :- اس لئے کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب :- کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوۂ بدر میں تھا[2]

حضرت مولانا شیخ محمد صاحب :- اگر آپ کی تمام حجتیں اور باتیں مان لی جائیں تو سب سے بڑی شرط جہاد میں نصب امام کی ہے۔ امام کہاں ہے کہ اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے۔[3]

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رح :- نصب امام میں کیا دیر لگتی ہے، مرشد برحق حضرت حاجی صاحب موجود ہیں انھیں کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی جائے۔[4]

---

[1] اس لئے کہ وہ چچا پیر تھے کیونکہ حضرت شیخ محمد صاحب محدث اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دونوں قطب العالم حضرت میانجی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ [2] نقش حیات صفحہ ۲۷
[3] سوانح قاسمی جلد ۲ صفحہ ۱۲۳ [4] ایضاً صفحہ ۱۲۵

حضرت حافظ ضامن صاحب :۔ مولانا بس سمجھ میں آگیا[1]

پھر سب نے حضرت حاجی صاحب کے دست حق پرست پر بیعت جہاد کی[2]

یعنی پہلے تشکیل حکومت کے لئے بیعت ہوئی تھی اب یہ بیعت جان و مال کی قربانی کے لئے۔

اب سوال یہ تھا کہ اقدام کس طرف ہو۔ ظاہر ہے دہلی کا مرکز ہی قبلہ نما بن سکتا تھا

چنانچہ۔ "سرفروشان دین و وطن سر ہتھیلی پر لیکر ایک منظم طاقت سے ٹکرانے

کے لئے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور تھانہ بھون سے شاملی کی

طرف مارچ شروع کر دیا جس کا نصب العین دہلی تھا[3]

شاملی کی طرف اقدام کا ایک دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ مہار سنگھ رئیس شاملی نے

جو علم آزادی بلند کیا تھا اس کو کمک کی شدید ضرورت تھی[4]

---

[1] نقش حیات جلد دوم ص۴۳ [2] ص۱۲۶ سوانح قاسمی جلد دوم [3] ایضاً ص۱۲۹

[4] انگریز مصنف "میلی سن" اپنی تاریخ کی جلد ششم ص۱۲۴ پر تحریر کرتا ہے۔

شاملی میں ایک ہندو زمیندار مہار سنگھ۔ نے ہنگامہ برپا کیا تھا اور خط و کتابت کرکے دربار دہلی سے تعلقات قائم کر لئے تھے انگریز اس کو دبا نہ سکتے تھے البتہ شاملی کو کھلم کھلا بغاوت سے محفوظ رکھا۔ شاملی جو آجکل ضلع مظفر نگر کی ایک سب ڈویژن (تحصیل) کا ہیڈ کوارٹر ہے اس زمانہ میں سہارنپور سے متعلق تھا۔ حاکم سہارنپور اسپنکی (Spankie) صاحب نے اس کی پوزیشن مضبوط کرنے کے لئے گورکھا فوج کا ایک دستہ بھیج دیا۔ ایڈورڈز (اس مقام کے فوجی کمانڈر) نے گورکھوں کی مدد سے شاملی میں قبضہ مکمل کیا۔ ایک وفادار مسلمان "ابراہیم خاں" کے ماتحت تھوڑی سی فوج شاملی چھوڑی اور ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو خود آگے روانہ ہو گیا۔ قاضی عنایت علی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر شاملی پر حملہ بول دیا تقریباً ایک سو تیرہ فوجیوں کے نقصان کے بعد "ابراہیم خاں" ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ ایڈورڈز (باقی ص۳۰۲ پر)

اب یہ تفصیل[1] کہ معرکہ کہاں کہاں اور کس کس طرح ہوا اور اس میں کس کس نے کتنا کتنا حصہ لیا۔ موضوع کتاب سے خارج ہے۔ اس سلسلہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ایک بیان پر کفایت کی جاتی ہے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحبؒ امیر جہاد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی زیارت سے مشرف اور فیضیاب ہوئے ہیں[2]۔ مکہ معظمہ میں کچھ عرصہ ان کی خدمت میں بھی رہے ہیں۔ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے (جو اس معرکہ کے رکن رکین تھے) خلیفہ مجاز ہیں۔ ایک راز داں خادم کی حیثیت سے عرصہ تک ان کی خدمت میں باریاب رہے ہیں۔ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز (جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ کے نہایت محبوب و مقرب شاگرد اور اپنی مجاہدانہ فطرت کی وجہ سے جہادی کاروبار کے امین و معتمد اور واقف اسرار تھے)

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کو جس درجہ آپ سے تقرب رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ مولانا حسین احمد صاحب نے حضرت شیخ الہند کی آغوش شفقت[3] سے

بقیہ ص۳۰۱ (حاشیہ) واپس ہوا تو شاملی کی حالت دیکھ کر کہ جہاں ۱۱۳ فوجی کام آچکے تھے بہت غصہ آیا مگر اس وقت مظفر نگر کی حالت بہت خراب تھی وہاں چلا گیا پھر کپتان اسمتھ اور لفٹنٹ کیول ریس کی زیر کمان سکھوں اور گورکھوں کی فوج تھانہ بھون بھیجی۔ مجاہدین نے اسے مار بھگایا تو دوبارہ کرنل "ڈنلاپ" کی سرکردگی میں پوری فوج بھیجی گئی جس نے پہلے تھانہ بھون پھر شاملی پر قبضہ کرکے ان کو تباہ و برباد کیا (۱۸۵۷ء کے مجاہد ص۱۶۱) [1] سوانح قاسمی جلد دوم میں کسی قدر تفصیل دی گئی ہے ضرورت ہو تو مراجعت فرمائی جائے۔ [2] ملاحظہ ہو نقش حیات جلد اول [3] یعنی حضرت شیخ الہندؒ سے

میں تربیت پائی اور پھر ایک فداکار رفیق کی حیثیت سے سفر و حضر انہیں کا یہ کہ قید و بند میں بھی عرصہ دراز تک ہمدم و ہمراز رہے ۔

لہذا ۱۸۵۷ء کے اس معرکے کے متعلق حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا بیان چشم دید شہادت کی حیثیت رکھتا ہے ۔

مشاورتی اجتماع میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت شیخ محمد صاحب کے درمیان جو گفتگو ہوئی جس کی تفصیل پہلے دی جا چکی ہے اس کو نقل کرنے کے بعد شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز تحریر فرماتے ہیں

پھر جہاد کی تیاری شروع ہو گئی اور اعلان کر دیا گیا ۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو امام[۵۱] مقرر کیا گیا ۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو قاضی بنایا گیا اور مولانا محمد منیر صاحب[۵۲] نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی میمنہ اور میسرہ (داہنے بازو اور بائیں بازو) کے افسر مقرر کیے گئے ۔ چونکہ اطراف و جوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے تقویٰ ، علم (تصوف اور تشرع) کا بہت زیادہ شہرہ تھا ۔ ان حضرات کے اخلاص و للہیت

---

۵۱ امام یعنی امیر یا صدر ۔ ۵۲ مولانا محمد طیب صاحب نے مولانا منصور انصاری صاحب کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ مولانا محمد منیر صاحب کو حضرت نانوتویؒ کی حفاظت کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی اور حضرت حاجی صاحب نے مولانا محمد منیر صاحب کو خطاب کرتے ہوئے خاص طور پر فرمایا تھا کہ مولانا محمد قاسم بالکل آزاد اور جری ہیں ۔ ہر صف میں بے محابا گھس جاتے ہیں آپ کسی وقت ان کا ساتھ نہ چھوڑیں ۔ اگر یہ صحیح ہے تو مولانا محمد منیر صاحب حضرت نانوتوی کے اے ڈی سی ہوئے البتہ یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ معرکہ کے وقت کے لیے مولانا محمد منیر کو میسرہ کی کمان سپرد کی گئی اور عام حالات میں مولانا محمد قاسم صاحب کے ساتھ رہنے اور ان کی نگرانی کی ہدایت کی گئی کیونکہ مولانا محمد منیر صاحب حضرت نانوتوی کے قریبی عزیز اور ان کے فدائی تھے اور مولانا نانوتوی کے بغیر خود ان کو بھی قرار نہیں آتا تھا ...... (سوانح قاسمی ج ۲ ص ۱۳۱ ، ص ۱۳۷ وغیرہ)

سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے۔ ہمیشہ سے اُن کی دین داری اور خدا ترسی دیکھتے رہے تھے اس لئے ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ علاوہ مریدین اور تلامذہ کے عام مسلمان بھی بے حد معتقد تھے اس لئے بہت تھوڑی مدت میں جوق جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا۔ اس وقت تک ہتھیاروں پر پابندی نہیں تھی۔ عموماً لوگوں کے پاس ہتھیار تھے جس کو رکھنا اور سیکھنا مسلمان ضروری سمجھتے تھے۔ مگر ہتھیار پُرانی قسم کے تھے۔ بندوقیں توڑے دار تھیں کارتوسی رائفلیں نہ تھیں۔ یہ صرف انگریزی فوجوں کے پاس تھیں۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوگئے اور تھانہ بھون اور اطراف میں حکومت قائم کرلی گئی اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیئے گئے۔

خبر آئی کہ توپخانہ سہارنپور سے شاملی کو بھیجا گیا ہے۔ ایک پلٹن لارہی ہے رات کو یہاں سے گذرے گی۔ اس خبر سے لوگوں میں تشویش ہوئی کیونکہ جو ہتھیاران مجاہدین کے پاس تھے وہ تلوار، توڑے والی بندوقیں اور برچھے وغیرہ تھے مگر توپ کسی کے پاس نہ تھی۔ توپخانہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا۔ حضرت گنگوہی نے فرمایا فکر مت کرو۔

سڑک ایک باغ کے کنارے گذرتی تھی۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو تیس یا چالیس مجاہدین پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے افسر مقرر کر دیا تھا آپ اپنے ماتحتوں کو لیکر باغ میں چھپ گئے اور سب کو حکم کیا کہ پہلے سے تیار رہو جب میں حکم کروں سب ایک دم فیر کرنا۔ چنانچہ جب پلٹن معہ توپخانہ باغ کے سامنے پہونچی تو سب نے یک دم فیر کر دیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی یہاں چھپے ہوئے ہیں توپخانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی نے توپخانہ کھینچکر حضرت حاجی صاحب کی مسجد کے سامنے لاکر ڈال دیا۔ اس سے لوگوں میں ان حضرات کی فراست۔ ذکاوت

فنون حربیہ کی مہارت۔ معاملہ فہمی اور ہر قسم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔

شاملی اس زمانہ میں مرکزی مقام تھا ضلع سہارن پور سے متعلق تھا وہاں تحصیل بھی تھی۔ کچھ فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی۔ قرار پایا[1] کہ اس پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا[2] جو طاقت پولیس اور فوج کی وہاں تھی وہ

---

[1] اس قرارداد کا پس منظر چند صفحہ پہلے گذر چکا ہے۔

[2] مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کر کے اس کی تفصیل یہ بیان کی ہے۔ انگریزی فوج جو شاملی میں موجود تھی وہ مجاہدین کے ہجوم کو دیکھکر تحصیل کی چہار دیواری میں محصور ہو گئی اور اندر سے فائر شروع کر دیئے مجاہدین کا ہجوم باہر میدان میں تھا جہاں کوئی آڑ نہیں تھی اس طرح مجاہدین کا جانی نقصان کافی ہوا۔ اتفاق سے تحصیل کے قریب ایک چھپر تھا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی نظر چھپر پر پڑی چھپر اٹھوا کر تحصیل کے صدر دروازہ پر ڈالا گیا اور اس میں آگ لگا دی گئی جس سے پھاٹک جل گیا اور اندر گھسنے کا راستہ کھل گیا۔ اب فوج میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی۔ اس کے کچھ سپاہی کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ کچھ مقتول ہوئے اور باقی گرفتار ہو گئے اور شاملی پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا (سوانح قاسمی جلد دوم)

[3] سر سید احمد خاں صاحب مرحوم نے وفادار مسلمانان ہند (لائل محمڈنس آف انڈیا) میں محمد ابراہیم خاں کا نام بھی شمار کرایا ہے جو اس ہنگامہ کے وقت شاملی کے تحصیلدار تھے اور نہ صرف یہ کہ خود مقابلہ کیا بلکہ حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اپنے بھائی اکبر خاں اور خاندان کے دوسرے افراد کو بھی اپنے وطن رام پور منہیاران ضلع سہارن پور سے بلا لیا جن کی تعداد پچاس تھی جب مقابلہ ہوا تو اس وقت تحصیل شاملی میں تقریباً دس سواء تہائی رسالہ کے اٹھائیس سپاہی پیل خانہ کے اور پچاس سے زائد سپاہی متعینہ تھانہ تحصیل اور پچاس سے زائد آدمی خود تحصیلدار کے خاندان کے تھے سرسید صاحب فرماتے ہیں یہ افسر (تحصیلدار) معہ اکثر آدمیوں اپنے خاندان کے کام آیا۔ اور شرط نمک حلالی کو پورا کر دیا۔ لائل محمڈنس آف انڈیا بحوالہ العلم کراچی بابتہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۸ء

مغلوب ہو گئی۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اسی ہنگامہ میں شہید ہو گئے[1]۔ حضرت حافظ صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ اُن کی شہادت سے پہلے روزانہ خبر آتی تھی کہ آج فلاں مقام انگریزوں سے چھین لیا گیا۔ آج فلاں مقام پر ہندوستانیوں کا قبضہ ہوا۔ مگر حافظ صاحب کی شہادت کے بعد پہلے پہل خبر آئی کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور یہی حال ہر جگہ کی خبروں کا تھا۔ اس سے پہلے گورے فوجی چھپتے پھرتے تھے۔ ایک ایک سپاہی گوروں کی جماعتوں کو بھگائے پھرتا تھا۔ مگر بعد میں معاملہ برعکس ہو گیا۔ پہلے کسی کھیت میں گورا چھپا ہوا تھا تو کاشتکار عورت نے اُسے کھرپے سے قتل کر ڈالا۔ مگر بعد میں معاملات اُلٹے ہو گئے۔

---

[1] اس معرکہ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے متعلق آپ کے اُستاذ زادہ، ہم سبق کے ساتھی اور نہایت مخلص عزیز مولانا محمد یعقوب صاحب ابن حضرت مولانا مملوک العلی صاحبؒ کی عینی شہادت ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب اپنی لکھی ہوئی سوانح عمری میں تحریر فرماتے ہیں
چند بار بندوقوں سے نوبت مقابلہ کی آ گئی۔ اللہ رے مولوی صاحب ایسے ثابت قدم۔ تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں کا مقابلہ۔ ایک بار گولی چل رہی تھی۔ یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے جس نے دیکھا جانا گولی لگی۔ ایک بھائی دوڑے۔ پوچھا کیا ہوا۔ فرمایا کہ سر میں گولی لگی۔ عمامہ اُتار کر دیکھا تو کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔ انہیں دنوں ایک نے منہ در منہ بندوق ماری جس کے سینے سے ایک مونچھ اور کچھ داڑھی جل گئی اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا۔ خدا جانے گولی کہاں گئی۔ اور اگر گولی نہ تھی تو اتنے پاس سے سنجھ بھی بس تھا۔ مگر حفاظتِ الٰہی بر سر تھی کچھ اثر نہ ہوا۔ ص ۱۱۳ سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب از مولانا محمد یعقوبؒ

حضرت شیخ الہند[1] رحمۃ اللہ فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام معاملہ جوش و خروش جنگ و جدال کا حضرت حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے لئے کیا گیا تھا[2] بہر حال حافظ صاحب کی شہادت اور دہلی کے سقوط کی خبر سے لوگوں کی ہمتیں بالکل پست ہو گئیں اور سب اپنے اپنے اوطان کو واپس ہو گئے۔

---

[1] شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز جس طرح ایک مرد مجاہد، میدان سیاست کے شاہسوار تھے۔ ایسے ہی حلقہ طریقت کے مرشد کامل اور ارباب باطن کے امام و مقتدا بھی تھے، آپ کے اس ارشاد میں اسی باطنی ذوق کی شان نمایاں ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں ارباب ظاہر کو سپر ڈالنی پڑتی ہے اور ماننا پڑتا ہے

غیب را ابرے و بادے دیگر است

آفتابے ماہتابے دیگر است

اس سے عجیب واقعہ وہ ہے جسکو مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی صدر الصدور سرکار آصفیہ قدس اللہ سرہٗ العزیز سے نقل کیا ہے۔ نواب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ انگریزوں کے مقابلہ میں جو لوگ لڑ رہے تھے ان میں شمالی ہند کے مشہور شیخ طریقت حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی بھی تھے۔ اچانک ایک روز مولانا کو دیکھا کہ خود بھاگے جا رہے ہیں اور باغیوں کے افسر کا نام لیکر کہہ رہے ہیں کہ "لڑنے سے کیا فائدہ خضر کو تو میں انگریزوں کی صف میں پا رہا ہوں۔" نواب صاحب ایک دوسرا واقعہ بھی بیان فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رح اس ہنگامہ کے بعد ایک ویران مسجد میں جا کر مقیم ہو گئے۔ ایک روز ایک انگریزی فوج ادھر سے گذر رہی تھی مولانا مسجد میں بیٹھے ہوئے اس فوج کو دیکھ رہے تھے کہ یکدفعۃً اٹھے مسجد کی سیڑھیوں سے اتر کر فوج کے پاس گئے اور ایک شکستہ حال شخص جو بظاہر سائیس معلوم ہوتا تھا اس سے کچھ باتیں کیں اور واپس آ گئے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ یہ کون صاحب تھے جن سے آپ نے باتیں کیں تو فرمایا خضر تھے (سوانح قاسمی ص ۱۰۳ حاشیہ)

[2] سرسید احمد صاحب مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ یہ قتل و خونریزی شاملی میں ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہوئی جو ...... دن فتح دہلی کا تھا۔ ([illegible])

ناکامی تحریک کے بعد

تھانہ بھون کی تباہی

۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ گرفتار ہوئے۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہوا تو پھر فتحمند فوجوں نے اطراف دہلی پر بھی قبضہ شروع کر دیا۔ چند روز بعد ہی تھانہ بھون کا نمبر آگیا[۵۱]۔ ایک شب کی تاریکی میں انگریزی فوج کی آمد کی خبر نے سنسنی پھیلا دی۔ اب شکست تو یقینی تھی۔ مگر بہادری یہ ہے کہ اس یقین کے باوجود مقابلہ کی ہمت کی گئی۔ قصبہ کے گرد فصیل تھی اس کے دروازے بند کر دیئے گئے اور وہی ایک توپ جو آغاز جنگ میں حضرت گنگوہی نے انگریزوں سے چھینی تھی اس کو ایک بلند مقام پر نصب کر دیا گیا اور عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اس توپ کا پہلا فائر ایسا کامیاب رہا کہ اس کا گولہ ٹھیک غنیم کی توپ کے دہانہ پر جا کر پڑا۔ انگریزی فوج کی یہ توپ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ یہاں ایک توپ تھی اور غنیم کے پاس بہت سی۔ یہاں توڑے دار بندوقیں تھیں اور وہ بھی بہت کم۔ اور دوسری طرف نئی قسم کی رائفلوں کی بہتات تھی۔ دو گھنٹے سے زیادہ مقابلہ جاری نہ رہ سکا۔ صبح صادق کے وقت مشرق کی جانب سے تھانہ

---

[۵۱] میلی سن سے پہلے حاشیہ میں نقل کیا جا چکا ہے کہ پہلی بار کپتان اسمتھ اور لفٹنٹ کیولر اس کی زیر کمان سکھوں اور گورکھوں کی فوج بھیجی گئی تھی مجاہدین تھانہ بھون نے اس کو مار کر بھگا دیا تھا اس کے بعد جنرل ڈنلاپ ایک بڑی بھاری فوج اور توپ خانہ کے ساتھ تھانہ بھون پہنچا۔ مجاہدین کو شکست دیکر تھانہ بھون کو تباہ کر دیا۔ یہاں اسی فوج کی تباہ کاری کا تذکرہ ہے۔

بھون پر گولہ باری شروع ہوئی تھی۔
فصیل توڑ دی گئی۔ دروازے اُڑا دیئے گئے۔ مٹی کا تیل ڈال کر مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ جو ملا اس کو تہ تیغ کیا گیا۔ قیمتی مال و اسباب سے فوج نے اپنی جیبیں بھریں جو باقی تھا وہ آس پاس کے گاؤں والوں نے لوٹ لیا۔ تھانہ بھون ایک اُجڑا دیار بن گیا۔

یہ چاروں بزرگ جن کا تذکرہ شروع سے چل رہا ہے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے (کسی قدر تفصیل آگے آئے گی۔ قاضی عنایت علی صاحب بہت سے ساتھیوں کو لے کر نواب محمود علی خاں صاحب کے پاس نجیب آباد پہونچ گئے اور سر سید صاحب کی روایت ہے کہ وہاں نواب صاحب کو کافی کمک پہونچائی اور جب کامیابی نہ ہوئی تو ایسے غائب ہوئے کہ پھر کبھی پتہ ہی نہ چل سکا کہ کہاں گئے۔ رحمہ اللہ۔ مزید تفصیل صفحہ ۵۴۴ پر ضمیمہ میں ملاحظہ فرمایئے۔

لہ سرکار کو پتہ بیشک نہیں چلا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نجیب آباد سے نکل کر دیوبند پہونچے چند روز یہاں قیام کرکے بھوپال تشریف لے گئے اور جب وہاں اپنے تعارف کا خطرہ ہوا تو جودھپور پھر الور تشریف لے گئے اور ریاست الور کے ایک قصبہ "تجارہ" کے قریب ایک گاؤں میں قیام کیا۔ پھر یہیں وفات پائی (از قاضی احسان اللہ صاحب تھانوی) مشہور و معروف شاعر انقلاب علامہ انور صابری سینہ بسینہ سند کے ذریعہ یہ روایت بھی بیان فرماتے ہیں کہ قیام دیوبند کے زمانہ میں خاکسار مولف (محمد میاں) کے کسی بزرگ کی رفاقت میں بھوپال تشریف لے گئے۔ مگر کسی اور ذریعہ سے اس کی تائید نہیں ہوئی۔

وارنٹ گرفتاری۔ پولیس کی ناکام دوڑ دھوپ
عزم و ہمت اور حوصلۂ بلند کی فتح

دنیا کے وہ انسان جن کو تاریخ کا ہیرو مانا جاتا ہے جس طرح اُن کے کارنامے حیرت انگیز ہوتے ہیں، اسی طرح بسا اوقات اُن کی حفاظت و عصمت کے وہ وسائل اور ذرائع بھی حیرت انگیز و تعجب خیز ہوتے ہیں جو قدرت اُن کے لئے وقت پر مہیا کر دیتی ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ۔ حضرت اسمٰعیل۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السّلام کے مرتبے تو بہت بلند ہیں۔ اکبر۔ نورجہاں۔ نپولین بوناپارٹ جیسے ناموروں کی سوانح حیات بھی ہمیں بہت سے ایسے حیرت انگیز واقعات سے آگاہ کرتی ہے کہ عقل نارسا جب اُن کی کوئی معقول وجہ پیش نہیں کر سکتی تو تسکین کے لئے اُن کو کرشمہ قدرت قرار دیتی ہے یا تاریخ کا معجزہ بتانے لگتی ہے۔

علاقہ تھانہ بھون کے یہ رہنما جنھوں نے انگریزوں کی زبان میں بغاوت اور غدر میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ تھانہ بھون میں شیر علی کے باغ سے حملہ کر کے فوجی دستہ کو شکست دی، اُس کے افسر قتل کئے۔ توپ خانہ چھینا۔ پھر شاملی کی تحصیل پر حملہ کر کے فوج کو شکست دی۔ سرکاری عمارت تباہ کی۔ سرکاری سامان ضبط کیا سپاہیوں کو مارا۔ اپنی آزاد حکومت قائم کی۔ باغی بادشاہ سے وفاداری کا اظہار کیا وغیرہ وغیرہ غرض کہ ایسا جرم تھا جو ان سرمستان حریت نے نہیں کیا تھا اور عبور دریائے شور سے کم

توپ دم کئے جانے یا ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا ڈالنے تک کی کونسی سزا تھی کہ اس دور بے آئین میں یہ اُس کے مستحق نہیں تھے۔ لیکن ان تمام حرکتوں کے باوجود ہر قسم کی سزا سے بچ جانا۔ ہماری زبان میں اس کے لئے کرشمۂ قدرت کے علاوہ اور کوئی لفظ موزون نہیں ہے۔

درست ہے۔ انگریز کا یہ احسان عظیم فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت نے عام معافی کا اعلان بھی کردیا تھا۔ مگر اوّل تو یہ اعلان یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہوا جبکہ سقوط دہلی کی تاریخ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء سے لیکر ساڑھے تیرہ ماہ تک بقول مرحوم بادشاہ "بہادر شاہ ظفر" عام پالیسی یہ رہی تھی کہ

"جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے"

اور اس طرح لاکھوں ہندوستانی تہ تیغ اور توپ دم کئے جاچکے تھے۔ علاوہ ازیں اس اعلان سے وہ لوگ مستثنیٰ تھے۔

(۱) جو انگریزی رعایا کے قتل میں بذات خود شریک ہوئے۔

(۲) جنھوں نے جان بوجھکر قاتلوں کو پناہ دی۔

(۳) جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے۔

(۴) جنھوں نے بغاوت کی ترغیب دی

لہ صرف امام ربّانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ گرفتار ضرور کئے گئے۔ چھ مہینے حوالات میں بھی رہے مگر سزا اُن کو بھی نہیں ہوئی۔ مقدمہ میں صاف بری ہوگئے۔ تفصیل آگے آئے گی۔ انشاءاللہ۔

ان کے متعلق ملکہ وکٹوریہ کے اس معافی نامہ میں یہ کہا گیا تھا

"ان کی نسبت صرف وعدہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی جاں بخشی ہوگی لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں ان سب احوال پر جن کے اعتبار سے وے اپنی طاعت سے پھر گئے کامل غور کیا جائے گا"[۵۱]

اسی بنا پر اس نمائشی معافی نامہ کے بعد بھی عرصہ دراز تک دار و گیر کا سلسلہ جاری رہا[۵۲] انتہا یہ کہ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی گرفتاری اس اعلان سے تقریباً سات ماہ بعد عمل میں آئی یعنی جولائی ۱۸۵۹ء میں۔

تحفظ کا حقیقی سبب دعا، وظیفہ، تعویذ اور عمل کی تاثیر سے انکار نہیں مگر ہمارے خیال میں سب سے موثر وظیفہ عزم و ہمت اور بلند نصب العین ہے۔ جو لامحالہ نصرت اور امداد خداوندی کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے (ارشاد ربانی ہے)

ولینصرن اللہ من ینصرہ

---

۵۱ ترجمہ معافی نامہ انگریزی جو اس زمانہ میں چھپ کر شائع ہوا تھا

۵۲ حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی تو گرفتار بھی اس معافی نامہ عام کے بعد ۱۸۵۹ء میں ہوئے تھے (ملاحظہ ہو الثورۃ الہندیہ یا باغی ہندوستان) اور جبکہ ۱۸۵۷ء کی تحریک کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں ۱۸۵۸ء کے اکتوبر تک چلتا رہا۔ تانتیا ٹوپی ۱۸۵۸ء کے آخر تک مقابلہ کرتے رہے تو انگریز بہادر کو یہ رحمدلی کہاں نصیب ہوئی تھی کہ وہ بلا استثناء ہر ایک کو معاف کر دیتا۔ یہ حوصلہ ایشیا کے سیاہ فاموں ہی کو نصیب ہوا ہے کہ

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

یورپ کے سفید فام سنگدل تو سزا و انتقام میں بھی "سود در سود" کے عادی ہیں (معاذ اللہ)

ان بزرگوں کو اللہ تعالیٰ نے اس وظیفہ کی توفیق عطا فرمائی جو نہ صرف ان بزرگوں کے لئے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پوری ملت کے لئے نجات دہندہ ثابت ہوئی ظاہری نظر میں یہ جماعت منتشر ہوگئی۔ اس کے کچھ افراد ہجرت کرکے مکہ معظمہ چلے گئے اور کچھ نے ہندوستان ہی میں رہ کر زندگی گذاری مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ انتشار بھی ایک خاص نظم کے ماتحت خاص نصب العین کے مطابق تھا۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر ہم اس کو قدرت کی "تدبیر محکم" قرار دیں۔

مکروا ومکراللہ واللہ خیرالماکرین

وہ بھی تدبیر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی تدبیر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔

کسی قدر تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے حوالہ سے پہلے گذر چکا ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے تقریباً ۱۰ سال پہلے حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ نے ہندوستانی تحریک کا مرکز مکہ معظمہ منتقل کر دیا تھا اور دہلی میں ایک نمائندہ بورڈ بنایا[1] تھا جس کی صدارت پہلے مولانا مملوک العلی صاحب کے سپرد تھی اور پھر یہی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب جو ۱۸۵۷ء میں علاقہ تھانہ بھون کے امیر قرار دیئے گئے اس بورڈ کے صدر بنا دیئے گئے۔

تحریک ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے اسی مرکز کا رخ فرمایا۔ اور غیر معمولی مشکلات[2] اور پریشانیاں برداشت کرکے مکہ معظمہ میں بیٹھ کر

---

[1] حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں:- مولانا محمد اسحاق اور ان کے بعد امیر (باقی ص ۳۱۶ پر)

آخر تک ہندوستانی تحریک کی قیادت فرماتے رہے۔

حضرت مولانا عبدالغنی صاحب محدث دہلوی جو دہلی کے حلقۂ درس میں حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب کے جانشین تھے اور مولانا رحمت اللہ صاحب جن کا ذکر خیر شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب کی تحریر کے سلسلہ میں پہلے گذر چکا ہے۔ یہ دونوں بزرگ بھی مکہ معظمہ ہی تشریف لے گئے اور وہاں جو عظیم الشان خدمات انجام دیں اُن کے نشانات اور باقیات صالحات آج تک مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں موجود ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی حضرت مولانا محمد منیر صاحب اور اُن کے برادر محترم مولانا محمد مظہر صاحب کو جب ہندوستان

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۳: امداد اللہ کو مکہ معظمہ میں بیٹھ کر اپنی تحریک جاری رکھنے میں جس قدر مشکلات پیش آئی ہیں اُن پر غالب آنا اُن کے حزم اور حلم کی روشن دلیل ہے اور ہم اسے امام عبدالعزیز کی تربیت سلسلہ کی برکات میں شمار کرتے ہیں۔ اگر یہ حضرات امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ نہ ہوتے تو کبھی اپنا کام جاری نہ رکھ سکتے تھے اگر ہم مکہ معظمہ میں اس قسم کی زندگی کا خود تجربہ نہ کرتے اور حضرت مولانا شیخ الہند رح کے واقعات ہمارے سامنے نہ ہوتے تو ہم ان اکابر کی محنت کی قدر نہ کرسکتے تھے

"دل من داند و من دانم و داند دل من" سیاسی تحریک صفحہ ۲۰۳ و صفحہ ۲۰۴

یہ مشکلات اور پریشانیاں خود ان دوستوں کی طرف سے پیش آئی رہیں جو معتقدانہ حاضر باشی کے ساتھ اپنی سادگی یا ہوشمندی سے جاسوسی کی خدمت بھی انجام دیتے رہے اس کی تفصیل طویل بھی ہے اور تلخ بھی اور اسی بناء پر ان حضرات کو ضرورت پیش آئی کہ سیاسی تربیت کے لئے "ادارہ حربیہ" کے بجائے "دارالعلوم" کی بنیاد ڈالیں۔

چھوڑا گیا اور ابھی شہیدوں کا خون خشک ہونے[1] نہیں پایا تھا کہ ان بزرگوں نے تحریک کی نشاۃ ثانیہ کے لئے دارالعلوم دیوبند جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد۔ مظاہر العلوم سہارنپور وغیرہ کے حلقے قائم کردیئے جنھوں نے سیاسیات سے علیحدگی کا اعلان کیا۔ مگر دین و مذہب (جس کی تعلیم کو نصب العین بنایا تھا) اس کی ہمہ گیر تفسیر میں ان بزرگوں کے عقیدہ کے مطابق وطنی سیاست اور جد و جہد آزادی ایک فرض کی حیثیت رکھتی تھی۔

اسی احساس فرض کا نتیجہ تھا کہ جیسے ہی ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کی گئی۔ اس جماعت کے سربراہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اور آپ کے ساتھیوں نے مسلمانوں کے لئے شرکت کانگریس کا فتویٰ صادر کیا اور برطانوی سامراج کے ہاتھوں میں کھیلنے والے سروں[2] اور خان بہادروں کے پھینکے ہوئے تمام تیر پوری جوانمردی سے اپنے سینوں پر لئے۔

---

[1] یعنی ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے صرف آٹھ سال بعد ۱۸۶۶ء ۱۲۸۳ھ میں "کتاب التمہید" میں حضرت مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فقرہ لکھا ہے۔ وہ ہمیشہ حضرات علماء کے پیش نظر رہنا چاہیئے مولانا فرماتے ہیں:۔ دارالعلوم دیوبند اُسِّسَ فی ۱۲۸۳ھ فاقتدی الناس فی تاسیس الفروع فاول فرع تاسس بعد سنۃ اشہر فی سہارنپور حتی وصلت الی اربعین فرعًا لکن نظامہا علی اللامرکزیہ وکنت اول زمان تنظیم جمعیۃ الانصار احبان اُغیر نظام الفروع المذکورۃ الی المرکزیہ ولکن شیخنا شیخ الہند ماکان یلتفت الی ذالک الا قلیلا و بعد ثلاث سنین تبینت لی حکمۃ اللامرکزیہ بالتجارب فان الحکومۃ لاتسہل لہا ان تتحکم و تغلب علی ذالک النظام و حفظ الحریہ مقدم علی تحسین الصورۃ التمہید ص۱۵۵ بحوالہ سیاسی تحریک ص۲۰۵ حاشیہ۔

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد صاحب (علیگ) مرحوم و علماء حق جلد اول از راقم الحروف محمد میاں عفی عنہ۔

پھر بیسویں صدی کے شروع میں موتمر الانصار اور جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک نظام قائم کیا گیا۔ اس نظام کا اندرونی رُخ یہ تھا کہ بقول شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز

"۱۹۰۵ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ریشمی خط کی تحریک شروع کی اور ۱۹۱۴ء تک اُسے اس حد تک پہونچا دیا کہ اگر کچھ ملک کے خائن خیانت نہ کرتے تو اُسی وقت ہندوستان آزاد ہو چکا ہوتا۔" لہ

اس وقت اس تحریک کے ذریعہ ہندوستان آزاد نہیں ہو سکا مگر یہی تحریک حریت و استقلال افغانستان کے لئے سنگ بنیاد ثابت ہوئی جس سے مشرق میں ایک نئی بیداری پیدا ہو گئی (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے نقش حیات جلد دوم۔ از شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی۔ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی سیاسی ڈائری نیز علمائے حق جلد اول وغیرہ

۱۹۱۶ء میں ریشمی رومال کی تحریک ناکام ہوئی اس کے رہنما حضرت مولانا محمود الحسن صاحب، حضرت مولانا حسین احمد صاحب، مولانا عزیر گل صاحب، حکیم نصرت حسین صاحب رحمہم اللہ گرفتار اور مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا برکت اللہ بھوپالی، مولانا محمد میاں منصور انصاری وغیرہ جلاوطن ہوئے۔ لیکن ابھی پورے پانچ سال بھی گذرنے نہیں پائے تھے کہ انہیں بزرگوں کے ساتھیوں نے جو ہندوستان میں تھے نئی کروٹ لی اور ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند

لہ خطبہ صدارت جمعیۃ علماء کانفرنس ناگپور منعقدہ نومبر ۱۹۴۹ء (الجمعیۃ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۴۹ء)

کی باضابطہ[۱] تشکیل کردی جس نے انڈین نیشنل کانگریس کے دوش بدوش جنگ آزادی میں حصہ لیتے ہوئے اور کانگریس سے کہیں زیادہ جانی اور مالی قربانیاں پیش کرتے ہوئے ۱۹۴۷ء میں مکمل آزادی حاصل کرلی۔ افسوس آخر میں برطانیہ کا جادو کام کرگیا اور جسم ہندوستان کے دو ٹکڑے کرکے اس کی شہ رگ کا خون کھینچ لیا گیا۔ مگر بہرحال آزادی جس عنوان سے بھی آئی اور نجات جس حد تک بھی میسر ہوئی وہ نتیجہ ہے انہیں کوششوں کا جن کا سرورق ان بزرگوں کے مبارک ناموں سے مزین ہے۔

اس جملہ معترضہ کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع فرمائیے۔ اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی سرگذشت سن لیجیے

پوری داستان طویل ہے ہم ہر ایک بزرگ کے جستہ جستہ واقعات بیان کرتے ہیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً ڈیڑھ سال انبالہ، ننگری، پنجلاسہ وغیرہ ضلع مظفرنگر، سہارنپور، اور ضلع انبالہ کے دیہات میں گذارا۔ ۱۲۷۶ھ میں[۲] ہجرت کی تبت

۱؎ ۱۹۱۹ء میں صرف یہی ہوا کہ اس کی تشکیل باضابطہ کردی گئی اس کے صدر اور سکریٹری منتخب ہوئے دستور اساسی مرتب ہوا۔ باقی اس جماعت کی اصل بنیاد بقول شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ۱۸۰۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ جب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے فتویٰ دیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی ختم ہوچکی ہے ہم سب کا فرض ہے کہ متحد ہوکر جلد بدیشی حکومت کو ہندوستان سے نکال دیں (خطبہ صدارت جمعیۃ علماء کانفرنس ناگپور۔ بحوالہ الجمعیۃ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۴۹ء و بحوالہ ارشادات)

۲؎ کرامات امدادیہ ص۲۸ کرامت (۲۴۳) روانگی کے وقت آپ گنگوہ بھی تشریف لے گئے مگر مولانا رشید احمد صاحب سے ملاقات نہ ہوسکی۔ آپ حوالات میں بند تھے۔ حضرت کی روانگی سے ایک ماہ بعد رہا ہوئے۔ امداد المشتاق ص۲۶۹ بحوالہ نقش حیات ص۶/۲۶

سے روانہ ہوئے۔ سندھ کے راستے سے کراچی پہونچے اور بحری جہاز سے مکہ معظمہ کے لئے روانہ ہوگئے۔

اس سفر میں چند عجیب و غریب واقعات قابل تذکرہ ہیں جن کو حضرت حاجی صاحب کے تمام سوانح نگاروں نے نقل کیا ہے۔ مثلاً

(۱) پنجلاسہ ضلع انبالہ کے رئیس راؤ عبداللہ خاں تھے۔ حکام رس۔ سرکار کے وفادار۔ اور حضرت حاجی صاحب کے ارادتمند۔ پنجلاسہ پہونچکر حضرت حاجی صاحب نے انہیں کے یہاں قیام کیا۔ حاجی صاحب جیسے باغی کو اپنے یہاں ٹھہرانا تباہی اور بربادی کو دعوت دینا تھا۔ مگر راؤ صاحب کا اخلاص ہر ایک خطرہ سے بے نیاز تھا۔

قدرت کی عجائب نوازی ملاحظہ ہو کہ اس قیام کے دوران میں راؤ صاحب کا اخلاص آزمائش کی کسوٹی پر کسا گیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ مخبروں نے مخبری کر دی اور صبح کے وقت جیسے ہی افق مشرق سے آفتاب نے سر نکالا مجسٹریٹ ضلع دوش لیکر راؤ صاحب کے مکان پر پہونچ گیا۔

حاجی صاحب نے بر سبیل احتیاط ایک ویران کوٹھری میں قیام فرمایا تھا جو گھوڑوں کے اصطبل کے پاس تھی۔ مخبر نے ایسی صحیح مخبری کی کہ اس کوٹھری تک کا پتہ بتا دیا تھا۔ یہ اشراق کا وقت تھا اور حسب معمول حاجی صاحب نماز اشراق میں مشغول تھے۔ راؤ صاحب کے لئے یہ بہت ہی نازک گھڑی تھی۔ مگر توفیق خداوندی نے حوصلہ مند راؤ صاحب کی مدد فرمائی۔ راؤ صاحب آگے بڑھے۔ گرم جوشی سے کلکٹر صاحب کا استقبال کیا۔ بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ تشریف لائیے۔ اس وقت صبح صبح کیسے تشریف آوری ہوئی۔ راؤ صاحب نے فرمایا۔

سخن پرور مجسٹریٹ نے کہا۔ سُنا ہے آپ کے اصطبل میں کوئی گھوڑا بہت عمدہ ہے۔ صاحب اُسے دیکھنے آئے ہیں۔

بہت بہتر ہے۔ تشریف لایئے۔ اصطبل حاضر ہے۔ گھوڑے ملاحظہ فرمایئے راؤ صاحب مجسٹریٹ بہادر کو اصطبل میں لے گئے۔ گھوڑے دکھائے۔ مجسٹریٹ بار بار راؤ صاحب کے چہرہ پر نظر ڈالتا تھا اور حیران تھا کہ راؤ صاحب پر خوف و ہراس یا گھبراہٹ کا کوئی اثر نہیں۔ وہ دل دل میں خیال کر رہا تھا کہ شاید مخبر نے جھوٹی خبر دی۔ اصطبل میں گھومتے ہوئے اس ویران کوٹھری کے دروازہ پر بھی پہونچ گیا جہاں حاجی صاحب قیام فرما تھے اور یہ کہتے ہوئے کہ کیا اس میں گھوڑوں کی گھاس بھری جاتی ہے، کواڑ کھلوا دیئے۔

کوٹھری میں چوکی پر جانماز بچھی ہوئی ہے۔ لوٹا چوکی کے کنارہ پر۔ اور وضو کے پانی سے نیچے کی زمین تر ہے۔ مگر نماز پڑھنے والا کوئی نہیں۔

کلکٹر صاحب نے کوٹھری کے کونہ کونہ پر نظر ڈالی کوئی شخص نظر نہیں آیا تو پھر راؤ صاحب سے ہی دریافت کیا کہ یہ چوکی کیسی ہے۔

راؤ صاحب۔ میں یہاں نماز پڑھا کرتا ہوں۔

کلکٹر صاحب۔ اصطبل کے کنارہ۔ ویران اور بوسیدہ کوٹھری میں نماز پڑھنے کا کیا مطلب؟ نماز کے لئے تو مسجد ہوتی ہے۔

راؤ صاحب۔ ہمارے مذہب کی یہ تعلیم ہے کہ فرض نماز تو مسجد میں جماعت کے ساتھ کھلم کھلا سب کے سامنے ادا کریں لیکن نفلیں چھپا کر کسی پوشیدہ جگہ میں پڑھیں۔ اس لئے اشراق وغیرہ کی نفلیں میں یہاں پڑھا کرتا ہوں۔

اب کلکٹر صاحب خاموش تھے۔ رخصت ہوئے۔ اور راؤ صاحب سے معذرت کی کہ کوئی گھوڑا ہماری مرضی کا نہیں نکلا۔ افسوس آپ کو تکلیف بھی دی اور ہمارا کام بھی نہیں ہوا۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

راؤ صاحب اس بلا کو رخصت کرکے سب سے پہلے اسی کوٹھری میں پہونچے۔ دیکھتا حاجی صاحب چوکی پر تشریف فرما ہیں۔[۱]

(۲) گڑھی پختہ جو اب ضلع مظفر نگر میں ہے اور اس زمانہ میں غالباً سہارنپور کے ضلع میں تھی حضرت حاجی صاحب یہاں تشریف لے گئے اور موضع کے رئیس کے یہاں قیام فرمایا۔ مخبروں نے خبر کردی۔ مجسٹریٹ ضلع نے پولیس کپتان کو فوراً حکم لکھ دیا۔

اس علاقہ کے تھانہ دار خواجہ احمد حسین[۲] صاحب سہارنپوری تھے۔ ایس۔ پی تھانہ میں پہونچا۔ کلکٹر کے حکم کا صرف اوپر کا حصہ جس میں تلاشی کا آرڈر تھا۔ دکھا دیا مگر باقی حصہ جس میں ملزم اور موضع وغیرہ کا نام تھا، نہیں دکھایا، کہ شاید مسلمان ہونے کی وجہ سے کسی صورت سے اس دوش کو ناکام کردیں اور پہلے ہی خبر بھیجکر حاجی صاحب کو اپنی جگہ سے غائب کرادیں۔ بہرحال کپتان صاحب تھانیدار کو ساتھ لیکر روانہ ہوئے۔ جب گڑھی پختہ کے قریب پہونچے تب خواجہ صاحب تھانیدار کو اندازہ ہوا کہ حاجی صاحب کی گرفتاری کے لئے یہ دوڑ جارہی ہے۔ خواجہ صاحب کو معلوم تھا کہ حاجی صاحب کس کے یہاں قیام فرما ہیں خواجہ صاحب نے گاؤں کے باہر سے

---

[۱] تذکرۃ الرشید ص ۷۷-۷۸ج ۱ [۲] خواجہ اظہر حسن صاحب سہارنپور کے مشہور قومی کارکن۔ اُن کے پوتے ہیں۔

ہی چلانا شروع کر دیا اور اس زمیندار کا نام لے لے کر دھونس جمانے لگے۔ نمکحرام تو کہاں ہے۔ باہر آ۔ آج تجھے سمجھتا ہوں۔ تو سرکار کے باغیوں کو اپنے یہاں ٹھہراتا ہے (وغیرہ وغیرہ) خواجہ صاحب کی آواز بہت بلند تھی۔ رات کے سناٹے میں خواجہ صاحب کی آواز پورے گاؤں میں گونج گئی۔ زمیندار نے خواجہ صاحب کی آواز پہچان لی۔ اس نے فوراً حاجی صاحب کو ایسی جگہ پہونچا دیا کہ حاجی صاحب ہاتھ نہ لگ سکے اور دوش ناکام واپس ہوئی۔

بہر حال جہاں جہاں حاجی صاحب پہونچتے رہے پولیس آپ کا تعاقب کرتی رہی مگر "جس کو اللہ رکھے اسے کون چکھے"

اسی طرح ایک اور گاؤں کا واقعہ ہے۔ رات کے وقت پولیس فورس بالکل بے خبری میں اس مکان پر پہونچ گئی۔ جہاں حضرت قیام فرماتھے۔ اسی کھلے ہوئے مردانہ مکان میں جہاں حضرت حاجی صاحب تشریف فرماتھے آپ کو لٹا کر آپ پر رضائی ڈال دی گئی۔

پولیس کو اس کا وہم بھی نہ ہوا کہ حاجی صاحب اس کھلے ہوئے مردانہ مکان میں ہونگے وہ پہلے زنانہ مکان کی طرف بڑھی۔ زمیندار بھی اس کے ساتھ مکان کے اندر گئے اور یہاں چیخنے چلاتے اور باہر کے آدمیوں کو ڈانٹتے ہوئے کہہ گئے کہ اس بڈھے کو کھیت پر ڈال آؤ۔ اس نے کھانس کھانس کر بلغم سے سارا مکان گندا کر دیا ہے۔

پولیس اپنے دھیان میں مست تھی۔ چودھری صاحب کی اس زبان کو نہ سمجھ سکی اور باہر کے آدمیوں نے حاجی صاحب کی چارپائی ایسی جگہ پہونچا دی جہاں پولیس نہ پہونچ سکی۔

"دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست"

مکہ معظمہ میں قیام اور وفات

مختصر یہ کہ غیبی امداد اور خداوندی تحفظات کے زیر سایہ آپ حجازِ مقدس پہونچے۔ وہاں پہونچکر زہد و تقویٰ۔ ریاضت و مجاہدہ اور توکل علی اللہ کی وہ مثال قائم کی جس نے عہدِ صحابہؓ کی یاد تازہ کردی۔ نہ صرف عجم بلکہ عرب نے بھی آپ کے سامنے گردن عقیدت خم کی۔ آج دنیا ر اسلام کا ہر ذی علم آپ کو شیخ العرب والعجم کے خطاب سے یاد کرتا ہے۔ ان عزائم اور بلند حوصلوں کے مقابلہ پر آپ تذکرہ نویسوں کے اس بیان سے سبق لیجئے کہ آپ خِلقۃً ضعیف و نحیف خفیف اللحم (دُبلے پتلے) تھے۔ سچ ہے جس کو اللہ تعالیٰ روحانی قوت سے نوازے اس کو جسمانی قوت کی کیا ضرورت۔

۱۲ر جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۹ر اکتوبر ۱۸۹۹ء بروز چہار شنبہ بوقت صبح واصل بحق ہوئے اور مکہ معظمہ میں دفن کئے گئے۔ رحمہ اللہ و رضی عنہ۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو جماعتی پروگرام کے مطابق ہندوستان ہی میں رہنا تھا اور جب تک حاجی صاحبؒ اس علاقہ سے بخیریت روانہ نہ ہو جائیں ان کی خدمت میں حاضری اور جماعتی ضروریات کی تکمیل بھی آپ کے فرائض میں داخل تھی۔

ادھر سرکار کی طرف سے وارنٹ گرفتاری کے ساتھ انعام کا بھی اعلان ہو گیا تھا۔ وارنٹ کی خبر سُنکر دوست احباب اور متعلقین نے روپوش ہو جانے پر مجبور کیا اور ایک علیحدہ جگہ آپ کو پہونچا دیا۔ تین روز تک آپ اُس جگہ روپوش رہے۔ چوتھا دن

ہوا تو گوشہ تنہائی کو خیرباد کہہ کر باہر تشریف لے آئے۔ مخلصین نے اصرار کیا تو فرمایا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غار ثور میں تین دن مخفی رہے تھے۔ سنت سے
اتنی ہی مدت ثابت ہے۔ یہ مدت ختم ہوگئی لہٰذا روپوشی بھی ختم۔[1]

یہ اتباع سنت کے شوق کا ایک نمونہ تھا۔

اب ان خدارسیدہ۔ پابند سنت۔ برگزیدہ بزرگوں کی حاضر جوابی اور ذکاوت ملاحظہ ہو۔

ایک روز آپ مسجد[2] میں تشریف فرما تھے۔ پولیس پہونچ گئی۔ آپ اطمینان سے اُٹھے جوتیاں سنبھالیں اور مسجد سے باہر نکلنے لگے۔ کپتان پولیس نے خود آپ سے پوچھا۔ "مولانا محمد قاسم کہاں ہیں"۔

آپ ایک قدم اور آگے بڑھے اور پیچھے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا۔ ابھی یہاں تھے اب کپتان پولیس مولانا کی تلاش میں مسجد کے اندر پہونچا۔ اور مولانا مسجد سے باہر نکل کر جہاں آپ[3] نے مناسب سمجھا تشریف لے گئے۔

---

[1] نقش حیات جلد دوم ص۵۰ [2] یہ اسی مسجد کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو چھتے کی مسجد کے نام سے مشہور ہے جو اس وقت کے ارباب باطن اہل اللہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

[3] سوانح قاسمی میں ہے کہ شاہ رمزالدین کی مسجد میں تشریف لے گئے ص۱۲۷ جلد دوم — سوانح قاسمی میں یہ بھی ہے کہ کپتان پولیس مسجد سے باہر نکلا اور حضرت کو جاتے ہوئے دیکھ کر بولا مولانا تو یہی معلوم ہوتے ہیں جو جا رہے ہیں پولیس ادھر چلی اور مسجد شاہ رمزالدین کا محاصرہ کرلیا حضرت وہاں (مسجد شاہ رمزالدین) سے نکلے اور پولیس کے پیچھے ہی گزرتے ہوئے کسی اور مسجد میں پہنچ گئے ص۱۲۷ مگر ہم نے متعدد بزرگوں سے وہی سنا ہے جو سطور بالا میں درج کردیا۔ ہم کرامات اولیا کے معترف ہیں مگر شرط یہ ہے کہ اس کا ثبوت بھی اتنا ہی قوی اور منضبط ہو یہاں قطع نظر ثبوت کے اس (باقی ص۳۲۴ پر)

پولیس ہی تھی ۔ اُس نے مولانا کا نام سُنا تھا ۔ اس کا تصور یہی ہوگا کہ اتنے بڑے مولانا جن کی اتنی شہرت ہے، بڑے جثے کلّے کے شاندار آدمی ہوں گے ۔ وضع قطع بھی ایسی ہی شاندار ہوگی ۔ اور مولانا کی سادگی کا یہ عالم کہ "بڑے مولانا" تو درکنار آپ کی شکل و شباہت[1] اور وضع قطع[2] سے آپ کو معمولی ذی علم[3] سمجھنا بھی مشکل ہوتا تھا ۔ یہ ضرور ہوا کہ آپ ایک عرصہ تک مستقل طور سے کہیں نہیں رہے ۔ آپ کے برادر نسبتی شیخ نہال احمد صاحب نے اصرار کر کے کچھ دنوں کے لئے اپنے گاؤں "چکوالی" میں بھیجدیا جو دیوبند اور نانوتہ کے درمیان لبِ سڑک تھا ۔

دیوبند سے چند میل کے فاصلہ پر موضع "املیا" ہے کچھ دنوں وہاں بھی قیام رہا اس کے علاوہ آپ کے لئے بہت دلچسپ مشغلہ ایک اور تھا ۔ یعنی اپنے شیخ طریقت اور امیر جہاد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری اُن کے حالات کی خبر گیری مستقبل کے متعلق اُن سے ہدایات حاصل کرنا مشورہ سے راہ عمل طے کرنا ۔ چنانچہ اس سلسلہ میں دن کو چھپتے چھپاتے اور رات کو سفر کرتے ہوئے آپ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) روایت میں ایک قسم کا تضاد ہے کیونکہ اگر پولیس کپتان نے مولانا کو جاتے ہوئے راستہ ہی میں دیکھ لیا تھا تو پھر فوراً ہی گرفتار کیوں نہیں کر لیا ۔ اتنا موقع کیوں دیا کہ آپ مسجد میں پہونچے اور پولیس کو محاصرہ کرنا پڑا ۔

[1] سنا گیا ہے ۔ سیاہی مائل گندمی رنگ تھا اور چہرہ پر چیچک کے نشان تھے (تفصیل سوانح قاسمی جلد اوّل میں ملاحظہ ہو) [2] گاڑھے کا معمولی کرتا پاجامہ یا لنگی آپ کی عام پوشاک تھی [3] ایک لطیفہ اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ آپ کسی گاؤں کی مسجد میں تشریف لے گئے نماز کا وقت آگیا آپکو کسی طرح یہ معلوم تھا کہ امام صاحب قرآن شریف صحیح نہیں پڑھتے تو آپنے نمازیوں سے فرمایا کہ "آپ کہیں تو میں نماز پڑھادوں" گاؤں کے نمازیوں نے آپ پر نظر ڈالی اور کہنے لگے واہ تجھ سے تو ہمارا امام ہی اچھا ہے ۔ ہم تیرے پیچھے کیوں نماز پڑھیں ؟

گنگوہ[۱]۔ انبیٹھہ[۲]۔ بوڑیہ۔ گمتھلہ۔ نگری[۳]۔ لاوڈہ، پنجلاسہ[۴] وغیرہ ضلع سہارنپور اور ضلع انبالہ کے مواضعات میں تشریف لے گئے۔ جہاں حضرت حاجی صاحب[۵] پہونچے ہوئے تھے

مفسر کا حج الزام غدر یا اس الزام کے شبہ میں لاکھوں ہندوستانی موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ ظلم و ستم اور وحشت و بربریت کی جتنی بھی صورتیں ہو سکتی ہیں ہندوستانیوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے کام میں لائی جا چکی ہیں مگر جو قدرت فرعون کے گھر میں موسیٰ کی پرورش کیا کرتی ہے وہ عجیب و غریب انداز سے اُن کی حفاظت کر رہی ہے جو فرعونِ برطانیہ کے مقابلہ میں موسیٰ بن کر سامنے آنے والے ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بھی انھیں منتخب افراد میں ہیں جن کو قدرتِ خداوندی برطانوی سامراج کے مقابلہ میں نہ صرف موسیٰ بلکہ موسیٰ گر بنا کر کھڑا کرنے والی ہے۔

آپ صحیح معنیٰ میں صرف تین روز روپوش رہے پھر خداوند عالم کی حفاظت کے بھروسہ پر خاص خاص مقاصد کے ماتحت متعدد مواضعات و قصبات اور شہروں میں گھومتے ہوئے تقریباً دو سال گذار دیئے۔

اس عرصہ میں حاجی امداد اللہ صاحب مکہ معظمہ بخیریت پہونچ چکے ہیں۔ بظاہر تارک الدنیا، مگر دنیا ریاست کے نہایت سنجیدہ امیر کی حیثیت سے مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کا قائم کیا ہوا مرکز سنبھال چکے ہیں۔ اب ضرورت تھی کہ جن کو اس مرکز کے ماتحت ہندوستان میں مرکزی کردار انجام دینا ہے پھر ایک مرتبہ مل کر بیٹھیں

۱؎ کرامات امدادیہ صفحہ ۱۲۔ ۲؎ ایضاً ۳؎ سوانح قاسمی ص ۱۸۲/۲ ۴؎ تذکرۃ الرشید۔ امداد المشتاق۔ نقش حیات۔ کرامات امدادیہ وغیرہ۔

اور اب تازہ حالات میں مستقبل کا تفصیلی لائحہ عمل طے کریں۔

اس مصلحت کے علاوہ ایک دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ انگریزی تجسس نگاہوں سے جو یکم نومبر ۱۸۵۸ء کے نمائشی اعلان معافی کے بعد بھی رہنمایان تحریک کی تلاش میں ہندوستان کے چپہ چپہ پر تیزی سے پڑ رہی ہیں، کچھ عرصہ تک آڑ لے لیں

یہی مصلحتیں سامنے تھیں جن کی بنا پر جمادی الثانیہ ۱۲۷۷ھ دسمبر ۱۸۶۰ء میں حج بیت اللہ کا قصد فرمایا۔ بظاہر اس سفر کے محرک حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں (حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے قابل فخر فرزند ارجمند۔ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر المدرسین اور تحریک دارالعلوم دیوبند کے رکن رکین)

مگر عجیب بات یہ ہے کہ ضروریاتِ سفر کا تکفل فرمانے والے یہی متوکل علی اللہ مولانا محمد قاسم صاحب ہیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے بیان[۱] کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے اور اس کی بین السطور غور سے پڑھیئے۔

---

[۱] حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد اُن کی سوانح حیات لکھی تھی جو مختصر ہے مگر نہایت جامع اس کا نام جس سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی تاریخ وفات بھی معلوم ہوئی۔ یہ ہے۔ حالات جناب طیب مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم

۵۱۷　۴۸۶　۲۹۴

۴ جمادی الاول - ۱۲۹۷ھ

یہ رسالہ اسی سال مطبع صادق الانوار میں باہتمام حافظ عبدالقدوس صاحب طبع ہو چکا تھا۔ تاریخ طباعت، شوال ۱۲۹۷ھ پھر مولوی سید احمد صاحب مالک کتب خانہ اعزازیہ نے اس رسالہ کو اپنے رسالہ ماہنامہ خالدین میں قسطوار شائع کیا اور اس کا نیا نام سوانح عمری رکھا۔ یہ اقتباس اسی سوانح عمری مطبوعہ انوری پریس دیوبند سے ماخوذ ہے۔

"آخر حضرت حاجی صاحب عرب کو روانہ ہو گئے۔ احقر کو بعد اُن کے یہی سوجھی کہ تو بھی چل۔ مولانا کی روپوشی محض عزیز و اقارب کے کہنے سے تھی ورنہ اُن کو اپنی جان کا کچھ خیال نہ تھا۔ مولانا نے بھی ارادہ کیا اس روپوشی کی بلا کے سبب والدین نے بخوشی اجازت دیدی۔ احقر بے سروسامان تھا۔ قلیل سازادِ راہ بہم پہونچایا تھا۔ مگر مولوی صاحب کی بدولت وہ سب راہ بخیر و خوبی طے ہوئی۔ ہر چند مولوی صاحب بھی بے سامان تھے مگر بدولت توکل سب راہ بخیر و خوبی پوری ہوئی اور سب کام انجام ہو گئے۔ کشتیوں کی راہ پنجاب ہو کر سندھ کی طرف کو گئے۔ کراچی سے جہاز میں بیٹھے۔ جمادی الثانی سنہ ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء میں روانہ ہوئے سلہ ایک سال بعد جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں وطن واپس پہونچے۔

سلہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس سفر کی ڈائری لکھتے رہے ہیں جو حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حسن توجہ سے بیاض یعقوبی کے نام سے سنہ ۱۹۲۹ء میں شائع کی گئی۔ اس ڈائری میں سہارنپور سے تاریخ روانگی ۱۰ر جمادی الاول سنہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۰ر دسمبر سنہ ۱۸۶۰ء یکشنبہ ہے۔ اس ڈائری میں ان تمام مقامات کا تذکرہ ہے جہاں قیام ہوا مقامات وہی ہیں جہاں حضرت حاجی صاحب نے سفر ہجرت کے وقت قیام فرمایا تھا۔ اس ڈائری سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حاجی حافظ عابد حسین صاحب بھی رفیق سفر ہیں اور یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے دیوبند میں ایک مدرسہ کے قیام کی تجویز پیش کی اور اپنے چند رفقاء کے ساتھ اس کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسہ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی حُسن توجہ سے دارالعلوم کی عظمت اختیار کی۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات لکھنی مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وارنٹ گرفتاری کا قصہ اعلان معافی پر ختم نہیں ہوگیا بلکہ ڈھائی سال مزید گذر گئے تب بھی وارنٹ گرفتاری اور اس کے مقابلہ میں اپنے تحفظ کا سلسلہ جاری تھا۔ نیز حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا یہ فقرہ کہ سب کام انجام ہو گئے اپنے اندر وسیع معنیٰ رکھتا ہے۔ سطور بالا میں اس کا مفہوم پیش کیا جا چکا ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی

تقریباً نو ماہ گذر گئے، معافی عام کا اعلان ہو چکا ہے۔ ۱۸۵۹ء کا جون جولائی گذر رہا ہے اگست آنے والا ہے۔ مگر دارو گیر کا بازار اب بھی گرم ہے حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خسر مولانا محمد تقی صاحب[۱] جھنجھر میں

---

[۱] مولانا محمد تقی صاحب حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں بھی تھے۔ حضرت مولانا گنگوہی کی عمر ابھی سات سال تھی کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ نے اپنے دادا قاضی پیر بخش صاحب اور اپنے اموں صاحبان کی زیر سرپرستی پرورش پائی۔ مولانا محمد تقی صاحب کے علاوہ تین اموں اور تھے مولانا محمد تقی صاحب۔ مولانا عبد الغنی صاحب۔ مولانا محمد شفیع صاحب۔ مولانا ابو نصر صاحب۔ جن کا تذکرہ سطور بالا میں آئے گا مولانا عبد الغنی صاحب کے فرزند ارجمند تھے۔ عمر میں صرف دو سال چھوٹے۔ تعلیم و تربیت میں ہمیشہ ساتھ رہے۔ مولانا محمد تقی صاحب عالم و فاضل صاحب نسبت بزرگ تھے۔ سلسلہ قادریہ میں حضرت شاہ سیف اللہ صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت اور مجاز تھے۔ اتباع سنت کا عشق یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ رفتار و گفتار اور خورد و نوش میں بھی اتباع سنت معمول تھا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ آپ کا مزار دہلی میں قلعہ کے میدان میں پرانی سنہری مسجد کے شمالی جانب بیلوں میں ہے ص۳۰ تذکرۃ الرشید حصہ اول۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جھنجھر میں نہیں بلکہ دہلی کے کسی معرکہ میں شہید ہوئے

شہید کئے جا چکے ہیں اور تھانہ بھون کے واقعات کے سلسلہ میں آپ کی گرفتاری کی افواہیں گرم ہیں۔ حضرت مولانا گنگوہی اس عرصہ میں گنگوہ میں رہے۔ صرف ایک دو مرتبہ بقول مصنف تذکرۃ الرشید

"راتوں چلتے۔ دنوں چھپتے خاردار جنگل پیدل قطع کرتے"

تگری[۱] اور پنجلاسہ وغیرہ پہونچے جہاں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سفر ہجرت کی منزلیں طے کرتے ہوئے قیام پذیر تھے۔

حضرت گنگوہی نے اس موقعہ پر بھی یہ اصرار کیا کہ حضرت حاجی صاحب کے ساتھ مکہ معظمہ چلیں۔ مگر حاجی صاحب کا حکم یہی ہوا کہ ہندوستان میں رہو تم سے حق تعالےٰ کو ابھی بہت سے کام لینے ہیں۔[۲]

حضرت مولانا رشید احمد صاحب حضرت حاجی صاحب کو رخصت کرکے واپس

۱۔ تگری کے خوش حال زمیندار راؤ اشرف علی خاں تھے جن کے خلف رشید اپنے زمانہ کے بلند پایہ مشہور عالم اور شیخ طریقت حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب تھے جنھوں نے رائے پور ضلع سہارن پور کو تلقین وارشاد کا مرکز بنایا اور آج اسی مرکز سے مرشد وقت حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کا آفتاب ارشاد، ضیا پاشیاں کررہا ہے۔ حضرت گنگوہی تگری میں راؤ اشرف علی خاں صاحب کے یہاں ہی مقیم ہوئے تھے۔ اس وقت حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب کی عمر تقریباً تین سال تھی۔ راؤ اشرف علی خاں صاحب حضرت گنگوہی سے اتنے متاثر ہوئے کہ آپ سے بیعت ہونے کی درخواست کی۔ مگر حضرت گنگوہی نے مشورہ دیا کہ قطب وقت حضرت حاجی صاحب ہندوستان میں موجود ہیں اُن سے بیعت ہوجیے چنانچہ اسی سفر میں راؤ اشرف علی خاں صاحب کو اپنے ساتھ پنجلاسہ لے گئے اور وہاں حضرت حاجی صاحب سے بیعت کرادی۔ تذکرۃ الرشید ص ۸۱ ج ۱۔ ۲۔ ایضاً تذکرۃ الرشید ص ۸۱ ج ۱

ہوئے پھر گنگوہ ہی کچھ عرصہ قیام فرمایا۔ اس کے بعد آپ رام پور منہیاران تشریف لے گئے اور وہاں حکیم ضیاء الدین صاحب مرحوم کے مکان پر قیام فرمایا۔ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ کی آخری تاریخیں یا محرم ۱۲۷۶ھ کی ابتدائی تاریخیں یعنی ۱۸۵۹ء کی جولائی کا مہینہ ہے۔ پولیس کپتان گارڈن کرنیل فرانسس پولیس فورس کے ساتھ گنگوہ پہونچتا ہے۔ مسجد کے ایک گوشہ میں ایک صاحب گردن جھکائے مراقبہ میں مشغول ہیں۔ ایک سپاہی آپ کے پاس پہونچتا ہے اور گردن پر زور سے ہاتھ مار کر کہتا ہے۔ "چل کھڑا ہو کیا گردن جھکائے بیٹھا ہے" اور پھر دھکا دیکر مار پیٹ کہتے ہوئے مسجد سے باہر لے آتا ہے۔ یہ صاحب گرفتار کر لئے جاتے ہیں۔ پھر مکان پر پہونچکر کونہ کونہ کی تلاشی لی جاتی ہے

یہ صاحب خاموش ہیں۔ جانتے ہیں کہ میں بے قصور ہوں اور جو کچھ میرے ساتھ کیا جارہا ہے وہ محض مشابہت کے دھوکہ میں۔ مگر ایک لفظ زبان سے نہیں نکالتے۔ کیونکہ اُن کی آرزو یہ تھی کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب محفوظ رہ جائیں خواہ ان پر کچھ بھی گذرے۔ سب کچھ کر گذرنے کے بعد فتح کے نشہ میں بدمست کرنیل اور اُس کے موذی سپاہیوں کی آنکھیں کھلتی ہیں کہ یہ جن کو گرفتار کیا گیا ہے ملزم کے ماموں زاد بھائی مولانا ابو نصر صاحب ہیں۔ اصل ملزم (مولانا رشید احمد صاحب) اس وقت یہاں گنگوہ میں موجود ہی نہیں ہیں۔ وہ کچھ دنوں سے چند میل کے فاصلہ پر قصبہ رام پور منہیاران میں مقیم ہیں۔ اس تحقیق کے بعد پولیس رام پور منہیاران پہونچی جہاں حضرت مولانا رشید احمد صاحب بلا مزاحمت گرفتار ہو گئے اور چونکہ تمام غصہ ناکردہ گناہ "مولانا ابو نصر صاحب" پر نکالا جا چکا تھا۔ اس لئے حضرت مولانا گنگوہی کو گرفتار کرتے ہوئے

کوئی توہین آمیز حرکت بھی سرزد نہیں ہوئی۔ حضرت گنگوہی کو بند بہلی میں بٹھا کر مسلح پولیس کی حفاظت میں سہارنپور پہونچایا۔ چند روز وہاں حوالات میں رکھے گئے پھر مظفر نگر منتقل کردیئے گئے۔ کیونکہ یہیں[۱] کے وارنٹ پر گرفتار ہوئے تھے۔ مولانا ابو نصر صاحب خود تو رہائی پا گئے مگر اپنے پھوپی زاد بھائی مولانا رشید احمد صاحب کی گرفتاری اپنی مصیبت سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ لہذا جیسے ہی پولیس گنگوہ سے روانہ ہوئی مولانا ابو نصر صاحب اور ان کے والد (حضرت مولانا گنگوہی کے ماموں) مولانا عبدالغنی صاحب پولیس کے پیچھے پیچھے پاپیادہ سہارنپور پہونچے۔

اب اس قصہ کا باقی حصہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے حوالہ سے ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

آپ پر علاوہ شرکت جہاد شاملی یہ بھی الزام تھا کہ سپاہیوں کی رائفل آپ کے پاس ہے۔ آپ نے دونوں سے بالفاظ توریہ انکار کیا۔ حاکم نے پوچھا تم نے گورنمنٹ کے خلاف ہتھیار اٹھایا۔ آپ نے فوراً جیب سے تسبیح نکالی اور فرمایا "یہ میرا ہتھیار ہے" اس نے کہا وہ بندوق کہاں ہے۔ آپ نے فرمایا مجھے بندوق سے کیا سروکار۔ غرضکہ اس کے تمام سوالات کا جواب اسی طرح دیتے رہے جب اس کی مقصد براری نہ ہوئی تو اس نے سپاہیوں کو حکم کیا کہ ننگی تلواریں لے کر اس کے سر پر کھڑے ہو جاؤ۔

---

[۱] کیونکہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ہے۔

آپ کے ماموں مولانا محمد شفیع صاحب گنگوہی جو کہ پنجاب میں عرصہ دراز تک ملازم گورنمنٹ رہ چکے تھے ہتھکڑیاں اور انگریز حاکم کی سختیاں اور دھمکیاں دیکھ کر پہلے سے سراسیمہ ہو رہے تھے اس حکم کو سُن کر سخت پریشان ہو گئے۔ آپ کو علیحدہ لیجا کر کہنے لگے۔ بیٹا بتلا دے وہ بندوق کہاں ہے۔ بندوق کے مل جانے پر حاکم تجھ کو چھوڑ دے گا وہ بندوق آپ کے کیا کام آئے گی۔ دیکھ ننگی تلواروں کا تجھ پر پہرہ بٹھا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا ماموں جان آپ گھبرائیے نہیں۔ ایک تلوار نہیں سیکڑوں تلواروں کا بھی اگر پہرا قائم کر دیا جائے تو کیا خوف ہے۔ بندوق کا بتانا الزام کو سر پر لینا ہے۔ اس پر وہ بھی چپکے ہو گئے۔ الغرض جب آپ ان تمام تخویفات اور دھمکیوں سے متاثر نہیں ہوئے اور نہایت استقلال سے جوابات دیتے رہے سپاہی ننگی تلواروں سے آپ پر پہرہ دیتے رہے تو آپ کو مظفر نگر جیل میں بھیج دیا گیا اور شہادتوں کے حصول کے لئے پولیس اور حکومت کوشش کرتی رہی تاکہ ثبوت بہم پہنچا کر مقدمہ چلایا جائے۔ ماموں صاحب مرحوم جو کہ گنگوہ سے اسی اعلان اور ارادہ پر نکلے تھے اور ساتھ ساتھ تھے کہ مولوی رشید احمد جب تک رہا نہ ہو جائیں گے میں گنگوہ واپس نہ آؤں گا انھوں نے ضمانت پر رہائی کی درخواست کی حاکم نے تین ہزار کی تین سال کے لئے ضمانت طلب کی (یعنی ایک ایک ہزار کی تین ضمانتیں تین سال تک کے لئے) تین شخص

ضمانت مطلوبہ کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر حاکم نے قبول کرنے سے اس
حیلہ سے انکار کر دیا کہ یہ سب گنگوہ کے باشندے نہیں ہیں اس لئے
ان کی ضمانت قانوناً درست نہیں۔

صاحب امداد المشتاق ص۱۵۳ پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی نقل کرتے ہیں
جب میں قید خانہ میں تھا تو میری تین سال کے لئے تین ہزار کی ضمانت
طلب ہوئی تھی۔ چنانچہ تین شخص ضامن ہوئے لیکن انگریز سخت مزاج
تھا اُس نے یہ کہکر کہ تینوں گنگوہ کے باشندے نہیں ہیں ضمانت نامنظور
کر دی، ماموں صاحب نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اس کو نہ چھڑالوں گا
گنگوہ نہ آؤں گا۔ چنانچہ وہ ساعی تھے۔ اسی اثنار میں ہمارے حضرت
(حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) گنگوہ تشریف لائے اور یہاں
خبر تھی کہ میں اب رہا ہوا۔ اب رہا ہوا۔ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ
سرہٗ العزیز نے فرمایا۔ چھوٹنے میں ابھی دیر ہے ہم اس سے مل آتے
ہیں۔ انھیں ایام میں کہ میں قید خانہ میں تھا خواب میں تشریف
لائے۔ گویا میرے پاس تشریف رکھتے ہیں اور تسلی فرماتے ہیں
پھر حضرت یہاں سے تشریف لے گئے اور میں ایک ماہ بعد چھوٹا
(امداد المشتاق ص۱۸۳)

جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری آخر
ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ یا ابتدا محرم ۱۲۷۶ھ (جولائی ۱۸۵۹ء) میں ہوئی۔ تقریباً ۶ ماہ
حوالات کی زندگی میں صرف ہوئے۔ پس آپ کی رہائی جمادی الثانی ۱۲۷۶ھ جنوری ۱۸۶۰ء

میں ہوئی اور حضرت حاجی امداداللہ صاحب جمادی الاول ۱۲۷۶ھ دسمبر ۱۸۵۹ء میں ہندوستان سے تشریف لے گئے۔ رحمہم اللہ وقدس اسرارہم۔

مولانا محمد مظہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ

خلف حافظ لطف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ[1] ساکن نانوتہ اپنے والد ماجد سے قرآن شریف حفظ کیا۔ مولانا مملوک علی صاحب۔ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری۔ مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی خلف الرشید حضرت شاہ ابوسعید صاحب وغیرہم سے علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ بخاری شریف حضرت شاہ مولانا اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی اوّل اجمیر کالج میں پھر آگرہ میں ملازم رہے۔ پھر ملازمت ترک کردی ۱۸۵۷ء کی تحریک حریت میں شریک ہوئے۔ بڑی جرأت وہمت سے جہاد شاملی میں حصہ لیا۔ پیر میں گولی لگی۔ علاج معالجہ کے بعد بھی اس کا نشان باقی رہا۔ تحریک ختم ہوئی تو کسی آنے والی تحریک کے لئے عرصہ تک اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔ روپوشی کی زندگی بسر کی۔ دار و گیر کا دور ختم ہوا تو دارالعلوم کے نمونہ پر سہارنپور میں مدرسہ مظاہر العلوم کی بنیاد رکھی۔ ان دونوں اداروں کے قیام میں صرف چھ ماہ کا فصل ہے[2]۔ آپ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پانچ سال بڑے تھے۔ ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۶ء کی شب میں آٹھ بجے آپ نے انتقال فرمایا۔

---

[1] حافظ لطف علی صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ کے ہم جد ہیں۔ ایک بزرگ شیخ ابوالفتح تک حافظ لطف علی صاحبؒ کا یہ سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ حافظ لطف علی صاحب خلف حافظ محمد حسن صاحب خلف حکیم غلام اشرف صاحب خلف حکیم عبداللہ صاحب خلف شیخ ابوالفتح صاحب اور حضرت مولانا قاسم صاحب کا سلسلہ اس طرح ہے مولانا محمد قاسم صاحب خلف شیخ اسد علی صاحب خلف شیخ غلام شاہ صاحب خلف شیخ محمد بخش صاحب خلف شیخ علاء الدین صاحب خلف شیخ ابوالفتح صاحبؒ (العلم کراچی بابتہ ماہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۸ء)

[2] تذکرۃ الخلیل ص۱۵ دارالعلوم دیوبند کی ابتدا ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ اور مظاہر العلوم سہارنپور کی ابتدا ماہ رجب ۱۲۸۳ھ میں ہوئی۔ تذکرۃ الخلیل ص۱۰ و ص۱۳

دوسری عظیم الشان خدمت

شاندار ماضی جلد دوم اور سوم میں وضاحت کی گئی ہے کہ تصانیف کے ذریعہ علمی پیرایہ میں اپنے نظریات کی اشاعت بھی اس جماعت کے پروگرام کا اہم جز تھی۔ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی مولانا محمد احسن صاحب[۱] کے تعاون سے پروگرام کے اس جز میں بھی حصہ لیا

---

[۱] مولانا محمد احسن صاحب نے دہلی پہنچکر حضرت مولانا مملوک علی صاحب سے تکمیل کی۔ مولوی محمد حسین صاحب مراد آبادی اپنی تصنیف انوار العارفین میں تحریر فرماتے ہیں۔ مولوی محمد احسن حافظ قرآن وواعظ خوش بیان۔ عالم فروع واصول۔ دانندہ براہین ودلائل معقول ومدرس علم معانی وکلام ودرس کنندہ۔ بفصاحت وبلاغت تام مفسر کلام اللہ ومحدث حدیث رسول اللہ وجامع جمیع علوم مترجم احیاء العلوم ومتصف باخلاق حسن ہستند۔ دہلی کالج سے عربی کی تکمیل کے بعد آپ ۱۸۴۶ء ۱۲۶۲ھ میں بنارس کالج میں فارسی کے مدرس اول مقرر ہوئے وہاں آپنے ایک بیوہ خاتون سماۃ زینب سے نکاح کرکے عقد بیوگان کی سنّت زندہ کی۔ اس بیوہ کے ساتھ ایک شیر خوار بچہ بھی آپ کی تولیت میں آیا جس نے جوان ہوکر دہلی میں "مطبع مجتبائی" قائم کیا جو بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں سب سے زیادہ مشہور مطبع تھا جس نے بیشمار نادر تصنیفات پوری تصحیح اور خوبی کے ساتھ شائع کرکے علم کے قدر دانوں سے خراج تحسین حاصل کیا۔

مولانا محمد احسن صاحب کا قیام بنارس میں تقریباً چار سال رہا۔ پھر آپ بریلی تشریف لے آئے اور بریلی کالج میں شعبہ فارسی وعربی کے ہیڈ مقرر کردیئے گئے۔ آپ نے مستقل قیام کے لئے بریلی ہی منتخب کرلی۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب انگیز طوفان آیا تو آپ نے اپنے بھائیوں اور دوسرے بزرگوں اور ساتھیوں کے خلاف اس انقلابی طوفان کے سامنے سینہ تان لیا۔ ابھی یہ سیلاب بریلی میں داخل نہیں ہوا تھا کہ آپنے وعظ اور تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں کو شرکت سے روکنے کی کوشش کی لیکن زمانہ کی رو کے مقابلہ پر سینہ تان لینا قطعاً غلط تھا چنانچہ آپ پر عوام کی یورش یہاں تک بڑھی کہ آپ بریلی چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ جب یہ سیلاب پایاب ہوگیا تو آپ دوبارہ بریلی واپس آئے یہاں مطبع صدیقی قائم کیا جس کو آپ کے (باقی صفحہ ۳۳۶ پر)

مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی

حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں ۱۲۴۷ھ میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے انہیں اساتذہ کے سامنے جن کا ذکر خیر بار بار آچکا ہے زانوئے تلمذ طے کیا۔ تحریک میں سرگرم شرکت کے بعد جہاد شاملی میں مردانہ وار حصہ لیا۔ آپ کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے بہت زیادہ تعلق خاطر تھا کسی وقت بھی اُن سے جُدائی گوارا نہیں تھی۔ امیر جہاد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس یگانگت اور تعلق قلبی کا لحاظ فرمایا۔ چنانچہ جو خدمت حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے سپرد فرمائی اُس میں آپ کو بھی شریک فرمادیا۔ مزید برآں تاکید فرمادی کہ مولانا محمد قاسم صاحب کو کبھی تنہا نہ چھوڑیں کیونکہ انہیں خود اپنی جان کا خیال نہیں تھا [۵]

تحریک کے خاتمہ پر جب روپوشی کا بادل چھٹا تو آپ نے بریلی پہونچ کر ۱۸۶۱ء میں بریلی کالج کی ملازمت اختیار کرلی اور وہاں مطبع صدیقی کے کام میں اپنے بھائی مولانا محمد احسن صاحب کے شریک و مددگار رہے۔ آپ دو سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم بھی رہے۔

(بقیہ حاشیہ ص۳۳۵) برادر محترم مولانا محمد مظہر صاحب اور مولانا محمد منیر کا تعاون حاصل رہا اور اسی تعاون کی بنا پر اس مطبع کو سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف شائع کرنے کی سعادت میسر آئی۔ حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء جیسی اہم ترین تصنیفات سب سے پہلے ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں اسی مطبع سے شائع ہوئیں۔ بریلی میں آپ نے عربی مدرسہ بھی قائم کیا جس کا نام مصباح التہذیب رکھا۔ اس کے بعد اس کو مصباح العلوم کہا جانے لگا۔ اب اسی نام سے مشہور ہے۔ تقریباً نوے سال عمر پاکر ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء میں آپ نے وفات پائی۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب[1] کیرانوی

اس محاذ کے مجاہدین میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا ذکر خیر باقی رہ گیا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کو شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب نے "بڑا عالم فاضل اور دانشمند" فرمایا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ تحریک میں شریک ہونے کے بجائے وطن واپس چلے گئے۔ شمس العلماء کے اس فقرہ پر گذشتہ صفحات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے یہاں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے شرکتِ جہاد کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد عارف الاسلام صاحب عثمانی الجلالی کا ایک مضمون روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ یہاں یہ مضمون بجنسہٖ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس مضمون سے قصبہ کیرانہ میں مقابلہ کی تفصیلات بھی معلوم ہوں گی نیز دو واجب الاحترام شخصیتوں اور جہاد میں شریک ہونے والی ایک برادری کا بھی تعارف ہوگا (یعنی مولانا عبد الحکیم صاحب تھانوی

---

[1] مولانا رحمت اللہ صاحب کے والد صاحب کا اسم گرامی مولانا نجیب اللہ صاحب تھا جو میرٹھ میں میر منشی رہے تھے۔ اجداد کا اصلی وطن پانی پت تھا جو جمنا کی دوسری طرف تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ جد اعلیٰ کا نام شیخ عبد الرحمٰن عثمانی گازرونی بتایا گیا ہے۔ آپ ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کیرانہ میں حاصل کر کے دہلی تشریف لے گئے۔ لال قلعہ کے پاس مولانا محمد حیات کے مدرسہ میں داخل ہوئے اس وقت کا مکے مدرسین اور دہلی کے دوسرے اساتذہ سے استفادہ کیا۔

اور چودھری عظیم الدین صاحب اور گوجر برادری) چند ضروری فوائد
حاشیہ میں اضافہ کردیئے گئے ہیں ۔ مولانا محمد عارف الاسلام
فرماتے ہیں :۔

یادگار شہیدان غدر ۱۸۵۷ء کے سلسلہ میں، میں اپنے حقیقی پردادا صاحب کے برادر کلاں مولانا رحمت اللہ مرحوم کیرانوی، بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے مختصر حالات درج کر رہا ہوں ۔

ضلع مظفر نگر کے پرگنہ شاملی میں زمیں داری شیوخ اور گوجروں کے ہاتھ میں تھا جن میں دینداری کے ساتھ جوش بھی تھا ۔ چنانچہ تھانہ بھون اور کیرانہ کا ایک محاذ قائم کیا گیا اور مجاہدین کی جماعت مدافعت اور مقابلہ کرتی رہی۔ شاملی کی تحصیل پر حملہ کیا گیا اور پرگنہ کے چاروں طرف اس مجاہدانہ تحریک کا انصرام ہوگیا۔

تھانہ بھون میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ اور مولوی عبدالحکیم صاحبؒ تھانوی مع رفقاء (ان رفقاء میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ اور جناب حافظ ضامن صاحب شہید کے اسماء گرامی خاص طور پر یاد رکھے جائیں) ـــــ اور نواح کیرانہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ رح گورہ فوج کا مقابلہ کر رہے تھے ۔ مجاہدین کیرانہ میں چونکہ مسلمان گوجر زیادہ تھے اس لئے ان کی قیادت چودھری عظیم الدین رح حضرت مولانا رح کے ساتھ کر رہے تھے (انقلاب کے بعد چودھری صاحب مذکور حضرت مولاناؒ کے پاس مکہ معظمہ چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا) اس زمانہ میں عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم اور تربیت کے لئے کیرانہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ بجایا جاتا تھا جس کی آواز سن کر لوگ جمع ہوجاتے تھے اور اعلان

ہوتا تھا۔ "ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا"
اس جملہ کے بعد جو کچھ کہنا ہوتا تھا عوام کو سنایا جاتا تھا اس پرانی آواز کو سننے والوں میں سے اب کوئی نہیں رہا۔ مگر جنھوں نے اپنے بزرگوں سے اس کی صدائے بازگشت سنی ہے وہ اب بھی موجود ہیں۔ کیرانہ کے محاذ پر بظاہر شکست کا امکان نہ تھا مگر بعض ابنائے وطن کی زمانہ سازی اور مخبروں کی سازش نے حالات کا رخ بدل دیا۔ کیرانہ میں گورہ فوج اور توپ خانہ داخل ہوا۔ محلہ دربار کے دروازہ کے سامنے توپخانہ نصب کیا گیا اور گورہ فوج نے دربار کا محاصرہ کرلیا۔ ہر گھر کی تلاشی لی گئی۔ عورتوں بچوں اور ہر شخص کو فرداً فرداً دربار سے باہر نکالا گیا۔ اس لئے کہ کسی مخبر نے اطلاع دی تھی کہ مولانا دربار میں روپوش ہیں۔ کیرانہ کے قریب پنجیٹھ مسلمان گوجروں کا ایک گاؤں ہے وہاں مولانا اپنی باقی ماندہ جماعت کے ساتھ پہونچے۔ خود پنجیٹھ کے لوگ بھی مجاہدین میں شریک تھے اسی دوران میں گورہ فوج کے ایک گھوڑا سوار دستہ نے پنجیٹھ کا رخ کیا۔ کیرانہ اور تمام قرب و جوار کے حالات کی اطلاع مولانا کو ملتی رہتی تھی۔ چنانچہ پنجیٹھ کے مکھیا کو جب فوج کی آمد کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے فوراً جماعت کو منتشر کردیا اور مولانا سے خواہش کی کہ "کھرپا" لیکر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں۔ چنانچہ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ گورہ فوج اسی کھیت کی پگڈنڈی سے گذری جہاں میں گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگ رہی تھیں اور میں فوج کو اپنے پاس سے گذرتا ہو دیکھ رہا تھا۔ فوج نے گاؤں کا محاصرہ کرلیا۔ مکھیا کو گرفتار کرلیا گیا۔ پورے گاؤں کی تلاشی لی گئی مگر مولانا کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ مجبوراً فوجی دستہ کیرانہ واپس ہوگیا۔ حالات پر قابو پالیا گیا اور حضرت مولانا کے خلاف فوجداری مقدمہ چلایا گیا۔ وارنٹ جاری ہوا۔ آپ کو

مفرور باغی قرار دیا گیا اور گرفتاری کے لئے ایک ہزار روپیہ انعام کا اعلان ہوا۔

حضرت مولاناؒ اپنا نام مصلح الدین بدل کر بیدل دہلی روانہ ہوئے۔ آپ کے لئے یہ وقت سخت آزمائش کا تھا۔ ایمانی عزم و ہمت اور استقلال کے ساتھ جے پور اور جودھپور کے مہیب ریگستانی جنگلوں کو پا پیادہ عبور کرتے ہوئے بندرگاہ سورت پہونچے اس زمانہ میں سورت بندرگاہ سے بھی جہاز کا سفر آسان نہ تھا۔ بادبانی جہاز سال بھر میں صرف ایک مرتبہ ہوا کی موافقت کے زمانہ میں سورت سے روانہ ہوتا اور اسی طرح جدہ سے آتا تھا اور ایک خط کا محصول چار روپے (للعہ) تھا۔ جو لوگ ہجرت کے ارادہ سے ترک وطن کرتے وہ ساتھ ہی دنیاوی تعلقات اور باہمی علائق کو زندگی ہی میں ختم کر دیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا کی روانگی اور فوجداری مقدمہ کے بعد آپ کی اور آپ کے خاندان کی جائداد ضبط ہو کر نیلام ہوئی۔ خاص طور پر پانی پت میں (جو کہ مولانا کا سابق وطن اور اُن کے جدِّ امجد حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء کی جائے مزار ہے) مخبر کمال الدین کی شناخت پر جو جائداد قرق کر کے نیلام کی گئی اس کا مختصر بیان درج ذیل ہے۔ جائداد کے نیلام کا فیصلہ ڈپٹی کمشنر کرنال نے ۳۰ جنوری ۱۸۶۲ء میں کیا۔

۱۔ سرائے کھجور ۔ اس کی قیمت سرکاری طور پر ڈپٹی کمشنر کے کاغذات میں پانچسو روپیہ ہے۔

۲۔ سرائے چوڑھے	"	"	"	"
۳۔ سرائے شیخ فضل الہی	"	"	"	"
۴۔ سرائے قصابان	"	"	"	"
۵۔ سرائے نوہ آباد	"	"	"	"
۶۔ سرائے بابان	"	"	"	"

یہ سب سرائیں اور وسیع قطعات زمین اور مکانات صرف ایک ہزار چار سو بیس روپیہ میں نیلام ہوئے جن کی قیمت لاکھوں روپے تھی۔ مزروعہ علاقے اور سکنائی جائداد اور زراعتی زمینیں اس کے علاوہ ہیں جو بحق سرکار ضبط ہوئیں۔ مذکورہ بالا سرائیں جس قیمت پر نیلام ہوئیں وہ بھی ملاحظہ ہوں۔

سرائے کھجور ۲۴ روپیہ۔ سرائے لوہ آباد ۱۵ روپیہ۔ سرائے چوڑھے ۵۶ روپیہ اور سرائے قصابان ۱۴ روپیہ۔

"کاغذات جائداد نیلام شدہ میں انڈکس مشمولہ کا یہ عنوان ہے۔

"انڈکس مشمولہ مثل فوجداری مقدمہ عرضی کمال الدین ساکن کیرانہ حال پانی پت مولوی رحمت اللہ باغی"

طویل سفر کے آلام ومصائب برداشت کرتے ہوئے مولانا مکہ معظمہ جا پہنچے اس کے بعد وہاں کس طرح اس مجاہد حق نے دینی اور علمی کارنامے انجام دیئے اور کس طرح عیسائی جماعتوں سے فاتحانہ مقابلہ کیا پھر مدرسہ صولتیہ قائم کرکے غیر فانی کارنامہ انجام دیا۔ سلطان ترکی عبدالحمید خاں صاحب سے شرف باریابی حاصل کیا اور اپنے حقیقی برادرزادہ یعنی میرے دادا مولانا بدرالاسلام (مرحوم) کو وہیں تعلیم وتربیت دے کر سلطان مذکور کا معتمد خاص بنوادیا، یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

بفضلہ اب تک ان کے جانشین مدرسہ مذکور سے وابستہ اور مکہ معظمہ میں شاد وآباد ہیں۔ مولانا آخری دنوں میں مدینہ منورہ میں حاضر تھے۔ ۲۴ رمضان ۱۳۰۸ھ (۲ مئی ۱۸۹۱ء) کو وصال ہوا، مدینہ منورہ کی خاک پاک ابدی آرام گاہ بنی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

ڈاکٹر وزیر خاں رحمۃ اللہ علیہ

اگرچہ آپ دہلی یا مضافات دہلی کے باشندہ نہیں ہیں آپ کا اصل وطن بہار بتایا گیا ہے مگر چونکہ عیسائیت اور عیسائیت نواز انگریزوں کے خلاف جہاد میں حضرت مولینا رحمت اللہ صاحب کے شریک رہے ہیں اس لئے مولانا رحمت اللہ صاحب کے تذکرہ کے ساتھ آپ کا ذکر خیر بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے اسباب بغاوت میں اُن کوششوں کا کسی قدر ذکر گذر چکا ہے جو عیسائی مشنریوں کی طرف سے ہندوستان میں جاری تھیں تاکہ مذہبی ہمنوائی حاصل کر کے برطانوی سامراج کو لازوال بنا دیا جائے۔ ان کوششوں کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ہندوستان کے مذہب پرستوں کو مناظرہ کا چیلنج دیا جاتا تھا۔ اور چونکہ اس وقت تک اقتدار کے وارث عام طور پر مسلمان ہی تھے۔ لہٰذا چیلنج کا نمایاں رُخ مسلمانوں ہی کی طرف رہتا تھا۔ ردِ عیسائیت کی خدمت حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر وزیر علی خاں صاحب نے اپنے ذمہ لی تھی۔ ڈاکٹر صاحب یورپ جا چکے تھے انگریزی کے ساتھ یونانی اور عبرانی زبانوں میں بھی آپ کو کافی درک تھا۔ آپ نے یورپ سے واپس آکر آگرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ تاج محل کے قریب محلہ کا غذیان میں آپ کی سکونت تھی یہیں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب سے تعارف حاصل ہوا اور علمی رجحانات کی یگانگت نے ایک جان دو قالب کی مثال صادق کر دی۔

اس دور کی مناظرانہ تاریخ میں پادری فنڈر کی شکست خاص اہمیت رکھتی ہے جس نے ترقی پذیر عیسائیت پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ پھر آخر تک وہ پنپ نہ سکی۔

پادری فنڈر کو شکست دینے والے یہی مولانا رحمت اللہ صاحب اور اُن کے رفیق و

معاون ڈاکٹر وزیر علی خاں[1] صاحب تھے۔

فنڈر ۱۸۵۴ء میں یورپ سے آیا تھا۔ رجب ۱۲۷۲ھ۔ مارچ ۱۸۵۶ء میں مناظرہ ہوا۔ اس شکست فاش کے بعد فنڈر کے لئے ہندوستان میں مونھ دکھانا مشکل تھا۔ وہ یہاں سے فرار ہوا۔ چند سال بعد ۱۲۸۴ھ میں وہ قسطنطنیہ پہونچا اور وہاں اسی طرح چیلنج کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب اور اُن کے دوست ڈاکٹر وزیر علی خاں صاحب بھی ہجرت کر کے مکہ معظمہ پہونچ چکے تھے۔ سلطان نے مولانا کو قسطنطنیہ طلب کیا فنڈر کو وہاں بھی شکست فاش نصیب ہوئی۔

ڈاکٹر وزیر خاں صاحب ۱۸۵۷ء کے دورِ انقلاب میں دہلی تشریف لے آئے اور جب تک جنگ جاری رہی دہلی میں مقیم رہے۔ بہادر شاہ اور جنرل بخت خاں کی طرف سے آپ کو خدمات بھی سُپرد کی گئیں۔ جنرل بخت خاں نے آپ کو لارڈ آف آگرہ بھی بنا دیا تھا۔ پھر جنرل بخت خاں کے ساتھ ہی آپ لکھنؤ تشریف لے گئے اور جب ہر طرح ناکامی ہوئی تو کسی طرح چھُپ چھپا کر مکہ معظمہ پہونچ گئے۔ یہاں آپ نے علاج معالجہ شروع کر دیا جس سے خلق خدا کو بہت فائدہ پہونچا اور وہی آپ کی حفاظت کا ذریعہ بھی بن گیا جس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی بدوی شیخ کی بیوی بیمار ہوئی۔ مرض لاعلاج تھا۔ اطبا مایوس ہو چکے تھے۔ بدوی رئیس نے سب سے مایوس ہو کر ڈاکٹر صاحب سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے علاج سے اللہ تعالےٰ نے مریضہ کو شفا بخشی۔ یہ بدوی شیخ ڈاکٹر صاحب کا بہت ممنون ہوا کچھ عرصہ بعد حکومتِ برطانیہ نے حکومتِ ترکیہ سے گفتگو کر کے ڈاکٹر صاحب کی حوالگی کا پروانہ حاصل

---

[1] حضرت مولانا فیض احمد صاحب بدایونی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مناظرہ میں معاون تھے۔

کردیا۔ جب بدوی سردار کو علم ہوا تو اُس نے شریف مکہ کے پاس پیغام پہنچایا کہ ڈاکٹر وزیر خاں میری امان میں ہیں جب تک میرے قبیلہ کے بیس ہزار افراد کٹ نہ جائیں گے ڈاکٹر وزیر خاں کو حوالہ نہیں کیا جاسکتا۔ شریف مکہ نے یہ رپورٹ حکومت ترکیہ کو پیش کردی۔ باب عالی (مرکزی حکومت ترکیہ) نے یہ پروانہ منسوخ کردیا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء)

رڑکی (ضلع سہارنپور)[1]

۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو گوجر قوم پرستوں نے رڑکی ضلع اور شہر کو آزاد کرا لیا تھا لیکن ۳۰ مئی کو انگریزی فوجوں نے دوبارہ رڑکی کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور رسد پہونچائی۔

۲ جون کو رڑکی فوج کے کچھ سرغنوں نے علم بغاوت بلند کردیا۔ ان میں سے کچھ سپاہی نگینہ ہوتے ہوئے بجنور پہونچے جہاں وہ گرفتار کر لئے گئے اور مرادآباد میں اُن کو پھانسی دیدی گئی۔ اُن میں سے تین سپاہی بھاگ کر رڑکی کے نزدیک ایک گاؤں "گنیش پور" میں پناہ گزین ہوگئے۔ انگریزی فوجوں نے ان کا تعاقب کیا لیکن وہ وہاں سے بھی بچکر نکل گئے اس پر قرب وجوار کے گاؤں والوں کو دھمکی دی گئی کہ اگر کسی بھی باغی کو چھپانے کی کوشش کی گئی تو اُسے بھی پھانسی دیدی جائے گی اس کے بعد گاؤں والوں پر مظالم ڈھائے گئے۔ ۱۳ جون کو پھر رڑکی فوج کے ایک سوار دستے نے جس کو بجنور جانے کا حکم ہوا تھا بغاوت کردی۔ اُن کا کورٹ مارشل کیا گیا۔

---

[1] محمد احمد صاحب نامہ نگار روزنامہ الجمعیۃ کی رپورٹ روزنامہ الجمعیۃ (مئی ۱۹۵۷ء) میں شائع ہوئی تھی یہ مضمون اسی سے ماخوذ ہے۔

۲۲ جون کو منگلور[1] میں نہر کے پل کے دوسری طرف قوم پرستوں کی فوج جمع ہوئی جس کی تعداد دو سو تھی ان کی ٹکر انگریزی فوج سے ہوئی جس میں تین قوم پرست ہلاک ہوئے اور آٹھ کو گرفتار کر لیا گیا جن میں سے چار کو اسی جگہ پھانسی دیدی گئی اور لاشوں کو رسی میں باندھ کر درختوں پر لٹکا دیا گیا۔ باقی چار کو رڑکی لاکر برگد کے درخت پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔

۴ جون کو دہانہ گنگا کے پاس رانی مجرا گاؤں میں قوم پرستوں اور انگریزی فوج کے درمیان زبردست جنگ ہوئی جو لگاتار چار دن تک جاری رہی۔ دونوں جانب سے توپوں کا استعمال ہوا قوم پرور انقلابیوں نے کچھ ہٹ کر دوسرے گاؤں "فتوا" میں مورچہ لگایا۔ ڈٹ کر مقابلہ ہوا۔ چار انگریز ہلاک ہوئے۔ چھ قوم پرور شہید اور ۴۲ گرفتار ہوئے ان میں سے گیارہ کو رڑکی لاکر برگد کے درخت پر پھانسی دی گئی۔ باقی ۳۰ کو بینت مار کر جوالا پور لیجا کر چھوڑ دیا گیا۔

۲۲ جولائی کو محمود پور اور دیوبند کے درمیان انگریزی فوجوں اور قوم پرستوں کے درمیان مقابلہ زبردست ہوا جس میں ۳۶ قوم پرور شہید ہوئے اور بہت سے زخمی اس کے علاوہ ۳۸ گرفتار ہوئے جن میں سے ۱۴ کو رڑکی میں اسی برگد کے درخت کے نیچے پھانسی دیدی گئی۔

---

[1] منگلور۔ رڑکی سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر مشہور قصبہ ہے حضرت مولانا قاضی اسمٰعیل صاحب جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے معاصر اور بلندپایہ شیخ طریقت تھے۔ ان کے صاحبزادے قاضی عبدالغنی صاحب اور ہندوستان کے مشہور قوم پرور خاموش رہنما مولوی سید طفیل احمد صاحب (علیگ) مصنف حکومت خود اختیاری اور مسلمانوں کا روشن مستقبل در سالہ "جواز سود" وغیرہ ان کے خلف رشید مولوی محمد احمد صاحب کاظمی ایڈوکیٹ۔ ان سب کا وطن مالوف یہی قصبہ منگلور (ضلع سہارنپور) ہے

مجاہدین کو شکست ہوگئی تو انگریزی فوجوں نے ان مواضعات پر چڑھائی شروع کردی۔ گاؤں والوں نے بھی مقابلہ کیا۔ مگر آخر کب تک؟ بہت سے شہید ہوئے۔ اکیس تیس کو گرفتار کرکے رڑکی لایا گیا۔ برگد کا درخت جس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر سانس لیا کرتے تھے ان مسافران شاہراہ آزادی کا مقتل بنایا گیا۔ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کو ان سب کو اسی جگہ پھانسی دیدی گئی۔ جواللاپور کے ایک گوجر سردار کو بھی یہیں لاکر پھانسی دیدی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۷ء سے پانچ سال پہلے (۱۹۵۲ء) تک اس برگد کے ٹھنے پر لوہے کا ہک اور زنجیر کا کڑا موجود تھا۔ آندھی میں یہ ٹہنا گر گیا تو یہ ہک اور زنجیر بھی غائب ہوگئی۔

برگد کا یہ درخت رڑکی سے متصل "سنہرا گاؤں" کے قریب ہے۔ مشہور یہی ہے اور قرین قیاس بھی ہے کہ اس درخت کی شاخوں میں رسیوں کے پھندے ڈال کر جن کو پھانسیاں دی گئیں اُن کی تعداد ڈھائی سو ہے۔ ۱۹۵۷ء میں جب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی سو سالہ یادگار منائی گئی تو جلسہ کے لئے اسی برگد کا سایہ تجویز کیا گیا جہاں سو سال پیشتر کے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

علی گڈھ فضا میں سکون تھا۔ یکایک ایک برہمن گرفتار کیا گیا۔ اُس پر الزام یہ تھا کہ اُس نے سپاہیوں کو ورغلایا اور یہ منصوبہ بنایا کہ ہم باہر سے بارات لائیں گے تم اُس کے ساتھ شامل ہوکر افسران کو مار ڈالنا۔ ۲۰ مئی کو اُسے دیسی سپاہ کے روبرو پھانسی دیدی گئی۔ سپاہی چپ چاپ یہ منظر دیکھتے رہے۔ یکایک ایک سپاہی آگے بڑھا۔ اور برہمن کی لٹکتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کرکے بلند آواز سے کہا:-

بھائیو! اسے دیکھو جس نے دھرم کی خاطر جان مسلمان کردی۔

اس آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ دلوں کی دنیا میں طوفان برپا ہوگیا۔ اُنھوں نے افسروں کو تو کوئی آزار نہیں پہونچایا۔ البتہ تمام فرنگیوں سے صاف صاف کہدیا کہ جلد سے جلد علی گڈھ چھوڑدیں۔ فرنگی رخصت ہوگئے تو فوجیوں نے جیل خانہ توڑا۔ قیدی چھڑائے خزانہ قبضہ میں لیا اور دہلی روانہ ہوگئے۔ یہ فوج کا عمل تھا اب شہر والوں کی کارگذاری ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا عبد الجلیل شہید

خلف مولانا ریاض الدین صاحب (شارح قصیدہ بردہ) حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب دہلوی کے شاگرد رشید جامع مسجد علی گڈھ کے امام تھے اور وہیں آپ کا حلقۂ درس بھی قائم تھا۔ نہایت متقی، پاکباز اور باخدا بزرگ۔ شہر کے آدمی آپ سے گہری عقیدت رکھتے تھے اور عوام کے رجحان سے متاثر ہوکر دنیا ساز انگریز بھی آپ سے ملاقات کرنے آتے تھے مگر آپ ان کو بہت ہی کم ملاقات کی اجازت دیتے تھے اور اگر یہ معلوم ہوجاتا کہ انگریز بہادر کے ساتھ اس کی میم بھی ہے تو دور ہی سے منع کرادیا کرتے تھے۔

آپ کے پوتے قاضی محمد سفیان صاحب قاضی شہر علی گڈھ کا بیان[۱] ہے کہ علی گڈھ انگریزوں سے خالی ہوا تو زمام قیادت آپ کے حوالہ کی گئی۔ تقریباً دو ماہ تک شہر کا نظم ونسق آپ نے سنبھالے رکھا۔ جولائی یا اگست میں انگریز تازہ دم فوجیں لے کر آگرہ کی جانب سے علی گڈھ پر حملہ آور ہوئے تو مولانا اپنے ساتھیوں کے ساتھ مقابلہ کے لئے سینہ سپر ہوگئے

۱؎ یہ قلمی بیان محفوظ ہے جو الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع بھی ہوچکا ہے۔

مڈراک کی سڑک پر انگریزی فوجوں سے تصادم ہوا۔ مقابل تازہ دم اور تمام ساز و سامان سے مسلح تھا۔ اس کی فوج باضابطہ قواعد داں تھی اور اس طرف صرف جوش آزادی اور ولولہ قربانی تھا جس نے آپ کو میدان جنگ میں ثابت قدم رکھا۔ یہاں تک کہ بہتّر ساتھیوں کے ساتھ آپ نے اسی میدان میں جام شہادت نوش کیا۔ ان ۷۲ شہدار کو جامع مسجد میں لایا گیا اور یہیں دفن کیا گیا۔ مولانا عبدالجلیل شہید کو بھی ان شہدا کے بیچ میں دفن کیا گیا۔ ان تمام شہدار کے مزارات جامع مسجد کے شمالی دروازہ کے بالکل قریب ہیں۔

مولانا کی شہادت کے بعد انگریز خونخوار درندے کی طرح سارے شہر میں گھوم رہا تھا جہاں کوئی مسلمان صورت ملا شہید کر دیا گیا۔ موتی مسجد کے سامنے پھول چوراہہ پر اور چوراہہ عبدالکریم پر پھانسیاں لٹکا دی گئی تھیں۔ جہاں کسی دشمن آزادی نے چغلی کھائی کہ یہ بھی شریک جہاد تھا اس کو فوراً پھانسی دیدی جاتی تھی۔ مجاہدین کے بیوی بچوں کو تلاش کر کے چن چن کر نہ تیغ کیا جارہا تھا ہماری پردادی صاحبہ اس قیامت صغریٰ میں اپنے چار بچوں کو لے کر اُن کے منہ پر پوتا مٹی مل کر جنگل کی طرف نکل کھڑی ہوئیں اور علی گدھ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں رسول پور میں ان چاروں بچوں کو چھپا کر رکھا۔ تقریباً تین سال تک انتہائی تکلیف کے اندر اس گاؤں میں جیسے تیسے ان بچوں کی پرورش کرتی رہیں۔ تین سال کے بعد جب گرفتاریاں بند ہوگئیں اور پوری طرح اطمینان ہوگیا تب وہ اپنے بچوں کو یہاں لیکر آئیں۔ علی گدھ آکر معلوم ہوا کہ مولانا عبدالجلیل شہید کے تمام مکانات اور جائداد کو کھدوا کر پھینک دیا گیا ہے۔ نہ رہنے کے لئے کوئی جگہ تھی اور نہ ٹھیرنے کے لئے کوئی ٹھکانہ۔ پھر اللہ نے رفتہ رفتہ اپنی مدد سے اُن کے ٹھیرنے کا اور گذارے کا انتظام کیا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب مرحوم جو اُن کے خلف اکبر تھے آہستہ آہستہ پروان

پڑھے اور انھوں نے وہ علم وکمال حاصل کیا جس نے مولانا عبد الجلیل شہید کے علم اور تمام کو دنیا میں روشن کر دیا۔ اسی دوران میں مولانا قاسم صاحب نانوتوی کا علی گڈھ آنا اور مولانا اسمٰعیل صاحب کو تعلیم دینا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔

بلند شہر۔ کالے آم کا میدان جنگ
عبد اللطیف خاں صاحب کا ایثار

بہت کم لوگوں کو یہ تاریخی واقعہ معلوم ہے کہ بلند شہر میں کالے آم (ضلع کی کچہریوں کے متصل) کے قریب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے ہندوستان کے حامیان آزادی کی ایک خونریز جنگ ہوئی تھی۔ اگرچہ انگریز اپنی فوجی طاقت اور تنظیم کے بہتر ہونے کے باعث اس میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ہندوستانیوں نے ایسی سختی سے جم کر مقابلہ کیا کہ اس کی مثال یوپی کے دوسرے شہروں میں مشکل سے ملے گی۔ اس لڑائی میں شروع سے ہی انگریزوں کا پلہ بھاری تھا۔ یعنی اُن کی فوج ہندوستانیوں سے زیادہ تھی اور سامان جنگ بھی افراط سے تھا۔ اس کے علاوہ دہلی اور میرٹھ سے اُن کو برابر مدد مل رہی تھی۔ اس کے برعکس ہندوستانیوں کی تعداد کم تھی اور اُن کے پاس ہتھیار بھی کم اور پرانی قسم کے تھے۔ پرانی توڑے دار بندوقیں بھالے اور تلواریں۔ میدانی توپ ایک بھی نہ تھی۔ اور کمک اور رسد کا کوئی انتظام نہ تھا لوگ آس پاس کے دیہات سے خود ہی آکر داد شجاعت دے رہے تھے۔ اس معرکہ کا اصل ہیرو مالاگڈھ کا نواب ولی داد خاں تھا جس کا حال بعد میں بیان کیا جائے گا کالے آم کی لڑائی میں خان پور، پنڈراول اور ملک پور کے رئیسوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ولی داد خاں کو نقد وجنس کی صورت میں جس قدر مدد دے سکتے تھے دی۔ ان مقامات کے سیکڑوں نوجوان آزادی کی لڑائی میں حصہ لینے کے لئے

میدان میں آ گئے ۔ نواب ولی داد خاں کو مدد دینے والوں میں عبدالطیف خاں رئیس خان پور کا نام اس لئے خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ اُن کی حیثیت اور مالی حالت دیگر رئیسوں سے زیادہ تھی وہ اپنی برادری میں ممتاز ترین فرد اور پٹھانوں کی بارہ بستیوں میں سردار سمجھے جاتے تھے ۔ اُن کی ریاست تقریباً ڈیڑھ سو دیہات پر مشتمل تھی ۔ عبدالطیف خاں ضلع بلند شہر کے قدیم جاگیرداروں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے ۔ اس لئے مغل بادشاہ اور اس کے حامیوں کو اُن سے توقعات بھی زیادہ تھیں ۔ عبدالطیف خاں سن رسیدہ ہونے کے باعث بذات خود کالے آم کی لڑائی میں شریک نہ ہو سکے لیکن ولی داد خاں کو بیش از بیش مدد دی ۔ دہلی کے لال قلعہ سے بادشاہ کے جو حامی نکل آئے تھے اُن میں سے اکثر نے قلعہ خانپور میں پناہ لی ۔ عبدالطیف خاں انگریزوں کو زر مال گذاری ادا کرنے سے پہلے ہی انکار کر چکے تھے ۔ کالے آم کی لڑائی کے بعد اُن کا نام کھلے ہوئے دشمنوں کی فہرست میں درج کر لیا گیا ۔ بلند شہر کے معرکہ میں شکست کھانے کے بعد ہندوستانی لشکر منتشر ہو گیا ۔ انگریزوں کے عتاب کا نزلہ پہلے عبدالطیف خاں رئیس خان پور اور اس کے بعد حرمت خاں ساکن پنڈراول اور فیض احمد خاں رئیس ملک پور پر گرا ۔ حرمت خاں اور فیض احمد خاں کو وکٹوریہ کے اعلان کے تحت معافی مل گئی لیکن عبدالطیف خاں رئیس خان پور کی تمام جائداد اور قلعہ ضبط کر لیا گیا اور اُن کو عمر بھر کے لئے کالے پانی بھیج دیا گیا۔[۱۵]

---

۱۵ از عزیز حسن خاں صاحب حسن پوری ۔ بحوالہ سنڈے ایڈیشن الجمعیۃ مورخہ ۲۶ شعبان ۱۳۷۲ھ ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء ۔

نواب ولی داد خاں اور انکے دو ساتھی

قلعہ مالاگڈھ کی بربادی اور گوجر قوم کی بے نظیر بہادری پھر تباہی

نواب ولی داد خاں بہادر مالاگڈھ ولد نواب بہادر خاں ولد حق داد خاں شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں علاقہ برن کے حاکم تھے۔ بلند شہر سے ۵ میل اتر پچھم کی سمت کالی ندی کے کنارے پر قلعہ مالاگڈھ کے نام سے قلعہ تیار کیا۔ نواب بہادر خاں در مرہٹوں سے بار بار جنگ ہوئی اور کبھی بھی مرہٹوں کو برن کے علاقہ میں قدم رکھنے کی ہمت نہ ہوئی نواب بہادر خاں صاحب کا انتقال ۱۸۲۴ء میں ہو گیا۔ نواب ولی داد خاں کو کمپنی ریاست کی آمدنی کے علاوہ ایک ہزار روپیہ ماہوار دیتی تھی' نواب ولی داد خاں کی ایک بھانجی بہادر شاہ کے شہزادے سے منسوب تھی۔ میرٹھ کی انقلابی فوجوں نے نام کے بادشاہ کو کام کا بادشاہ بنایا تو نواب ولی داد خاں بہادر شاہ کو مبارکباد دینے کے لئے دہلی تشریف لے گئے۔ ۲۶ مئی ۱۸۵۷ء کو نواب ولی داد خاں بہادر شاہ سے سند صوبہ داری دوآبہ لیکر چند سپاہیوں تلنگوں وغیرہ کے ساتھ مالاگڈھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ غازی آباد پہونچے۔ تحصیل دار و تھانہ دار نے حاضر ہو کر نذر

لہ ماسٹر ریاض الدین صاحب کا یہ مضمون روزنامہ الجمعیتہ کے سنڈے اڈیشن میں شائع کیا جا چکا ہے۔ ماسٹر ریاض الدین صاحب موضع ایچانہ ضلع بلند شہر کے رہنے والے ہیں نواب ولی داد خاں کے ایک ساتھی حاجی بابا اللہ خاں صاحب جن کا ذکر اسی مضمون کے آخر میں آرہا ہے وہ ماسٹر ریاض الدین صاحب کے دادا کے بھائی تھے۔ ماسٹر صاحب نے یہ واقعات اپنے خاندان کے ان بزرگوں سے سنے ہیں جو ۱۸۵۷ء میں جوان تھے۔ ماسٹر ریاض الدین صاحب کے موضع ایچانہ سے قلعہ مالاگڈھ پورب دکھن کی سمت ۸ میل کے فاصلہ پر تھا اور موضع اساہ صرف ایک میل اتر پورب میں۔

گذاری اور حکومت دو آبہ کی مبارک باد دی۔ نواب صاحب نے غازی آباد کا انتظام مکمل کر کے کچھ سپاہی سڑک اور قصبہ کی حفاظت کے لئے متعین کر دیئے۔ مہربان علی خاں و مظفر علی خاں امروہی کو ساتھ لیا اور قصبہ داوری میں آکر قیام کیا اور کئی ہزار گوجر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ تیسرے دن نواب صاحب اپنے قلعہ مالاگڈھ میں آگئے اور ضروری انتظامات میں لگ گئے۔ دوسرے دن سائل پور کا نمبردار ۱۰۰ سواروں اور ۲۰۰ پیادوں کو لیکر خدمت میں حاضر ہوا۔ نمبردار صاحب کے صاحبزادے چاند خاں کو بغیر ثبوت کلکٹر بلند شہر نے پھانسی دیدی تھی۔ نمبردار صاحب انگریز کلکٹر سے اپنے بیٹے کا انتقام لینا چاہتے تھے کلکٹر کو معلوم ہوا کہ سائل پور کا نمبردار نواب ولی داد خاں کے پاس گیا ہوا ہے۔ کلکٹر نے حفاظت کے انتظامات شروع کر دیئے۔ ادھر نواب ولی داد خاں نے اپنی صوبہ داری دو آبہ کا اعلان کر دیا اور ہر طرف احکام جاری کر دیئے اور محمد اسمٰعیل خاں کو پچاس سوار اور چالیس تلنگے اور ایک توپ دیکر قصبہ بلند شہر پر قبضہ کے لئے روانہ کر دیا۔ محمد اسمٰعیل خاں نے بلند شہر پر قبضہ کر لیا کلکٹر بلند شہر چھوڑ کر بابوگڈھ چھاؤنی تحصیل ہاپوڑ ضلع میرٹھ چلا گیا اور بلند شہر کے علاقہ پر نواب ولی داد خاں کی حکومت قائم ہو گئی۔ ان کے پرچم کے تلے غلام حیدر خاں و مہدی بخش خاں سہارنپوری و قاضی وزیر علی خاں بلند شہری عبد اللطیف خاں رئیس خان پور، اسمٰعیل خاں و اعظم خاں و نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد و حاجی یاد اللہ خاں اینچا نوی تھانیدار قصبہ گلاوٹھی و امین پدھان گوجر موضع اساوڑ وغیرہ وغیرہ جمع ہو گئے۔ اکثر ضلع بلند شہر کے جاٹ انگریزوں کے طرفدار تھے اور موضع کورلی و بھٹونہ اور موضع بیتونی جاٹوں کے گڈھ بنے ہوئے تھے۔ نواب ولی داد خاں صاحب نے محمد اسمٰعیل خاں صاحب کو بلند شہر سے بلا کر امین گوجر جس کے

ساتھ ایک ہزار گوجر تھے۔ اُس کی ہمراہی میں موضع کوربی اور بھٹونہ کی طرف روانہ کیا۔
یہاں کے لوگوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا جو انگریزی ہتھیاروں سے لیس تھے امین گوجر
کے ساتھ ایک توپ بھی تھی نواب صاحب کے ماموں نواب صاحب کی تمام فوج کے گولا
بارود کے مختار کل تھے جو انگریزوں سے سانہ باز کر چکے تھے اور نوابی کے خواب دیکھ رہے
تھے آخر نواب صاحب کے ماموں نے غداری کی اور اسمٰعیل خاں اور امین گوجر کو شکست
ہوئی اسمٰعیل خاں زخمی ہو کر مالاگڈھ واپس لوٹ آئے۔ امین گوجر اساورچلا گیا اور چالو ملال
سے نوک جھونک ہوتی رہی۔ نواب ولی داد خاں کے پاس دس ہزار سوار اور پندرہ ہزار
پیادے اور ضرورت کے لائق ہر قسم کا سامان بھی موجود تھا اور ہر جگہ کے رؤسا سوار اور
پیادے لیکر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے۔ امیر علی خاں امراؤ
بہادر خاں ولد مظفر علی خاں چھ سو سواروں کو لیکر خدمت میں حاضر ہوا۔ نواب ولی داد خاں
کی انگریزوں سے کافی عرصہ تک جنگ ہوتی رہی۔ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں
کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ مسٹر ترنیسل گورے اور دیسی سوار اور پیادہ لیکر بابوگڈھ چھاؤنی
ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں جما ہوا تھا نواب صاحب نے محمد اسمٰعیل خاں و حاجی منیر خاں کو
میں ساڑھے تین سو سوار اور پانچ سو پیادے دیکر اور مزید فوج بھیجنے کا وعدہ
کر کے کرنل ترنیل پر حملہ کرنے کے لئے ہاپوڑ کی طرف روانہ کر دیا۔ قصبہ گلاؤٹھی پہونچکر
محمد اسمٰعیل خاں، حاجی منیر خاں و حاجی یاد اللہ خاں ابنجانوی تھانیدار گلاؤٹھی نے آپس
میں طے کیا کہ صبح چار بجے مسٹر ترنیل کی فوج پر فقط سواروں کے رسالہ سے حملہ کیا جائے
اور پیادوں کو قصبہ گلاؤٹھی میں رکھا جائے اور وقت ضرورت طلب کیا جائے۔
یہ سوار نواب صاحب کی فوج کے جاں باز سوار تھے اور اس رسالہ کا نام لاندے

سواروں کا رسالہ تھا۔ کیونکہ اس رسالہ کے تمام گھوڑوں کی دُم کے کچھ بال کٹے ہوئے رہتے تھے۔ رسالہ شام کے وقت قصبہ گلاوٹھی سے روانہ ہو کر موضع مرشد پور کے پاس کالی ندی کے نالے عرف (چھوئیے) کے میدان میں ٹھہر گیا اور سوار آرام کرنے کے لئے گھوڑوں کی باگوں کے ہاتھ اور پیروں میں پھندے لگا کر سو گئے۔ کیونکہ صبح چار بجے مسٹر کرنل ترینل کی فوج پر حملہ کرنا تھا۔ یہاں سے چار میل کے فاصلہ پر مسٹر ترینل فوج لئے پڑا ہوا تھا۔ کسی غدار نے ترینل کو خبر کر دی کہ نواب ولی داد خاں کا رسالہ آرام سے سویا ہوا ہے کرنل ترینل نے جو گھات میں ہی بیٹھا ہوا تھا ایک بجے رات کو رسالہ پر حملہ کر دیا۔ نواب صاحب کا رسالہ غفلت میں سویا ہوا تھا اور گھوڑوں کی باگیں ہاتھ اور پیروں میں پڑی ہوئی تھیں فائرنگ ہوتے ہی گھوڑے بدک کر بھاگنے لگے اور تمام سوار سموں سے کچلے گئے جو اٹھ کھڑے ہوئے وہ گولیوں کا نشانہ بنا دیئے گئے چند سوار جان بچا کر بھاگ سکے۔ اس شکست کے بعد نواب صاحب کی ہمت نہیں ٹوٹی مگر دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ دہلی فتح ہونے کے چند دن بعد ہی انگریزی فوجوں نے مالاگڈھ پر چاروں طرف سے دھاوا بول دیا۔ مقابلہ سخت رہا۔ آخر نواب صاحب کے ماموں کی غداری رنگ لائی اور شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مالاگڈھ کا علاقہ انگریزوں نے ضبط کر کے مالاگڈھ کے قلعہ کو کھود کر مٹی کا ڈھیر کر دیا اور بلند شہر دادری دنکور خورجہ خان پور کے اکثر لوگوں کو گرفتار کر کے دار پر چڑھایا۔ ہر روز بلند شہر میں کالے آم پر لوگوں کو پھانسی دی جاتی تھی اور لاشیں لٹکی رہنے دی جاتی تھیں۔ نواب ولی داد خاں و رئیس کھلیسا وغیرہ شکست کے بعد بریلی پہونچ گئے اور نواب خان بہادر خاں وغیرہ کے ساتھ مل کر روہیل کھنڈ میں انگریزوں سے اپریل ۱۸۵۸ء تک جنگ کرتے رہے۔ نواب خان

بہادر خاں گرفتار ہو گئے اور نواب ولی داد خاں کہاں روپوش ہوئے کچھ پتہ نہیں چلا۔ سُنا گیا ہے کہ تقریباً دس برس بعد نواب ولی داد خاں نے بنجاروں کا بھیس بدل کر قلعہ مالاگڈھ کے ڈھیر کے قریب قیام کیا اور قلعہ کا خزانہ کھود کر لے گئے۔ پھر پتہ نہیں چلتا کہاں روپوش ہوئے۔ نواب صاحب کی نسل سے بھی کوئی شخص مالاگڈھ میں نہیں رہا اور نہ بعد میں گرفتار ہوا۔

(نوٹ:۔ یہ کالا آم جس پر پھانسیاں دی گئیں چوراہے کے بیچ میں اب تک کھڑا ہے۔)

امین پدھان گوجر رئیس اساور ضلع بلند شہر

امین پدھان نواب ولی داد خاں رئیس مالاگڈھ ضلع بلند شہر کی فوج میں افسر تھا کئی ہزار گوجر سوار اور پیادے توپ خانہ کے ساتھ اس کے ہمرکاب رہتے تھے۔ بڑی شان کا آدمی تھا اور بڑا بہادر آدمی تھا۔ جدوجہد آزادی ۱۸۵۷ء میں نواب ولی داد خاں (مالاگڈھ) کی ہمدردی اور وطن کی آزادی کے لئے اپنی تمام قوم کو جنگ آزادی میں جھونک دیا۔

اساور، سدھارنپور، قصبہ دادری و قصبہ دنکور، جمنا کے کھادر کے آس پاس کے تمام گوجر اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے تھے۔ نواب ولی داد خاں کو گوجر فوج پر بڑا بھروسہ تھا۔ ہر حملہ میں گوجر فوج پیش پیش رہتی تھی اور آخر وقت تک بڑی بہادری سے لڑتی رہی۔ سکندر آباد پر تین دفعہ حملہ کیا۔ گورلی۔ بھٹونہ پر حملہ کیا جہاں کئی ہزار انگریزوں کے طرفدار موجود تھے اور مالاگڈھ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے سدھارن پور کے ماووت قبیلہ کے چار گوجر لٹش۔ ہردیال۔ گردیال۔ وغیرہ نے بہادری

کی مثال قائم کردی ۔ موضع بینوئی میں کئی ہزار جاٹ جمع تھے اور نواب صاحب کے نومفتوحہ علاقہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے ۔ چاروں بھائیوں نے موضع بنبوئی پر حملہ کرکے ہجوم کثیر کو منتشر کیا ۔ لٹس کی تنبیہی میں بلّم لگا مارتے والا کھینچ نہ سکا دو میل دور آکر لٹس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بلّم کو پکڑ کر کھینچ لیا ۔ سُنا گیا ہے کہ چاروں بھائیوں کے ہتھیار کام نہیں دے رہے تھے ۔ چاروں بھائی ہتھیار پھینک کر آدمیوں کو آدمیوں سے ٹکرا کر مار دیتے تھے اور تہلکہ مچاتے ہوئے تھے اسی مناسبت سے یہ مثال قائم ہوگئی کہ اگر کسی سے کوئی کام نہیں ہوسکتا تو کہا جاتا ہے کہ راوتوں کا سالو ہالوٹ گیا مگر ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ ماننا پڑیگا کہ گوجر فوج میں نظم و نسق کی کمی تھی لوٹ مار پر جلد راغب ہوجاتے تھے ۔ آخر کار نواب ولی داد خاں کو شکست ہوئی امین پدھان و تمام گوجر قوم پر انگریزوں کا عتاب نازل ہوا ۔ گوجر قوم کے گاؤں کے گاؤں جلا دیئے گئے ۔ جائدادیں نیلام کردی گئیں اور کوشش کی گئی کہ اس پوری قوم کو من حیث القوم نیست و نابود کردیا جائے ۔ باقی رہے نام اللہ کا ۔ انگریز ہندوستان سے نکل گیا ۔ یہ قوم اب بھی باقی ہے ۔ مگر حالت آجتک بہتر نہیں ہوسکی ۔

حاجی یاد اللہ خاں موضع اینچانہ ضلع بلندشہر

حاجی یاد اللہ خاں اینچانوی قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلندشہر میں کمپنی سرکار کی طرف سے علاقہ قصبہ گلاؤٹھی کے تھانیدار تھے ۔ بڑے رعب داب کے آدمی تھے ۔ مئی ۱۸۵۷ء میں نواب ولی داد خاں نے اپنی صوبیداری دو آبہ کا اعلان کردیا ۔

امین پدھان گوجر حاجی یاد اللہ خاں کا دوست تھا ۔ دونوں میں بڑی گاڑھی چھنتی تھی ۔ امین پدھان کے اشارہ سے حاجی یاد اللہ خاں نے قصبہ گلاؤٹھی کا تمام علاقہ نواب ولی داد خاں کے سپرد کردیا ۔ نواب صاحب نے انعام و اکرام دیکر عزت افزائی

کی اور اختیارات میں ترقی کردی۔ حاجی صاحب نے بڑی خوبی کے ساتھ آخر وقت تک علاقہ کا نظم ونسق قائم رکھا اور کئی معرکوں میں پیش پیش رہے۔ قلعہ مالاگڈھ کی شکست کے بعد گرفتار ہوئے زمین جائداد سب ضبط ہوئی اور نیلام کردی گئی۔ بڑی کوشش سفارشوں سے جان بخشی ہو گئی۔

روہیلکھنڈ

بریلی۔ بدایوں۔ مراد آباد۔ بجنور۔ شاہجہانپور

گورنر روہیلکھنڈ
نواب[1] خان بہادر خاں شہید (بریلی)

نواب خان بہادر خاں حافظ الملک حافظ رحمت خاں والی روہیلکھنڈ کے پوتے تھے اُن کے والد کا نام نواب ذوالفقار خاں تھا جو بریلی کے گورنر رہ چکے تھے جن کے نام پر بازار ذوالفقار گنج شہادت گنج کے پاس اب تک بریلی میں موجود ہے۔ شعر وسخن میں کمال رکھتے تھے مصروف تخلص۔ جرأت کے شاگرد تھے۔ آپ کا ایک دیوان بھی تھا۔ مقاصد الصالحین آپ کی تصنیف ہے۔ دور انگریزی میں نواب خان بہادر خاں صدر امین کے عہدے پر تعینات تھے۔ تاریخ گلزار ی لال قلمی کے مصنف نے ۱۸۴۷ء میں خان بہادر خاں

[1] سید مصطفٰے علی صاحب بریلوی کا مضمون جو روزنامہ الجمعیتہ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا اس مضمون کا ماخذ ہے۔

کی تنخواہ ۲۵۵ روپیہ تحریر کی ہے۔ ہندوستانیوں کو اتنا بڑا عہدہ شاذ ونادر ہی دیا جاتا تھا ذاتی اعزاز واکرام خاندانی پنشن اور آرام وسکون کی زندگی حاصل ہونے کے باوجود خان بہادر خاں انگریزوں کی جابرانہ پالیسی اُن کے ظلم وستم اور ناانصافی سے سخت نالاں تھے۔ اتفاقاً بریلی چھاؤنی میں ایک اور انقلابی شخصیت جنرل بخت خاں روہیلہ کی موجود تھی جو انگریزی توپ خانہ کا ایک نہایت قابل اور محب وطن افسر تھا۔ جنرل بخت خاں نے بغاوت کی تنظیم[۵] اپنے دوست مدار علی خاں وغیرہ کے مشورہ اور اعانت سے کی اور ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء بروز اتوار وہ لاوا پھوٹ نکلا جس کی توقع کی جارہی تھی۔ چنانچہ بعض ہوشیار انگریزوں نے اپنے اہل وعیال کو احتیاطاً نینی تال روانہ بھی کر دیا تھا۔ تاریخ سلیمانی قلمی میں مرقوم ہے کہ بلوہ ہونے سے قبل مسٹر الیگزینڈر کمشنر روہیلکھنڈ نے نواب خان بہادر خاں سے کہا کہ امروز فردا میں بلوہ ہونے والا ہے۔ چونکہ یہ ملک آپ کا موروثی ہے اس کا بندوبست کیجئے۔ نواب نے تو اس وقت انکار کر دیا لیکن بعد کو جب جنرل بخت خاں روہیلہ معززین شہر اور فوج کے سربراہوں کے ہمراہ نواب کی خدمت میں تخت نشینی کا معروضہ پیش کرنے گئے تو کچھ پس وپیش کے بعد عنان حکومت سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا۔ مسند نشینی کی رسم پرانی کوتوالی کے سامنے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ انجام دی گئی۔ مسند نشینی کے واسطے خان بہادر خاں اپنی قیام گاہ واقع محلہ بھوڑ سے (آجکل یہ کوٹھی کھیڑہ) خان بہادر کہلاتی ہے)

---

[۵] روہیلکھنڈ میں بغاوت کی ابتدائی تنظیم جن کے ہاتھوں ہوئی اُن میں جنرل بخت خاں اور مدار علی خاں کے علاوہ محمد شفیع رسالدار (سواروں کی رجمنٹ ۸) جنرل نیاز محمد خاں۔ ظفر یار خاں اور سادات نو محلہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے تنظیم اس ہوشیاری اور قابلیت سے کی کہ انگریز افسروں کو وقت کے وقت تک حقیقت حال کا پورا اندازہ نہ ہوسکا (العلم جنگ آزادی نمبر۔ کراچی)

موجودہ نینی تال روڈ سے گذرتے ہوئے پُرانی کوتوالی آئے تھے۔ ایک چشم دید گواہ نے میرے عم بزرگوار اور مولوی سیّد الطاف علی صاحب بریلوی سے بیان کیا کہ چونکہ اتنے بڑے مجمع کو اعلیٰ درجہ کی سواریوں میں لیجانا ممکن نہیں تھا اس لئے نواب نے پیدل چلنا پسند کیا۔ نواب آگے آگے چل رہے تھے۔ سُرخ و سپید چہرہ بڑی بڑی آنکھیں۔ بلند و بالا قد سفید لمبی داڑھی۔ دائیں بائیں جنرل بخت خاں روہیلہ۔ دیوان سوبھا رام۔ مدار علی خاں اور دیگر معززین صف بہ صف مسلح چل رہے تھے۔ خان بہادر خاں نے حکومت سنبھالتے ہی ایک وار کونسل قائم کی۔ اندرونی معاملات دیوان سوبھا رام کے سپرد کیے۔ سوبھا رام بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ سادات نو محلہ (جن کے محلات موجودہ مسجد نو محلہ سے لیکر ڈاک خانہ موجودہ تک پھیلے ہوئے تھے) اور سیّد معصوم پیرزادہ (جو حافظ رحمت خاں والیٔ روہیل کھنڈ کے پیر کی اولاد میں سے تھے) کسی بات پر دیوان سوبھا رام سے ناراض ہوگئے۔ لیکن خان بہادر خاں نے اپنے بزرگوں کے پیر کے گھرانے تک کی رائے کو رد کرکے دیوان کو بحال رکھا۔ مالیہ وصول کرنے کے واسطے خان بہادر خاں نے باقاعدہ تحصیلدار مقرر کیے اور شدید مشکلات کے باوجود چند روز کی جد وجہد میں پورے روہیل کھنڈ میں نمونہ کا امن و انتظام قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس وقت جبکہ ہر طرف آگ برس رہی تھی روہیلکھنڈ دارالامن بنا ہوا تھا۔[1] خان بہادر خاں کو خوش قسمتی سے اپنے

۱؎ محترمہ سیّدہ انیس فاطمہ بریلوی جنھوں نے اپنی مشہور کتاب "۱۸۵۷ء کے چند ہیرو" لکھکر جنرل بخت خاں جیسے جانبازان حریت کا سب سے پہلے تعارف کرایا ہے اُنھوں نے دو روایتیں بھی قلمبند کی ہیں جو اپنے بزرگوں سے سُنی تھیں۔ اس زمانہ کے امن و امان کے سلسلہ میں انھیں محترمہ کی روایت ہے کہ "ہمارے دادا صاحب کو سیّد صاحب (سیّد وزیر علی صاحب) نے بتایا کہ خان بہادر خاں کے زمانہ حکومت میں پورا شہر ساری رات جاگتا رہتا تھا۔ بازار کھلے رہتے (باقی صفحہ ۳۶۰ پر)

ابتدائی ایام میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کا بھی کامل اعتماد حاصل ہوگیا تھا ٹھاکر جیمل سنگھ۔ رگھناتھ سنگھ آف بدھیلی اور ٹھاکران شیوگڈھ ونگریاسادات نے کامل اتحاد عمل سے کام لیا۔ رگھناتھ سنگھ کو خانبہادر خاں نے راجہ کا خطاب دیا اور پرگنہ فرید پور کا انچارج بنا دیا۔ ٹھاکر جیمل سنگھ کو کلکٹر کا عہدہ دیا گیا اور ایک ہزار روپیہ ان کی تنخواہ مقرر کردی گئی۔ نواب نے تقریباً ۳۰ ہزار فوج جمع کی ۴۰ توپیں مہیا کیں۔ اس فوج پر تقریباً ۲ لاکھ ۶۵ ہزار روپیہ ماہوار خرچ کیا جاتا تھا۔ نواب نے ٹکسال قائم کی۔ خان بہادر خاں کی مہر پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ الحکم للہ والملک للہ۔

فرمان شاہی

نواب نے جنرل بخت خاں روہیلہ کو دہلی روانہ کیا۔ وہاں جنرل کا بڑا اعزاز کیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر نے جنرل کو (لارڈ گورنر) کا خطاب دیا اور کل افواج شاہی کی کمان سپرد کردی۔ یہ بہادر جنرل آخر وقت تک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سڑکوں اور گلی کوچوں میں بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ مکمل امن وامان تھا۔ لوگ نواب کی انتظامی قابلیت اور رعایا پروری کے بڑے مداح تھے۔ مسجدیں مسافرخانے اور سڑکیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ امن وامان کی ڈونگی پیٹتے ہی ہر چیز ارزاں ہوگئی تھی تیل روپے کا پانچ سیر۔ گھی ڈھائی سیر اور گیہوں بیس سیر کے حساب سے فروخت ہو رہا تھا۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں کوئی تقریب نہ ہوتی ہو۔ لوگ خوش ہو ہو کر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے اور کہتے کہ خدا نے اپنی رحمت سے نصاریٰ کی حکومت سے ایسی نجات دلادی ہے کہ ہر چیز میں برکت ہوگئی ہے۔ اسلحہ سازوں کی دوکانوں پر بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ تلواروں پر دستے چڑھوائے جا رہے تھے۔ مجاہدوں کے غول کے غول زرہ بکتر سے لیس پورے شہر میں گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے۔ "اسلام کا بول بالا۔ زنگی کا مونھ کالا" کے نعروں سے زمین و آسمان ہل جاتے تھے (العلم کراچی جنگ آزادی نمبر اپریل تا جون ۱۹۵۷ء)

دادِ شجاعت دیتا ہوا مفقود الخبر ہوگیا۔

۱۲ر جون ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر شاہ دہلی نے نواب خان بہادر خاں کو اپنا نائب مقرر کیا اور خلعت سرفرازی وخطاب نواب انتظام الدولہ محافظ الملک خان بہادر خاں تنویر جنگ رئیس اعظم روہیلکھنڈ عطا کیا گیا۔ مرادآباد۔ بدایوں۔ شاہ جہاں پور اور بجنور میں خان بہادر خاں کی حکومت تسلیم کرلی گئی نواب مجو خاں مرادآباد میں۔ نواب کلن نبیرہ بخشی سردار خاں آنولہ میں۔ نواب غلام قادر خاں شاہ جہاں پور میں اور نواب محمود علی خاں بجنور میں نیابت کے فرائض انجام دینے لگے۔ مرادآباد میں عباس علی خاں (نبیرہ نواب دوندے خاں والی مرادآباد) بھی امیدوار نظامت تھے اس لئے آپس میں سخت رسہ کشی شروع ہوگئی۔ خان بہادر خاں نے انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی غرض سے جنگ آزادی کے بیشتر رہنماؤں مثلاً نانا راؤ، سید احمد اللہ شاہ دلاور جنگ، فیروز شاہ۔ نواب تفضل حسین خاں والی فرخ آباد وغیرہم سے برابر خط وکتابت رکھی اور دامے، درمے، قدمے معاون رہے

نینی تال پر چڑھائی

دہلی سے باضابطہ اجازت ملنے نیز ابتدائی ملکی و مالی انتظام کرنے کے بعد خان بہادر خاں کی توجہ اصل دشمن کی طرف ہوئی جو نینی تال میں موقع کی تاک میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ذرا سا سکون پاتے ہی انگریز روہیلکھنڈ پر حملہ آور ہونگے۔ چنانچہ انھوں نے بنے میر خاں اپنے پوتے کی سرکردگی میں ایک زبردست فوج روانہ کی لیکن یہ فوج بہیڑی سے آگے نہ بڑھی۔۔۔ ۲۰ر اکتوبر ۱۸۵۷ء میں علی خاں میواتی کے تحت ایک تازہ دم فوج بریلی سے روانہ ہوئی۔ یہ فوج یلغار کرتی اور ترائی کے جنگلات سے گزرتی ہوئی دامنِ کوہ میں کاٹھ گودام

تک پہنچ گئی لیکن اس دوران میں ملکی غداروں کی مدد سے دیسی فوج کی نقل و حرکت کی مکمل اطلاع انگریزوں کو پہنچ گئی۔ چنانچہ اعلیٰ درجہ کی خبر رسانی، عمدہ توپ خانہ اور پہاڑی پوزیشن کی وجہ سے انگریزوں کو عارضی فتح حاصل ہوگئی۔ بریلی گزیٹر کے مصنف نے اس واقعہ کے سلسلہ میں حقیقی غداری کا اقبال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس شکست کا نتیجہ دیکھ کر خان بہادر خاں انگریزی لکھنے اور پڑھنے والوں کو گرفتار کرنے پر مجبور ہوگئے کیونکہ ان کو بجا طور پر شبہ تھا کہ کچھ لوگ نینی تال سے نامہ و پیام رکھتے ہیں۔ پانچویں کالم کی روک تھام کرنے کے بعد ایک نئی فوج چیدہ چیدہ نوجوانوں پر مشتمل حیدر خاں و فضل حق خاں کی کمان میں کاٹھ گودام گئی اور کمال دلیری اور بہادری کے ساتھ رات کی تاریکی میں نینی تال پہونچنے کے واسطے پہاڑی علاقہ طے کرنے لگی۔ ایک خطرناک موڑ پر انگریز سپاہ سے بڑے گھمسان کی جنگ ہوئی۔ ایک بہادر افسر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ لال ڈانگی پہنچ گیا لیکن شیرازہ منتشر ہوجانے کی وجہ سے یہ مہم بھی ناکام رہی۔ فروری ۱۸۵۸ء میں خان بہادر خاں نے آخری زبردست کوشش نینی تال فتح کرنے کی کی اور فضل الحق و کالے خاں اور محمود خاں کو مستقلاً اس مورچہ پر تعینات کردیا۔ ان لوگوں نے اس قدر جانبازی سے کام لیا کہ انگریز میدان میں اُترنے کی ہمت نہ کرسکے باوجودیکہ گورکھوں کی پوری پوری مدد ان کو حاصل ہوچکی تھی۔ اگست ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو نینی تال غیر محفوظ مقام معلوم ہونے لگا اور اُنھوں نے اپنے بال بچوں کو الموڑہ بھیج دیا۔ (بریلی گزیٹر) مولوی ذکاءاللہ صاحب دہلوی نے اس وقت کی روہیلکھنڈ کی بغاوت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جن ضلعوں میں بغاوت ہوئی وہ روہیلکھنڈ کی بغاوت کے آگے خفیف تھی اسوقت بریلی شہر میں غضب کا جوش و خروش تھا۔ ظہیر دہلوی داستان غدر میں تحریر فرماتے ہیں "بریلی میں ہر طرف کے

مفرورین کا اجتماع ہے اور سب سردار مثلاً نانا راؤ، فیروز شاہ وغیرہم جمع ہیں۔ رام پور کے تیس ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں اور مردمان رام پور کا یہ حال ہے کہ ایک ایک تھان دوپٹہ کا سر سے بندھا ہوا اور آدھا آدھا گھوڑے کے رکاب سے لٹکتا ہوا ہے۔ چار چار طمنچے کمر میں لگے ہوئے ہیں دوہری تلواروں میں ڈاب رکھی ہوئی ہے گھوڑوں پر سوار ہیں اور شہر میں گھوڑے کداتے پھرتے ہیں پچاس ہزار کا اجتماع بریلی میں موجود ہے۔ یہ وقت خان بہادر خاں کے عروج کا تھا۔

ریاست رامپور کی مخالفت

نواب یوسف علی خاں والئ ریاست رام پور انگریزوں کے بڑے خیر خواہ تھے اور ایجنٹ تھے۔ مراد آباد پر زبردست فوج لیکر چڑھ دوڑے۔ نواب رام پور کے خاندان کو حافظ رحمت خاں کے خاندان سے پرانی کاوش تھی وہ جانتے تھے کہ حافظ رحمت خاں کے خاندان کے معزز فرد "خان بہادر خاں" کے سامنے اُن کا چراغ جل نہیں سکے گا۔ علاوہ ازیں انگریزوں کی غلامی رگ رگ میں سما چکی تھی۔ جب انگریز نینی تال بھاگ گئے تو نواب یوسف علی خاں نے اُن سے روہیلکھنڈ پر قبضہ کرنے کی اجازت طلب کی ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مصنف اخبار الصنادید اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ نواب نے نینی تال لکھا "یہ موقع بہت مناسب ہے اگر آپ منظور کریں تو ہم روہیلکھنڈ میں حکومت قائم رکھیں" (انگریزوں کی طرف سے) کیونکہ جب تقویت کامل ہو جائے گی (خان بہادر خاں کی) تو پھر اجرائے حکومت میں مدتوں مشکلیں ہوں گی اور ریاست (رامپور) کو خطروں میں مبتلا ہونا پڑے گا۔

انگریز پُورے یہودی ٹھہرے ایسے نازک وقت میں اپنے یاروفادار پر بھی پورا بھروسہ نہ کرسکے اور ۴ رجون ۱۸۵۷ء کو پیغام دیا کہ آپ صرف ضلع مرادآباد پر حکومت کرسکتے ہیں نواب یوسف علی خاں کا مرادآباد پر عارضی قبضہ ہوگیا تھا لیکن نواب مجوّنے نوابی فوج کو شکست دیکر دوبارہ حکومت قائم کرلی (اخبار الصنادید میں بڑی تفصیل کے ساتھ نواب یوسف علیخاں کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے) خود رامپور کے عام ریاستی فوجیوں کی یہ حالت تھی کہ وہ علی الاعلان کہتے تھے کہ "ہم اب خان بہادر خاں کی نوکری کریں گے"

نواب کی طرف سے نینی تال کو بہت بڑی مقدار میں سامان رسد اور نقد روپیہ علی بخش خاں کی معرفت بھیجا جاتا تھا (خدا کی عجیب قدرت نظر آتی ہے کہ انہی علی بخش خاں کے پوتوں (مولانا محمد علی و شوکت علی مرحوم) نے آزادی ہند کے واسطے عظیم الشان جدوجہد کی)

جنرل بخت خاں کا رامپور پر دھاوا

دربار رامپور کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے باخبر ہوکر جنرل بخت خاں ایک مضبوط فوجی دستہ لے کر رامپور پر حملہ آور ہوئے ساتھ ہی خان بہادر خاں نے اعلان کیا کہ شمسہ تاج دار بیگم بنت نواب سید احمد علی خاں ریاست کی جائز حکمراں ہیں ان کو ریاست کا حکمراں بنایا جائے گا۔

رام پُور کے خاندانی جھگڑوں میں حکومت ایک ہی خاندان کے دوسرے فریق کو منتقل ہوگئی تھی اور جائز حکمراں محروم تھے - نواب یوسف علی خاں نے جنرل بخت خاں کا مقابلہ نہیں کیا - جنرل نے شہر و قلعہ کی مضبوط ناکہ بندی کرنے کے بعد نواب کے سامنے بہت سخت شرائط رکھیں - (۱) ولی عہد ریاست جنرل کے ساتھ مع فوج دہلی انگریزوں کے خلاف لڑنے جائیں گے (۲) ریاست رام پور حکومت روہیلکھنڈ کو وافر مالی امداد دے گی۔

حافظ احمد علی خاں شوق (مولانا محمد علی مرحوم کے چچا زاد بھائی) جنرل بخت خاں کے حملہ کا حال لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ " ۹ر جون ۱۸۵۷ء کو بخت خاں کئی ہزار فوج کے ساتھ رام پور آیا۔ مولوی سرفراز علی اس کی طرف سے سفیر تھے۔ تمام شہر کو مورچہ بند کیا شہر کے مقصد خود جا کر بخت خاں کو بھڑکاتے تھے ان کا منشا تھا کہ روپیہ دیا جائے اور ولی عہد بہادر ریاست مع فوج کے دہلی کو ساتھ چلیں۔ یہ مرحلہ سب سے زیادہ سخت تھا علی بخش خاں نے اس مرحلہ کو بلطائف الحیل طے کیا اور ۱۳ر جون کو بخت خاں رام پور سے چلا گیا۔ نواب نے ازراہِ چاپلوسی جان بچانے کی خاطر جنرل بخت خاں کو خوب رسد بھجوائی اور مبالغہ کی حد تک مولوی سرفراز علی کی عزت افزائی کی اور اس طرح اپنے آپ کو بچا لیا"

لیکن جنرل بخت خاں نے رامپور کی ریاست کو ختم کرنے کے بجائے صلح کر لی۔ یہ اُن کی سیاسی غلطی تھی جس کے نتائج بعد کو ظاہر ہوئے۔

نواب یوسف علی خاں اپنی حملہ کارروائیوں کی اطلاع علی بخش کے ذریعہ انگریزوں کو بھیجتے تھے اور اُن کے جاسوس روہیلکھنڈی مجاہدوں کی فوج میں افراتفری پھیلاتے، نیز نقل و حرکت کی اطلاعات بہم پہنچانے کا کام کرتے تھے اخبار الصنادید کے مصنف نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے دیسی فوج کی چابکدستی کا اندازہ ہوتا ہے۔

" ایک بار علی بخش خاں دس بارہ گاڑیاں رسد کی لیکر گئے۔ شفاخانہ (بازپور) میں صاحب کمشنر کے گارد کے سپرد کر کے چلے گئے۔ جب گارد اسباب لے کر شفاخانہ سے بڑھا تو ناگہاں خان بہادر خاں کی فوج نے آ لیا اور تمام اسباب لوٹ کر لے گئی۔

حالات کی تبدیلی خان بہادر خاں کی شکست

خان بہادر خاں کو رام پور کی غداری، روپیہ کی کمی اور آپس کے نفاق

کی وجہ سے ہر فوجی مہم میں ناکامی ہو رہی تھی۔ مگر وہ ہمت ہارنے والے آدمی نہیں تھے لیکن جب دہلی اور لکھنؤ کے زبردست مورچے انگریزوں کے قبضہ میں پہونچ گئے اور روہیلکھنڈ انگریزوں کی ابھری ہوئی قوت کے مقابلہ میں واحد علاقہ رہ گیا تو نینی تال کے انگریز بھی امدادی فوجیں آجانے پر دلیرانہ ٹوٹ پڑے۔ یہاں حوصلے پست ہو چکے تھے۔ تاہم خان بہادر خاں نے شاہزادہ فیروزشاہ بنڈے میر خاں ولی داد خاں وغیرہم کی سرکردگی میں شہر سے ۵ میل باہر نکٹیا ندی کے کنارے مورچہ قائم کیا اور بذاتِ خود مورچہ سنبھالا صبح صادق سے بہت بڑے علاقہ میں دست بدست اور توپ تفنگ کی جنگ ہوتی رہی کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ شہزادہ فیروزشاہ ولی داد خاں بنڈے میر خاں اسمٰعیل خاں وغیرہم نے حق مردانگی ادا کر دیا۔ خان بہادر خاں کی فوج میں ۱۳۳ مجاہد بھی تھے جو بلا مبالغہ سر سے کفن باندھ کر نکلے تھے ان مجاہدین کی ایک تصویر ایک انگریز کے قلم سے جو گورا پلٹن ۹۳ میں سرجنٹ منیجر تھا۔ قابل ملاحظہ ہے۔ کتاب کا نام ۵۷ء کے معرکوں کی یادداشت ہے۔ سرجنٹ منیجر لکھتا ہے۔

"خان بہادر خاں کی فوج میں غازیوں کی ایک جماعت بھی تھی جو بلاشبہ سر سے کفن باندھ کر جان دینے اور جان لینے کے ارادہ سے آئی تھی یہ مسلمان شوق شہادت کے نشے میں چور تھے۔ ان کی داڑھیاں سفید تھیں۔ انگلی میں چاندی کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھے جس کے نگینہ پر اللہ کندہ تھا۔ ہر غازی کی کمر میں سبز رنگ کا پٹکا بندھا ہوا تھا وہ روئی کی صدری پہنے ہوئے اور سر پر سفید پگڑیاں باندھے ہوئے تھے جن پر سرخی کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے، انکے ہاتھ میں تلوار تھی اور پشت پر ڈھال۔ دین کا

نعرہ لگا کر ہمارے سامنے آئے اور حملہ آور ہونے سے پہلے اُن کا سردار جو ایک بیس سال کا بے ریش و بروت نوجوان تھا جس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ صف سے آگے بڑھ کر ہم سے یوں مخاطب ہوا کیا تم کافروں میں کوئی حوصلہ مند ہے؟ جو میرا مقابلہ کر سکے۔ اگر ہو تو سامنے آئے۔ اس کی آواز پر ہماری صفوں میں سناٹا چھا گیا کوئی نوجوان آگے نہیں بڑھا۔ ایک منٹ بعد پھر بھی چیلنج دیا اور کہا میں پانچ آدمیوں سے تنہا مقابلہ کر سکتا ہوں لیکن پھر بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔ آخر جھنجھلا کر اس نے تلوار میان سے باہر نکالی اور ہماری صفوں پر حملہ آور ہوا اُس نے اس شدت سے حملہ کیا کہ چشم زدن میں اٹھارہ سپاہیوں کو زخمی کر کے ڈال دیا۔ اس کی بے نظیر شجاعت سے کمانڈنگ آفیسر اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے حکم دیا کہ اس نوجوان کو زندہ گرفتار کیا جائے لیکن اُس نے کہا تم زندہ شیر کو گرفتار نہیں کر سکتے چنانچہ زخمی ہو جانے کے باوجود جبکہ اُس کے جسم کے ہر عضو سے خون کے فوارے اُبل رہے تھے اُس نے دوبارہ اسی شدت کے ساتھ حملہ کیا۔ جب کمانڈنگ آفیسر نے یہ دیکھا کہ اگر اس کو قتل نہ کیا گیا تو شاید ساری کمپنی (سو آدمیوں کی ایک کمپنی) کا صفایا کر دے تو مجبوراً اُس نے حکم دیا کہ سنگینوں سے خاتمہ کر دو۔ یہ سُنکر سپاہیوں نے اُسے نرغہ میں لیکر اپنی سنگینیں بیک وقت اُس کے سینہ میں پیوست کر دیں لیکن جب تک اس کی روح جسم میں باقی رہی وہ برابر تلوار کے جوہر دکھاتا رہا اُس کا

ہاتھ اُس وقت ساکن ہوا جب اُس کی روح پرواز کر گئی۔" ؎۱

خود انگریزی فوج کا کمانڈر "سرکولن" بھی ایک غازی کے ہاتھوں واصل جہنم ہوتے ہوتے رہ گیا۔ سرکولن گھوڑے پر سوار ایک کمپنی سے دوسری کمپنی میں دیکھنے جا رہا تھا کہ ایک غازی پر اُس کی نظر پڑی۔ زخموں سے چور۔ مردہ شکل۔ گھوڑے کی ٹانگوں کے پاس تھا کہ دفعتہً کودا اور سرکولن پر تلوار سے حملہ کرنے لگا۔ اگر سرکولن کا محافظ سکھ فوراً تلوار سے غازی کی گردن نہ اڑا دیتا تو نیم بسمل غازی نے سرکولن کا کام تمام کر دیا تھا

آخری لڑائی شہر کے متصل موجودہ کنٹونمنٹ کے قریب ہوئی۔ اس مرحلے پر مسلسل لڑتے لڑتے تھک جانے والے فوجیوں کو امداد پہونچانے کی غرض سے کچھ نئے بھرتی شدہ فوجی بھیجے گئے۔ وہ جنگ کی گرما گرمی برداشت نہ کر سکے اور بھاگ نکلے۔ خان بہادر خاں نے اُن کا کورٹ مارشل کیا اور سزائیں دے کر دوبارہ میدان جنگ میں بھیجا لیکن بزدلوں نے بہادروں کو بھی ڈرپوک بنا کر سارا کھیل بگاڑ دیا اور نواب کی فوجوں کو شکست ہوگئی۔ ۵ مئی ۱۸۵۸ء کی شب باشندگان بریلی کے واسطے بڑی قیامت کی رات تھی۔ سارا شہر بھاگ رہا تھا۔ افرا تفری کا عالم تھا۔ جان مال آبرو غرض کوئی چیز محفوظ نہیں تھی۔ خان بہادر خاں نے سخت پریشانی کے عالم میں گوریلا جنگ جاری رکھنے کا پروگرام بنایا اور راتوں رات ترائی کے جنگلات میں نکل گئے۔ ادھر انگریزی فوج اس وجہ سے شہر میں داخل نہیں ہوئی کہ اس کو گلی گلی لڑائی ہونے و اتلاف جان کا خطرہ تھا۔ جب دوسرے دن انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی تو اکثر محلے کے محلے

؎۱ بدایوں کا جہاد حریت از مولوی محمد سلیمان صاحب بدایونی مطبوعہ العلم بابتہ جولائی ستمبر ۱۹۵۵ء
ایضاً میلی سن جلد چہارم ص ۳۶۸

ویران تھے جو مرد و زن باقی رہ گئے تھے وہ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ مکانات کو آگ لگا دی گئی۔

انجام[1] ۱۸۵۹ء تک نواب خان بہادر خاں انگریزوں سے گوریلا جنگ لڑتے رہے۔ ایک مرتبہ دست بدست جنگ کرتے ہوئے گھوڑے سے گر پڑے۔ ابھی اُٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار کر لئے گئے اور لکھنؤ لیجا کر انگریزوں کے سپرد کر دیئے گئے۔ وہاں سے بریلی لائے گئے۔ جب چیف کمشنر کی عدالت میں پیش کیے گئے تو زمین پر بیٹھ گئے اور کہا مدتوں کرسیوں پر بیٹھے اب قیدیوں کی جگہ بیٹھنا ہے۔ لیکن چیف کمشنر نہیں مانا اور بغلوں میں ہاتھ ڈلوا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ جب مقدمہ شروع ہوا تو خان بہادر خاں نے بڑی دلیری اور مردانگی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک برجستہ تقریر کی اور کہا "چونکہ کل روہیلکھنڈ ہمارا ملک موروثی تھا اس وجہ سے بخت خاں اور جملہ رعایا نے مجتمع ہو کر مجھ کو مسند نشین کیا جس وقت آپ صاحبان نے فوج کے ظلم سے مجبور ہو کر ملک چھوڑ دیا تب میں نے اپنا قبضہ کیا۔ باقی رہی بلوائیوں کی روک تھام تو یہ میرے اختیار میں نہ تھی۔ انھوں نے جو چاہا کیا۔ بعد از ان

---

[1] بوائیں میں ظہور | محترم غلام رسول مہر صاحب میلی سن جلد پنجم ص۱۹۱ و ص۱۹۲ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:۔ مولانا احمد اللہ کی شہادت کے بعد مجاہدوں اور آس پاس کے زمینداروں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ راجہ پوائیں کو اس غداری کی کہ اس نے مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کو دھوکے سے شہید کرا دیا۔ عبرتناک سزا دیں گے۔ اس موقع پر جہاں نظام علی خاں۔ نواب تفضل حسین خاں۔ ولایت شاہ۔ علی خاں میواتی اور بعض دوسرے مجاہد فوج لیکر جمع ہوئے وہاں خان بہادر خاں بھی چار ہزار جانبازوں کے ساتھ ان کے ہمراہ تھا۔ نظام علی خاں اور علی خاں میواتی نے اس سلسلے میں پیلی بھیت پر بھی حملہ کیا۔

لڑائیاں جابجا سر میدان میری اور آپ کی فوج سے البتہ ہوئیں۔ ان میں طرفین کا کشت و خون ہوا اس میں میری کیا خطا ہے

عروس ملک کسے در کنار گیرد تنگ
کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار زند

اب آپ کے بس میں ہے جو چاہے حکم دیجیے۔ چنانچہ اوائل ۱۸۶۰ء میں پرانی کوتوالی کے سامنے نواب خان بہادر خاں کو پھانسی دے دی گئی [1]

حیات حافظ رحمت خاں میں سید الطاف علی بریلوی لکھتے ہیں۔
"پھانسی کے بعد لاش بریلی ڈسٹرکٹ جیل میں دفن کر دی گئی۔ ایک خاندانی بزرگ نے جو دفن کے وقت موجود تھے خان بہادر خاں کی لاش کو بغیر کفن قبر میں رکھتے ہوئے دیکھ کر اُن کے چہرہ پر اپنا رومال ڈال دیا قیصر التواریخ میں صفحہ ۲۹۶ پر درج ہے کہ ورثاء نواب نے نعش طلب کی جواب دیا گیا تم اسے شہید بنا کر قبر پر میلہ کرو گے کہ ہماری تکلیف کا باعث ہوگا بعد اس کے قلعہ میں گڑوا دیا۔ بعض ثقہ روایتیں یہ ہیں کہ خان بہادر خاں کی لاش ڈسٹرکٹ جیل بریلی کے دوسرے اور تیسرے پھاٹک کے درمیانی حصے میں ازراہِ تحقیر دفن ہے۔ چونکہ شورش کا اندیشہ سخت تھا اس لئے انگریزی فوج اور توپ خانہ سے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔

---

[1] آخری وقت میں اُن سے کہا گیا کہ کچھ نصیحت و وصیت کرنی ہو تو کیجئے۔ آپ نے فرمایا مجھے کچھ نہیں کہنا پھر آبدیدہ ہو کر یہ شعر پڑھا۔

بجرم کلمہ حق مے کشند و غوغا نیست
زمرگ زندگیم مے شود غوغا نیست

(غلام رسول مہر)

بدایوں - اور اُس کی تاریخی عظمت

شمالی ہند کے دورِ اول کے فتوحات میں بدایوں[1] ہے یہ دورِ قطبی و شمسی میں قبۃ الاسلام کے نام سے مشہور رہا۔ اسلامی عہد کا پہلا ناظم بدایوں کا قطب الدین[2] ایبک تھا۔ دوسرا شمس الدین التمش (۶۰۰ھ لغایتہ ۶۰۷ھ) سید علاء الدین (۷۴۸ھ لغایتہ ۸۷۹ھ) شاہ دہلی نے ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء میں دہلی کو خیرباد کہہ کر بدایوں کو پایۂ تخت بنایا اور وہیں دفن ہوا۔ سلطان محمود غزنوی نے ۴۰۸ھ/۱۰۱۷ء میں جب قنوج پر حملہ کیا اور دریائے گنگا کے کنارے پر خیمہ زن ہوا وہ جگہ ریاست[3] بدایوں کی تھی اس وقت دھرم پال وہاں کا راجہ تھا اور کان[4] سین وزیر تھا جو نہایت فرزانہ اور ہوشیار تھا۔ از راہ دور اندیشی وہ سلطان کی خدمت میں گراں بہا تحائف وہدایا لیکر حاضر ہوا[5]۔ سلطان نے نذر قبول کر کے وزیر مذکور کو خلعت سے سرفراز کیا اور راجہ کے لئے تحائف دیئے۔

ہندوؤں کے عہدِ حکومت میں شہر بدایوں کی آبادی سات[6] لاکھ اکیاسی ہزار تھی سلطان محمد تغلق کے زمانہ حکومت[7] ۷۲۹ھ میں ہند کی خانہ شماری اور مردم شماری ہوئی

---

[1] بدایوں کی فتح منتخب التواریخ ۵۹۱ھ فرشتہ ۵۹۹ھ [2] قطب الدین خود ایک سال بدایوں رہا پھر اپنا نائب سپہ سالار ہزبر الدین حسن ارنب کو کیا۔ کنز التاریخ [3] عمدۃ التاریخ جغرافیہ بدایوں۔ بدایوں کے جنوب مشرق سرحد پر قنوج کا ضلع فرخ آباد ہے دریائے گنگا ہر دو اضلاع کے درمیان ہے اس وقت فرخ آباد نہ تھا قنوج تھا۔ سورج پور کا گھاٹ برسوں سے مشہور چلا آرہا ہے [4] کان سین نام کا محلہ اس وقت تک بدایوں میں ہے اور قصبہ اوسہت ضلع بدایوں میں کان سین کی چھتری ہے [5] عمدۃ التاریخ مولفہ مولوی عبدالحیٔ مرحوم

[6] عمدۃ التاریخ۔

[7] ایضاً یہ پورا مضمون جو صفحہ ۳۹۲ پر ختم ہوتا ہے محترم ایوب صاحب بی، اے کا مرتب فرمودہ ہے۔

اس وقت شہر میں ستائیس ہزار پانسو نوے مکانات پختہ۔ تین سو اکیاسی مساجد و تین مندر[۵۱]۔ چار لاکھ اناسی ہزار سات سو ایک اشخاص کی آبادی تھی۔

عہد اکبری[۵۲] میں شہر کی آبادی ایک لاکھ اکتیس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ بدایوں حکومت اسلامی کی ابتدا سے دہلی کا صوبہ رہا۔ انحطاط سلطنت مغلیہ سے روہیلوں کا مرکز رہا اپنی طاقت و عظمت کی بربادی[۵۳] پر نواب وزیر اودھ کا ماتحت ہوا۔ ۱۲ر نومبر ۱۸۰۱ء سے بدایوں انگریزی حکومت کا حصہ قرار پایا۔ اودھ کی عنان حکومت اس وقت نواب سعادت علی خاں کے ہاتھ میں تھی۔

انگریزوں نے اپنے مقبوضہ روہیلکھنڈ کے دو ضلع یا صدر مقام بنائے۔ ایک مراد آباد دوسرا بریلی۔ بدایوں کو بریلی میں شامل کیا۔ ۳۱ر اکتوبر ۱۸۲۳ء کو جدید رد و بدل کرکے ایک ضلع سہسوان[۵۴] بنایا اور بدایوں کو سہسوان میں رکھا۔ مئی ۱۸۳۸ء

---

۵۱ کنز التاریخ مطبوعہ ۱۹۰۷ء اب بدایوں میں اٹھائیس مندر اور اٹھانوے مساجد ہیں
۵۲ آئین اکبری۔ اس وقت آبادی ۵۲۹۶۶ - ۱۹۵۱ء ۵۳ ۱۷۷۴ء میں نواب شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں میں لڑائی کٹرہ میران پور میں ہوئی۔ روہیلوں کو شکست ہوئی حافظ صاحب اس لڑائی میں کام آئے۔ ۵۴ سہسوان بدایوں سے غرب میں ۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔ سہسرا باؤ نام کے راجہ نے آباد کیا تھا اور ایک قلعہ بھی بنایا تھا۔ ڈھنڈ نام کی جھیل بہت بڑی اس میں ہے۔ قصبہ گنجان آباد نہیں ہے۔ کیوڑہ کی کاشت خصوصی چیز ہے۔ محمد شاہ تغلق کے زمانہ کی ایک مسجد آثار الصنادید میں ہے۔ یہ خطہ بہت مردم خیز ہے۔ بڑے بڑے علماء فضلاء کا مسکن رہا ہے۔ چند حضرات کے نام درج ذیل ہیں:۔ شمس العلماء مولوی امیر احمد جو غالباً ہندوستان کی پہلی کھیپ کے شمس العلماء رہے یہ خطاب ان کو ۱۳۰۵ھ میں ان کی ادبیت کی بناء پر ملا تھا اگلے سال ۱۳۰۶ھ میں آپ کی وفات ہو گئی شمس العلماء مولوی محمد امین جج جبلپور۔ المتوفی ۱۹۲۹ء۔ علامہ مولوی امیر حسن۔ مولوی عبد الباری مشہور مناظر جن سے پادری لوگ مقابل آتے گھبراتے تھے۔ المتوفی ۱۳۰۳ھ۔ مولوی (باقی ۳۷۳ پر)

میں سہسوان سے صدر مقام کو منتقل کرکے بدایوں ضلع کا صدر کیا گیا اور سہسوان تحصیل رہی۔ اس وقت سے اس وقت تک دونوں اسی حال پر چل رہے ہیں۔

مجسٹریٹ ضلع

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت بدایوں کا مجسٹریٹ ضلع مسٹر ایڈورڈس تھا۔ اس نے مصائب غدر کے نام سے ایک روزنامچہ مرتب کیا ہے جس کا ترجمہ اردو میں مولوی نذیر احمد نے کیا ہے جو منشی نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ مسٹر ایڈورڈس کے پاس ضلع کا چارج ۵ مئی ۱۸۵۷ء سے تھا۔ یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ جب کسی حکومت میں انقلاب رونما ہوتا ہے تو پہلے امن و امان، سکون و اطمینان مفقود ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ بدامنی، انتشار، لوٹ مار، خونریزی مسلّط ہوتی ہے۔ انقلاب کے بعد جو حکومت برسراقتدار ہوتی ہے اگر اس کے عمال ہوشیار اور فرض شناس ہوتے ہیں تو جلد حالات پر قابو پالیتے ہیں اور اگر برعکس اس کے راشی، عیاش، جاہ پرست باہمی رقابت و سازش کا شکار ہوتے ہیں تب دوسرے انقلاب کا انتظار ہوتا ہے۔

ابتدار

بدایوں ضلع میں سب سے پہلا ہنگامہ ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا اگرچہ ملک میں سیاسی بےچینی کی ابتدا ۱۰ مئی سنہ مذکورہ کو شروع ہوگئی تھی۔ موضع بہٹہ گوسائیں میں خربوزوں کی گاڑی کو روز روشن میں لوٹ لیا۔ جب پولیس تفتیش حالات کو گاؤں گئی تب اس کو زدوکوب کیا۔ پولیس ڈر گئی اور موقع پر سے بھاگ

بقیہ حاشیہ ص ۳۷۲۔ محمد بشیر کی بابت صرف اس قدر بتا دینا کافی ہے کہ اسحاق بن عبدالرحمٰن بن حسن بن محمد النجدی کو مولوی صاحب سے شرف تلمذ تھا۔ المتوفی ۱۳۲۶ھ۔ آبادی میں اکثریت مسلمانوں کی ہے کل آبادی ۲۲۴۲۱۔

آئی۔ اسی دوران میں موضع بنورا بیورا تھانہ رجپورہ کے اہیروں نے بشمول موضع عزیز پورہ وغیرہ کے موضع جناوی میں آگ دیدی۔ موضع کنور پور کے ٹھاکروں نے ایک سرکاری سوار کو قتل کر دیا۔ موضع بترپا کے اہیروں نے دو ٹھاکر زمینداروں کو جو موضع اسد پور کے باشندہ تھے قتل کر دیا اور موضع بناور کے ٹھاکروں نے یوسف علی خاں کو قتل کر دیا۔ ان حالات کا اثر عام طور سے سارے ضلع پر ہوا۔

اسباب بغاوت

مسٹر ایڈورڈس مجسٹریٹ ضلع نے اپنے روزنامچہ میں اسباب بغاوت ان الفاظ میں دکھائے ہیں۔

"بلوے سے ایک برس بلکہ آگے میں نے حکام اعلیٰ سے صاف صاف بیان کر دیا تھا کہ دیوانی کی عدالتیں اپنے اختیارات بہت بُری طرح سے عمل میں لاتی ہیں ان کا یہ طریقہ بے ٹھور ٹھکانہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے قرضوں کے لئے منافع وموافق آراضی نیلام کروا ڈالتے ہیں اور اس سبب سے انتظام مدن میں خطرناک رد و بدل پیدا ہوتا ہے پچھلے بارہ یا پندرہ برسوں میں ایسے نیلام بڑی کثرت سے ہوئے اور تحصیل مالگذاری کے ایسے طریقے جاری ہوئے کہ ملک کے رئیس لوگ برباد ہو گئے اور دیہات کے جتھے ٹوٹ گئے۔

جنگ آزادی

۱۹ر مئی ۱۸۵۷ء سے بدایوں کے مفصلات میں لوٹ مار شروع ہوئی مگر شہر میں سکون تھا دوسری جگہوں سے خبریں آرہی تھیں۔ ۲۵ر مئی ۱۸۵۷ء کو عید الفطر تھی۔ کسی نے مجسٹریٹ ضلع کو خبر دی کہ اہل اسلام نماز عید پڑھکر بلوہ کریں گے۔ وہ اس خبر سے متاثر ہوا شہر کے سر برآوردہ مسلمانوں کو اپنے بنگلہ پر بلاکر بٹھالیا۔ یہاں تک کہ نماز کا وقت گذر گیا۔ اس کے ذہن

نارسا میں بلوے کا انحصار نماز عید پر تھا۔ اس نے تصویر کے دوسرے رُخ کو اپنی نخوت وتکبّر میں دیکھا ہی نہیں کہ اس مداخلت فی الدین سے نفرت وغصّہ زیادہ ہوگا۔ غیور مسلمانوں پر اس کی احمقانہ حرکت کا وہی اثر ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ انگریز سے تنفر وکینہ میں اضافہ ہوا اگرچہ فوری انتقام کا جذبہ بربنائے مصلحت رک گیا۔ مگر عوام میں کافی ہیجان پیدا ہوگیا۔

۲۷ رمئی تک ضلع مجسٹریٹ کو انتہائی وحشت رہی جس قدر انگریز شہر و مضافات میں تھے سب خوف وہراس سے مجسٹریٹ ضلع کے بنگلہ پر جمع ہوگئے۔ ۲ رجون کو بریلی سے ایک جماعت جو انگریزوں کے خلاف تھی آئی۔ نمبر ۶۸ جو خزانہ بدایوں پر متعین تھا اس نے خزانہ لوٹ لیا جیل خانہ ٹوٹ گیا۔ پولیس والے وردیاں پھینک کر بھاگ گئے جلندھری سرائے۔ پیران سرائے۔ نئی سرائے۔ ناہر خاں سرائے۔ محلہ براہم پور۔ بنگلہ شرقی موضع رسولپور کے لوگ بریلی سے آنے والی فوج کے ساتھ ہوگئے۔ مرزا منصور بیگ کی قیادت میں بنگلہ شرقی۔ محلہ براہم پور۔ محلہ پٹھانی سرائے۔ نئی سرائے والوں نے منصفی اور کوتوالی کے دفتر جلا دیئے۔ مرزا منصور بیگ رسالدار تھے۔ مسٹر ایڈورڈس معہ اپنے چھ سات مہمانوں اور دو اردلیوں کے شیخوپور[1] پہنچے۔

---

[1] شیخوپور تین میل کے بُعد پر بدایوں سے سوت ندی کے کنارے پر آباد ہے۔ نواب فرید خاں نے عہد عالمگیر میں آباد کیا اور ایک قلعہ تعمیر کیا اور معہ اپنے اہل خاندان کے بدایوں سے سکونت ترک کر کے توطن اختیار کیا۔ آبادی قصبہ کی ۳۸۲۴

شیخ شرف الدین[۱] نے ایک رات ان لوگوں کو اپنی حفاظت میں رکھ کر موضع گکوڑہ[۲]
جو ان کی زمینداری کا گاؤں تھا پہونچایا۔ گکوڑہ میں غلام نبی خاں اور نیچے سنگھ انگریزوں
کے پناہ دہندہ تھے۔ وہاں سے وہ لوگ ایٹہ۔ فرخ آباد ہوتے ہوئے ہردوئی پہنچے
بریلی سے آنے والی فوج نے انگریزوں کو تلاش کیا۔ خالی بنگلوں کو نذر آتش
کیا۔ شیخوپور میں انگریزوں کی موجودگی کی خبر پاکر وہاں پہنچے۔ گوہر مقصود کو وہاں نہ پاکر
بغیر کسی مزاحمت یا نقصان کے لوٹ آئے۔

۳۱ مئی سے ایک دن قبل مسٹر الیگزینڈر کمشنر نے بریلی میں خان بہادر خاں
سے جو خاندان حافظ الملک کے ایک معزز رکن تھے کہا کہ "امروز و فردا میں یہاں
بلوہ ہونے والا ہے چونکہ یہ ملک آپ لوگوں کا موروثی ہے آپ اس کا بندوبست کیجیے[۳]۔

---

[۱] شیخ شرف الدین نسبًا فاروقی ہیں حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی اولاد ہیں اُن کے مورثِ اعلیٰ شیخ اعظم شہید (۹۹۱ھ) بعہد اکبر موضع منور میں شہید ہوئے داماد حضرت خواجہ سلیم چشتی المتوفی ۹۷۰ھ کے تھے اُن کا بیٹا نواب قطب الدین خاں تھا جو جہانگیر کا رضاعی بھائی تھا المقتول ۱۶۰۷ء گورنر بنگال کا رہا اس کے تین لڑکے شیخ ابراہیم الملقب بہ نواب کشور خاں المتوفی ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء نواب فرید خاں المتوفی ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۶ء اول الذکر اور آخر الذکر یکے بعد دیگرے بدایوں کے گورنر رہے۔ ثانی الذکر کا لڑکا نواب اخلاق خاں گورنر دکن رہا۔ شیخ شرف الدین بڑے زمیندار تھے۔ انگریزوں کی وفاداری کے صلہ میں بڑی زمینداری ملی اور سی آئی ای کا خطاب۔ اس خاندان کے ایک رکن نواب عبدالغفار المتوفی ۱۹۳۰ء اس طرح سے پانچ مغلئی نواب اور ایک انگریزی خاندان شیخوپور کے نواب ہوئے۔

[۲] موضع گکوڑہ پرگنہ اجھانی میں بدایوں سے چودہ میل جنوب مغرب میں گنگا کے کنارے آباد ہے یہاں پر کاتکی اشنان پر میلہ جمع ہوتا ہے تقریبًا تین لاکھ کا مجمع ہو جاتا ہے یہ میلہ نواب عبداللہ خاں خلف نواب علی محمد خاں المتوفی ۱۱۸۰ھ نے اپنے ایک بریلی کے ہندو دوست کی وجہ سے لگایا تھا ایک عرصہ تک رؤسا شیخوپور اس میلہ کی آمدنی وصول کرتے رہے پھر کسی مصلحت سے وہ آمدنی ڈسٹرکٹ بورڈ بدایوں کو منتقل کردی۔ اب میلہ پر مستقل اقتدار و قبضہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا ہے۔ آبادی ۲۸۰۴

[۳] حیات حافظ رحمت خاں ص ۳۶۲

خان بہادر خاں نے اس وقت تو انکار کیا لیکن جب واقعی بلوہ ہوگیا اور انگریز بریلی چھوڑ کر بھاگ گئے تب عنانِ حکومت روہیلکھنڈ اپنے ہاتھ میں لی۔

۱۷ جون ۱۸۵۷ء کو خان بہادر خاں نے عبدالرحمٰن خاں کو بدایوں کا ناظم مقرر کیا اور شیخ فصاحت اللہ[۱] بدایونی کو نائب ناظم مقرر کیا۔

جس دن عبدالرحمٰن خاں بدایوں آئے اُسی دن گنواروں کے ایک جم غفیر نے شیخو پورہ پر حملہ کیا۔ شیخ زادوں نے قلعہ شیخو پور کے دروازے بند کرلئے۔ محلہ جلندھری سرائے[۲] (بدایوں) اور موضع گورامی[۳] کے لوگوں نے بروقت پہونچکر لٹیروں کا زبردست مقابلہ کیا۔ کوئی سو اشخاص کو قتل کیا بقیۃ السیف نے راہ فرار اختیار کی

عبدالرحمٰن خاں نے بدایوں آکر ملازمان سابقہ کو اُن کی جگہوں پر بحال رکھا بیشتر ملازمین اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔ کچھ لوگ ملازمتیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مولوی تفضل حسین[۴] اور مولوی اشرف علی نفیس[۵] پنشنر تحصیلداران کو ڈپٹی کلکٹر

۱؎ شیخ فصاحت اللہ بدایوں کے صدیقی شیخ بریلی میں وکالت کرتے تھے۔

۲؎ جلندھری سرائے بدایوں کا جنوبی محلہ ہے۔ شیخو پور سے ایک میل سے کچھ زائد فاصلہ پر ہے۔ معززاور بہادر پٹھانوں کی بستی ہے مرفہ الحال لوگ ہیں ۳؎ موضع گورامی شیخو پور سے تین میل پر ہے سر برآوردہ لوگ تعلیمیافتہ پٹھان ہیں آبادی ۷۸۵ افراد پر مشتمل ہے۔

۴؎ مولوی تفضل حسین بدایوں کے صدیقی شیخ۔ اُن کے نام کا اس وقت تک بدایوں میں مولوی گنج یادگار ہے جو اُن کی ملکیت تھا ضبط ہوکر نیلام ہوگیا۔ نام باقی ہے۔ زیادہ تر سبولی اور آنولہ میں تحصیلدار رہے۔

۵؎ مولوی اشرف علی نفیس ولد مولوی نجف علی ممتاز المتوفی ۱۸۵۴ء باپ اور بیٹے دونوں تحصیلدار تھے۔ نسبًا بدایوں کے صدیقی شیخ۔ اول الذکر نواب گنج ضلع بریلی میں تحصیلدار رہے۔

مقرر کیا۔ منشی ذوالفقار الدین[۱] سررشتہ دار فوجداری کو ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر کیا۔ مولوی رضی اللہ تحصیلدار بدایوں کو تحصیلدار بسولی۔ محمود حسین پنشنر تحصیلدار ڈپٹی مقرر ہوئے محمود حسین کے بھائی احمد حسین کو جو نائب سررشتہ دار تھے سررشتہ داری پر ترقی دی گئی سیف اللہ خاں تحصیلدار کو فوجی افسر مقرر کیا۔ یاد اللہ خاں کو توال شہر مقرر ہوئے گنّور کے تحصیلدار مولوی ماجد علی نے ناظم کی اطاعت قبول کی۔ ولی داد خاں رسالدار مقرر ہوئے۔ چودھری تفضل حسین رئیس محلہ چودھری سرائے وصفت علی کمیدان مقرر ہوئے کچھ اور لوگوں کا بھی تقرر کمیدانی پر ہوا۔ لچھمن سنگھ کو اوجھیانی کا تحصیلدار مقرر کیا۔ بدایوں کے سپہ سالار فوج جنرل نیاز محمد خاں مقرر ہوئے اور عظمت اللہ خاں بخشی کو مقرر کیا گیا۔ جولائی میں وصول مالگذاری کا کام شروع ہوا۔ موضع کھینک[۲] اور موضع رفیع آباد[۳]

---

[۱] منشی ذوالفقار الدین ولد وہاب الدین موحّد بدایوں کے متولیوں کے خاندان سے تھے آپ کی شہادت کا تذکرہ آگے آئے گا۔ آپ کے والد مولوی وہاب الدین موحّد تخلص کرتے تھے۔ سلیم پور ضلع بدایوں میں تحصیلدار نواب وزیر آف اودھ کے زمانہ میں تھے جب انگریزوں کے پاس ۱۸۰۱ء میں بدایوں آیا تو انگریزوں نے موحّد کو بدستور انُ کے عہدہ اور جائے تعیناتی پر رکھا "نظامی بدایونی" (مولوی نظام الدین حسین ایڈیٹر ذوالقرنین کی سوانح عمری مرتبہ مولوی محمد احمد کاظمی مطبوعہ ۱۹۳۹ء کے صفحہ ۶ پر لکھا ہے "اسوقت روہیلوں کی عملداری تھی اور وہ (موحّد) داتا گنج ضلع بدایوں میں تحصیلدار تھے۔ انہیں کے وقت میں سلطنت کی کایا پلٹ ہوئی۔ انگریزی سکہ جاری ہوا برٹش حکام نے بھی اس عزت کو قائم رکھا اور بدستور اپنے عہدہ پر مامور رہے" موحّد کے زمانہ میں تحصیل داتا گنج میں نہ تھی سلیم پور میں تھی۔ ۱۸۳۲ء میں انگریزوں نے سلیم پور سے تحصیل داتا گنج کو منتقل کی اسوقت موحّد کا انتقال ہو چکا تھا۔ روہیلوں کی عملداری بدایوں سے ۱۷۷۴ء میں ختم ہو کر نواب وزیر کو پہونچی۔ موحّد کے دوسرے دو بیٹوں کا ذکر کاظمی صاحب نے کیا مگر منشی ذوالفقار الدین کا عمداً ذکر کرنے سے گریز کیا ہے۔ [۲] موضع کھینک بدایوں سے جانب شمال ۵ میل کے فاصلہ پر ہے ۹۰۰ ایسے شب نیرس کا میزہ لگتا ہے آبادی ۷۰۰ ہے [۳] موضع رفیع آباد موضع بناور کے ملحق ہے ۵۹۲ اشخاص آباد ہیں۔

کے ٹھاکروں نے ادائے مالگزاری میں تمرد کیا جس کی پاداش میں اُن کو قرار واقعی سزا دی گئی۔ خان بہادر خاں نے موضع بھٹولی[۵۱] کے امرائے سنگھ ٹھاکر کو داتا گنج[۵۲] کا تحصیلدار مقرر کیا مگر تحصیل کے ٹھاکروں نے خاندانی رقابت سے اس کی حکومت تسلیم نہیں کی اور متوازی حکومت قائم کر کے ہرلال سنگھ عرف ہلی سنگھ ٹھاکر ساکن موضع بکسینہ[۵۳] کو اپنا سردار بنایا اس نے اپنا لقب دھپو دھام[۵۴] اختیار کر کے مہر پر یہ سجع کندہ کرایا۔ نیچے

دھرتی اوپر رام ۔ مہر کچہری دھپو دھام ۔

ہلی سنگھ نے ایک بڑا جتھا ٹھاکروں کا بنا کر بدایوں پر حملہ کی تیاری کر کے چڑھائی کی۔ شہر کی سرحد پر لڑائی ہوئی اور وہ شکست کھا کر بھاگ گیا۔

دوبارہ اگست کے مہینہ میں پھر ان ٹھاکروں نے بدایوں پر حملہ کا قصد کیا اب نواب کی فوج اور توپوں سے بدایوں لیس تھا یہ معلوم ہو کر ان کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ موضع کنہل کے بھائی سنگھ ٹھاکر نے بھی شہر پر حملہ کیا مگر بُری طرح سے پسپا ہو کر بھاگے

---

۵۱ موضع بھٹولی دو میل سے کم داتا گنج سے ہے۔ ٹھاکروں کی آبادی ہے زائد تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ ٹھاکر لچھمن سنگھ ڈپٹی کلکٹر المتوفی ۱۹۱۲ء مولف "کل لچھمن" تاریخ ٹھاکران یہاں کے رہنے والے تھے آبادی چودہ سو باون ہے۔

۵۲ داتا گنج ۱۹ میل پر بدایوں سے مشرق میں ہے ۔ ۱۸۳۳ء میں تحصیل کا صدر مقام ہوا ہے ہندوؤں کی اکثریت ہے مہاجن اور ویش زائد ہیں ۔ پٹھانوں کی آبادی اگرچہ مختصر ہے مگر با اثر ہیں آبادی ۴۰۷۲ ۔ ہنگامہ کے زمانہ میں منشی جیت سنگھ داتا گنج میں تحصیلدار تھے۔

۵۳ موضع بکسینہ جانب جنوب داتا گنج سے چار میل کے فاصلہ پر سوت ندی پر آباد ہے موضع کی آبادی ۱۷۹۹ء

۵۴ دھپو دھام نام کا راجہ چند صدی قبل گذرا ہے۔

اکتوبر کے مہینہ میں بالا راؤ برادرزادہ نانا راؤ جو انگریزوں سے برسرپیکار تھا کچھ سوار و پیادہ فوج کے ساتھ مالاگڈھ سے انوپ شہر کا گھاٹ اُتر کر بدایوں کے ضلع میں ہوتا ہوا شاہ جہان پور کے ضلع چلا گیا۔

جنرل نیاز محمد خاں نے فتح گڈھ پر حملہ کی تیاریاں کیں اور اس کام کے لئے چالیس ہزار روپیہ چندہ ضلع سے کیا۔ جنرل نیاز محمد خاں تیاری مکمل کر کے فتح گڈھ کو روانہ ہوئے۔ قصبہ ککرالہ[1] جو راستہ میں پڑتا تھا وہاں کے کثرت سے پٹھان مجاہدین کر لڑنے کو ساتھ ہوئے۔ سورج پور کے مشہور گھاٹ پر گنگا کو عبور کر کے ضلع فرخ آباد میں داخل ہوئے۔ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو اچانک بالکل بے خبری میں سر گرانٹ نے حملہ کر کے جنرل کو شکست دیدی۔

فروری اور مارچ کا زائد وقت انگریزوں کے مخبروں کی تلاش اور سزا دہی میں صرف ہوا۔ مخبروں اور دشمنوں کی پناہ دہی کے سلسلے میں قادر گنج کے اس حصہ میں آگ دینا پڑی جہاں ایسے لوگ چھپے ہوئے تھے۔

---

[1] ککرالہ۔ بدایوں سے گیارہ میل مشرق میں ہے۔ نواب وزیر اودھ (۱۷۷۴ء لغایتہ ۱۸۰۱ء) نے یوسف علی خاں کو جاگیر میں دیا تھا۔ ۱۸۰۵ء میں نواب جنگی خاں روہیلہ کی جاگیر میں ککرالہ آیا اس نے جنگ مرہٹہ ۱۸۰۳ء میں خاصی شہرت پائی تھی اس کا انتقال ۱۸۱۹ء میں ہوا۔ کمپنی نے اُن کے ورثاء کو بجائے جاگیر کے پنشن کردی جنگی خاں کے والد عمر خان تھے جن کو آصف الدولہ (۱۷۷۵ء لغایت ۱۷۹۷ء) اپنے ساتھ لکھنؤ لے گیا۔ عمر خاں کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔ نوٹیفائڈ ایریا ہے مسلم آبادی کی اکثریت ہے۔ قصبہ کی آبادی ۹۹۶۱ ہے۔ تعلیم پر مسلمانوں کو بہت توجہ ہے قصبہ ہذا کے مسلم مدرسے بکثرت ہیں۔

شروع اپریل میں محسن[۱] علی خاں سرگرانٹ سے شکست کھا کر بریلی کو جاتے ہوئے بدایوں سے گذرے۔ قریب قریب یہ وہی زمانہ تھا جب جنرل بخت خاں۔ ڈاکٹر وزیر خاں مولوی فیض احمد بدایونی وغیرہ بریلی سے لکھنؤ جاتے ہوئے بدایوں سے گذرے اور اپنے اس مشہور فتوائے جہاد کو جو مولانا رحمت اللہ کیرانوی۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلوی۔ مولوی عبدالقادر۔ قاضی فیض اللہ دہلوی۔ مولانا فیض احمد رسوا بدایونی۔ ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی۔ سید مبارک شاہ رامپوری کے دستخطوں سے شائع ہوا تھا بدایوں میں اشاعت کی گئی جس کے نتیجہ میں گکرالہ مجاہدین کا مرکز بن گیا۔

۱۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو نواب نے بریلی سے تین سو فوجی ناظم بدایوں کو بھیجے۔ ۲۷ اپریل کو جنرل پنی اور مسٹر ولسن نے نولی تاتارپور[۲] کے گھاٹ پر گنگا عبور کر کے قیام کیا۔ اس کے ساتھ دو سو جوان۔ ڈھائی سو ملتانی سوار ۳۵۲ جوان رجمنٹ ۶۴ کے ۳۲۰ جوان سیکنڈ پنجابی۔ ۲۶۰ بلوچ بٹیلین اور ڈھائی سو گیارھویں دیسی پلٹن کے۔ چھ بھاری چھ ہلکی توپیں تھیں۔ اُس نے کیپٹن گون کو حکم دیا کہ فوراً بڑھ کر گکرالہ سے چار میل پر نواب کی فوج جو وہاں پڑی ہے اس کو منتشر کر دے یا گرفتار کر لے۔

---

[۱] محسن علی خاں فرخ آباد کے پٹھان نواب بنگش کے ساتھ انگریزوں سے لڑے ان کے ایک بھانجے متو خاں قائم گنج کے رئیس اور بڑے بہادر تھے ۱۹۲۸ء کی ایک مقامی لڑائی میں نہایت بہادری سے جان دی۔ مولوی فضل الرحمٰن بدایونی وکیل قائم گنج نے اس سانحہ کی ایک درد انگیز مثنوی لکھی ہے۔ [۲] موضع نولی تاتارپور تحصیل داتا گنج پرگنہ اوسہت کا شاداب موضع ہے آبادی ۲۵۴ اشخاص کی ہے۔

ادھیست میں ایک اور انگریزی فوج معہ ایک توپ اور ہزار آدمی کے پڑی تھی ۲۹ اپریل کو جنرل پینی راتوں رات چاندنی میں ادھیست کے قریب پہونچ گیا۔ جاسوسوں نے خبر دی کہ ناظم کی فوج کا رُخ داتا گنج کی طرف ہے ادھیست خالی ہے۔ انگریزوں کا ایک جاسوس کمانڈر پانچیبن کے پاس شاہجہان پور جا رہا تھا پکڑا گیا۔ اس کو سزائے موت دی گئی۔

انگریزی فوج کے ککرالہ پہونچنے سے ایک دن قبل پچھم کے ایک باغ میں جہاں قصبہ کا کھلیان تھا۔ ایک سوار آیا یہ دوپہر کا وقت تھا گرمی پڑ رہی تھی۔ چھوٹے خاں اس وقت کھلیان میں حفاظت کو موجود تھے اور کچھ لوگ بھی تھے یہ سب معمر تھے اس لئے ان کی امتیازی حیثیت تھی۔ چھوٹے خاں نے سوار کی بہت ہی خاطر تواضع کی اور دوران گفت گو میں یہ معلوم ہوا کہ قصبہ کے لوگ انگریز کے مخالف ہیں اور سب آمادہ جہاد ہیں وہ سوار بہت خوش ہوا اور بہت کچھ لوگوں کی ہمت افزائی کی اہل قصبہ کثرت سے جمع ہوگئے۔ سوار کے رفقاء ادھر ادھر سے آگئے۔ اب قصبہ والوں کو معلوم ہوا کہ وہ سوار شہزادہ فیروز ہے[۵۱]۔ لوگوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ شہزادہ نے قصبہ کے حالات کا مطالعہ کرکے لوگوں سے کہا کہ اگر خداوند عالم نے ہم کو کامیاب کردیا تو تم سب کو انعام و اکرام سے نوازا جائیگا۔ انگریزی فوج نے آدھی رات کو ککرالہ کی طرف کوچ کیا۔ نصف مسافت

---

۵۱ شہزادہ فیروز خلعت بہادر شاہ۔ شاہ دہلی نے ۱۸ فروری ۱۸۵۸ء کو ایک اعلان ہندوستان کے ہندو مسلم کے نام انگریزوں کے خلاف جاری کیا تھا جو بہادری پریس بریلی سے شائع ہوا تھا مولوی قطب شاہ ناشر تھے۔ شاہزادہ فیروز کا انتقال نہایت غربت و عسرت میں مکہ معظمہ میں ۱۸۷۷ء میں ہوا (ٹائمس آف کراچی ۱۴ مارچ ۱۹۵۴ء)

طے کر کے دم لیا تاکہ پیدل فوج بھی آ کر ان سے مل جائے جب پیدل فوج آ گئی تو اس کو حکم دیا کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر چلے۔ جلدی کی ضرورت نہیں اور اپنا کوچ توپ خانہ اور سوار دل کے ساتھ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ گگرالہ ایک میل رہ گیا۔ یہ صبح صادق کا وقت تھا کہ مجاہدین کا ایک گروہ آتا نظر پڑا جنھوں نے چار توپیں گراپ کی سر کیں مگر کوئی انگریز زخمی نہیں ہوا۔ انگریزوں نے جوابی توپوں کے فیر کئے۔ مجاہدین نے موقع پاکر انگریزی فوج کو تلواروں پر رکھ لیا اور کلا بکلا لڑنا شروع کر دیا۔ انگریزی فوج نے مجاہدین کی شمشیر زنی کی تاب نہ لاکر پسپائی شروع کر دی اور درختوں کی آڑ لے کر توپیں چلانے لگے اس سے مجاہدین کا اتلاف جان کافی ہوا۔ اس بے ترتیبی اور بدنظمی میں بہت دیر میں معلوم ہوا کہ جنرل پینی غائب ہے۔ مقامی روایت ثقہ اشخاص کی یہ ہے کہ انگریزی فوج کی آمد پر گولہ انداز نے ایسا گولہ نشانہ پر مارا کہ جنرل پینی کا سر اڑ گیا۔ بڑی تلاش سے اس کی نعش ملی۔ دیکھا بازو پر ایک زخم گولی کا تھا اور کسی مجاہد کی تلوار اس کا خون پی چکی تھی۔ توپوں کی آواز سنکر سورج نکلنے پر کرنل جونس معہ پیادہ فوج کے موقعہ پر آیا۔ مقامی روایت یہ ہے کہ اس فوج کے آنے سے گگرالہ کے مجاہدین انگریزی فوج کے بیچ میں پھنس گئے اور ایک ہزار غازی شہید ہوئے۔ شہزادہ نے کچھ سامان اور آدمی لیکر گگرالہ سے پچھم اور موضع گھوائی سے پورب ایک جھاڑی دار ٹیلہ کی آڑ سے مورچہ لگایا۔ پھر بھی ناکامی رہی۔ مجاہدین بدایوں کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ توپ خانہ نے دور تک اُن کا تعاقب کیا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر بدایوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ امر تحقیق شدہ ہو گیا کہ یہ سرفروش جماعت ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی کے رفقاء کار کی تھی۔

۲۹ راپریل ۱۸۵۸ء کو جب گگرالہ میں معرکہ کارزار گرم تھا میجر گارڈن نے مرادآباد

کے ایک دستہ فوج سے نواب کے آدمیوں کو بسولی پر شکست دی۔

اب بدایوں دو طرف سے انگریزی فوج کی زد میں آگیا تب نواب کی سپاہ نے دفتر کو نذر آتش کر دیا اور بریلی کو روانہ ہوگئی۔ قریب قریب تمام وہ لوگ جو انگریز کے خلاف تھے وہ بدایوں چھوڑ کر چلے گئے۔ رحم علی خاں ٹھیکیدار بسولی و سہسوان ایک مختصر جماعت کے ساتھ گنگا عبور کر کے گوالیار کی طرف چلا گیا۔

قصبہ اسلام نگر[۵۱] کے باشندہ بابو رام نرائن وکیل اور مخدوم بخش قریشی کی قیادت میں معہ اپنے رفقاء کار شہامت علی۔ ناصر علی۔ منیر خاں۔ ہنسا سنگھ۔ دہن سنگھ کے مجتمع ہوئے اس سے زیادہ اور کیا اتحاد کی مثال ہوگی۔ بابو رام نرائن ہندو ظاہر اور قریشی ایک قصاب جو گائیں ذبح کر کے گوشت فروخت کرے یہ اس کا پیشہ۔ ان لوگوں کا وقت انگریزوں کے کاسہ لیسوں سے مقابلہ میں زائد صرف ہوا جن کا سرگروہ ذارا سنگھ ٹھاکر ساکن بیر ول[۵۲] تھا۔ ان لوگوں نے متعدد حملے رام نرائن پر کئے مگر سب میں ناکام رہے۔ ریاست رام پور کی فوج

---

[۵۱] اسلام نگر اس کا پہلا نام نیودھنا تھا التمش کے زمانہ میں رستم خاں نے اسلام نگر نام رکھا ایک روایت یہ ہے کہ رستم خاں دکھنی سنبھل کا گورنر عہد شاہجہاں میں تھا اس نے اپنے لڑکے اسلام خاں کے نام سے اسلام نگر نام رکھا۔ یہ قصبہ تابع سرکار سنبھل مغل عہد میں تھا بدایوں سے ۳۴ میل پر ہے تحصیل بسولی کا تھانہ ہے مسلم آبادی نصف سے کم ہے۔ قصبہ کی آبادی ۶۷۰۶

[۵۲] موضع بیرول پرگنہ اوجھانی میں گنگا کے کنارے آباد ہے۔ ایک ہزار ایک سو اُنتیس مردم شماری ہے۔

نے بسرکردگی حکیم سعادت[۵] علی خاں اسلام نگر پر حملہ کیا۔ لڑائی ہوئی۔ رام نرائن کے پاس توپیں تھیں فریقین میں خوب گولہ باری ہوئی۔ وکیل میدان جنگ میں کام آیا۔ علاوہ اور سامان کے حکیم صاحب کے ہاتھ وہ برنجی توپیں بھی آئیں۔ یہ واقعہ ۱۳ رجون ۱۸۵۸ئ کا ہے

۲۷ رمئی کو دو ہزار سرفروشوں کا گروہ جھانسی سے جانی[۵] کے میلہ میں ہوتا ہوا

اوسیت سے شاہ جہان پور ہوکر لکھنؤ پہونچا۔

اب انگریز ضلع پر چھا گیا اور اُس نے اپنے انتظامات شروع کئے۔ مسٹر ولسن نے ضلع چھوڑنے سے پہلے ٹھاکر لال سنگھ بکسینہ والے کو داتا گنج کا بھیکم سنگھ کو اوسیت کا تحصیلدار شیخ شرف الدین کو بدایوں کا تحصیلدار ۱۸ رمئی ۱۸۵۸ئ کو ہیبت سنگھ

اور ڈال سنگھ ساکنان کوٹ کو سہسوان کا تحصیلدار مقرر کیا۔

---

[۵] حکیم سعادت علی خاں قصبہ آنولہ (جو نواب علی محمد خاں کا دارالحکومت تھا) ضلع بریلی کے بڑے رؤسا سے تھے۔ سنہ ۱۸۴۷ئ میں بدایوں کے تحصیلدار تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ نواب محمد سعید خاں بھی بدایوں میں ڈپٹی کلکٹر ہیں نواب صاحب بدایوں سے ہی سریر آرائے مسند ریاست رامپور ہوئے تھے اس وقت نواب صاحب حکیم سعادت علی خاں کو اپنے ساتھ رامپور لے گئے اپنی فوج کا افسر اعلیٰ اور مشیر ریاست مقرر کیا۔ نواب علی محمد خاں کا قلعہ اور محلات جب نیلام ہوئے حکیم سعادت علی خاں نے خرید لئے جو اسوقت تک اُن کی اولاد کے قبضہ میں ہیں۔ حکیم صاحب نے قصبہ آنولہ میں انگریزی شفاخانہ بے نظیر رفاہ عام کھولا جو اس وقت تک جاری ہے۔ حکیم صاحب ایک غیر معمولی قابلیت کے حامل تھے اُنھوں نے زمینداری میں بہت سے اصلاح کے کام کئے موضع نگربن تحصیل بسولی تھانہ وزیر گنج میں اُن کا یہ موضع ہے اس گاؤں میں جو سڑکیں آبادی میں نکالی ہیں اس قدر چوڑی ہیں جسکی مثال مشکل سے بہت سے شہروں میں نہ ہوگی۔

[۵] موضع جانی پرگنہ اوسیت تحصیل داتا گنج میں لب گنگا آباد ہے ۷۰۵ نفوس کی آبادی ہے۔

دارا سنگھ ٹھاکر پیرول کو اوجھانی۔ تندھاری سنگھ ٹھاکر بیلا ڈانڈی کو بدایوں اور ضلع بریلی کے چار ٹھاکروں کو بلسی۔ کوٹ۔ بسولی کے پولیس افسر مقرر کئے گئے بلسی کا تھانیدار بھائی سنگھ کو مقرر کیا۔ چندن سنگھ ٹھاکر بھاپنور کو بسولی اور کوٹ کی مالگزاری وصول کرنے پر مقرر کیا۔ مسٹر کارمیکل کو بدایوں کا مجسٹریٹ ضلع مقرر کیا گیا تھا مگر وہ ابھی تک بریلی سے بیٹھے بیٹھے ضلع کا انتظام افسران متذکرہ صدر کی وساطت سے چلا رہا تھا جس کے ہاتھ میں ضلع کی ظاہری باگ تھی۔

۳ رجون کو بریگیڈیر کک معہ ایک دستہ فوج کے شاہجہانپور سے اوسیت آیا اور لب سڑک ان تین گاؤں کو جس کے متعلق مخالفت کا خیال تھا ان کو آگ لگا دی۔ اسی دن گگرالہ میں آگ لگائی۔ اس آگ میں عورتیں بچے بہت جلے اور چاروں طرف گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ ایشری پرشاد مخبر ساتھ تھا۔ تقریباً پانچ سو اشخاص گرفتار کرلئے گئے۔ روزانہ سو آدمیوں کو سزائے موت اس طرح سے دیجاتی کہ سفید چونہ سے حوالات میں سو آدمیوں کی پشت پر نشان لگایا جاتا دو گھنٹہ کے بعد نشان والے لوگوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے ایک طرف سے کان پر گولی کا فیر کیا جاتا اس فیر سے جو لوگ بچ جاتے ان کو اسی طرح لائن میں کھڑا کر کے باڑ ماری جاتی اور جب تک یہ مظلوم ایک ایک کر کے ختم نہ ہو جاتے یہ تماشہ جاری رہتا تھا۔

گگرالہ کے لوگ جو گھبراہٹ اور پریشانی میں فرار ہو گئے تھے ان کو تلاش کر کے گرفتار کیا جاتا اور پناہ دہندوں کو گرفتار کر کے طریقہ بالا پر سزائے موت دیجاتی۔ گگرالہ بالکل ویران ہو گیا۔ تمام سامان اور اناج وغیرہ جلا دیا گیا وہ بُرا وقت ہو گیا تھا کہ دوست آشنا اہل گگرالہ سے بات کرنے گھبراتے کسی اعانت و امداد کو

تیار نہ ہوتے۔ تین مہینے دھکے دربدر کھاکر لوگ بھوکے پچھے کھچے جمع ہوئے۔ ایشری پرشاد مخبر کی اطلاع دہی پر پھر فوج ککرالہ دوبارہ آئی اور دارو گیر شروع ہوئی۔ کچھ لوگ اس مرتبہ ایشری کے کہنے سے چھوڑے گئے۔ کچھ مار پیٹ کر کے اور کچھ کو جان لے کر چھوڑا کچھ عرصہ کے بعد پھر یہ عمل کیا۔ چوتھی مرتبہ جنرل بینی کی میم آئی اس نے ککرالہ کا نکڑہ باں کہہ کر فرمائش کی کہ پورے قصبہ کو کھود کر جھیل بنا دیا جائے یہ فرمائش تو پوری نہیں ہوئی البتہ پورا قصبہ کھنڈر ضرور کر دیا گیا۔ ۱۹۱۴ء تک ککرالہ کے آدمی کو ملازمت نہیں دی جاتی تھی۔ جنگ عظیم میں ککرالہ سے بھرتی فوج کی بکثرت ہوئی۔

قصبہ کے سربرآوردہ اشخاص جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں نمایاں حصہ لیا۔ پہلوان منگل خاں، رستم خاں، غلامی خاں، سردار خاں، محمد خاں، مان خاں، چھادم خاں دلاور خاں، واصل خاں، فوجدار خاں وغیرہ تھے۔

یہ حرکت بہیمانہ صرف رعب بٹھانے کو تھی کیونکہ اس زمانہ میں رحم، عفو، انصاف عنقا تھا۔ بریگیڈیر ۲ جون کو بدایوں پہونچا اہم اور نمایاں گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ دو دن کے بعد مسٹر کارمیکل مجسٹریٹ ضلع بمعیت کرنل ولکنسن ایک دستہ فوج لئے ہوئے بریلی سے بدایوں آئے۔ اب گرفتاریاں اندھا دھند شروع ہو گئیں۔

بقول ظفر

جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے

شہر کے تین مسلمانوں اور ایک ہندو سنار تر دنامی نے حکومت کا ہاتھ گرفتاریوں میں غیر معمولی انہماک سے بٹایا۔

دوسرے دن دو فوجی دستے مراد آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ کرنل ولکنسن

نے سیدھا راستہ مراد آباد کا براہ بسولی اختیار کیا راستہ میں دو گاؤں تباہ و برباد کئے گئے۔ جنرل لگ اور کارمیکل سہسوان پہنچے اور وہاں پر بہت سی گرفتاریاں کی گئیں مولانا سید نیاز احمد ولد سید آل احمد مودودی جو ایک عالم و فاضل بزرگ تھے علاوہ علم و فضل کے فن سپہ گری کے ماہر تھے۔ مولانا سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کئے ہوئے تھے اور اُن کے ساتھ شریک جہاد رہے تھے۔ سہسوان کے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں شریک ہوئے۔ نشانہ گولی بنے اس وقت ہاتھ میں تسبیح اور لب پر کلمہ شہادت تھا عمر ۹۲ کے قریب تھی۔ اسلام نگر میں بھی داروگیر بہت سختی سے شروع ہوئی۔ جس پر بھی بابو رام نرائن وکیل کے ساتھی ہونے کا شبہ دلایا گیا اس کو انتہائی سخت سزائیں دی گئیں۔ اسلام نگر میں چند گھر سادات اور کنبوہوں کے ہیں۔ اول الذکر معافیدار تھے۔ ان سادات کا ایک امام باڑہ قصبہ میں تھا کسی نے مخبری کر دی کہ سید محب علی متولی امام باڑہ نے مشہور فتوائے جہاد امام باڑہ میں دفن کر دیا ہے امام باڑہ بیخ و بن سے کھود ڈالا۔ میر صاحب کو گولی ماردی اور معافیات ضبط کرلیں۔

مجسٹریٹ ضلع نے فوج کا ساتھ چھوڑ دیا کیونکہ اب فوج کی ضرورت نہیں رہی تھی ضلع پر رعب بیٹھ گیا تھا۔ سیکڑوں فرضی خیر خواہ بلا معاوضہ لوگوں کو پھانسیاں دلانے کو موجود تھے۔ اکثر و بیشتر فاسق محروم رہے۔ یہ مہینہ سہسوان اور گنور میں صرف کیا۔ اگست میں احکامات کی تعمیل باقاعدہ ہونے لگی اور مالگذاری تیزی سے داخل خزانہ ہونے لگی جس کی تعداد چار لاکھ سینتالیس ہزار دو سو اکیانوے روپیہ آٹھ آنہ گیارہ پائی تھی۔ اب یہ وہ وقت ہے کہ انگریز نے جذبہ انتقام میں جو جو اور جس جس طرح سے سزائیں دیں چنگیز خاں اور ہلاکو کی روحیں چیخ اٹھیں اور اسیر

ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اپنے مظالم پر ایسا پردہ ڈالا جس کا پتہ ونشان نہیں اور دوسروں کے واقعات کو کس رنگ آمیزی سے دوہرایا جاتا ہے۔

بدایوں کے چار اشخاص کو عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ وہ چاروں ایک ہی گھر کے تھے۔ شیخ فصاحت اللہ[۵۱] نائب ناظم اور شیخ سلیم اللہ وکیل۔ شیخ آیت اللہ وکیل تینوں بھائی۔ چوتھے شیخ فضل احمد بھتیجہ کسی عام معافی کی بنا پر یہ لوگ واپس ہوئے مگر اول الذکر کو خاک وطن نصیب نہ ہوئی راستہ میں انتقال ہوگیا۔ آخرالذکر نے واپس آکر وکالت پاس کرکے کام شروع کیا اور ضلع کے چوٹی کے وکیل بنے۔ کیس اشخاص کو گولیاں ماری گئیں۔ اُن میں مولوی تفضل حسین تحصیلدار مولوی اشرف علی تحصیلدار مولوی حامد علی تحصیلدار مولوی رضی اللہ[۵۲] تحصیلدار منشی ذوالفقار الدین سر رشتہ دار۔ بدر الاسلام[۵۳] عباسی المتخلص مشہور۔ سید محمد شاہ[۵۴] معہ اپنے داماد کے۔ شیخ بچا پنجابی سوداگر ساکن محلہ چاہ میر۔ ایک سو سترہ اشخاص کو پھانسیاں دی گئیں۔ ایک سو پچیس اشخاص کو میعادی قید اور دو سو ستر اشخاص کو بید[۵۵] کی سزا دی گئی۔ چوبیس مسلم مواضعات اور چار سو قطعات آراضی بحق حکومت ضبط کئے گئے۔ پانسو چھتیس مکانات اور دس ہزار پانسو پچیس روپے کا زیور ضبط کیا گیا۔

انگریزی حکومت کے قیام پر دو طرح کے اشخاص کو انعامات سے نوازا گیا۔ نمبر

---

۵۱ مفصل حالات دوسرے صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔ ۵۲ مفصل حالات دوسرے موقع پر ملاحظہ فرمائیے ۵۳ دوسرے موقع پر حالات ملاحظہ فرمائیے۔ ۵۴ بید کی سزا میں صرف ایک نام شیخ مسیح الدین ولد شیخ غلام محمد کا معلوم ہوا ہے۔ ہنگامہ سے قبل مختاری کرتے تھے۔ الزام بغاوت میں گرفتار ہوئے ساٹھ بید لگے۔ آخری ضرب بید پر الا اللہ کہا۔ اس پر بدبخت نے دس بید اور لگوائے بیہوش ہوگئے۔ ۱۹۲۲ء میں انتقال کیا۔

ایک وہ لوگ رہے جنھوں نے انگریزوں کو پناہ دیکر ان کی حفاظت کی ۔نمبر دوم وہ لوگ تھے جنھوں نے نظم ونسق اور ضبط وامن کی بحالی میں اعانت وامداد کی ۔

نمبر ایک میں کپتان گون اور اُن کے ہمراہیوں کے پناہ دہندے بنیتم سنگھ اور پنجاب سنگھ ٹھاکران اوسانواں ۔ پرتاپ برہمن موضع میاؤ[1] ۔ اندر سنگھ ٹھاکر موضع سلیم پور اور بختاور سنگھ ٹھاکر موضع بیلا ڈنڈی[2] ۔ ان کو زرنقد اور زمین داری دی گئی ۔مسٹر ایرینہ کے پناہ دہندے ہمت سنگھ ٹھاکر موضع گدھول جگنا تھ کو رمی موضع نگلہ شرقی اور ہیرا سنگھ ٹھاکر موضع گرڈ گاؤں ۔

مسٹر پیٹرس اور اُن کے خاندان کی نگہبانی اور حفاظت کا انعام اجیت برہمن موضع نظام آباد کو ملا ۔ علاوہ بریں تر لیسٹھ اشخاص کو صرف زرنقد دیا گیا ۔

نمبر دوم کے سلسلہ میں شیخ شرف الدین رئیس شیخوپور ۔ ہرلال سنگھ ٹھاکر موضع بکسینہ ۔ ہیبت سنگھ اور ڈال سنگھ ٹھاکران موضع کوٹ ۔ داتا سنگھ ٹھاکر موضع پیرول ۔

---

[1] موضع میاؤ ۔ اوسیت سے داتا گنج جانے والی سڑک پر ہے آبادی ۲۰۳۰ ہے مسلم آبادی کافی ہے ۔ موضع کا رقبہ ۲۹۱۲ ایکڑ ہے بڑا حصہ بدایوں کے مسلمانوں کی زمینداریوں کا تھا غالب حصہ کے مالک بدایوں کے محلہ جالندھری سرائے کے لودی پٹھان تھے ۔

[2] موضع بیلا ڈانڈی تقریباً تین میل پر داتا گنج سے گنگا کے کنارے پر آباد تھا ۔ آبادی دریا سے کٹ گئی لوگ باغات میں رہ رہے ہیں اس وقت تین سو اشخاص کی آبادی ہوگی بختاور سنگھ و قندہاری پسران اجیت سنگھ ہیں اس وقت اونکار سنگھ پسر نرائن سنگھ صوبہ کی اسمبلی کا ممبر ہے ۔

پرس رام موضع آسپنور (تحصیل گنور) ان سب کو ان کی خدمات کے صلہ میں زمینداریاں دی گئیں ۔ وزیر سنگھ تھانہ دار گنور ۔ پربھو لال پیشکار ۔ شیخ ارشاد علی اندپانچ کس دیگر شیوخ گنور کو سرکاری دفتر کی حفاظت کی جلدو میں زمینداریاں دی گئیں ۔ بیالیس دیگر اشخاص کو صرف زرنقد انعام میں دیا گیا ۔ ان میں زائد تعداد گنور کے اہلکاروں کی تھی ۔

انگریزوں نے ابتدائی دور میں ہر ایک قاضی کو جو جس جگہ تھا وہاں کا منصف یا صدر الصدور مقرر کر دیا تھا ۔ اس طرح سے ایک عرصہ تک صرف مسلمان علماء و فضلاء یکہ و تنہا بلا شرکت غیرے صوبہ متحدہ میں خصوصی طور سے ان عہدوں پر قابض رہے اس سلسلہ میں ایک مشہور لطیفہ ہے پہلے غیر مسلم منصف غازی پور میں منشی بنواری لال مقرر ہوئے تھے ۔ اُن کے اجلاس کے پیشکار نے کاغذ کے سرنامہ پر لکھا اجلاس مولوی بنواری لال صاحب ۔ منصف نے یہ دیکھ کر پیشکار سے کہا کہ میرے نام سے قبل منشی لکھا کرو مولوی نہیں ۔ پیشکار نے کہا کہ منصف اور صدر الصدور کے نام کے ساتھ مولوی ہی لکھا جاتا ہے ۔ تب منصف نے پیشکار سے کہا کہ اب تک ان عہدوں پر مسلمان مقرر ہوتے تھے وہ فقہ اسلامی کے ماہر ہوتے تھے اس وجہ سے لفظ مولوی اُن حضرات کے نام کے ساتھ لکھنا مناسب و درست تھا ۔ اب ذرا انگریز کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو ۔ اس کے نقطۂ نظر سے مولوی ملا کا اطلاق چھاؤنی کے پیش نماز پر رہا اور قاضی صرف نکاح خواں رہ گیا ۔ جس کی توثیق قاضی ایکٹ ۱۸۶۴ء بنا کر کر دی ۔

جب تک انگریزی داں منصف ۔ صدر الصدور ہونا لازمی نہیں کیا گیا تھا بدایوں کے منصف اور صدر الصدور بیک وقت اس قدر تعداد میں تھے کہ کوئی دوسرا ضلع بھی مل کر اہل بدایوں کے برابر نہ تھے ۔ انگریزی عہد میں برابر یہ سلسلہ رہا ۔ جوڈیشل سروس کا

انحطاط دیکھ کر انگریزی تعلیم پر توجہ شروع ہوئی۔ بدایوں میں پہلا گریجویٹ[۱] ۱۸۸۵ء میں کوئینس کالج بنارس سے ہوا اور وہ کلکتہ یونیورسٹی میں نمبر دوم پر آیا۔

اس کے بعد کافی انہماک اور سرعت سے بدایوں کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا رواج ہوا جس قدر مسلم گریجویٹ بدایوں کے ہوئے اس قدر روہیلکھنڈ کے کسی ایک ضلع میں نہ تھے۔ بدایوں کے ہندو گریجویٹ مسلم گریجویٹ سے کم تھے اور ہر شعبہ زندگی میں نمایاں ترقی کر رہے تھے۔ اب مشرقی علوم کے ماہر خال خال رہ گئے ہیں۔

---

[۱] مولوی وزیر احمد ولد مولوی محمد حسین المتوفی ۱۹۳۴ء ٹونک والے۔ مولوی صاحب کے والد اور چچا حافظ احمد حسین ریاست ٹونک میں بہت ممتاز عہدوں پر متمکن تھے۔ نواب محمد علی خاں رئیس ٹونک ایک ہنگامہ کے سلسلہ میں معزول ہوئے اور بنارس رہنے کا حکم ہوا یہ دونوں بھائی بھی نواب کے ساتھ بنارس آگئے۔ حافظ صاحب نے نواب کے معاملہ کا مرافعہ لندن جاکر پیش کیا یہ وہی زمانہ تھا جب سر سید احمد خاں (اپریل ۱۸۶۹ء تا اکتوبر ۱۸۷۰ء) معہ اپنے دونوں لڑکوں کے لندن گئے ہوئے تھے۔ حافظ صاحب اور سید صاحب کی وہاں ملاقاتیں رہیں۔ حافظ صاحب نے اپنے بھتیجہ کو جو دونوں بھائیوں میں اس وقت اولاد اکبر تھے اور عربی و فارسی کے منتہی تھے انگریزی پڑھاکر بدایوں کا پہلا گریجویٹ کرایا۔

سیکڑوں مجاہدین میں سے چند

(۱) حضرت مولانا فیض احمد بدایونی[1]

پیدائش مولانا فیض احمد ابن حکیم غلام احمد۔ مولوی محلہ شہر بدایوں میں ۱۲۲۳ھ ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ خدا کی قدرت کہ آپکی عمر قریب تین سال کے ہوگی کہ والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور یتیمی کا داغ لگا۔ مگر آفریں آپکی والدہ کو جنھوں نے آپکی تربیت باحسن وجوہ فرمائی کیوں نہ ہو آخر ایک عالم و شیخ کی بیٹی تھیں۔

تعلیم و تربیت مولانا کو قدرت نے شروع ہی سے وہ دل و دماغ بخشا تھا کہ جس پر آپکے ہم درس طلبا کو رشک آتا تھا۔ جو چیز ایک بار پڑھ لی یاد ہوگئی اور ایک دفعہ نظر سے گذر گئی دل پر نقش ہوگئی تحقیق و تدقیق آپ کا حصہ تھا اہل خاندان خیال کرتے تھے کہ مستقبل قریب میں یہ بچہ فخر خاندان ہوگا۔

بالائے سرش ز ہوشمندی   می تافت ستارۂ بلندی

والدہ نے اس ہونہار بچہ کو اپنے بھائی مولانا فضل رسول کے سپرد کردیا۔ آپ نے نہایت محبت اور ناز نعم سے پرورش فرمائی۔ مولانا فیض احمد نے تمام علوم منقول و معقول صرف چودہ سال کی عمر میں حاصل فرمالئے اور پندرھویں سالگرہ سے قبل آپ کو اجازت درس مل گئی۔ دیگر فنون مروجہ خطاطی و شعر و شاعری وغیرہ میں بھی آپ نے کمال حاصل کیا۔ ایک قلیل عرصہ میں آپ کا شہرہ ہوگیا اور تشنگان علم نے اس منبع علم و فضل کی طرف رخ کیا

[1] یہ تمام مضمون جناب محمد ایوب صاحب قادری بی اے بدایونی کا مرتب فرمودہ ہے جو الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوچکا ہے۔

بیعت جب مولانا نے علوم ظاہری سے فراغت پائی تو علوم باطنی کا خیال آیا۔ حضرت اچھے میاں ارہرویؒ کے خلیفہ اجل آپ کے نانا حضرت مولانا شاہ عبدالحمیدؒ مسند رشد و ہدایت پر جلوہ افروز تھے آپ نے سلسلہ قادریہ برکاتیہ میں اپنے نانا صاحب سے بیعت فرماکر علوم باطنی کی تکمیل کی۔

درس و تدریس آپ نے جب مسندِ درس کو سنبھالا تو ایک عالَم مستفید ہوا طلباءً سے ایک خاص تعلق ہوتا تھا۔ اُن کی خبر گیری اور بسا اوقات اُن کی مدد کرنا آپ کے معمولات سے تھا۔ دوران ملازمت میں بھی آپ طلبار کو درس دیتے تھے اور یہ اُس دور کی خصوصیات سے تھا آپ کے تلامذہ کا شمار دشوار ہے۔

ملازمت آغاز ملازمت کی صحیح تاریخ کا تعین مشکل ہے البتہ اتنی بات ظاہر ہے کہ ایک عرصہ تک بدایوں میں درس تدریس کے بعد آپ اس طرف متوجہ ہوئے اور چونکہ آپ کے ماموں صاحب سررشتہ دار رہ چکے تھے لہذا اسی تعلق کی بناپر آپ نے بھی انگریزی ملازمت اختیار کی آگرہ اس وقت صوبہ کا صدر مقام تھا۔ صدر نظامت آگرہ میں اوّل آپ مسل خواں پھر پیش کار رہے اور آخر میں بورڈ آف ریونیو میں سررشتہ دار ہو گئے فرائض منصبی نہایت دیانت محنت اور راست بازی سے انجام دیتے تھے حکام بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اسی زمانہ میں ولیم میور نے جو کہ وہاں مجسٹریٹ علاقہ فوج تھا اور بعد کو لفٹنٹ گورنر صوبہ یوپی ہوا (۱۸۶۸ تا ۱۸۷۲ء) اُس نے آپ سے عربی پڑھی۔

اخلاق مولانا فیض احمد نے اخلاق بڑے وسیع پائے تھے اہالیانِ وطن کی آپ بڑی مدد کرتے تھے۔ بدایوں کا جو شخص پہنچا اور جس کام میں مدد کا خواستگار ہوا اُس کی حتی الوسع امداد کی، قیام و طعام کی کفالت کرتے بعض اوقات

ان مصارف کے لئے قرض کی ضرورت پڑتی۔ صاحب اکمل التاریخ لکھتے ہیں:۔ باوجود ثروت و وقار کے دل فقیرانہ، مزاج شاہانہ تھا۔ فقراء سے محبت اور غرباء سے الفت طلبہ کے شائق اور علم کے شیدائی تھے۔ شاگردوں کی تمام ضروریات کے خود متکفل ہوتے تھے بسلسلہ درس وتدریس اقامت آگرہ میں برابر جاری رہا۔

مناظرہ مابین مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ہمدوش مذہب عیسوی نے بھی فروغ حاصل کیا اور ہر ممکن صورت سے اس مغلوب ملک کو مذہبی حیثیت سے بھی فتح کرنے کی کوشش کی گئی۔ کمپنی کی تائید و اعانت سے مذہب مسیحی کی تنظیم اور ترقی عمل میں آئی۔ ملک کے طول و عرض میں ہر جگہ اس تنظیم کے آثار قائم کئے گئے۔ چرچ مشن سوسائٹی بائبل سوسائٹی، مشن فنڈ، مشن ہسپتال، مشن کالج اور مدارس جابجا قائم ہوتے مذہبی کتابوں اور رسائل کی اشاعت کے ذریعہ ہندوستانیوں کے رجحانات وعقائد سلب کرنے کی کوشش کی گئی۔ غرض یہ وہ زمانہ تھا کہ عیسائیوں نے ہندوستان میں اسلام کے خلاف زبردست مہم جاری کر رکھی تھی۔ ۱۸۵۴ء میں پادری فنڈر (REVD. C.C.D. FONDAR) یورپ سے ہندوستان آیا۔ یہاں اس نے اور اس کی جماعت نے دل شکن تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس کی کتاب "میزان الحق" نے خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا۔ پادری فنڈر نے آگرہ کو مناظرہ کا گڑھ ٹھہرایا۔ کیونکہ آگرہ ہی اسوقت علماء کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر یہاں کسی طرح فتح ہو گئی تو عیسائیت کی تبلیغ میں بڑی مدد ملے گی۔ اس نے مشاہیر علماء کو چیلنج دیا۔ مجلس علماء میں مشورہ ہوا۔ مولانا فیض احمد کے دوست ڈاکٹر وزیر خاں نے چیلنج قبول کر لیا اور مذہب عیسوی کے مشہور ماہر

و مناظر مولوی رحمت اللہ کیرانوی جو کہ عرصہ سے پادری مذکور سے خط و کتابت کر رہے تھے بلائے گئے انھوں نے چھل اینٹ آگرہ میں قیام کیا۔ ضروری انتظامات کے بعد ۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء بروز پیر کٹرہ عبد المسیح آگرہ میں مناظرہ کا پہلا اجلاس ہوا۔ اہل اسلام کی جانب سے مناظر اول مولوی رحمت اللہ عثمانی کیرانوی اور مناظر دوم ڈاکٹر وزیر خاں تھے جن کے معین و مددگار مولانا فیض احمد بدایونی تھے۔ عیسائیوں کی طرف سے مناظر اول پادری فنڈر اور مناظر دوم پادری فرنچ تھے۔ مجلس مناظرہ میں مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی۔ مسٹر کریچین سیکنڈ صوبہ بورڈ، مسٹر ولیم میور مجسٹریٹ علاقہ فوج، مسٹر لیڈل ترجمان حکومت پادری ولیم گلین مفتی ریاض الدین مولوی حضور احمد سہسوانی۔ مولوی امیر اللہ مختار راجہ بنارس۔ مولوی ضمیر الاسلام امام جامع مسجد آگرہ مفتی خادم علی مہتمم مطلع الاخبار مفتی سراج الحق۔ مولوی کریم اللہ خان بچھرایونی۔ پنڈت جگل کشور۔ راجہ بلوان سنگھ (بنارس)، قاضی حکیم فرزند علی گوپاموی۔ مولوی سراج الاسلام نیز اور بہت سے علماء، عمائدین اور رؤسا شہر موجود تھے۔ شرائط مناظرہ میں یہ خاص شرط تھی کہ مغلوب کو غالب کا مذہب اختیار کرنا ہوگا۔ تین روز تک مناظرہ ہوا۔ پادری فنڈر کو انجیل کی تحریف کا اقرار کرنا پڑا اور اس نے شکست فاش کھائی اور آگرہ سے راہ فرار اختیار کر کے سیدھا یورپ پہونچا۔ اس مناظرہ کی پوری کیفیت (البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف) کے نام سے وزیر الدین نے مرتب کر کے حافظ عبد اللہ کے اہتمام سے ۱۲۷۰ھ میں فخر المطابع شاہ جہان آباد میں ولی عہد مرزا فخرو کے صرفہ و حکم سے چھپوا کر اکناف و اطراف ہند میں تقسیم کرادی تھی اور اسی مناظرہ اکبر آباد کو چھوٹی تقطیع پر حصہ اول "مباحثہ مذہبی" اور دوسرا اسلات مذہبی کے نام سے سید عبد اللہ اکبر آبادی نے منشی محمد امیر کے اہتمام سے

مطبع منعیہ اکبرآباد سے ۱۲۷۰ھ میں چھپوایا۔ پہلا حصہ فارسی میں تقریری مناظرہ کی روداد ہے اور دوسرے حصہ میں ڈاکٹر وزیرخاں اور پادری فنڈر کا تحریری مناظرہ اردو میں ہے اس کتاب کا عربی ترجمہ مولوی رحمت اللہ کی کتاب اظہار الحق کے حاشیہ پر مطبوعہ ہے جو کہ مطبع محمودیہ قاہرہ مصر سے ۱۳۱۷ھ میں طبع ہوا ہے۔ غرض اس تاریخی مناظرہ میں مولانا فیض احمد بدایونی نے ڈاکٹر وزیرخاں کو ہر طرح مدد دی اور اُن کی کامیابی کے لئے ممدہوئے۔ اور یہ دوران ملازمت میں بڑا کام تھا۔

جامع مسجد آگرہ

یہ ہندوستان کی قابل فخر تاریخی جامع مسجد اس زمانہ میں عجیب حالت میں تھی۔ صرف بیچ کا حصہ خالی تھا جس میں ستر اسی نمازی نماز پڑھ سکتے تھے۔ باقی حصہ پر کبوتر بازوں کا قبضہ تھا یا رسیاں بٹنے والے رسیاں بٹتے تھے۔ مسجد کی دوکانیں بنیوں کے پاس رہن تھیں۔ مولانا نے یہ صورت دیکھی تو بے چین ہوگئے اور طویل جدوجہد کا سلسلہ شروع کردیا جس کا اندازہ مقدمات کی مسلوں کے معائنہ سے ہوسکتا ہے۔ بالآخر مولانا کو کامیابی ہوئی۔ دوکانیں خالی کرائی گئیں۔ مسجد کا انتظام درست کیا گیا۔ کبوتر بازوں کو نکالا گیا۔ رسی بٹنے کی لعنت ختم کرکے مسجد کی درستی کرائی گئی اور مسجد کے انتظام کے لئے لوکل ایجنسی آگرہ کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے تحت آج تک جامع مسجد آگرہ کا انتظام ہے

آگرہ میں شاہ احمد اللہ کی آمد

مولانا سید احمد اللہ شاہ ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے جذبہ انقلاب لیکر دہلی پہونچے۔ بقول مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ وہاں انگریز ریزیڈنٹ کی نگاہیں بہت تیز تھیں۔ ایسی کسی کارروائی کا ہونا اور پروان چڑھنا ناممکن تھا۔ اسی بنا پر حضرت مولانا مفتی صدرالدین صاحب

آزردہ نے شاہ صاحب کو آگرہ جانے کا مشورہ دیا اور وہاں کے بزرگوں کے نام تعارفی خط بھی لکھ دیا۔ حضرت شاہ صاحب وہ تعارفی خط لیکر مفتی انعام اللہ خاں بہادر وکیل سرکار کے پاس پہونچے انھوں نے بڑی قدر و منزلت کی یہاں علماء و فضلاء کا اجتماع تھا اس پورے حلقہ میں شاہ صاحب کی بڑی عزت ہوئی محفل سماع اور وعظ کا دور شروع ہوا یہاں تک کہ شاہ صاحب کو یہاں اپنے خواب کی تعبیر نظر آنے لگی۔ بہت لوگ معتقد ہوگئے۔ عام گرویدگی دیکھ کر حکومت کو بھی فکر ہوئی چنانچہ حضرت شاہ صاحب سے تعلق رکھنے والے علماء پر جو صدر نظامت میں عہدہ دار بھی تھے۔ مقدمہ چلایا۔ مقصد یہ تھا کہ جماعت منتشر ہو جائے مگر حکومت کو اس میں ناکامی ہوئی۔ کیونکہ تمام ملزمین بے داغ بری کر دیئے گئے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء

میرٹھ اور دہلی میں علم انقلاب بلند ہوا تو اُس کا فوری اثر آگرہ پر پڑا جو صوبائی حکومت کا مرکز تھا۔ کالون صاحب لفٹنٹ گورنر نے سب فوج ہندوستانی اور انگریزی کو جمع کر کے فہمائش کی جس کا اثر چند روز رہا مگر ماہ جون میں یہاں بھی واقعات شروع ہوئے۔ جولائی میں تیزی آئی۔ مجاہدین فوج کی سرپرستی ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی نے کی مگر جب حالات کا جائزہ لیا اور دہلی سے پیام و سلام کے ذریعہ طلبی ہوئی تو کچھ مسلح سپاہ کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی دہلی روانہ ہوگئے۔

مولانا فیض احمد صاحب دہلی میں

دہلی میں ایسے ذی علم سنجیدہ اور با اخلاص اصحاب فکر کی ضرورت تھی۔ ان دونوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ڈاکٹر وزیر خاں جنرل بخت خاں کے مشیر خاص کی حیثیت سے کام کرنے لگے اور

مولانا فیض احمد صاحب مرزا مغل کے پیشکار مقرر ہوئے۔ مختلف معرکوں میں آپ نے شرکت فرمائی۔

۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب جنرل بخت نے دہلی سے کوچ کیا تو مولانا فیض احمد صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں جنرل بخت خاں کے ساتھ تھے۔ اُس وقت لکھنؤ میں معرکہ کارزار گرم تھا۔ مولانا شاہ احمد اللہ صاحب دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ یہ مولانا فیض احمد صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں لکھنؤ پہونچے اور تمام اہم معرکوں میں شاہ صاحب کے ساتھ رہے۔

سقوطِ لکھنؤ کے بعد سب کا اجتماع شاہ جہانپور میں ہوا اور یہاں چند ماہ تک انگریزوں سے سخت معرکے ہوتے رہے۔ اسی اثنار میں مولانا فیض احمد صاحب بدایوں پہونچے۔ ڈاکٹر وزیر خاں آپ کے ساتھ تھے اور شاہزادہ فیروز بھی بدایوں پہنچ چکے تھے۔ بدایوں کے معرکوں میں ان مجاہدین نے حصہ لیا۔ ککرالہ کے معرکہ میں قیادت کا فرض انجام دیا۔ پھر جب یہاں بھی ناکامی ہوئی تو قصبہ محمدی پہونچے جہاں مولانا احمد اللہ شاہ صاحب نے حکومت قائم کی تھی۔ یہ دونوں بزرگ مولانا کی وزارت میں داخل ہوئے۔ مولانا شاہ احمد اللہ کی شہادت کے بعد ایسے روپوش ہوئے کہ آپ کے ماموں مولانا فضلِ رسول نے آپ کی تلاش میں قسطنطنیہ تک سفر کیا مگر کہیں سراغ نہ لگ سکا۔ رحمہ اللہ۔

(۲) منشی ذوالفقارالدینؒ[1]

صاف گوئی اور صداقت پسندی کی ناقابل فراموش مثال

منشی ذوالفقارالدین ولد وہاب الدین بدایوں کے متولیوں کے خاندان سے تھے۔ جب انگریزی تسلط کے بعد گرفتار ہو کر مسٹر کارمیکل کے سامنے بغرض جواب دہی پیش ہوئے تب منشی جی نے اپنی قوتِ ایمانی کی بنا پر صاف الفاظ میں کہا تمہاری حکومت جا چکی تھی مجھکو ملازمت کی ضرورت تھی میں نے نوکری کرلی۔ منشی جی کبھی اس انگریز کے ساتھ کام کر چکے تھے وہ چاہتا تھا کہ منشی جی جرم سے انکار کردیں انھوں نے صاف جواب دیا کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ حق گوئی اور صداقت پسندی کی حد ہوگئی کہ آپ نے جان دیدی مگر جھوٹی بات سے زبان کو ملوث کرنا پسند نہیں کیا۔ سچ ہے

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

آپ کی تاریخ شہادت حسب ذیل کہی گئی ہے

کی بغاوت ہوئے قتل آہ — شہادت کا رتبہ ملا بالیقیں
مجھے فکر تھی اُن کی تاریخ کی — کہ ہاتف نے مجھ سے کہا اے حزیں

یہ مظلوم بیکس کی تاریخ ہے
ہوا مسند آرائے خلد بریں

۱۲ ھ ۷۴

---

[1] از (۲) تا (۸) ماخوذ از مضمون محترم سلیمان صاحب شائع شدہ الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن)

ایمان نہیں کھو سکتا، جان دینا آسان ہے

(۳) مولوی رضی اللہ بدایوں کے صدیقی شیخ تھے۔ مولوی صاحب سے کارمیکل نے پڑھا تھا جب وہ گرفتار ہو کر اس کے سامنے پیش ہوئے۔ اس کے استفسار پر مولوی صاحب نے شرکت ہنگامہ کا اقبال کیا۔ اس نے مقدمہ ملتوی کر کے دوسرے دن پر رکھا اور چاہا کہ مولوی صاحب انکار جرم کریں مگر دوسرے دن پھر پیشی کے وقت مولوی صاحب نے پچھلے بیان سے سر مو فرق نہیں کیا۔ سزائے موت کا حکم ہوا جس وقت گولی کے نشانہ کے لئے پیش ہوئے اس وقت کارمیکل نے کہا کہ اگر آپ اس وقت بھی انکار کر دیں تو آپ کی جان بچا دوں۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کیا میں تمہاری وجہ سے اپنا ایمان و عاقبت خراب کر لوں؟ نہایت خندہ پیشانی سے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

(۴) چودھری تفضل حسین صاحب ولد چودھری محمد عظیم فاروقی شیخ محلہ چودھری سرائے بدایوں۔ چودھری صاحب انگریزی تسلط ہونے پر روپوش ہو گئے۔ ایک گھوڑے پر سوار جنگلوں میں گھومتے پھرتے۔ سائیس آبادی میں جا کر کھانے کا انتظام کر لاتا۔ گھر جائداد وغیرہ سب نیلام ہو گئی۔ عام معافی میں ظاہر ہوئے ۱۸۹۲ء میں انتقال ہوا اس خاندان کی بڑی ریاست تھی جو ختم ہوئی۔

عجیب اتفاق ہے۔ تفضل حسین نام کے تین بزرگ۔ تینوں جرم بغاوت میں ماخوذ۔ مگر نتیجے مختلف رہے۔

مولوی تفضل حسین صاحب (قاضی ٹولہ) تحصیل دار۔ جرم بغاوت میں گولی کی ضرب سے شہید کئے گئے۔

حکیم تفضل حسین صاحب (مولوی ٹولہ) مقدمہ چلا اور رہائی پائی۔
چودھری تفضل حسین —— عام معافی کی وجہ سے بچے

(۵) خسر داماد دونوں شہید

ایک دن کی بیاہی صاحبزادی بیوہ

سید محمد شاہ ولد سید حیدر علی سرائے کے سادات میں سے تھے۔ یہ محلہ بدایوں کا ایک محلہ ہے مگر حدود میونسپلٹی سے باہر ہے اس کی آبادی ۱۳۱۷ ہے۔ سادات کے دو گروہ ہیں۔ ایک زیدی سید دوسرے خضر خانی۔ سید محمد شاہ کا تعلق آخر الذکر سادات سے ہے۔ یہ لوگ سید علاء الدین آخری سید بادشاہ جو بدایوں میں سکونت پذیر ہوگیا تھا اس کی نسل سے ہیں مشہور مفتی محمد عوض بریلوی (روہیلکھنڈ) کے نواسے تھے۔ مفتی صاحب کی شہرت علاوہ ان کے علم وفضل کے اپریل ۱۸۱۶ء کے ہنگامہ کی وجہ سے تھی جو ۱۸۱۴ء کے ریگولیشن ہاؤس ٹیکس پر حکومت سے ہوا تھا۔ سید صاحب کے صرف ایک لڑکی حسینہ نامی تھی۔ شام کو اس کا نکاح ہوا۔ صبح کو سید محمد شاہ مع داماد کے گرفتار ہوکر گولی سے اڑا دیئے گئے سید صاحب نے عین نماز میں جان دی

سزائے بید اور الا اللہ پر مزید سزا

(۶) بید کی سزا میں صرف ایک نام شیخ مسیح الدین ولد شیخ غلام محمد کا معلوم ہوا ہے۔ ہنگامہ سے قبل مختاری کرتے تھے۔ الزام بغاوت میں گرفتار ہوئے ساٹھ بید لگے آخری ضرب بید پر الا اللہ کہا۔ اس پر بدبخت نے دس بید اور لگوائے بیہوش ہو گئے

۱۹۲۲ء میں انتقال کیا۔

(۷) جنرل نیاز محمد خاں نہایت بہادر اور دلیر بات کے پکّے اور غیور تھے۔ ۱۹ اپریل کی شکست کے بعد بدایوں چھوڑ کر بریلی چلے گئے۔ جنرل نے اپنے زمانہ قیام بدایوں میں ایک مقامی شخص سے ایک گھوڑا خریدا تھا۔ بیچنے والے کو خیال ہوا کہ اب انگریز آگیا خدا جانے میں دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے کس مصیبت میں مبتلا ہوں۔ اپنے چند اعزا کو لے کر نکاس شہر پر سدِ راہ ہوا۔ جنرل کے ہمراہیوں نے چاہا کہ دارو گیر کریں۔ جنرل نے فوراً ہمراہیوں کو مزاحمت سے روک کر گھوڑا مالک سابق کو دیدیا اور قیمت کی بابت ایک لفظ بھی زبان پر نہ لائے۔

جنرل فرار ہو کر مکہ معظمہ گئے۔ ۱۸۷۲ء میں نواب جوناگڈھ کی ملازمت کی بمبئی کسی ضرورت سے آئے تھے انگریز کے پنجہ میں آ گئے۔ مقدمہ بدایوں میں چلا۔ اس وقت مسٹر ایم ڈبلیو سندرس کلکٹر بدایوں (۱۸۷۳ء لغایت ۱۸۸۱ء) تھا۔ منجانب حکومت پیروی مقدمہ مسٹر کارمیکل نے کی (جو اس وقت بورڈ آف ریونیو کے ممبر تھے) جنرل کی طرف سے مولوی طفیل احمد صاحب وکیل پیش ہوتے (مولوی طفیل احمد صاحب انھیں مولوی رضی اللہ تحصیلدار کے فرزند احمد تھے جن کو بغاوت کے الزام میں گولی ماری گئی تھی۔ جنرل نیاز محمد خاں کو سزائے موت کا حکم ہوا۔ عدالت اپیل سے سزائے موت کا حکم حبس دوام بعبور دریائے شور سے مبدل کر دیا گیا

(۸) بدرالاسلام عباسی۔ بدایوں کے عباسی خاندان سے تھے۔ دورِ حاضر کے اس خاندان کے ممتاز رکن قاضی عبدالسلام المتوفی ۱۲۸۹ھ جنھوں نے قرآن کریم کی نظم تفسیر زاد الآخرہ لکھی ریاست رام پور کے قاضی رہے اُن کے خلف الرشید قاضی شمس الاسلام المتوفی ۱۳۱۷ھ بے حد مخیر قاضی ریاست رامپور تھے۔ عباسی صاحب نے ایک نظم

دوران ہنگامہ میں لکھی جس کا ایک مصرعہ تھا۔

سر کمپنی کا کاٹ کے بکا پاؤ آنہ میں

یہ جرم تھا جس کی سزا موت تجویز ہوئی۔

مراد آبادؔ[۱]

اس زمانہ میں مسٹر سی بی سانڈرس مجسٹریٹ، مسٹر جے کمبل جوائنٹ مجسٹریٹ اور مسٹر جے کراکرانٹ ولسن جج تھے۔ آخر الذکر چونکہ اس ضلع میں سترہ برس سے تعینات تھے۔ لہذا وہ ضلع اور باشندگان ضلع کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے اور جب صورتِ حال زیادہ تشویشناک ہوگئی تو تمام ضلع کا انتظام انہیں کے سپرد کر دیا گیا۔

مراد آباد میں قاضی عصمت اللہ صاحب فاروقی کی اولاد میں نواب مجدالدین خاں عرف نواب مجو خاں۔ نواب شبیر علی خانصاحب، لاورالملک نواب دوندے خاں کے پوتے نواب عباس علی خاں اور اسد خاں وغیرہ مولانا کفایت علی صاحب۔ کافی۔ اور مولانا وہاج الدین صاحب عرف مولوی منو۔ سرکردہ لوگوں میں سے تھے۔

دہلی کے انقلاب کی خبریں اگرچہ ۱۲ رمئی ہی سے پہونچنی شروع ہوگئی تھیں مگر یہاں ایک ہفتہ بعد ۱۹ رمئی کو حرکت شروع ہوئی۔

نواب رام پور بہت سختی سے انگریزوں کے حامی تھے مگر باشندگان رام پور کی ایک بہت بڑی جماعت انگریزوں سے متنفر اور انقلاب کے لئے بے چین تھی۔ وہ رام پور میں کوئی اقدام

---

[۱] جناب محترم محمد ایوب صاحب قادری بی اے بدایونی کا ایک بہت ہی قابل قدر مقالہ روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن مورخہ ۱۹ رنومبر ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا یہ مضمون اسی سے ماخوذ ہے۔

نہ کر سکی تو اُس کے تقریباً دوسو افراد مراد آباد پہنچے اور علم انقلاب بلند کر دیا۔ ۱۹ر مئی کو مراد آباد کا جیل خانہ توڑا گیا۔ مولانا منہاج الدین صاحب عرف مولوی منو صاحب ان کے قائد تھے۔ ۳ر جون کو پلٹن نمبر ۲۹ نے بھی بغاوت کردی۔

قیام حکومت

جب انگریز مراد آباد سے بھاگ کر نینی تال اور میرٹھ چلے گئے تو نواب مجدالدین عرف مجو خاں حاکم مراد آباد مقرر ہوئے۔ نواب شبیر علی خاں فوج کے جرنیل مقرر ہوئے۔ اسد علی خاں ہندی توپ خانہ کے افسر مقرر ہوئے۔ مولوی کفایت علی کافی صدر شریعت بنائے گئے۔ انھوں نے اور مولانا منہاج الدین صاحب عرف مولوی منو نے مسلمانوں میں جہاد کی روح پھونکی۔ شہر میں ہر جمعہ کو بعد نماز انگریز کے خلاف وعظ ہوتا تھا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر مراد آباد میں کہا گیا ہے کہ "مسلمانوں نے من حیث القوم ضلع بھر میں برٹش گورنمنٹ سے اپنی مخالفت کو نہایت صاف اور صریح طور پر ظاہر کیا ہے روہیلکھنڈ کے دوسرے اضلاع کی طرح مراد آباد کے ضلع میں بھی غیرت مذہبی اور انگریزوں کی ہر بات سے نفرت کے جذبات نے مسلمانوں کو عام بغاوت پر آمادہ کر دیا تھا" غرض مراد آباد پوری طرح بیدار تھا مولانا کفایت علی نے نشر و اشاعت کے سلسلہ میں کافی کام کیا۔ فتویٰ جہاد کی نقول دوسرے مقامات پر بھجوائیں بلکہ بعض مقامات پر خود تشریف لے گئے۔ آنولہ ضلع بریلی میں خاص اسی مقصد کے لئے ہفتہ عشرہ قیام کیا تھا۔ حکیم سعید اللہ ابن عظیم اللہ کے یہاں ٹھہرے مولانا کافی آنولہ سے بریلی پہنچے۔ خان بہادر خاں سے مشورہ کیا۔

۱؎ سر سید احمد خاں مرحوم نے اپنی کتاب سرکشی اہل بجنور میں تحریر فرمایا ہے کہ مراد آباد جیل ۱۹ر مئی کو توڑی گئی تھی۔ بظاہر یہی صحیح ہے۔

نواب رام پور کا دخل

نواب رام پور یوسف علی خاں صاحب نے انگریزوں سے پورا روہیلکھنڈ فتح کر لینے کی اجازت چاہی تھی۔ مگر جزرس اور محتاط انگریز اس وقت بھی اس سخاوت پر آمادہ نہ ہوا۔ اُس نے صرف ضلع مراد آباد فتح کر لینے کی اجازت دی۔ چنانچہ نواب صاحب نے اپنے چچا۔ عبدالعلی خاں و حکیم سعادت علی خاں کو بھیجکر مراد آباد والوں کو اپنے حق میں ہموار کرنا چاہا۔ کچھ کامیابی نہ ہوئی تو ۲ رجون کو خود نواب یوسف علی صاحب مراد آباد پہونچے۔ وہاں نواب مجو خاں کے اقتدار کو ناقابل تسخیر دیکھ کر خود اُن کے اقتدار سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی یعنی اپنی طرف سے بھی نواب مجو خاں ہی کو ناظم ضلع تسلیم کر لیا۔ ان کے علاوہ چند افسر اپنی طرف سے مقرر کئے۔ حکیم سعادت خاں صاحب کو جج۔ نیاز علی خاں کو ڈپٹی کلکٹر۔ موسی رضا کو کوتوال اور غلام بشیر پسر موسی رضا کو جیلر مقرر کیا۔

جنرل بخت خاں کا مراد آباد سے گذرنا

نواب رامپور کی مداخلت حاکم روہیلکھنڈ خان بہادر خاں کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اُن کو مولانا کافی کے ذریعہ حالات کا علم ہوا تو نواب مجو خاں کی امداد کے لئے جنرل بخت خاں کو روانہ کیا۔ یعنی یہ طے کر دیا کہ جنرل بخت خاں دہلی جاتے ہوئے مراد آباد قیام کریں۔ چنانچہ ۹ رجون کو جنرل بخت خاں اپنی فوج کے ساتھ مراد آباد پہونچے۔ نواب رام پور میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی انھوں نے اپنا انتظام اُٹھا لیا۔ اپنے افسر واپس بلا لئے۔ اب نواب مجو خاں کو آزادانہ انتظام کا موقع ملا۔ مجاہدین کی سرگرمیاں بھی تیز ہو گئیں۔ نواب مجو خاں نے جنرل بخت خاں کی فوجوں کے لئے باربرداری وغیرہ کا انتظام کیا۔ ۱۷ رجون ۱۸۵۷ء کو یہ فوج دہلی روانہ ہو گئی

اب نواب رام پور نے نواب مجو خاں اور عباس علی خاں نبیرہ نواب دوندے خاں میں تفرقہ ڈلوادیا۔ عباس علی خاں نے خود حاکم بننے کا ارادہ کیا مگر خان بہادر خاں نے فوراً تمام حالات سے باخبر ہوکر بریلی سے مصالحت کے لیے خاص آدمی بھیجے اور تمام نشیب و فراز سمجھائے۔ موضع بیجنا کے باشندوں نے بھی مصالحت کے لئے زور دیا۔ آخر دونوں کا اختلاف ختم ہوگیا۔

ریاست رامپور کی دوبارہ مداخلت جنرل بخت خاں کی فوج کی روانگی کے بعد ۴ ہر جون کو دوبارہ نواب رام پور نے عبدالعلی خاں اور حکیم سعادت علی خاں کو مع فوج مرادآباد بھیجا ان لوگوں نے نواب مجو خاں سے پھر مصالحت کرلی اور ان کو سنبھل کی نظامت سپرد کردی۔ نواب مجو خاں کے حاکم سنبھل مقرر ہوتے ہی صاحب سنگھ اور چہدو لکھوری کے جاٹوں نے سنبھل اور اس کے گرد و نواح میں تحریک کو قوت دی حسن پور، ٹھاکردوارہ میں جنگی خاں و مردان خاں اور بلیوں اور روپ سنگھ اہیر نے تحریک کو مدد دی

واقعہ کدو خانی ۳ر اگست ۱۸۵۷ء کو مرادآباد میں ایک واقعہ پیش آیا جس کو واقعہ کدو خانی کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ رامپوری فوج کا ایک ملازم کدو خرید رہا تھا۔ ایک مرادآبادی مسمی محمد عثمان سے تکرار ہوگئی۔ جھگڑا بڑھا عثمان خاں زخمی ہوا۔ بدلے میں اس کے اقربا نے فوجی کو مار ڈالا۔ حکیم سعادت علی خاں نے فساد کو رد کنے کی کوشش کی اور عثمان خاں کے علاج کا حکم ہوا ہنوز رزہ کو توالی نہ پہونچا تھا کہ راستہ میں فوجیوں نے حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ اب تو اہالیان مرادآباد (مجاہدین) اور رام پوری فوج کی چل گئی۔ بہت سے رامپوری مارے گئے۔ آخر بمشکل امن قائم ہوا۔

شہزادہ فیروز شاہ کی آمد نواب رام پور کا مراد آباد میں دخل تھا عبدالعلی خاں انتظام سنبھالے ہوئے تھے۔ شہزادہ فیروز شاہ، رمضان ۱۲۷۴ھ مطابق ۲۲ را پریل ۱۸۵۸ء کو براہ سنبھل مراد آباد میں داخل ہوا اور قریب عید گاہ جنگل میں قیام کیا۔ مجاہدین کی ہمتیں بلند ہو گئیں۔ تدبیریں اور منصوبے تیار ہونے لگے۔ غلام ناصر خاں موسی رضا خاں اور مولوی شاہ علی فیروز شاہ کے پاس پہونچے۔ شہزادہ نے کہہ دیا کہ راستہ بھول کر آگیا ہوں، روزہ دار ہوں، بعد افطار روانہ ہو جاؤں گا۔ اسی درمیان میں شہزادہ کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ شہزادہ کی فوج اصول و قواعد جنگ سے واقف اور ماہر تھی۔ نواب رام پور کی فوج نے شہزادہ سے شکست فاش کھائی۔ سب سے پہلے غالب علی رسالدار بھاگا۔ فوج کے سربراہ موسی رضا اور غلام ناصر بری طرح زخمی ہوئے راستہ میں مولوی شاہ علی نے شیوخ قصابان کے چودھری سے امداد چاہی۔ اس نے دین سے روگردانی اور فرنگی کی مدد کا طعنہ دیا۔ شاہ علی خفیف ہوئے۔ شہزادہ کی فوج مراد آباد میں پھیل گئی۔ انگریز کے ہمدردوں کی مرمت کی گئی۔ مجاہدین میں بڑی قوت پیدا ہو گئی سولہ ہزار اشخاص نے بقسم شرعی محضر نامہ پر شرکت کے لئے دستخط کئے۔

شہزادہ فیروز سے جنگ نواب رام پور نے ۲۴ را پریل ۱۸۵۸ء کو دوبارہ شہزادہ کے مقابلہ پر فوج روانہ کی۔ مگر جھبڑے کے پل تک پہنچتے پہنچتے فوج میں نصف آدمی رہ گئے۔ حکیم نجم الغنی رامپوری مؤلف اخبار الصنادید نے دیکھنے والوں کی زبانی یہ روایت قلمبند کی ہے کہ سپاہی بندوق کا کندہ درخت کے تنے پر زور سے مارتے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ پھر بندوق پھینک کر رام پور کی طرف لوٹ جاتے۔ غرض طلوع صبح کاذب سے قبل ریاست رام پور کی فوج نے رام گنگا کے اس طرف

کنارا کر لیا۔ شہزادہ فیروز شاہ ہوشیار تھا اس کا انتظام خبر رسانی نہایت درست تھا۔ فوج کو ٹھیک کیا اس کو مطلق خوف وہراس نہ تھا۔ پانچ ہزار قواعد داں فوج اس کے ہمراہ اور تمام شہر مراد آباد مدد کو تیار۔ اُس نے تین مورچے قائم کئے۔ ایک شاہ بلاقی شاہ کے مزار کے پاس، ایک قلعہ پر اور تیسرا ان دونوں کے درمیان۔ ریاست کی فوج نے بھی تین حصے کر کے تینوں متذکرہ بالا مورچوں کے مقابل مدافعت کی تیاری کی قلعہ کے مقابل کاظم خاں مزار کے پاس حکیم سعادت علی خاں اور درمیانی مورچے پر عبد العلی خاں متعین تھے۔ ۲۴ر اپریل ۱۸۵۸ء کو کاظم علی خاں کی فوج نے حملہ کیا فیروز شاہ کی فوج نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ہنگامہ جدال و قتال گرم ہوا۔ حکیم سعادت علیخاں کی فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ حکیم سعادت علی خاں، حسین بخش، یعقوب خاں نے شہزادہ پر دوسری جانب سے حملہ کر دیا، اوّل ابتری ہوئی پھر فوج جلد سنبھل گئی شہزادہ کی فوج نے مصنوعی طور سے راہِ فرار اختیار کی رام پور کی فوج نے مژدہ فتح سمجھ کر تعاقب کیا کچھ دور جانے کے بعد فیروز شاہ کی فوج نے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ نوابی فوج کو شکست فاش ہوئی۔ بڑے بڑے سردار کام آئے۔ آخر میں شہزادہ نے ایک پُر اثر تقریر کی اور جہاد کی ضرورت اور انگریزوں کی کرتوتوں پر روشنی ڈالی مگر نوابی فوج پر کچھ اثر نہ ہوا نواب کی فوج نے مجتمع ہو کر پھر حملہ کیا قریب ۱۲ بجے فیروز شاہ نے میدان چھوڑ دیا کیونکہ اس کو اطلاع ملی کہ جنرل جونسن تازہ دم فوج سے آپہونچا ہے۔ حکیم سعادت علی خاں و حسین بخش رسالدار وغیرہ مراد آباد میں فاتحانہ طور سے داخل ہوئے۔ جنرل جونسن گورہ فوج کی بھاری جمعیت کے ساتھ نجیب آباد سے مراد آباد پہونچا۔ ۲۵ر اپریل ۱۸۵۸ء کو مراد آباد پر انگریزی عمل دخل پورے طور پر ہو گیا رامپوری فوج واپس چلی گئی اس کے بعد مسٹر انگلس مراد آباد پہونچا اور مجاہدین کی دارو گیر شروع

ہوئی۔ کرنل گک نے شہر کی ناکہ بندی کر کے خانہ تلاشی اور گرفتاری شروع کی۔

انجام انگریزی حکومت کی بحالی کے بعد ضلع مرادآباد میں سخت مظالم ہوئے مجاہدین کو پھانسیاں دی گئیں، توپ سے اُڑا دیا گیا، گولیاں ماری گئیں۔ نواب مجو خاں کے متعلق تحریر ہے کہ آخر وقت میں بھی ایک مکان کی چھت پر بندوق چلاتے ہوئے معلوم ہوئے۔ سپاہی ہتھیار بندان کو پکڑنے گئے اُنھوں نے بڑی دلیری سے چند کو تمنچے سے مارا اور باقیوں کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار مزید اضافی امداد پہونچی اور وہ گولی سے مارے گئے تھے۔ مولانا کفایت علی کافی کو پھانسی دی گئی جائدادیں ضبط کی گئیں مکانوں کو آگ لگائی گئی۔ بقول سرسید مرادآباد ایک بڑا غمکدہ قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا۔ چنانچہ مولانا حالی حیاتِ جاوید میں ارقام فرماتے ہیں جائدادیں ادنیٰ ادنیٰ شبہ پر ضبط ہوتی تھیں اور انگریزی حکام نیچرل طور پر ہندوستانیوں کی طرف سے بدگمان اور نہایت غیظ و غضب میں بھرے ہوتے تھے۔ خصوصاً ضلع مرادآباد پر گورنمنٹ کا سخت عتاب تھا اور انگریزی افسران کا یہاں اعتدال پر رہنا سخت دشوار تھا۔

واقعاتِ امروہہ امروہہ میں میرٹھ اور دہلی کی خبریں پہونچنے کے بعد، ۱۷ مئی ۱۸۵۷ء کو خاندان دیوان محمود اور خاندان درویش علی[۱] منصب پنجہزاری کے سربرآوردہ حضرات نے درگاہ شریف ولایت شرف الدین میں مجلس مشاورت طلب کی جس میں عمائد و اکابرین شہر علماء اور اہل الرائے حضرات شریک تھے، انقلاب میں حصہ لینا طے ہوا۔ ۱۹ مئی کو جیل خانہ مرادآباد کے ٹوٹنے کے بعد جب سید گلزار علی[۱] ابن اکبر علی ایک جتھہ کے ساتھ راتوں رات مرادآباد پہونچے تو اُن کے

---

[۱] سید گلزار علی صاحب درویش علی خاں کے اخلاف میں سے تھے۔ درویش علی خاں صاحب

(باقی ص ۴۱۱ پر)

پہونچنے کے بعد پھر مشورہ ہوا۔ ۲۰ مئی کو تھانہ و تحصیل پر قبضہ کر لیا۔ اول انگریزوں کی طرف سے گورکھا فوج بھیجی گئی۔ بعض امروہہ کے لوگوں نے انگریزوں کی مدد کی پھر ولسن خود مرادآباد سے امروہہ پہونچا۔ اس نے سید گلزار علی کے مکانات منہدم و مسمار کرا دیئے۔ ولسن کے لئے اس وقت امروہہ میں ٹھیرنا ناممکن تھا اس کو مجبوراً بھاگنا پڑا تو اس کی روانگی کے بعد تحریک آزادی نے بڑھنا شروع کیا اب باشندگان امروہہ نے بادشاہ دہلی کے حضور میں عرضداشت بھیجی۔ جواب میں کچھ دیر ہوئی تو شبیر علی خاں ولد نذیر علی خاں۔ شیخ بشارت علی خاں و مہر علی خاں نبیرگان درویش علی خاں۔ گلزار علی ولد اکبر علی۔ شیخ الٰہی بخش۔ محمد سبحان علی معافیدار۔ شیخ بشارت علی خاں نے (دوبارہ برائے یاددہانی) عرضیاں بھیجیں۔ اُن کے جواب میں شاہی شقے موصول ہوئے جن میں ان لوگوں کی ہمت افزائی کی گئی اور تحریک کو کامیاب بنانے کا مشورہ دیا گیا۔ چنانچہ امروہہ میں حکومت خود اختیاری کا نفاذ ہوا۔ شبیر علی خاں و گلزار علی سرکردہ مجاہدین تھے۔ حریت پسندوں نے اپنا رابطہ خان بہادر خاں (والی روہیلکھنڈ) سے قائم کیا۔ خان بہادر خاں نے اپنی طرف سے ایک صاحب "قران خاں" کو امروہہ کا نگراں مقرر کیا۔ ادھر نواب رامپور اپنی کوششوں میں مصروف تھے۔ انھوں نے اپنے آدمیوں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۰۔ کسی زمانہ میں مغل بادشاہ کی طرف سے پنجہزاری منصب دار رہے تھے اس موروثی نمک خواری نے اس وقت مغل بادشاہ سے وفاداری پر آمادہ کیا۔ آپ نے بادشاہ کے نام درخواست بھیجی سنبھل، امروہہ اور مرادآباد سے انگریزوں اور اُن کی حکومت ختم کر دینے کی بشارت دیتے ہوئے خاندانی منصب کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ درخواست میں یہ بھی ظاہر کیا کہ امروہہ کا نظم و نسق بڑے بھائی شیخ بشارت علی کے سپرد ہے جن کے ماتحت پانسو نوجوان کام کر رہے ہیں اور میں غازی آباد پہونچکر نواب ولی داد خاں کی مدد کر رہا ہوں۔ تاریخ سادات امروہہ اور باغی علماء صفحہ ۷۸

کے ذریعہ سازشوں کا جال بچھا دیا۔ ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن آنچہ کرد آں آشنا کرد

نواب رام پور کی طرف سے سید ظہور حسین (ناظم عارضی)، اصغر علی خاں (ناظم مستقل)، محب علی خاں تحصیلدار۔ یعسوب الدین تھانیدار اور کریم بخش عباسی (کوٹ گشت) مقرر ہوئے اور اس کے علاوہ بہت سے اشخاص نے انگریزی کی مخبری کے فرائض انجام دیئے۔ جس کے صلہ میں اُن کو اعزاز واکرام وزمینداریاں ملیں۔

گلزار علی خاں کے سپرد فوج کا انتظام کیا۔ اس لائق اور جانباز مجاہد نے فوج کی بڑی اچھی تنظیم کی۔ مانڈے خاں اُن کے شریک تھے۔ ۱۹ر نومبر ۱۸۵۷ء کو رام پور کی فوج سے (جو حکیم سعادت علی خاں کی زیر سرکردگی تھی) گلزار علی خاں کا مقابلہ ہوا۔ بڑے زور کا معرکہ ہوا۔ مجاہدین کے جذبہ وجوش سے مقابل گھبرا گئے۔ لیکن سعادت علی خاں کی فوج کامیاب ہوئی اور مراد آباد کے ساتھ ساتھ امروہہ پر پھر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہوگیا پھر تو پھانسیاں دی گئیں۔ توپوں سے اڑائے گئے۔ مکانات کو آگ لگائی گئی اور بہت سے لوگوں کو عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ شبیر علی خاں کالے پانی پہونچے۔ گلزار علی روپوش ہوئے اور ضلع بریلی کے گھنے جنگلوں میں عمر گذار دی۔

سیکڑوں میں سے چند

نواب مجّو خاں (مراد آباد) اور چودھری عبدالقادر عرب

اصل نام مجدالدین احمد عرف مجّو۔ والد کا نام محمد الدین احمد خاں۔ نبیرہ قاضی عصمت اللہ صاحب فاروقی۔ قاضی عصمت اللہ عہد عالمگیری کے ایک امیر تھے۔ مختلف صوبوں کے حاکم رہے۔ نواب مجدالدین خاں جاگیردار وسیع حوصلہ رئیس تھے۔ عمائدین مراد آباد کا آپ کے یہاں اجتماع رہتا۔ خصوصیت سے ہر ہفتہ اعلیٰ پیمانہ پر دعوت ہوتی جس میں عمائدین شہر اور علماء و فضلاء خاص طور پر مدعو ہوتے تھے۔ اُن کے بھائی نواب سعیدالدین خاں تھے۔ مرزا غالب مراد آباد گئے تو انھیں کے یہاں قیام فرمایا۔

نواب مجّو خاں کے مخلص دوست چودھری عبدالقادر عرب تھے جن کی کُشتی کی شہرت دور دور تھی۔ جنگ آزادی میں نواب مجّو خاں کے ساتھ رہے۔ جب انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا تو نواب مجّو خاں زنانخانوں میں چھپ گئے۔ مگر چودھری صاحب کھلے بندوں محلّہ اصالت پورہ میں مقیم رہے۔ انگریزی افسر پہونچے تو خود زنان خانہ سے نکل کر اپنے آپ کو سپرد کر دیا اور نواب مجّو خاں کو بھی کہلا بھیجا کہ روپوش رہنا بہادری نہیں ہے۔ چنانچہ نواب صاحب بھی باہر نکلے اور خود کو گرفتار کرا دیا۔ مقدمہ چلا۔ سزا موت تجویز ہوئی۔ تمام جائداد و املاک ضبط ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو چونے کی بھٹی میں جلا دیا گیا اور مراد آباد میں یہ بھی مشہور ہے کہ نواب مجّو خاں کو ہاتھی کے پاؤں سے باندھ دیا گیا۔[۵۱]

روسا مراد آباد کی حویلیوں کے نشانات اب تک موجود ہیں۔ باوجودیکہ ایک ایک

---

۵۱ ایک روایت یہ بھی ہے کہ نواب مجّو خاں گرفتار کرنیوالوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوگئے مگر زیادہ مشہور آخری روایت ہے

حویلی میں پورا پورا محلہ آباد ہو گیا ہے۔ پھر بھی کچھ حصے باقی ہیں تو اتنے وسیع کہ عظیم الشان دیوان خانوں کے سامنے بلند چبوترے اور نیچے کے حصے میں پائیں باغ۔ اب تک باقی ہیں۔[۱]

مولانا کفایت علی صاحب[۲] کافی شہید رحمۃ اللہ علیہ

عالم و فاضل طبیب[۳] اور قادر الکلام شاعر[۴] تھے۔ خانوادہ سادات کے ایک رکن تھے مراد آباد اصل وطن تھا۔ حضرت شاہ ابو سعید[۵] صاحب مجددی رام پوری سے علم حدیث کی تکمیل کی اسی علم شریف سے بے حد شغف تھا۔ خاص طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ سے عشق تھا۔ سچ یہ ہے کہ عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انہیں جذبات نے صورت شعر اختیار کر لی تھی۔ یہی آپ کی شاعری تھی۔ آپ خود فرماتے ہیں۔

---

[۱] ماخوذ از مشاہیر جنگ آزادی مصنفہ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی ص ۲۶۲ و ص ۲۶۳

[۲] حضرت مولانا کفایت علی صاحب کافی رحمۃ اللہ علیہ شہید کے متعلق معلومات کا یہ تمام ذخیرہ جس سے یہ باب مرتب کیا گیا ہے محترم محمد ایوب صاحب قادری بی اے کے مضمون سے ماخوذ ہے جو العلم جنگ آزادی نمبر (اپریل تا جون ۱۹۵۷ء) (کراچی) میں شائع ہوا تھا۔ [۳] مولانا کافی نے علم طب حکیم شیر علی صاحب سے حاصل کیا۔ حکیم شیر علی صاحب مولانا رحمان علی صاحب مولف "تذکرہ علماء ہند" کے والد ماجد تھے [۴] شیخ مہدی علی خاں ذکی مراد آبادی شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ اور رام پور کے درباروں سے متعلق رہے۔ لکھنؤ سے ملک الشعراء کا خطاب تھا اپنے دور کے نامور شعراء میں سے تھے۔ مراد آباد میں آپ کے چار شاگرد مولانا کفایت علی کافی مولوی محمد حسین تمنا۔ مولوی معین الدین نزہت اور مولوی شبیر علی خاں تنہا۔ چار یار باصفا مشہور تھے۔ ۷۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ سال وفات ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء [۵] شاہ ابو سعید بن شاہ صفی القدر ۲ ذی قعدہ ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۱ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ قرآن شریف حفظ کیا۔ علوم عقلی و نقلی مفتی شرف الدین صاحب رامپوری و شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی سے حاصل کئے حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ دہلوی سے سند حدیث حاصل کی۔ اپنے والد سے مرید ہوئے پھر شاہ درگاہی رامپوری المتوفی ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء سے اجازت بیعت ارشاد حاصل کی۔ شاہ غلام علی صاحب دہلوی سے نقشبندی سلسلہ میں اجازت حاصل کی۔ دہلی میں آپ سے بڑا فیض جاری ہوا۔ بروز عید الفطر ۱۲۴۹ھ / ۱۸۱۱ء ٹونک میں انتقال ہوا۔ جنازہ دہلی لایا گیا۔

بس آرزو یہی دل حسرت زدہ کی ہے ‏ ‏ سُنتا رہے شمائل احوال مصطفےٰ
ہو سعید دوجہاں وہ جو کوئی لیل ونہار ‏ ‏ نعت اوصاف رسول اللہ کا شاغل ہو

آپ صاحب تصانیف ہیں۔ مگر موضوع تصانیف احادیث مقدسہ ہیں۔

آپ کی مشہور (مگر آجکل نایاب) تصانیف یہ ہیں۔

بہارِ خلد۔ ترجمہ شمائل ترمذی شریف منظوم۔ نسیم جنت[1]۔ مجموعہ چہل احادیث مع تشریح منظوم۔ خیابان فردوس۔ ترجمہ منظوم ترغیب اہل سعادت: مصنفہ حضرت مولانا عبدالحق صاحب محدث دہلوی متعلق بہ فضائل درود شریف۔

حج بیت اللہ اور زیارت حرم مدینہ منورہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا بے حد شوق تھا۔ آپ کے دیوان "دیوان کافی" کی متعدد نظموں میں اس شوق کا اظہار ہے۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کی یہ تمنا پوری کی۔ تو ایک مثنوی اس سفر کے متعلق بھی لکھدی۔ جو "تجمل دربار رحمت بار" کے عنوان سے منشی عبدالرحمٰن صاحب شاکر مالک مطبع نظامی کانپور کی کوشش سے طبع ہوئی۔

ان کے علاوہ مولود بہاریہ۔ جذبہ عشق[1]۔ اوقات نحو وصرف۔ بھی آپ کی تصانیف ہیں۔

مولانا کافی کا کچھ عرصہ آگرہ میں بھی قیام رہا ہے۔ جب ۱۸۵۷ء کی تحریک حریت مرادآباد میں نمودار ہوئی تو آپ صف اوّل کے مجاہدین میں پیش پیش تھے۔

انگریزی حکومت ختم ہو جانے کے بعد جب نواب مجدالدین عرف نواب مجو خاں

---

[1] اس میں ستون حنانہ کا واقعہ نظم کیا ہے۔ حلیہ شریف اور وفات نامہ بھی آپ کے منظوم رسالے ہیں۔ مگر یہ دونوں بہار خلد سے ماخوذ ہیں۔

کی زیرِ سرکردگی آزاد حکومت قائم کی گئی تو آپ صدر الشریعت قرار دیئے گئے۔ آپؒ کے یہاں مقدمات کا فیصلہ شرعی احکام کے مطابق ہوتا تھا۔

اسی اثناء میں جب مراد آباد میں نواب رام پور کی بالادستی قائم ہوئی تو آپ نے انگریزوں کے خلاف ایک فتویٰ جہاد مرتب کیا۔ اس کی نقلیں آپ نے دوسرے مقامات پر بھجوائیں بلکہ بعض مقامات پر آپ خود تشریف لے گئے۔ آنولہ[1] ضلع بریلی میں خاص اسی مقصد کے لئے ایک ہفتہ سے زیادہ قیام فرمایا۔ حکیم سعد اللہ ولد حکیم عظیم اللہ صاحب آپ کے ہم سبق ساتھی تھے۔ انھیں کے یہاں آپ کا قیام رہا۔ حکیم صاحب آنولہ میں تحریک آزادی کے خاص رکن تھے۔ مولانا کافی آنولہ سے بریلی پہونچے۔ وہاں نواب خان بہادر خاں اور امام المجاہدین مولانا سرفراز علی صاحب سے مشورے ہوئے۔ جنرل بخت خاں کی ماتحتی میں جو فوج بریلی سے دہلی جارہی تھی اسی فوج کے ساتھ آپ مراد آباد واپس ہوئے۔

گرفتاری اور پھانسی

۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو مراد آباد پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا۔ مولانا کافی کچھ دنوں محفوظ رہے۔ ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء ۱۶ رمضان المبارک ۱۲۷۴ھ کو مولانا گرفتار ہوئے۔ مولانا پر مختلف الزامات عائد کئے گئے اور ضابطہ کی کارروائی کے بعد پھانسی کا حکم صادر کردیا گیا۔ مولانا کافی نے جیسے ہی حکم سنا نہایت خوشی کا اظہار کیا اور جب مولانا کو پھانسی کے لئے لے جایا گیا تو آپ کی زبان پر ایک تازہ نظم تھی جو بڑے ترنم سے بلند آواز سے پڑھ رہے تھے۔ نظم یہ ہے۔

---

[1] آنولہ میں نواب کلن خاں (نبیرہ بخشی سردار خاں) نواب خان بہادر خاں کی طرف سے حاکم مقرر تھے۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب (شاگرد حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی) نواب جان محمد۔ نواب حسن۔ شیخ خیر اللہ اور حکیم سعد اللہ اُن کے خاص رفقاء اور مبشر تھے۔

کوئی گل باقی رہیگا نے چمن رہ جائیگا
پر رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا

ہم صفیرو باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اُڑ جائیں گی سُونا چمن رہ جائیگا

اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہو
اس تن بے جان پر خاکی کفن رہ جائیگا

نام شاہان جہاں مٹ جائیں گے لیکن یہاں
حشر تک نام و نشان پنجتن[۱] رہ جائے گا

جو پڑھے گا صاحب لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائیگا

سب فنا ہو جائیں گے کافی ولیکن حشر تک
نعت حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائیگا

حضرت مولانا کافی رحمۃ اللہ علیہ کو جیل مراد آباد کے پاس مجمع عام کے سامنے پھانسی دی گئی اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ رحمۃ اللہ و رضی عنہ

مولانا وہاج الدین صاحب مراد آبادی

مولانا حمید الدین صاحب عرف چھوٹے مولوی معافیدار، حضرت مولانا وہاج الدین صاحب کے ہمشیر زاد تھے۔ مولانا حمید الدین صاحب کے نواسے عزیز احمد صاحب قادری چشتی نے اپنے نانا صاحب کی زبانی ۱۸۵۷ء کے قصے سنے تھے۔ اُن میں حضرت مولانا

---

[۱] پنجتن کی تعبیر کے لئے مولانا کافی کے دیوان کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

السّلام اے چار یار باصفا۔ ارکان دین
مجمع جود و حیا۔ صدق و عدالت السّلام

ثنا خوان نبی ہوں اور اصحاب نبی کافی
ابو بکر و عمر و عثمان علی سے مجھکو الفت ہے

مجھے الفت ہے یاران نبی سے
ابو بکر و عمر عثمان و علی سے

محبت اُن کی ہے ایمان میرا
میں اُن کا مدح خواں ہوں جان و جی سے

وہاج الدین صاحب کے مجاہدانہ کارنامے خاص اہمیت رکھتے تھے۔ عزیز احمد صاحب نے اُن کو قلمبند فرمایا جو روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن مورخہ ۲ مئی ۱۹۸۷ء میں شائع کئے گئے۔ ان صفحات میں عزیز احمد صاحب کا یہی مضمون پیش کیا جا رہا ہے اس میں مولانا وہاج الدین صاحب کے حالات کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں جو ایک مورخ کے لئے قابل قدر ہیں۔

شہید ملت فدائے قوم مولوی وہاج الدین عرف مولوی متو رحمۃ اللہ علیہ خلف مولوی جمیل الدین ابن مولوی وجیہہ الدین ابن مفتی شیر محمد مراد آباد کے ممتاز با اثر، قوم پرور اور جلیل القدر رئیس تھے، نہایت ہی فیاض، سیر چشم اور مہمان نواز تھے ان کا دستر خوان فراخ تھا، مذہب کے معاملے میں آہنی ستون، عبادت گذار، بے مثل شجاع۔ اخلاق کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ ہر اعلیٰ و ادنیٰ کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ سب سے یکساں ملتے جلتے۔ ہر ایک کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہتے تھے اور ضرورت مندوں و غربا کی دل کھول کر امداد کرتے اور اُن کی تقریبوں اور محفلوں میں بغیر کسی بلندی و پستی کا خیال کرتے ہوئے شریک ہوتے۔ مختصر یہ کہ بہت بڑے جتھے بند اور مقتدر رئیس ابن رئیس تھے لندنی سرکار سے خصوصی اعزاز بھی ملا ہوا تھا۔ شہر کے حکام نہایت عزت و احترام کرتے تھے اور اُن سے ملنا باعث فخر و ناز سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب کو عربی فارسی اور اُردو علوم کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی پوری قدرت حاصل تھی انھوں نے انگریزی زبان اپنے حقیقی چچا مولانا محمد اسمٰعیل کی لندنی بیوی سے جو ایک یورپین مہذب خاندان سے تعلق رکھنے والی لیڈی تھیں، پڑھی تھی۔

مولانا محمد اسمٰعیل لندنی کے کوئی نواسہ اور پوتہ نہ تھا صرف ایک لڑکی تھی اور

ایک ہی نواسی تھی۔ نواسی کا نام شہر بانو تھا۔ چونکہ مولانا کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اس لئے اُن کی وفات کے بعد اُن کے بڑے بھتیجے مولوی منہاج الدین عرف مولوی منّو کو دولت انگلیشیہ سے خلعت کے ساتھ ساتھ وہ اعزازی نشان بھی عطا کی گئی تھی جو لندن سرکار سے ان کے چچا مولانا محمد اسمٰعیل لندنی کو ملی تھی یہی وجہ تھی کہ جب کوئی انگریز مولوی منّو صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے اُن کے دولت کدہ پر حاضری دینے آتا تو سلام کے بعد بھی مؤدب کھڑا رہتا۔ جب مولوی صاحب مذکور اعزازی نشان کو تن سے جُدا کر کے الگ رکھ دیتے تو بیٹھکر گفتگو کرتا۔ غرض مولوی صاحب شہر کی ناک تھے۔

مولوی صاحب مذکور کے تین بھائی اور ایک بہن تھی جو آزادی کی جنگ میں اُن کے دوش بدوش رہے اُن کے نام یہ ہیں۔

مولوی سراج الدین، مولوی منہاج الدین، مولوی عبداللہ اور فضیلت النساءٗ فضیلت النسار کی شادی مولوی افضل الدین کے ساتھ ہوئی تھی۔ جو مفتی بہار الدین کے پوتے تھے۔ آپس کے اتحاد اور اتفاق کی بنا پر صحرائی اور سکنائی جائداد مشترک تھی اور سب بھائی اور بہن یکجا طور سے محلہ رفعت پورہ میں رہتے تھے۔ جائے سکونت گھیر منو کے نام سے مشہور تھی۔ مقام سکونت کے قریب ایک مسجد بھی ہے جو عہد حاضر میں مولوی مختصر صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت ان مقامات پر مولوی منو کے خاندان کا کوئی فرد آباد نہیں، عرصہ سے چونا پز اور دنداں ساز وغیرہ مقام مذکور کو خرید نے کے بعد آباد ہوگئے ہیں۔ مولوی منہاج الدین صاحب کے یہاں روزانہ شہر کے شرفار اور اہل علم جمع ہوا کرتے تھے اُن کا حلقۂ احباب ذی علم لوگوں سے رہتا جن میں سے چند کے اسمار گرامی یہ ہیں مولانا کافی صاحب، مولوی سرفراز علی صاحب، سید اکبر علی صاحب، سید

گلزار علی صاحب اور مولوی وزیر علی صاحب۔

مولوی وجیہہ الدین بھی کئی بھائی تھے۔ اُن کے ایک بھائی کے بیٹے قاضی محمد بخش صاحب شہر کے قاضی تھے۔ قاضی صاحب بھی شہر کے عمائدین میں سے تھے۔ قاضی صاحب کی اولاد میں قاضی محمد عباس، قاضی تجمل حسین، قاضی امداد حسین وغیرہ وغیرہ تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مولوی وہاج الدین عرف منّو نے ایک قائد کی حیثیت سے انتہائی سرگرمی سے کام کیا اور متعلقہ اسکیم کے تحت پارٹیاں قائم کرنے کے لئے پوشیدہ طور پر بذات خود اور نمائندوں کے ذریعہ سربرآوردہ لوگوں کو حصول آزادی کی اس تحریک میں شرکت کی دعوت دیتے رہے۔ چند رؤسا اُن کو اس کار نیک میں پیش پیش دیکھ کر ساتھ ہوگئے اور اس طرح ایک بڑی جماعت وجود میں آگئی۔

۱۹ مئی کو مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو کی قیادت میں ضبط و نظم کے ساتھ حریت نوازوں کا ایک جم غفیر جیل خانہ کی طرف گیا۔ ہجوم نے مولوی منو صاحب کا اشارہ پاتے ہی جیل خانہ پاش پاش کر دیا۔ قائد نے سب سے پہلے پرچم لہرایا۔ اور تمام قیدیوں کو آزاد کر کے اُن کے خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا انتظام کیا۔ بعد ازاں اُن کے حسب خواہش جس نے اس جماعت میں شامل ہونا چاہا شامل کیا اور باقی لوگوں کو زادِ راہ دیکر خدا حافظ کہدیا۔ قائد نے شامل ہونے والے لوگوں کا ایک جتھہ بنا کر سید اکبر علی صاحب اور سید گلزار علی صاحب کی سپردگی میں اودھ کی سمت روانہ کر دیا۔ اس دوران میں جان کرافٹ ولسن حریت نوازوں کی مارچ کی خبر پاتے ہی روپوش ہوگیا۔

مرادآباد جیل خانہ ٹوٹنے کی خبر روہیلکھنڈ میں پہونچتے ہی عہدیداران کا سارا رعب

دبدبہ یخ بستہ ہوکر رہ گیا تھا۔ ان کی جس قدر بھی دہشت عوام کے دلوں پر تھی یکسر غائب ہوگئی۔ مرادآباد سے ایک وفد قصبہ آنولہ بریلی بھیجا گیا۔ وفد کے صدر مولوی کفایت علی صاحب کافی تھے جنھوں نے اپنے فرائض انتہائی خوش اسلوبی جوانمردی شجاعت اور دانشمندی سے سرانجام دئیے پھر مرادآباد تشریف لے آئے۔ ریاست رام پور کی منجمد فضا میں حرکت پیدا کرنا بہت ہی مشکل کام تھا مگر فدائے قوم مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو ہی کی یہ قوم پروری، حب الوطنی اور شجاعت تھی کہ سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ خطرات کی اس وادی میں کود پڑے وہ بے خوف ہوکر رام پور خاص اور گرد و نواح کے قصبوں اور دیہاتوں میں جلسے کرتے پمفلٹ پڑھ کر سناتے اور اس طرح اپنے وطن کے سپوتوں کو بیدار کرکے جنگ آزادی کی تحریک میں شمولیت کی دعوت دیتے۔

مرزا ناظم بخت کے بیٹے اور فرخ سیر بادشاہ کے نواسہ شہزادہ فیروزشاہ کا جب مرادآباد میں ورود ہوا تو شہر کے خواص اور عوام سب ہی نے شاندار طریقے پر استقبال کیا مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو فیروزشاہ کے دست راست تھے۔ مولوی صاحب اور سید صاحب مذکور اور دیگر رؤسائے شہر ان کی ہر قسم کی معاونت کرتے رہے۔ شاہزادہ فیروزشاہ نے شہر کا گشت کیا اور فرداً فرداً ان رؤسا کے یہاں بھی گیا جو جنگ آزادی میں شریک نہ تھے اور اپنے دروازے مقفل کرچکے تھے۔

مرادآباد میں فیروزشاہ اور اس کی ہمراہ فوج کا پڑاؤ اس باغ میں ہوا تھا جس باغ کی کوٹھی میں کبھی آنتوں والا صاحب رہتا تھا مقام مذکور اس سڑک پر واقع ہے جو سڑک گل شہید کے برف خانہ کے چوراہے سے بڑے اسٹیشن کو جاتی ہے۔

ریاست رام پور کے نواب حریت پسندوں سے الگ تھے۔ انگریزوں نے موقع

کو غنیمت سمجھ کر پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انگریزوں نے نواب رامپور کی کثیر فوج لے کر مراد آباد پر چڑھائی کر دی۔ شاہزادہ فیروز شاہ کی سرپرستی میں مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو کے علم جہاد کے زیر سایہ مجاہدین جنگ آزادی نے نواب کی فوج اور انگریزوں سے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا حتیٰ کہ بعض خواتین مردانہ لباس زیب تن کر کے میدان میں آئیں اور مخالفین کے دانت کھٹے کر دیئے لیکن ساز و سامان میں انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکے بالآخر شکست ہوئی۔ انگریز شہر پر قابض ہو گئے۔ شاہزادہ فیروز شاہ سنبھل والی سڑک سے روانہ ہو کر کندرکی ہوتا ہوا قصبہ آنولہ سے گزر کر بریلی پہونچا۔ اگرچہ انگریزوں نے اس کا تعاقب کیا مگر فیروز شاہ کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔

انگریزوں نے برسر اقتدار آتے ہی شمع حریت کے پروانوں کی ایک طویل فہرست بنائی۔ فہرست میں اضافہ ہوتا رہا۔ گرفتاریاں شروع کر دی گئیں۔ محبان وطن کے لئے سزائے موت کا حکم جاری ہونے لگا۔ شہر کی مختلف سمتوں میں پھانسی گھر قائم کئے گئے۔ پھانسیوں کا مرکز سرائے پختہ کے سنبھلی گیٹ کے متصل رکھا گیا جہاں جاں نثاروں کو آزادی سے پھانسیاں دی جانے لگیں۔ حریت کے پروانوں کے لئے کوئی قانون اور کوئی انصاف نہ تھا جو شخص جس کا بھی نام لے دیتا اس کو انتہائی بے رحمی سے پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا جاتا اور پھانسی کے بعد انھیں وہیں دفنا دیا جاتا تھا۔ شہدائے ملت کی یادگار ہیں اب بھی ایک محلہ آباد ہے جو گل شہید کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ ایک شخص نے جو مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو کے دستر خوان کا نمک خوار تھا مخبری کی خدمت انجام دی۔

رمضان المبارک کا مہینہ اور عصر مغرب کے درمیان کا وقت تھا کہ فوجی دستہ نے مولانا کی قیام گاہ کا محاصرہ کر لیا۔ پہلے ہی نمکخوار مخبر آگے بڑھا مولانا تنہا مکان میں

تشریف فرما تھے ان کو اپنی آمد کی خبر کرائی۔ مولانا وہاج الدین صاحب ان دنوں انتہائی محتاط تھے مگر آنے والے کا نام سنتے ہی ان کی احتیاط اور دقت کی نزاکت نرم دلی اور خلوص و ہمدردی کے نیچے دب گئی اور انھوں نے فوراً ہی صدر دروازہ کھول دینے کا حکم صادر فرمادیا۔ دروازہ کھلتے ہی ساتھ ساتھ فوجی رسالہ بھی دیوان خانہ میں داخل ہوا اور آزادی سے آگے بڑھا اس پر ایک نمک حلال ملازم نے تیوری بدل کر مداخلت کی جسے اسی وقت شہید کر دیا گیا۔ مولوی صاحب نے اپنی بندوق جو قریب ہی رکھی تھی اٹھائی لیکن معاً ان پر گولیاں برس پڑیں اور ان کی روح کلمہ پڑھتی ہوئی قفس عنصری سے عالم بقا کو پرواز کر گئی۔

آقا اور ملازم کی نعش فوجی رسالہ اپنے ساتھ لے گیا اور ان کی تمام آبائی جائداد ضبط کرلی گئی۔

مولانا وہاج الدین صاحب اور ان کے ملازم دونوں کی پختہ قبریں محلہ کنجری سرائے میں کچہری روڈ پر مغل بندوں کی مسجد کے قریب ایک حظیرہ میں ہیں۔ نیم کے چند درخت ان پر سایہ فگن ہیں۔

بجنور

فدائے قوم نواب محمود خاںؒ

یہ باب زیادہ تر سر سید احمد خاں صاحب کی مشہور کتاب سرکشی ضلع بجنور سے ماخوذ ہے۔ سر سید مرحوم ۱۸۵۷ء میں ضلع بجنور میں صدر امین تھے۔ ہنگامہ کے اس تمام دور میں انگریزوں کے نہایت مخلص وفادار رہے۔ یہ کتاب اُن کے چشمدید واقعات کا مجموعہ ہے اور اس بنا پر بہت زیادہ قابل اعتماد ہے۔ یہ کتاب قطعاً نایاب ہے۔ ہم شکر گذار ہیں کہ محترم مولانا عبداللہ صاحب کی نوازش و عنایت سے اس نایاب کتاب کا ایک قلمی نسخہ میسر آیا جس سے یہ باب مرتب کیا گیا۔ (مصنف)

اٹھارہویں صدی کے وہ نامور جنھوں نے غیرت و خودداری اور حریت پروری کی روایات زندہ رکھیں اُن میں نجیب خاں کا نام خاص طور پر عزت و احترام کا مستحق ہے۔ نجیب خاں روہیلہ پٹھانوں کے ایک معمولی[۱] خاندان کا ہونہار فرد تھا جس نے

---

[۱] نجیب خاں احمد شاہ کے وقت میں یعنی ۱۷۴۸ء میں دوندے خاں کا ملازم تھا۔ اور اُس کی طرف سے پرگنہ دارانگر کی تحصیل کرتا تھا۔ اُس نے بہت سے لوگ اپنے ساتھ جمع کئے اور ان پرگنہ جات پر جواب ضلع بجنور میں ہیں قبضہ کر لیا۔ پھر دوندے خاں کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی اس سبب سے مستقل مالک اس کا ہو گیا اور بادشاہ کے دربار تک بھی رسائی کر لی (تاریخ سرکشی اہل بجنور از سر سید احمد مرحوم) نجیب خاں یوسف زئی عمر خیل روہیلہ پٹھان تھے۔

قابلیت، صلاحیت، عمدہ کارگذاری اور عزم و ہمت کے سر و سامان کے ساتھ میدان ترقی میں تیزی سے قدم بڑھایا۔ یہاں تک کہ عالمگیر ثانی کے عہد حکومت میں امیرالامرائی کا منصب جلیل اور نجیب الدولہ کا خطاب حاصل کیا۔

اس کا نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ بیرونی حملوں اور اندرونی کش مکش اور طوائف الملوکی کے اس نازک دور میں سلطنت مغلیہ کی گرتی ہوئی دیوار کو ایسا سہارا دیا کہ اس کی عمر میں کئی سال کی طویل مدت کا اضافہ ہو گیا۔ اس کی تعمیری صلاحیتیں دامن کوہ کے ایک ویران علاقہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔ جو اپنی تمام شادابیوں اور زرخیزیوں کو گھنے جنگل کی ہولناکیوں میں گم کئے ہوئے تھا۔ یہاں شہر "نجیب آباد" بسایا، اُس کے قریب ۱۷۷۵ء میں ایک مضبوط قلعہ "پتھر گڑھ" تعمیر کیا۔

نجیب الدولہ نجیب خاں کے جانشین فرزند کا نام ضابطہ خاں[۱] تھا جو باپ

---

[۱] ضابطہ خاں کے ایک لڑکے کا نام غلام قادر خاں تھا جس نے اس طوائف الملوکی اور دورِ کشمکش میں دہلی پر چڑھائی کی۔ قلعہ میں گھسا اور انگریزوں کے کٹھ پتلی بادشاہ (شاہ عالم) کو معزول کر کے اُس کی شان میں وہ گستاخی کی جس نے اس کے تمام کئے دھرے پر پانی پھیر دیا اور نیک نامی کے بجائے بدنامی اس کے گلے کا طوق بن گئی یعنی اس نے بادشاہ کو اندھا کر دیا بادشاہ کی دردمندانہ اپیل پر مرہٹی راجہ مہاراجہ سندھیا نے غلام قادر خاں کا تعاقب کر کے گرفتار کیا۔ لوہے کے پنجرے میں قید کیا پھر ایک ایک عضو جدا کر کے اس کو مار ڈالا۔ ضابطہ خاں کے دوسرے بیٹے کا نام معین الدین خاں عرف بھنبو خاں تھا جو مہاراجہ سندھیا کے حملہ کے وقت جان بچا کر بچ بھاگ گیا تھا۔ نواب محمود خاں انہیں معین الدین خاں کے فرزند ہیں۔

کی جگہ کچھ عرصہ کے لئے مغل بادشاہ کا امیر الامراء رہا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شاندار ماضی جلد دوم)

نواب محمود خاں اسی ضابطہ خاں کے پوتے تھے[1] چونکہ یہ علاقہ اسی خاندان کا آباد کیا ہوا تھا اور ظاہر ہے آباد ہونے والے بھی وہی ہونگے جو نجیب الدولہ کے رفیق اور اُس کے معتمد سپاہی یا افسر تھے۔ تو اس بنا پر نہ صرف اس پرگنہ میں بلکہ پورے ضلع بجنور میں اس خاندان کا یہ اثر تھا کہ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا اور بغاوت کی خبریں یہاں پہونچنے لگیں تو سر سید احمد خاں صاحب مرحوم کی شہادت یہ ہے کہ

مجھے یقین تھا کہ جب لوگوں کو یقین ہو جائے گا کہ فوج آتی ہے اور رستے میں ہے تو جتنے لوگ یہاں ہیں کوئی بھی ہمارا ساتھ نہیں دینے کا۔ اور ہم کو ایک ایسا چوہا تک بھی میسر نہیں آئے گا جو حکام انگریزی کی رفاقت کرکے گنگا پار کسی امن کی جگہ تک اُن کو پہنچا دیوے اور بلاشبہ میری رائے بہت صحیح اور نہایت پکی تھی۔[2]

پھر ایک صفحہ بعد ارشاد ہے۔

اور ہم کو ہرگز توقع نہ تھی کہ بُرے وقت میں یہ لوگ ہمارا ساتھ دیویں گے بلکہ ہم یقین جانتے تھے کہ یہ سب نا محمود خاں کے ساتھ

---

[1] پسر نواب معین الدین خاں عرف بھنبو خاں پسر ضابطہ خاں۔ عالی شان کوٹھی مبارک محل نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔

[2] تاریخ سرکشی اہل بجنور۔ قلمی ص۱

ہو جائیں گے[۵۱] چند صفحوں کے بعد تحریر ہے ۔

اور حقیقت میں یہ ممکن نہ تھا کہ ضلع بجنور کے آدمی نا محمود[۵۲] خاں کو چھوڑ کر کسی اور کی حکومت قبول کریں[۳]۔

نواب محمود خاں کے والد

خاندان کے تذکرہ میں سرسید احمد صاحب کی اسی تصنیف کے دو اقتباس اور ملاحظہ فرمائیے فرماتے ہیں (۱)

" مسٹر کولبرک صاحب بہادر ۱۸۱۲ء میں ایک بہت بڑا کانٹوں دار

---

۵۱ تاریخ سرکشی اہل بجنور ص۱۷ ۔ خاندانی اثر کے علاوہ خود نواب محمود خاں کے ذاتی اوصاف نے اُن کو ہر دلعزیز بنا دیا تھا ۔ محمد ایوب صاحب بی اے نواب کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں ، تعلیم و تربیت معقول طریقہ سے ہوئی ۔ ریاست کا انتظام سنبھالا تو دادو دہش کے باعث قرض سے گراں بار رہے ، خوش طبع ، یارباش اور مہمان نواز تھے ، شکار کا بہت شوق تھا ۔ نشانہ خوب لگاتے تھے (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن مورخہ ۱۹ ر نومبر ۵۶ء)
نواب کی فراخ حوصلگی اور وسیع القلبی کا نتیجہ تھا کہ باوجودیکہ سرسید کی خفیہ خط و کتابت مراد آباد کے جج جے کر ۔ کرانٹ ولسن سے تھی مگر نواب محمود خاں نے اس کو نظر انداز کیا (محمد ایوب صاحب سنڈے ایڈیشن مورخہ ۱۹ ر نومبر ۱۹۵۶ء)

۵۲ یہ تہذیب الاخلاق کے مصنف سرسید احمد خاں صاحب مرحوم کے اخلاق ہیں کہ نواب محمود خاں کو ہر جگہ نا محمود خاں لکھا ہے اور صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ خاتمہ کتاب میں مسلمانوں کو وفاداری کا سبق دیتے ہوئے اس غریب محمود خاں کو بد ذات بھی فرما دیا ہے تاہم غنیمت ہے کہ جس طرح امام بخش عرف مارے خاں شیر کوٹی اور عنایت رسول صاحب وغیرہ کو حرامزادہ کہا ہے ۔ نواب محمود خاں صاحب کو اس خطاب سے معاف رکھا

۵۳ سرکشی ضلع بجنور ص۲۱ قلمی ۔

درخشت بو گئے یعنی لبا گئے تھے۔ اُجڑے ہوئے، جلا وطن ہوئے ہوئے نامحمود خاں کے باپ بھنبو خاں کو نجیب آباد میں جس کے سبب گویا یہ برباد ہوا ہوا خاندان پھر لوگوں کی نظروں میں سما گیا تھا اور اسی سبب سے ہر ایک شخص ضلع کا اپنے تئیں قدیم متوسل اور پُرانا نمکخوار اور نسبتی تابعدار نامحمود خاں کا سمجھتا تھا اور ایسے تزلزل کے وقت میں ہر ایک کی نگاہ اُسی پر پڑتی تھی۔ ۵۱

دوسرا اقتباس:۔

(غلام قادر خاں روہیلہ کے مشہور واقعہ کے بعد ضابطہ خاں کا دوسرا لڑکا) معین الدین خاں عرف بھنبو خاں بھاگ کر پنجاب چلا گیا تھا۔ جب سرکار دولتمدار انگریزی نے اضلاع دہلی کو فتح کیا تب بھنبو خاں کو بلا کر بہت خاطر کی اور پانچہزار مہینے کی پنشن مقرر کر کے بریلی میں رہنے کا حکم دیا اور پھر مسٹر کو لبرک صاحب بہادر کی رپورٹ سے ۱۸۱۲ء میں نجیب آباد میں آباد ہوا۔ اُس کے مرنے کے بعد سرکار دولتمدار انگریزی نے بہ نظر ترحم محمود خاں اور جلال الدین خاں اس کے بیٹے اور بیٹیوں کے لئے ہزار روپیہ مہینے کی پنشن مقرر کی اور ہر ایک شخص کو اس خاندان میں سے بہت بڑے بڑے معززہ عہدے عطا فرمائے کہ تمام خاندان بہ کمال عزت اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ ۵۲

---

۵۱ سرکشی ضلع بجنور ص۱۶ ۵۲ ایضاً ص۳ (مطبوعہ)

سرسید صاحب مرحوم ۔ بھمبوخاں کی بازآبادکاری کو انگریزوں کی عنایت خسروانہ قرار دیتے ہیں اور اسی کتاب میں ایک جگہ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ :۔

یہ ضلع (ضلع بجنور بالخصوص پرگنہ نجیب آباد) بالکل ملا ہوا ہے
پہاڑ اور بہت بڑے جنگلوں سے جبکہ سرکار کی بخوبی عملداری تھی۔
(یعنی ۱۸۵۷ء سے پہلے) جب بھی اکثر ڈاکو اس میں رہتے تھے ۔

یعنی اس ضلع کا محل وقوع اس قسم کا ہے کہ یہاں امن قائم رکھنا بہت مشکل تھا اور پہلے اقتباسات سے واضح ہوچکا ہے کہ

"ضلع کا ہر شخص اپنے تئیں قدیم متوسل اور پرانا نمکخوار اور پشتینی تابعدار نامحمود خاں کا سمجھتا تھا"

اور یہ بھی تاریخ کی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ۱۸۱۲ء کا دور کمپنی کی حکومت کے لئے بہت سخت تھا ۔ ایک طرف پنڈاری گریلا لڑائیاں لڑ رہے تھے ۔ دوسری طرف مرہٹوں کی باضابطہ فوجیں دہلی کے قریب تک پہونچ رہی تھیں ۔ مہاراجہ گوالیار انگریزوں کے برخلاف راجہ نیپال سے سازباز کر رہا تھا ۔ ایسی صورت میں عنایت خسروانہ نہیں بلکہ سامراجی اغراض کا تقاضا تھا کہ نواب بھمبوخاں جیسے بااثر شخص کو ایسے پرخطر علاقہ میں بسایا جائے جو فوجی لحاظ سے نہایت اہم تھا ۔ جہاں میدانی علاقہ کے باشندے پہاڑی قوموں کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف بغاوت کا آتش فشاں جب چاہتے تیار کر سکتے تھے ۔

انہیں مصلحتوں کی خاطر بھمبوخاں کو وقتی طور پر آلہ کار بنایا گیا اور جیسے ہی یہ مصلحتیں ختم ہوئیں اور بھمبوخاں کی عمر کا آفتاب غروب ہوا وظیفہ کی مقدار پانچ ہزار

ماہانہ کے بجائے صرف ایک ہزار ماہانہ پورے خاندان کے لئے کردی گئی۔

جبکہ یہ پورا ضلع بھنبو خاں کے باپ دادا کا آباد کردہ تھا اور ضلع کے باشندے اپنے تئیں اس خاندان کا قدیم نمکخوار سمجھتے تھے تو حق وانصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ بھنبو خاں کو پورا ضلع واپس دیدیا جاتا اور اس کی نوابی تسلیم کی جاتی۔ لیکن پورے علاقہ کو بحق سرکار کمپنی ضبط کر کے صرف پانچہزار ماہانہ کا وظیفہ مقرر کرنا خسروانہ عنایت نہیں بلکہ وہی غاصبانہ پالیسی ہے جو پورے ملک میں چلائی جارہی تھی اور جس کے برخلاف بجا طور پر ریاستوں اور جاگیرداروں کے وارث چراغ پا تھے۔

بھنبو خاں کی وفات کے بعد وظیفہ میں تخفیف اسی عام پالیسی کی تکمیل تھی۔

سرسید صاحب فرماتے ہیں

ہر ایک شخص کو اُس کے خاندان میں سے بڑے بڑے معزز عہدے عطا فرمائے۔

ان معزز عہدوں کی تفسیر بھی ملاحظہ فرمالیجئے[1]۔

---

[1] سید صاحب کی یہ قناعت پسندی قابل تعریف ہے کہ نہ عہد مغلیہ کے منصب پنجہزاری، ہفت ہزاری وغیرہ پر نظر ہے نہ انگریزی دور کی گورنری یا کم از کم کلکٹری کا اعزاز و اکرام سامنے ہے۔ خاندان کے سیکڑوں افراد اور خاص اس گھر کے تقریباً ۵۰ افراد میں سے دو ایک کو تحصیلداری کا شرف حاصل ہے۔ چند افراد جمعداری اور رسالداری کے عہدے پر فائز ہیں مگر سید صاحب اسی پر نازاں اور مراحم خسروانہ کے شکر کے لئے سجدہ ریز ہیں اور خمیدہ کمر۔

احمد اللہ خاں بھانجا محمود علی خاں۔ تحصیلدار نجیب آباد ضلع بجنور۔

محمد عمر خاں۔ تحصیلدار ضلع حصار

محمد حسین خاں۔ رسالدار

عطا خاں　　جمعدار

عنایت اللہ خاں۔ جمع خرچ نویس۔ [1]　　وغیرہ وغیرہ

۱۸۵۷ء آغاز اور انجام

۱۰ رمئی کو میرٹھ میں اور ۱۱ رمئی ۵۷ء کو دہلی میں جو کچھ ہوا اس کی خبریں ۱۲ رمئی کو بجنور پہونچیں تو یہاں بھی حرکت شروع ہوئی۔ ۱۹ رمئی کو مراد آباد میں جیل خانہ توڑا گیا۔ رہا شدہ قیدی بجنور پہونچے تو فضا میں تلاطم شروع ہو گیا۔

جیسا کہ سابق اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے انگریزی حکومت سے برہمی عام تھی اور کسی تزلزل کے وقت اگر کسی کا اقتدار ضلع میں تسلیم کیا جا سکتا تھا تو وہ نواب محمود علی خاں صاحب تھے۔

مسٹر الیگزینڈر شکسپیر۔ کلکٹر اور مسٹر جارج پام جوائنٹ مجسٹریٹ تھے ان کے علاوہ ضلع کے اور چند افسر انگریز تھے۔ ان لوگوں نے حالات کا جائزہ لیا اور یقین کر لیا کہ اس سیلاب کے سامنے اُن کے وجود نازک کے سفینے تنکے ٹھہر نہیں سکتے تو سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ کس طرح بیک بینی و دو گوش ضلع بجنور سے نکل کر رڑکی پہونچ سکیں جہاں انگریزی طاقت محفوظ تھی۔ سرسید صاحب صدر امین اور اُن کے رفیق خاص سید تراب علی تحصیلدار بجنور کے مشورے سے ۷ رجون ۵۷ء کو نواب محمود علی خاں صاحب

[1] سرکشی ضلع بجنور ص۳

کو ضلع کی حکومت کا پروانہ دیدیا گیا اور اسی شریف الطبع رئیس کی شرافت کی پناہ میں سب انگریز بخیر و عافیت ضلع سے نکل کر رڑکی پہونچ گئے۔

انگریز افسران کے بخیریت نکل جانے کے بعد نواب محمود خاں نے ۸ر اور ۹ر جون کی درمیانی شب میں اپنی حکومت کا اعلان کیا۔ امیر الدولہ۔ ضیاء الملک مظفر جنگ کے خطابات اختیار کئے اور اب پورا نام مع القاب اس طرح لکھا جانے لگا

امیر الدولہ۔ ضیار الملک ذوی الاقتدار نواب محمود خاں بہادر مظفر جنگ۔

اعلان حکومت کے بعد ضلع کا انتظام سنبھالا[۵۱]۔ ہر ایک شعبہ کے افسر مقرر کئے پورے ضلع میں یہاں تک امن و امان ہو گیا کہ بقول سر سید صاحب گنگا پار کے باغیوں نے بھی اپنے لئے بجنور سے زیادہ کوئی مامن نہ دیکھا۔ چنانچہ دلیل سنگھ اور قدم سنگھ گوجر اور رضا حسن عرف چھٹن اور عنایت علی خاں قاضی تھانہ بھون مع اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کے اس ضلع میں آئے۔ اس ضلع کے باغیوں نے اُن کو امن دیا۔ اُن کے سوا میر الطاف اور مرزا حاجی اور مرزا مبارک شاہ شاہزادگان مفرور دہلی اس ضلع میں آئے اور نواب محمود خاں اور ماڑے خاں نے اوّل اوّل بہت عزت اور توقیر[۵۲] کی اس کے علاوہ پیشقدمی کر کے ہر دوار تک انگریزی طاقت کو ختم کر کے اپنا قبضہ کر لیا[۵۳]۔

---

۵۱ محمد ایوب صاحب تحریر فرماتے ہیں ۱۴ر جون کو شاہ دہلی کی خدمت میں عرضداشت بھیجی گئی۔ جواب سے نوازا گیا۔ انتظام کی درستی کو بہ نظر استحسان دیکھا گیا۔ مغل شاہزادے دہلی سے نجیب آباد پہونچے۔ (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن۔ ۱۹ر نومبر ۱۹۵۶ء)۔

۵۲ سرکشی ضلع بجنور صد ۹۳ ۵۳ سرکشی ضلع بجنور صد ۱۲ مطبوعہ۔

اسی کے ساتھ بقایا مالگذاری حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی گئی ۔ احمد اللہ خاں نواب کے بھانجے نجیب آباد کے تحصیلدار تھے ۔ انھوں نے نواب محمود خاں کے مدار المہام اور مختار کل کی حیثیت اختیار کرلی اور پھر مالگذاری وصول کرنے میں کچھ ہندو زمینداروں سے ایسی سختی برتی کہ مقابلہ کی نوبت آگئی اور اسی تلخی نے رفتہ رفتہ پورے ضلع میں ہندو مسلم جنگ کی شکل اختیار کرلی ۔ اس وقت نتیجہ اگرچہ مسلمانوں کے حق میں رہا اور پورے ضلع میں اُن کا ڈنکا بجنے لگا ۔ مگر اس تسلط و اقتدار نے ہندو زمینداروں کو انگریزوں سے نامہ و پیام پر آمادہ کردیا ۔ [۱]

بہرحال تقریباً ایک سال بعد جب شکسپیئر [۲] اور پامر [۳] دوبارہ ضلع بجنور میں فاتحانہ

---

[۱] انگریز موقع سے کب چوک سکتا تھا ۔ جیسے ہی پامر نے چودھری صاحبان کا رُخ دیکھا مبلغ دس ہزار کی فرمائش کردی کہ نینی تال بھیج دیئے جائیں جہاں صاحب لوگوں کو ضرورت ہے ۔ چنانچہ چودھری پرتاپ سنگھ نے دو منزلوں میں اس فرمائش کی تعمیل کی (سرکشی اہل بجنور)

[۲] مولانا عبداللہ خاں صاحب کرتپوری کے پردادا قلندر علی خاں اور اُن کے خلف رشید حسن رضا خاں ساکنان لبی کوٹلہ نواب محمود علی خاں کے رشتہ دار بھی تھے اور شریک جہاد بھی ۔ مولانا عبداللہ خاں صاحب اس معرکہ کی (جس میں نواب محمود خاں کو وہ شکست ہوئی جو تمام شکستوں کی بنیاد تھی جس کی تلافی وہ آخر تک نہیں کرسکے) اس معرکہ کی تفصیل جو اپنے والد الحاج محمد ہدایت اللہ خاں صاحب سے سُنی تھی اس طرح بیان کرتے ہیں : — جنوری ۱۸۵۸ء میں نواب نے ایک بڑی جمعیت کے ساتھ ضلع سہارنپور پر حملہ کی تیاری کی ۔ وہ چیدہ نوجوان جو اس معرکہ کے لئے منتخب کئے گئے ان میں مولانا عبداللہ صاحب کے دادا حسن رضا خاں صاحب بھی تھے ۔ مولانا عبداللہ صاحب فرماتے ہیں کہ ضلع بجنور کی شمالی حد پر کوہ ہمالیہ کا بن (وسیع جنگل) واقع ہے اور مغربی حد پر دریائے گنگا ۔ نواب کے لشکر نے ضلع سہارنپور پر چڑھائی کا جو راستہ اختیار کیا وہ بہت غیر مناسب تھا ۔ نواب نے بن (جنگل) اور پہاڑ کا لحاظ رکھتے ہوئے شمال مغربی حد سے حملہ کی تجویز کی چنانچہ لشکر کا کوچ ہوا بن طے کرنے کے بعد قصبہ "کن کھل" کا رُخ کیا ۔ سرما کا موسم جنوری کا مہینہ تھا (باقی صفحہ ۴۳۴ پر)

داخل ہوئے تو۔

(۱) نواب محمود خاں اُن کے بھائی جلال الدین خاں۔ عظمت اللہ خاں۔ احمد اللہ خاں اور شفیع اللہ خاں (خواہرزادگان نواب محمود خاں) اور مارڑے[1] خاں باغی قرار دیئے گئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان ایام میں دریا پایاب ہوتا ہے اس لئے دریا کو پار کرنا کچھ مشکل نہ تھا ابھی یہ پروگرام صیغہ راز میں تھا کہ شاطر انگریز نے اس کو ناکام بنانے کا بہت گہرا منصوبہ تیار کر لیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جیسے ہی لشکر گنگا کے وسط میں پہونچا گنگا کا وہ بند جہاں سے پانی نہر گنگ میں پہونچتا ہے توڑ دیا گیا۔ فوراً ایک سیلاب موج زن ہوا اور تقریباً آدھے لشکر کو بہالے گیا۔ بقول سرسید۔ نواب کے لشکر کا آب شمشیر کے بجائے موج آب سے کام تمام ہوا۔ انگریز کی چاق چوبند فوج نے اس تباہ شدہ لشکر کا تعاقب کر کے ایک ایک کو ختم کر دینے کی کوشش کی۔

دادا حسن رضا ہاتھی پر سوار تھے۔ زخمی ہو کر گرے اور ایک درخت سے سہارا لگا کر بیٹھ گئے آدمی شکیل اور وجیہہ تھے۔ دشمن کے سپاہیوں نے آپ کو نواب محمود خاں سمجھا اور سر قلم کر لیا۔

(آزادی نمبر روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۱۵ راگست ۱۹۵۸ء) محمد ایوب صاحب بی اے تحریر فرماتے ہیں کہ "نوابی فوج کو غیر متوقع شکست ہوئی۔ انگریزی فوجوں نے مختلف علاقوں پر قبضہ شروع کر دیا۔ محمود خاں نے حالات کا جائزہ لیا۔ مجلس مشاورت منعقد ہوئی۔ سربرآوردہ حضرات میں سعد اللہ خاں منصف اور احمد اللہ خاں موجود تھے اس کے بعد مارڑے خاں، شفیع اللہ خاں، نتھو خاں اور مولوی عنایت علی خاں وغیرہ نے نگینہ کے باغوں میں مورچے قائم کئے۔ مقابلے ہوئے مگر انگریز کامیاب ہوا

(سنڈے ایڈیشن الجمعیۃ مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۵۷ء)

[1] مارڑے خاں اصل نام امام بخش۔ شیرکوٹ کے رہنے والے تھے ایک معمولی خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ مگر ہمت و جرأت خداداد تھی جماعتی نظم و نسق کا بھی اچھا سلیقہ تھا۔ جب نظام حکومت ختم ہوگیا تو قصبہ کے سربرآوردہ صاحبان نے قصبہ کی حفاظت اُن کے ذمہ کی۔ امام بخش صاحب نے رضاکاروں کا دستہ تیار کیا جس نے چند ہی روز میں ایک باضابطہ فوج کی شکل اختیار کر لی اور نہ صرف قصبہ شیرکوٹ میں بلکہ پورے ضلع میں ان کی دھاک بیٹھ گئی جب نواب محمود خاں کی حکومت قائم ہوئی اور اُن کی طرف سے اُن کے بھانجے احمد اللہ خاں مالگذاری وغیرہ کے لئے یہاں پہونچے تو مارڑے خاں نے اپنے ہتھیار کھولکر محمود خانصاحب کے سامنے رکھدیئے احمد اللہ خانصاحب نے اسلحہ ان کو واپس کئے اور ضلع کی فوجوں کا کمانڈر بنا دیا یہ آخر تک پوری ہمت و جرأت اور نہایت پامردی سے فرائض متعلقہ انجام دیتے رہے (حالات قلمی مارڑے خاں) جو مولانا وحیدالدین صاحب قاسمی شیرکوٹی انچارج دفتر جمعیۃ علماء ہند کے پاس محفوظ ہیں۔

(۲) اور ضلع کے تمام رؤسا کے نام اعلان نامہ جاری کیا گیا۔

"جو کوئی منجملہ تمہارے یا رشتہ داران ہمہ ملازمان یا باشندگان شہر تمہارے کے باغیان مذکور کو پناہ یا مدد دیگا۔ یا اس کی نوکری کرے گا تو مجرم سرکار متصور ہوکر کل جائداد منقولہ و غیر منقولہ و زمینداری وغیرہ تمہاری ضبط سرکار ہوکر تم کو تدارک سنگین ہوگا اور مسکن تمہارا مثل باغیان مالاگڈھ اور تھانہ بھون وغیرہ کے گرایا جائے گا۔ چاہیئے کہ یہ آفت اوپر اپنے مت لاؤ... الخ (ص ۹۱)

(۳) انگریزی فوج کی مزاحمت جگہ جگہ کی گئی اس میں جو بہادر کام آئے اُن کا شمار بہت مشکل ہے۔ البتہ کامیابی کے بعد دوبارہ نظم قائم کرنے اور امن بحال کرنے کے بہانے جس تہذیب اور شرافت کا مظاہرہ کیا گیا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیجئے۔

بمجرد فتح ہونے نگینہ کے جناب صاحب مجسٹریٹ بہادر اور جناب اندرسین برگیڈ میجر مع سپاہیان پلٹن خاکی کے شہر نگینہ میں تشریف لے گئے اور سید تراب علی تحصیلدار کو واسطے انتظام شہر کے اپنے ساتھ لیا اور شہر کی ناکہ بندی کرکے جیسا کہ چاہیئے تھا انتظام شہر کا فرمایا اور تین سو آدمی شہر میں سے گرفتار کئے ان میں سے ۴۵ آدمی اسی وقت مارے گئے الخ [1]

ایک باغ میں عنایت رسول خاں اور اُن کے ساتھ کچھ آدمی چھپے ہوئے تھے فوج نے ان کا محاصرہ کیا۔ عنایت رسول صاحب، ان کے ملازم جان محمد اور اُن کے ساتھ پچاس ساٹھ آدمی وہیں قتل کر دیئے اور ساٹھ ستر آدمیوں کو زندہ پکڑ کر لے گئے اور گولیوں سے مار دیا

[1] سرکشی ضلع بجنور ص ۱۰۰ قلمی۔

اور اکثر آدمی قاضی محلّہ کے جو اس باغ میں چھپے ہوئے تھے وہ بھی مارے گئے۔ [1]
نجیب آباد فوج پہونچی تو شہر خالی پڑا تھا۔ قلعہ پتھر گڈھ میں کچھ سپاہی تھے وہ فرار ہونے لگے تو اُن کا تعاقب کیا گیا اور تیس سواروں کو مار دیا گیا۔ شہر نجیب آباد لٹ گیا۔ اور تمام شہر میں آگ لگ گئی۔ جلال الدین خاں اور سعد اللہ خاں گرفتار کئے گئے۔ ۲۳ اپریل ۱۸۵۸ء کو اُن کے گولی ماری گئی۔ [2]

بیسویں اپریل ۱۸۵۸ء کو یہ تجویز ہوئی کہ مکانات نامحمود خاں و جلال الدین خاں جو اُن کی سرداری اور حکومت کے نشان ہیں اُڑا دیئے جاویں تاکہ سرکار کی کمال ناراضی اُن پنشن خوار نمکحراموں سے (نقل کفر کفر نباشد) ظاہر ہو اور لوگوں کو بخوبی غیرت ہو۔ چنانچہ اُسی تاریخ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور دیوان خانہ جو بہت بڑا مکان اور حکومت کی نشانی تھی اُڑا دیئے گئے۔ [3]
یہ درد انگیز قصہ طولانی ہے۔ چند واقعات بیان کر دیئے گئے کہ
"قیاس کن ز گلستان من بہار مرا"

---

[1] سرکشی اہل بجنور صفحہ ۱۰۶ [2] ایضاً [3] ایضاً۔

دوسرا رُخ - وفاداری کا معیار

یہ ۱۸۵۷ء کا ایک رُخ تھا۔ خون شہادت کی رنگینیاں اس کا غازہ ہیں۔ اب وفاشعاری اور نیازمندی کے رُخ پر بھی ایک ہلکی سی نظر ڈال لیجئے۔

سرسید احمد خاں صاحب نے تن من کی بازی لگا کر جس طرح حق وفا ادا کیا۔ وہ شاید ناکافی تھا اس لئے ان کو اپنی کمال نیازمندی اور برأت کے اظہار کے لئے وہ انداز تحریر بھی اختیار کرنا پڑا جس کی تعبیر کے لئے وفاداری۔ نیازمندی۔ جیسے الفاظ بھی ناکافی ہیں، لاحظہ فرمایئے۔ نواب محمود خاں کا نام تو انھوں نے نامحمود خاں رکھا اور پھر اس کو اس طرح نبھایا کہ کسی جگہ بھی اس مصنوعی نام کے نقل کرنے میں فروگذاشت نہیں ہوئی۔ اس کتاب میں سیکڑوں جگہ نام آیا ہے اور ہر جگہ نامحمود خاں ہی لکھا گیا ہے۔

اس عام اصطلاح کے علاوہ جگہ جگہ ان واجب الاحترام شخصیتوں کو جن کی تعظیم کے لئے پورے ضلع بجنور کی گردنیں خم ہوتی تھیں، بدذات۔ نمکحرام۔ حرام زادہ وغیرہ کے مہذب الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔

وہی سرسید جو چند سال بعد "تہذیب الاخلاق" کے مصنف بنے کیا اُن کے اخلاق ایسے ہی ہونے چاہئیں۔ ایک طرف اپنے بھائیوں کے ساتھ یہ سلوک، یہ زبان اور یہ ادب تہذیب، دوسری جانب انگریز کی ایک ادنیٰ ترین توجہ پر جن الفاظ میں اور جس طرح شکریہ ادا کیا اس کو پڑھئے اور سبق لیجئے کہ انگریز کے دربار میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے کس درجہ فدائیت اور نیازمندی کی ضرورت تھی۔

سرسید صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

میں نہایت متامل ہوتا ہوں اس اگلی بات بیان کرنے سے کہ میں اپنی نسبت آپ لکھتا ہوں۔ پھر مجھ کو اس کے لکھنے پر اس لئے دلیری ہوتی ہے کہ درحقیقت میں خود نہیں لکھتا بلکہ اپنے آقا کی بات بیان کرتا ہوں اور پھر مجھ کو نہایت خوشی ہوتی ہے کہ اگر میرے آقا نے میری نسبت بات کہی ہو میں کیوں نہ اس کو کہوں اور کس لئے نہ کہوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اُس کو بیان کر کر اپنا فخر کرنا نوکر کا کام ہے۔

یعنی جب میں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا مسٹر جان کری کرانٹ ولسن صاحب بہادر دام اقبالہٗ صاحب جج اور اسپیشل کمشنر میری عزت بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی کہ تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ تم نے اس نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا اور باوجودیکہ ضلع بجنور میں ہندو اور مسلمان میں کمال عداوت تھی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کو مقابلہ کر کے اُٹھایا تھا اور جب ہم نے تم کو اور محمد رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور نہایت طرفداری سرکار کے سبب تمام ہندو اور مسلمان تمہارے حاکم بنانے پر خوش ہوئے۔ سرکار نے بھی تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد سے سارے ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی[لہ] اور تم اسی طرح وفادار

لہ ضلع کا نظم و نسق انھیں دو مسلمان افسروں کے سپرد ہوا تھا۔ مگر انتظام تو کیا کر سکتے جان کے لالے پڑ گئے۔ بمشکل تمام جان بچا کر نکل سکے۔

نمک حلال سرکار کے رہے۔ اس کے صلہ میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر بطور یادگار رکھی جائے تو یہ بھی کم ہے۔

میں اپنے آقا کا کمال شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھ پر ایسی مہربانی کی اور میری قدر دانی کی۔ خدا ان کو سلامت رکھے[۹۱]

عیب ے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

نفی حکمت مکن از بہر دل عامی چند

سرسید کی جب یہ تحریر سامنے آئی ہے جو آزادی اور جمہوریت کے موجودہ دور میں حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ شرمناک بھی ہے تو ناانصافی ہوگی اگر اس موقع پر ایک دوسرا اقتباس بھی پیش نہ کیا جائے۔ مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے سرسید نے فرمایا:۔

غدر کے بعد مجھے اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گذرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم شکسپیر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے۔ بعوض اس وفاداری کے تعلقہ[۹۲] جہاں آباد جو سادات کے ایک نہایت

---

۹۱ سرکشی اہل بجنور ص ۶۷۔ ۹۲ میر صادق اور میر رستم علی چاند پور ضلع بجنور کے رئیس تھے انھوں نے ایک عرضداشت بہادر شاہ کے پاس بھیجی تھی۔ بعد فتح دہلی وہ عرضداشت کاغذات دفتر شاہی میں مل گئی بس صرف اس بنا پر ان کا تعلقہ ضبط کر لیا گیا۔ یہی تعلقہ تھا جسے دوسری جائداد کے علاوہ بجنور کے ڈپٹی کمشنر نے سرسید کو دینا چاہا تھا حیات جاوید ص ۷۹ تا ص ۸۱ بحوالہ غلام رسول مہر ص ۲۰۵۔

نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپیہ سے زیادہ کی مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہونچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں اُن کی جائداد لیکر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت یہ بالکل سچی بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی۔ اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا

۱؎ اختلاف رائے کے باوجود یہ حقیقت پسندی اور مظلوموں کے ساتھ یہ ہمدردی قابل قدر ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تاریخ میں ایسے حقیقت پسندوں کی کمی نہیں ہے۔ مولانا میر محبوب علی صاحب کا ذکر خیر آگے آئے گا کہ آپ نے سرکاری انعامات واپس کر دیئے۔ کاتب حروف کے ایک خاندانی بزرگ سید محمد انور صاحب اس زمانہ میں جھانسی کی طرف اوورسیر تھے۔ آپ بھی وفادار رہے اور جب آپ کا انگریز افسر فرار ہوا تو آپ نے اس کی کوٹھی اور تمام املاک کی پوری حفاظت کی۔ اس کے صلہ میں سرکار نے آپ کے نام کئی مواضعات کا پروانہ بھیجا مگر آپ نے اس پروانہ کو نذر آتش کر دیا اور جب تحقیق ہوئی تو جواب دیا کہ میں نے جو کچھ کیا اپنی دیانت اور احساس فرض کے تقاضے سے کیا۔ میں اس کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کر سکتا۔ آپ کے متعلق ایک لطیفہ بھی احقر نے اپنے والد ماجدؒ سے سُنا ہے کہ عرصہ تک سلسلہ مراسلت بند رہنے کے بعد جب ڈاک خانوں کا نظام بحال ہوا تو آپ نے خانگی مصارف کے لئے رقم بھیجی۔ مگر منی آرڈر سے رقم بھیجنا اسوقت بھی خلاف احتیاط تھا تو ایک کتاب میں اشرفیاں رکھ کر کتاب کا پارسل والد صاحب کے نام کر دیا۔ والد صاحب کو روپیہ کی ضرورت تھی روپیہ کے بجائے کتاب کا پارسل پہونچا تو خفا ہو کر پٹک دیا کہ بوڑھے طوطے کو پڑھانے کے لئے کتاب بھیجی ہے۔ جب غصہ فرو ہوا تو (باقی صفحہ ۴۴۱ پر)

آپ یقین کیجئے اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا - اور میرے بال سفید کر دیئے
پھر یہ خیال ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے
کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت
میں جا بیٹھوں - نہیں! اس کی ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیئے اور جو
مصیبت پڑی ہے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے
میں نے ارادہ ہجرت موقوف[1] اور قومی ہمدردی کو پسند کیا - [2]

سرسید کی اس تحریر کی تصدیق کے لئے رسالہ اسباب بغاوت ہند پیش کیا جا سکتا ہے -

وہی سرسید جو اس پر نازاں ہے کہ اس کے "آقا" انگریز نے اس کو "نمک حلال نوکر" کہا، جب وہ دیکھتا ہے کہ بغاوت کا تمام الزام مسلمانوں کے سر

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ - پارسل کھولا تو اشرفیاں دیکھ کر دعائیں دیں - اسی بنا پر ارشاد ربانی ہے خلق الانسان من عجل - یہ سید محمد انور صاحب خدا ترس پاکباز صاحب تقویٰ وطہارت تھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے رفیق خاص حضرت حاجی محمد عابد صاحب سے بیعت تھے آپ نے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا تھا رحمہم اللہ -

[1] یہ صرف سرسید صاحب مرحوم کی تخصیص نہیں ہے - پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء نے بھی یہی کیا - فرق صرف اتنا ہے کہ علماء کرام کے پیش نظر تحفظ دین تھا اور یہ کہ آزاد فکر صاحب دیانت اہل علم پیدا ہوں اور سید صاحب کے پیش نظر مسلمانوں کی وجاہت دنیاوی عزت اور وفاداری حکومت متسلطہ - ابھی آدھی صدی بھی نہ گذری تھی کہ دونوں کے نتائج سامنے آ گئے -

[2] العلم کراچی جنگ آزادی نمبر ص۲۹ وحیات جاوید از ص۹۷ تا ص۱۰۰ جلد اول -

تھوپ کر پوری قوم کے کچلنے اور اس کی نسلیں ختم کر ڈالنے کا تہیہ کیا جا رہا ہے — اور بقول سر سید۔

کوئی آفت ایسی نہیں جو اس زمانہ میں ہوئی ہو گو وہ رام دین اور ماتا دین نے کی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔ کوئی بلا آسمان سے نہیں چلی جو اس نے پہونچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔ ان دنوں جو میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گذرے اور جو کتابیں اس ہنگامہ کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں۔ اور ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں دار درخت اس زمین میں نہیں اگا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا[1]

تو یہی سر سید "اسباب بغاوت ہند" لکھکر بغاوت کی ذمہ داری حکمراں طبقہ کے سر تھوپ دیتا ہے اور ساتھ ہی ایک ایسا مطالبہ کر دیتا ہے جس کے لئے اس وقت تک نہ کسی کے قلم نے جنبش کی تھی اور نہ کسی کی زبان متحرک ہوئی تھی۔

سر سید کہتے ہیں :۔

" بلا شبہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مداخلت غیر ممکن اور بے فائدہ محض تھی۔ مگر لیجسلیٹو کونسل میں مداخلت نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بس یہی ایک بات ہے جو جڑ ہے تمام ہندوستان کے فساد کی

---

[1] العلم کراچی جنگ آزادی نمبر۔

اور جتنی باتیں جمع ہوتی گئیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں۔ [۱]

"اسباب بغاوتِ ہند" سرسید کا ایسا کارنامہ ہے کہ اس کے متعلق اس وقت بھی یہی کہا گیا اور پوری ایک صدی کے گرم و سرد حوادث کے بعد بھی یہی کہا جاتا ہے۔

"ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

صرف انگریز کی حقیقت پسندی [۲] اور نکتہ رسی تھی جس نے نوائے تلخ کو نویدِ جاں افزا سمجھا۔ ورنہ سرسید کے مخلص دوستوں کے خیال کے مطابق سرسید یہ کتاب لکھ کر اپنے لئے دار و رسن کا انتظام مکمل کر چکے تھے۔

بہرحال اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیئے کہ سرسید بھی بہی خواہی ملک و ملت کا وہی سوز و گداز قلب و جگر میں رکھتے تھے جو مجاہدین حریت کو نصیب ہوا تھا البتہ اختلاف رائے نے راستے جدا جدا کر دیئے تھے۔

نقطۂ نظر میں بنیادی فرق یہ تھا کہ مجاہدین حریت انگریز کو غاصب اور ناجائز حکمراں تصور کرتے تھے جس سے نجات پانا اولین فرض تھا اور سرسید ان کو جائز حکمراں اور ان کی اطاعت کو لازمی اور ضروری مان چکے تھے۔

---

۱ اسباب بغاوت ہند ص ۱۲

۲ اس کے علاوہ خود انگلستان کے سیاسی حالات بھی سرسید کے مساعد ہو گئے کیونکہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم کر کے ہندوستان کو براہِ راست ملکہ وکٹوریہ کے زیر حکومت کیا گیا تو لامحالہ ایسے الزامات کی ضرورت تھی جن سے کمپنی کی اس برطرفی کو جائز اور تقاضائے عدل و انصاف قرار دیا جا سکے۔ اسباب بغاوتِ ہند۔ ایسے الزامات کی بہت ہی معقول دستاویز تھی جس کو ارکانِ پارلیمنٹ نے غنیمت سمجھا۔ چنانچہ انگریزی میں اس کا ترجمہ بکثرت تقسیم کیا گیا۔

سچائی اور خلوص کے ساتھ اختلاف رائے باعث ملامت تو کیا ہوتا نص حدیث نے اس کو رحمت فرمایا ہے ۔ البتہ یہ انتہا پسندی کہ مخالف کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر کر تہذیب و شائستگی کے لازمی تقاضوں سے بھی اس کو محروم کر دیا جائے ۔ اور اُس کے لئے بازاری الفاظ سے بھی گئے گذرے الفاظ استعمال کئے جائیں، یقیناً ایسی شکایت ہے جس کا ازالہ آج تک نہیں ہو سکا۔

انگریزی زبان کی تعلیم اور انگریز کی ملازمت ۱۸۵۷ء سے نہیں تقریباً پچاس سال پیشتر سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز جائز قرار دے چکے تھے ۔ مگر سرسید کی یہی انتہا پسندی تھی جس نے انگریزی زبان کی تعلیم کے ساتھ انگریزی کلچر کو بھی ضروری قرار دیا۔ اور صرف انگریزی تعلیم گاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ انگریزی کلچر کی تربیت گاہ کی حیثیت سے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی جس کے نتیجہ میں وہ اختلافات برپا ہوئے جن کا شور آج تک کانوں میں گونج رہا ہے،

سرسید کی یہی انتہا پسندی تھی جس سے ڈپلومیٹک انگریزوں کو فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملا۔ اُس نے ایک طرف اپنے پوشیدہ ذرائع سے ان اختلافات کو ہوا دی جس سے خود مسلمان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور دوسری طرف بہت سے سیاسی مسائل ہیں، سرسید کو آلہ کار بنا کر ہندو اور مسلمانوں میں وہ خلیج پیدا کر دی جس کا آخری نتیجہ تقسیم ملک کی صورت میں نمودار ہوا۔

رجوع | اس ضمنی بحث کے بعد ضلع بجنور کے حالات کو ایک بزرگ کے تذکرہ پر ختم کیا جاتا ہے

شاہ غلام بہولن سیوہاروی[1]

آپ مراد آباد کے مشہور قادری بزرگ حضرت شاہ بُلاقی الملقب بہ شاہ بوکن (متوفی ۱۱۳۹ھ) کے پرپوتے تھے آپ کا سلسلہ نصب حضرت شاہ بلاقی مراد آبادی تک اس طرح ہے۔

شاہ غلام بولن ابن شاہ کریم اللہ ابن شاہ رحمت اللہ ابن حضرت شاہ بُلاقی قادریؒ۔

آپ نے جدا مجد کا سلسلہ طریقت اپنے ماموں شاہ غلام احمد نہٹوریؒ خلف وخلیفہ حافظ محمد امین کاندھلویؒ ثم نہٹوری سے اخذ کیا اور انھیں سے مجاز ہوئے آپ کا مولد و مسکن سیوہارہ ضلع بجنور تھا۔

آپ بقول صاحب انوار العارفین۔ صاحب اوقات، خوش اخلاق اور قرآن خواں تھے۔ آپ کا دریائے رشد وہدایت برابر جاری رہتا تھا۔ لوگ کثیر تعداد میں آکر آپکی خدمتیں فیض رُوحانی حاصل کرتے تھے۔ آپ کی سیرچشمی، سخاوت اور مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ اپنی خانقاہ واقع سیوہارہ میں ہر وارد و صادر کو کھانا کھلاتے۔ آپ کا لنگر خانہ سفرۂ عام تھا جس پر سب دوست اور دشمن شکم سیر ہوتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں آپ کا لنگر خانہ تمام غریبوں اور مسافروں اور فقر و فاقہ کے ہاتھوں پریشان لوگوں کے لئے کھلا ہوا تھا سب آتے تھے اور کھانا کھاتے تھے۔

سچ جانئے انگریز نے جہاں اپنے بہت سے "کارنامے" دکھائے ہیں وہاں یہ بھی کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں اپنے کئے ہوئے مظالم کی خونچکاں داستانیں صفحۂ دل و دماغ سے فراموش

---

[1] مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی کا ایک مضمون روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا شاہ صاحب کے حالات اسی سے ماخوذ ہیں۔

کرادیں۔ اخلاف نے خود ہی اُن رنجیدہ حالات کو مصلحتاً بھلادیا جو تاریخ میں جلی حروف میں لکھے جانے کے قابل تھے۔ نہ صرف بھلایا بلکہ اُن تاریخی نوشتوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی جن سے آج واقعات کی ترتیب و تدوین میں مدد ملتی۔ امروہہ میں ایک مردِ مجاہد نے انگریز کے خلاف ایک مثنوی بزبان فارسی لکھی تھی اس مجاہد کے خاندان کے ایک فرد نے اس مثنوی کو ایسا پاٹ کر رکھا کہ اُس کو ہوا تک نہ لگنے دی اس کو یہی خوف رہتا تھا کہ کہیں انگریز کو اس مثنوی کا پتہ نہ چل جائے۔ بالآخر وہ مثنوی آج ہماری نظروں سے غائب ہے پتہ نہیں کیا ہوئی اس کے چند اوراق جو کسی نے نقل کر لئے ہوں گے راقم الحروف کو ملے مگر چونکہ غیر مرتب ہیں اُن سے کوئی تاریخ مرتب نہ ہو سکی۔ شاہ غلام یوسف صاحب کے جو حالات یہاں لکھ رہا ہوں یہ انوار العارفین مولفہ حافظ محمد حسین صاحب چشتی مراد آبادی سے ماخوذ ہیں۔

انگریز نے غلبہ پاکر جو دار و گیر شروع کی تو آپ کو اس الزام میں گرفتار کیا گیا کہ آپ انگریز کے دشمنوں کی مدارات کرتے ہیں اور اُن کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اس گرفتاری کا باعث ایک چغلخور بدبخت تھا جو بظاہر آپ کا مرید و معتقد بنا ہوا تھا لیکن بہ باطن انگریز کا خیر خواہ تھا مؤلف انوار العارفین نے لکھا ہے کہ اس نام نہاد معتقد کی چغلی کا واقعہ مشہور و معروف اور زبان زدِ خاص و عام ہے۔ کاش کہ وہ اس واقعہ کی وضاحت خود فرما دیتے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ واقعہ لوگوں کو یاد بھی ہے یا نہیں؟

آپ کو گرفتار کر کے جزیرہ انڈمان بھیجا گیا اور وہیں ۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ کو آپ رحمتِ حق سے واصل ہو گئے۔ نور اللہ مرقدہٗ۔ حافظ محمد حسین لکھتے ہیں کہ اس قید میں آپ قیود تعلقات سے آزاد اور رضا بمولا میں گرفتار رہتے تھے۔ اور یہ دو شعر اُن کے حسبِ حال تھے۔

خونے نکردہ ایم و کسے را نکشتہ ایم
جرمم ہمیں کہ عاشق روئے تو گشتہ ایم
بجرم عشق توام میکشند و غوغائیست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ئیست

آپ کی تاریخ وفات میں یہ قطعہ بھی انوار العارفین میں ہے۔

زیں دار فنا چو رخت بربست — شد خلد بریں مقام و مسکن
تاریخ وصال او خرد گفت — ماہ اسئے جہاں غلام بولن
سنہ ۱۲۷۶ھ

صاحب انوار العارفین نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ غلام بولن ہر سال اپنے جدامجد کے مزار کی زیارت کے لئے مراد آباد آتے تھے میں اُن کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں۔

آپ کے فرزند حضرت محمد عاشقؒ کے متعلق انوار العارفین میں لکھا ہے کہ جوان صالح اور صاحب ہمت مثل پدر بزرگوار ہیں اور رام پور میں سکونت رکھتے ہیں اور وہیں اپنے آباو اجداد کے سلسلہ کو جاری کر رہے ہیں اور تعلیم و تلقین میں مشغول ہیں۔

(انوار العارفین بزبان فارسی صفحہ ۷۰۴ مطبوعہ مطبع صدیقی بریلی)

شاہ جہان پور

شاہ جہان پور میں میرٹھ کی بغاوت کی خبریں ۱۵ مئی ۱۸۵۷ء کو پہنچیں انتظام پر پلٹن ۲۸ مقرر ہوئی۔ مولوی سرفراز علی گورکھپوری اس زمانہ میں شاہ جہان پور میں موجود تھے۔ پلٹن کے سپاہی بھی اُن کے وعظ سے متاثر ہوئے ۲۵ مئی کو عید الفطر کے دن افسروں نے خزانہ لٹنے کی افواہ سُن کر اسپیشل گارڈ اور سنتری ڈبل کرنے کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے اس کو بے اعتقادی و بے عزتی پر محمول کیا اور بددل ہو گئے۔

۳۱ مئی کو انگریز گرجا میں جمع تھے کہ انقلابی فوجوں نے اُن پر یورش کر دی۔ کچھ انگریز زخمی ہوئے پھر انھوں نے دروازہ بند کر لیا اور عورتوں کو گرجے کے مینار پر پہونچا دیا۔ یہاں کا شور سُنکر کچھ انگریز جو قریب ہی رہتے تھے اپنے نوکروں کو ساتھ لیکر گرجا پہونچے۔ ان سب کے پاس بندوقیں اور طمنچے تھے اور یورش کرنے والے صرف تلواریں لئے ہوئے تھے اب سپاہی بھی اپنی بندوقیں سنبھالنے کے لئے دوڑے۔ اس اثنار میں گرجا کے انگریزوں کو نکل جانے کا موقع مل گیا۔ اُن کی سواریاں جن پر وہ گرجا آئے تھے موجود تھیں۔ جنھوں نے کم از کم عورتوں اور بچوں کو نکال لینے میں بڑی مدد کی۔ کچھ سکھ سپاہ بھی پہونچ گئی تھی جس نے حفاظت کا فرض انجام دیا۔ لیکن اب یہ ہنگامہ کار زار گرجا تک محدود نہ رہا پوری چھاؤنی میں پھیل گیا۔ چند انگریز افسر مارے گئے اور باقی کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ شاہ جہان پور چھوڑ کر کوئی محفوظ مقام تلاش کریں کچھ انگریزوں نے "راجہ پوایئں" کے یہاں پناہ لی۔ مگر پورے علاقہ میں اتنا اشتعال پھیل چکا تھا کہ راجہ بھی حفاظت کی ذمہ داری نہ لے سکا۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد لوگوں نے زمام حکومت نواب غلام قادر خاں کے حوالہ کی۔

نواب غلام قادر خاں

نواب غلام قادر خاں ابن حاجی میاں نواب بہادر خاں بانی شہر شاہجہان پور کے خاندان سے تھے یہ اپنے خاندان میں سب سے بڑے اور با اثر تھے۔ سب لوگ ان کا ادب کرتے تھے۔ جب شاہجہان پور میں یہ ہنگامہ ہوا تو آپ اپنے پیر سعادت علی شاہ نبیرہ غلام علی ہانسوی کے یہاں تشریف لے گئے تھے جب واپس ہوئے تو اہل خاندان، باشندگان شہر اور مجاہدین نے قیادت آپ کے سپرد کی آپ کے پیرزادگان رؤف میاں و ظہور میاں پسران شاہ سعادت علی نے بھی ہمت بڑھائی۔ نواب خان بہادر خاں نے سند نظامت دی۔ نواب قادر علی ان کے حق میں دست بردار ہو گئے،

لیکن شریک و مددگار کی حیثیت سے تحریک میں شامل رہے، مجاہدین نے خوب زور پکڑا۔ نواب غلام قادر خاں نے بہت اچھی طرح ریاست کا انتظام کیا۔ قریب ایک سال ان کا دور رہا۔ جنرل بخت خاں نواب تفضل حسین، شہزادہ فیروز شاہ نواب اسمٰعیل ڈاکٹر وزیر خاں مولوی فیض احمد بریلوی شاہ احمد اللہ اور نانا راؤ وغیرہ شاہ جہان پور جمع ہو گئے۔

معرکہ کارزار

۲۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو نواب غلام قادر خاں نے بجھوریا کے گھاٹ پر انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دیئے، کافی نقصان پہونچایا۔ شہر کے مورچوں کی کمان مولانا شاہ احمد اللہ صاحب کے سپرد تھی۔ شاہ صاحب نے لگاتار ایسے حملے کئے کہ انگریز جیل خانہ کے تھوڑے سے علاقہ میں محصور ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۸ء کو انگریز محصورین کی حالت نازک ہو چکی تھی کہ پہلے جنرل جونسن تازہ دم فوج لے کر پہونچ گیا۔ پھر بریلی پر مکمل قبضہ کے بعد ۱۸ مئی کو سر کالن کیمبل فاتحانہ حوصلہ مندیوں کے ساتھ شاہجہان پور پہونچا۔ شاہ صاحب موقع کی نزاکت محسوس کر کے اپنے تمام ہمراہیوں کے ساتھ قصبہ محمدی چلے گئے۔

محمدی میں قیام حکومت

محمدی میں ان کی حکومت قائم ہو گئی۔ جنرل بخت خاں مولوی سرفراز علی اور نانا راؤ پیشوا کا بیٹہ ہیں اندر کونسل میں مولوی لیاقت علی الہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا فیض احمد بدایونی تھے۔ فیروز شاہ نے اول اختلاف کیا پھر شرکت کر لی شاہ صاحب کا خطبہ سکہ جاری ہوا۔ آپ کے سکہ پر یہ شعر کندہ ہوتا تھا ؎

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامیٔ دین محمدؐ احمد اللہ بادشاہ

شاہ جہان پور سے بڑھکر سر کالن کیمبل نے قصبہ محمدی پر حملہ کر دیا انگریزی فوج کی طاقت زیادہ تھی، شاہ صاحب کو ناکامی ہوئی محمدی چھوڑنا پڑا کچھ لوگ نیپال کی طرف چلے گئے۔ ۵ رجون کو

راجہ پوائین نے شاہ صاحب کو اپنے یہاں بلایا اور دھوکہ سے آپ کو گولی کا نشانہ بنوادیا۔ (تفصیل شاہ صاحب کے تذکرہ میں ملاحظہ فرمائی جائے)

دیگر قصبات کی کیفیت باشندگان شہر تلہر نے بھی تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ نواب خان بہادر خاں نے غلام محمد خاں کو ناظم تلہر اور ان کے بھائی کفایت اللہ خاں کو تحصیلدار مقرر کیا۔ میراں پور کٹرہ میں فیض محمد خاں اور نظامی خاں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی پوری کوشش کی۔

جلال آباد میں احمد یار خاں تحصیلدار نے تحریک کو تقویت دی بعد کو یہ ناظم ہوگئے۔ بہت سرگرمی سے انتظام کیا اور بریلی سے ایک فوج زیر کمان نواب اسمعیل خاں (نواب فتح گڈھ) بلاکر راجپوتانہ کھنڈر کو مطیع کیا۔ جنگ بچپوریہ میں یہ شریک تھے ۲۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو جب انگریز جلال آباد پر قابض ہوگئے تو ان کو علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔

انتقامی کارروائی اکتوبر ۱۸۵۸ء میں پورے ضلع شاہجہان پور پر مکمل طور سے انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ انگریزی حکومت نے تمام سردار اور روٴسا اور علماء کو عبرت ناک سزائیں دیں۔ نواب غلام قادر خاں اودھ چلے گئے، وہیں نیپال کی پہاڑیوں میں انتقال ہوگیا۔ نواب قادر علی خاں، عبدالروٴف خاں، قاضی سرفراز علی کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ غلام محمد خاں، کفایت اللہ خاں تلہری بھی کالے پانی بھیجے گئے۔ جائدادیں ضبط ہوئیں۔ احمد یار خاں جلال آبادی گرفتار ہوئے اور پھانسی دی گئی۔ وسیع مکانات، حویلیاں، محلات، قلعہ ڈھائے گئے غرض کوئی ایسا ظلم نہ تھا جو روا نہ رکھا گیا ہو۔

حرف آخر۔ روہیلکنڈ نے اگرچہ دلی اور میرٹھ سے چند روز بعد جنگ آزادی میں حصہ لیا لیکن اس قوت سے حصہ لیا اور پھر جتنی دیر تک قربانیاں پیش کرتا رہا پورے ہندوستان کا کوئی خطہ بھی اس کی نظیر نہیں پیش کرسکا۔

(ماخوذ از مضمون محترم محمد ایوب صاحب بی اے دمحاربہ عظیم وغیرہ)

چند نامور علماء اور جرنیل

مولانا احمد اللہ شاہ شہید

عزم و ہمت، حمیت ملی اور غیرتِ وطن کا وہ شعلہ جوالہ جو "چنیا پٹن"[1] سے اٹھا، دہلی اور آگرہ میں چمکا۔ سرزمین اودھ میں چمکا۔ روہیلکھنڈ میں شعلہ افشاں ہوا۔ پھر اسی کے ایک گوشہ میں محو سکون ہوگیا۔ اس کو ۱۸۵۷ء کی جان مضطرب کہا جائے یا شہدائے ۱۸۵۷ء کا سرتاج دونوں درست۔

اپنے تو اپنے غیر بھی[2] ان کے علم و عمل، قوت روحانی اور جرأت ایمانی کے معترف ہیں

۱؎ واقعات ۱۸۵۷ء کے ممتاز مورخ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی جن کی مشہور اور مسلم تصنیفات سے اس مضمون میں خوشہ چینی کی گئی ہے چنیا پٹن کی تاریخ اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

"پایان گھاٹ" کے راجہ دائل کے زمانہ میں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں نے کاسری کے زمیندار اور اس کے دیوان سے اتحاد و اتفاق کرکے دریا رشہر کے کنارے تجارت گاہ تعمیر کرنے کے لئے ایک موضع "مدراس کپم" حاصل کیا، جو تعلقہ "پونامل" سے متعلق تھا۔ راجہ نے اس کی سند طلائی لوح پر کندہ کرا کے کارندوں کے حوالہ کی اور ایک ہزار دو سو "ہون" سالانہ اس کا پیش کش مقرر کیا اور موضع کی مناسبت سے اس کا نام مدراس رکھا۔ کچھ دنوں بعد چند مواضع اور حاصل کر لئے گئے۔ "چنا نایک کوپم" اور پوکم اور پیل پیٹہ یہ بھی تعلقہ پونامل سے متعلق تھے۔ چنا نائک کوپم چونکہ مدراس کی آبادی میں شامل کر لئے گئے تھے اس لئے قدیم نام کی مناسبت سے اس کا نام "چنیا پٹن" رکھا گیا۔

۲؎ جی۔ ڈبلیو۔ فارسٹر کی شہادت ملاحظہ فرمائیے:۔

وہ عالم باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا۔ روحانی طاقت کی وجہ سے صوفی تھا اور جنگی مہارت کی وجہ سے وہ سپاہی اور سپہ سالار تھا۔ احمد شاہ نام تھا۔ ظلم طبیعت میں نہیں تھا ہر انگریز اس کو قدر سے نگاہ سے دیکھتا ہے

(ہسٹری دی انڈین میوٹنی)

اصل نام ولدیت اور سلسلہ نسب

تاریخ آزادی کے ہیرو۔ وطن عزیز کے بہادر فرزند فدار ملک و ملت۔ سلطان حیدر علی عرف سلطان ٹیپو (شہید) کے ایک مصاحب۔ سید محمد علی نواب چنیا پٹن تھے انہیں نواب محمد علی کے یہاں سنہ ۱۲۰۴ھ میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ باپ کے نام کی مناسبت سے احمد علی نام رکھا گیا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اصل نام سے شہرت بہت کم ہوئی۔ پہلے ضیاء الدین عرف رہا۔ دلاور جنگ خطاب۔ اور جب یہ لڑکا عمر عزیز کی تقریباً چھ دھائیاں طے کرنے کے بعد جدوجہد آزادی کا علم بردار ہوا تو احمد اللہ شاہ کہلانے لگا۔ رحمۃ اللہ۔

سید محمد علی۔ سید جلال الدین عادل کے فرزند ارجمند تھے۔ سید جلال الدین جو خاندان قطب شاہی (فرمانروائے گولکنڈہ) کی یادگار[1] تھے۔ ایک طرف چنیا پٹن کے رئیس اور نواب تھے تو دوسری جانب ایک باخدا بزرگ تھے جو اپنے زمانہ کے ولی اور قطب سمجھے جاتے تھے۔

تعلیم و تربیت اور طبعی رجحانات

خاندانی عظمت کے بموجب آپ کی تعلیم و تربیت امیرانہ ہوئی اور اس زمانہ کے رواج کے مطابق علوم دینی کے ساتھ فنون حرب کا بھی ماہر بنایا گیا۔ ہوش سنبھالا تو طبیعت کا میلان اوراد و وظائف کی طرف تھا۔ نماز۔ روزہ اور احکام شریعت کے سخت

---

[1] سنہ ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے "گولکنڈہ" پر قبضہ کر کے قطب شاہی خاندان کا خاتمہ کیا۔ آخری بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ تھے جو عبداللہ قطب شاہ کے داماد تھے۔ جب اس خاندان میں حکومت نہ رہی تو ابوالحسن کے پوتے "چنیا پٹن" جا بسے اور وہاں کے نواب کہلائے۔ اس خاندان کے نامور بزرگ سید جلال الدین عادل تھے۔ رحمۃ اللہ

(مفتی انتظام اللہ شہابی)

پابند تھے۔ ہر عمل میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ضروری سمجھتے تھے۔ والدین سے ٹیپو سلطان کی شہادت اور سلطنت خداداد کی تباہی کا حال سُنا تو حکومت اور مال و دولت سے دل بیزار ہو گیا۔[1]

سیاحت و بیعت

جوانی کا آغاز تھا کہ سیاحت کا شوق ہوا۔ پہلے حیدرآباد گئے پھر یورپ کا سفر کیا۔ انگلستان جاکر ملکہ وکٹوریہ کے مہمان ہوئے۔ وہاں سے واپس ہوکر عربی ممالک کا دورہ کیا۔ حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہوئے پھر ایران ہوکر "چمن" کے راستہ سے ایک عرصہ کے بعد ہندوستان پہونچے۔ یہاں "سانبھر" کے علاقے میں ڈیرے ڈالدیئے۔[2]

پھر مراحل سلوک طے کرنے اور روحانی کمالات حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی۔ حضرت قربان علی شاہ کی شہرت سُنکر جے پور گئے۔ ریاضت و مجاہدہ اور چلہ کشی کے انوار پہلے سے موجود تھے بیعت نے فوراً ہی نسبت مشائخ کا کیف پیدا کردیا حضرت قربان علی شاہ صاحب نے جس طرح روحانی فیوض و کمالات سے مالامال کیا اصلاح صوفیا اور تنظیم مجاہدین کا فرض بھی آپ کے ذمہ کردیا اور ہاں محفل سماع کی بھی اجازت دیدی۔[3] بہرحال مولانا احمد اللہ شاہ صاحب جے پور سے ٹونک تشریف لے گئے۔ نواب وزیرالدولہ سے مجلسیں گرم رہیں۔

ٹونک کی آب و ہوا آپ کے ذوق سماع کے موافق نہیں تھی[4] مگر ذوق جہاد کے لئے سب سے زیادہ موافق آب و ہوا اسی ٹونک کی تھی جو حضرت سید احمد شہید کے پس ماندگان کا مرکز تھا اور ابھی

---

[1] مولوی احمد اللہ شاہ اور پہلی جنگ آزادی۔ از مفتی انتظام اللہ شہابی۔ [2] ایضاً صفحہ ۱
[3] ایضاً صفحہ ۱۔ [4] نواب وزیرالدولہ نے حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل صاحب شہید سے تربیت پائی تھی۔ یہ بزرگ سماع کے سخت مخالف تھے۔ پھر نواب صاحب موصوف حضرت مولانا سید نصیرالدین صاحب دہلوی سے بیعت ہوئے تھے۔ مولانا نصیرالدین صاحب بھی حضرت سید صاحب شہید سے تربیت یافتہ اور اُن کے خلفاء میں سے تھے جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے [5] منشی ذکاء اللہ خاں صاحب کی شہادت پہلے گذر چکی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے جہاد میں شریک ہونے والے وہابی مجاہدین سب سے زیادہ ٹونک سے آگے تھے جن کی تعداد دو ہزار تھی۔

چند سال ہوئے حضرت مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی کا جہادی قافلہ ۔ وزیر الدولہ کے دماغ کو سرشار کرتا ہوا یہاں سے گذرا تھا ۔

حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب ٹونک سے رخصت ہو کر گوالیار پہونچے ۔ یہاں ایک بزرگ محراب[۵۱] شاہ قلندر تھے ۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ اُن کے مشائخانہ اطوار نے آپ کے دل کو موہ لیا ۔ یہ قلندر صاحب بھی عجیب تھے ۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ۔ مگر راہ و رسم انقلاب سے باخبر ۔ ظالم فرنگی کے دشمن اور استخلاص وطن کے دلدادہ ۔

مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب نے قلندر صاحب کے حلقہ ارادت میں داخل ہونا چاہا تو داخلہ کی شرط یہ تھی کہ جہاد کی سوکھی رگوں میں تازہ خون دوڑائیں گے اور وطن عزیز کو انگریزوں سے نجات دلائیں گے ۔ شاہ صاحب نے بسر و چشم یہ شرط منظور کی اور سلسلۂ قادریہ میں آپ سے بیعت ہو کر خرقہ خلافت حاصل کر لیا[۵۲] ۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ کتنے عرصہ آپ نے گوالیار میں قیام کیا ۔ البتہ اس موقع پر یہ فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ تقریباً تیس سال پہلے جب حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ جہاد کے لئے روانہ ہوئے تھے تو سب سے پہلے تقریباً دو ہفتہ تک آپ کا قیام یہیں رہا تھا ۔ پھر راجہ ہندو راؤ اسی ریاست کے مدار المہام تھے جن کے نام سیدصاحب نے مرکز جہاد سے خط لکھکر اُن کو جنگ آزادی کے لئے اُبھارا تھا ۔

دہلی مرکز سیاست ۔ اور اس کی موجودہ حالت

جہادی قلندر حضرت محراب علی شاہؒ کے دست مبارک پر عہد جہاد کرنے کے بعد عزم و عمل کا وقت آیا تو قدرتی طور پر حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب کی نظر دہلی کی

---

۵۱ آپ گوالیار کے ایک رئیس کے یہاں پیادوں میں ملازم تھے ۔ رئیس کا نام سردار سنتولے تھا (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما ۔ ص ۹) ۵۲ مولوی احمد شاہ اور مفتی انتظام اللہ صاحب ۔

طرف اُٹھی کیونکہ

(۱) اگرچہ انگریزی اقتدار کا مرکز کلکتہ اور اس کا فورٹ ولیم تھا مگر ہندوستانیوں کی سیاست کا مرکز اب بھی دہلی ہی تھا۔

(۲) یہاں مغل سلاطین کا جانشین موجود تھا جو سیاسی لحاظ سے مفلوج و مجبور ہونے کے باوجود اُن بیشمار ہندوستانیوں کے جذبات پر حکمراں تھا جو مغل اعظم ہی کے کسی وارث کو سلطنت و حکومت کا صحیح مستحق سمجھتے تھے۔

(۳) یہی دہلی تھی جس کی ولی اللّٰہی تربیت گاہ میں "روح انقلاب" نے جنم لیا تھا جہاں شاہ عبدالعزیز صاحب کی تربیت گاہِ سیاسی میں وطن عزیز کو نجات دلانے کی تحریک پروان چڑھی تھی اور اس نے اپنا دورِ شیر خوارگی پورا کیا تھا جہاں جنگ حریت کے سب سے پہلے علمبردار سید احمد شہید کو پرچم قیادت عطا ہوا تھا۔ جہاں سے چند سال پہلے مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی کی زیر سیادت سرفروشانِ حریت کا آخری قافلہ روانہ ہوا تھا

(۴) یہی دہلی تھی جہاں بقول مولانا عبید اللہ سندھی اب بھی ولی اللّٰہی تحریک کی وہ مرکزی جماعت موجود تھی جس کی رہنمائی حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب اپنی ہجرت گاہ "مکہ معظمہ" سے فرما رہے تھے۔

اس قسم کی متعدد وجوہات تھیں جن کی بنا پر مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب کا قدم سب سے پہلے دہلی کی سمت اٹھنا ضروری تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن اس وقت کی صورت حال نے جو نزاکتیں پیدا کر دی تھیں اُن کا احساس مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب کو گوالیار میں نہیں ہو سکا۔ یا پوری طرح نہیں ہو سکا۔ مثلاً

(۱) گذشتہ چالیس سال میں جس طرح دہلی حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ

حضرت مولانا نصیر الدین دہلوی شہیدؒ، حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی تحریکات کا مرکز رہی۔ اس کا تقاضا تھا کہ بقول مولانا عبید اللہ سندھی

"یہاں ریزیڈنٹ کی نگاہ بہت سخت ہو"

(۲) شاطران انگریز طے کر چکے تھے کہ بہادر شاہ پر بادشاہت کے موجودہ طمطراق کو بھی ختم کر دیا جائے۔ لال قلعہ جو عظمت ہندوستان کا آخری نشان سمجھا جاتا تھا اس کو بہادر شاہ کے جانشین سے خالی کرا لیا جائے اس کے لئے جو تدبیریں عمل میں لائی جا رہی تھیں اور جس طرح شاہزادوں سے ساز باز کا سلسلہ جاری تھا اس کا یہی تقاضا تھا کہ ریزیڈنٹ کی نگاہیں سخت اور محتاط رہیں۔

(۳) حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب کے دہلی تشریف لانے کا سال معین نہیں ہو سکا قیاس[۱] یہ ہے کہ ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں آپ دہلی تشریف لائے ہوں گے یعنی تقریباً ۱۲۶۲ھ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پنجاب میں سکھ حکومت کو ختم کیا جا رہا تھا جس سے پورے پنجاب میں بد دلی پھیلی ہوئی تھی۔ علاقہ ملتان کی فوجیں زیر قیادت دیوان مولراج انگریز سے جنگ کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ پٹھانوں نے زیر قیادت سلطان محمد خاں و دوست محمد خاں علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ "بالاکوٹ" کا رئیس سید ضامن شاہ انگریزوں کے دوست "گلاب سنگھ" مہاراجہ کشمیر سے

---

[۱] چند صفحات بعد آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ آگرہ میں مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب کے ہمنواؤں پر ایک مقدمہ چلایا گیا تھا۔ مارچ ۱۸۵۰ء میں ابتدائی عدالت سے اس کا فیصلہ سنایا گیا۔ مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب دہلی سے آگرہ تشریف لے گئے تھے آگرہ پہنچ کر حلقہ اثر قائم کرنے اور اس درجہ رسوخ حاصل کرنے میں (کہ حکومت اُن کے اُن ہمنواؤں پر جو حکومت کے اعلیٰ منصبوں پر فائز تھے۔ مقدمہ چلانے پر مجبور ہوئی) تین چار سال یقیناً صرف ہوئے ہوں گے۔

برسر پیکار تھا اور اُس کی امداد کے لئے مرکز صادق پور سے مجاہدین کا ایک دستہ مولانا ولایت علی صاحب کی زیر قیادت بالاکوٹ پہونچ چکا تھا اور شہادت مجاہدانہ کی پرانی تمنائیں سرفروشی سے پوری کر رہا تھا۔ اور جیسا کہ اسی سلسلہ کی تیسری جلد میں بیان کیا گیا ہے۔ بقول مسٹر دیبی پرشاد مصنف گلشن پنجاب۔ پورے ہندوستان بالخصوص شمالی مغربی صوبہ (پنجاب و فرنٹیر و کشمیر) میں غلغلہ مچ رہا تھا۔

ان نزاکتوں کے علاوہ سیاسی مصلحت کا بھی تقاضا یہی تھا کہ جو تحریک موجودہ حالات کے مطابق چلائی جائے اس کا مرکز دہلی نہ ہو۔

اسلامی جہاد کی نوعیت سے جو تحریک سید احمد شہیدؒ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے بعد مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے چلائی تھی اس کی ناکامی ثابت ہو چکی تھی اب ایک عوامی حزب کی تحریک کی ضرورت تھی۔ دہلی اگرچہ مرکز سیاست تھی۔ مگر یہاں تحریک حریت ایک خاص حلقہ سے مخصوص تھی۔ یہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں اور مریدوں کا حلقہ تھا۔ بیشک اس حلقہ کے اثرات پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے مگر شاطران برطانیہ نے وہابیت کے جس الزام سے حضرت سید احمد صاحب کی تحریک کو سرحد میں ناکام کیا تھا۔ جیسا کہ شاندار ماضی کی جلد دوم میں واضح کیا جا چکا ہے وہ الزام اگرچہ قطعاً بے بنیاد تھا۔ مگر کچھ اپنوں کی ناعاقبت اندیشی اور زیادہ تر کلکتہ کے سرکاری دارالافتاء نے مسلسل پروپیگنڈہ کر کے اس بیس سال کے عرصہ میں اس الزام کو اس حد تک حقیقت کا درجہ دیدیا تھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت سید احمد شہید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھنے والا حلقہ صرف سیاسی نہیں رہا بلکہ مذہبی نقطۂ نظر سے ایک مکتبہ خیال بن گیا تھا۔

اب تدبر اندیشی سیاسی دور اندیشی کا مطالبہ یہ تھا کہ آئندہ تحریک کی دعوت ایسے انداز سے

دی جائے کہ جو عناصر اس مکتبۂ خیال سے تعلق نہیں رکھتے وہ بھی تحریک سے وابستہ ہوں اور مکتبۂ خیال کی حدبندی اُن کی شرکت یا قیادت کے راستہ میں حائل نہ ہو سکے۔ اس مصلحت کے پیش نظر حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب جیسی شخصیت تھی جن کو قدرت کے پوشیدہ اشاروں نے خود بخود دہلی کے سیاسی مدبرین کے پاس پہونچا دیا تھا۔

دہلی کے بعد آگرہ

شاہ جہان آباد (دہلی) اور اکبر آباد (آگرہ) کا پرانا رشتہ اگرچہ اب کمزور ہو چکا تھا۔ مگر تعاون اور اعتماد باہمی کی روح ابھی فنا نہیں ہوئی تھی اور اگرچہ چند سال پہلے آگرہ ملی رجحانات اور قومی جذبات کے لحاظ سے ایک شہر خموشاں[۱]

---

[۱] مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی آگرہ کے قدیم باشندے تھے آپ سے زیادہ آگرہ کے حالات اور ماضی قریب کی تاریخ سے کون واقف ہو سکتا ہے آپ تحریر فرماتے ہیں:۔ جاٹوں اور مرہٹوں کے زمانہ میں آگرہ کی حالت بے حد زبوں ہو چکی تھی۔ ملا ولی محمد شاہ کی درسگاہ محلہ بالو گنج میں تھی۔ مولوی شمس الضحیٰ اور مولوی بدر الدجیٰ اور رہبر اعظم علی اعظم اسی مدرسگاہ کے فارغ التحصیل عالم تھے۔ مولوی محمد معظم جن کے مکتب میں مرزا غالب نے پڑھا۔ میاں نظیر کا مکتب محلہ مائی تھان میں تھا۔ یہاں ہندوؤں کے چند بچے تعلیم پاتے تھے۔ حکیم غلام قطب الدین خاں باطن (صاحب نغمۂ عندلیب) وخلیفہ گلزار علی اسیر یہ ان کی درسگاہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ مولوی امجد علی اصغر کا مدرسہ محلہ تاج گنج میں تھا۔ یہ تھی کل کائنات اکبر آباد کے درس و تدریس کی گنتی کے چند لوگ پڑھے لکھے تھے۔ قاضی سید باسط علی خاں ہمدانی۔ آگرہ کے قاضی القضاۃ تھے۔ مرہٹوں نے ان کو معزول کر کے لکو بھٹ کو قاضی القضاۃ بنا دیا۔ باسط علی خاں مرافعہ کہتے شاہ عالم ثانی کے پاس دلی پہونچے۔ البتہ مرہٹوں نے کچھ خانقاہوں کو جاگیریں ضرور دیں بہر حال حکمراں طبقہ کا اثر یہ تھا کہ مسلمان شعائر اسلامی سے دور ہٹ گئے تھے۔ نماز روزہ کی طرف سے تغافل برتا جاتا تھا۔ متولیان مسجد جامع اکبری نے مسجد کی زمینیں دکانیں ہندوؤں کے ہاتھ رہن رکھ دی تھیں۔ جامع مسجد کا مصرف صرف یہ رہ گیا تھا کہ اس کے صحن میں کبوتروں کی (باقی صفحہ ۴۵۹ پر)

بن چکا تھا مگر جب سے وہ برطانوی صوبہ کا دارالحکومت بنا تھا اس میں پھر چہل پہل ہو گئی تھی اور ذی استعداد صاحب فکر علماء و فضلاء کا ایسا مجمع اس کو میسّر آگیا تھا جس کی نظیر کوئی دوسرا شہر مشکل سے پیش کر سکتا تھا۔ ان علماء میں اگرچہ زیادہ وہ تھے جو حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز سے تلمذ اور (بالواسطہ یا بلاواسطہ) شاگردی کا تعلق رکھتے تھے مگر غالباً ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو ایک مکتبۂ خیال کے پابند کی حیثیت سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ یا حضرت سید احمد شہیدؒ سے وابستہ ہو۔

مختصر یہ کہ مختلف مکاتب خیال اور مختلف سلسلۂ تلمذ کے علماء اور فضلاء یہاں رونق افروز تھے اور آگرہ گلہائے رنگارنگ کا گلدان بنا ہوا تھا۔ ایک عوامی تحریک کا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قلقلیں کھڑی کی جاتی تھیں اور سوتی رسّی بٹنے کے کرگھے لگے ہوئے تھے۔ بیچ کے در میں چند چٹائیاں پڑی رہتی تھیں۔ گنتی کے لوگ نماز پڑھتے تھے۔ جمعہ کی نماز میں بیس پچیس مسلمان شریک ہوتے تھے۔ امیرالامراء ذوالفقارالدولہ نجف خاں کے زمانہ سے البتہ تعزیہ داری کا رواج بڑھ گیا تھا۔ تعزیوں پر عرضیاں چڑھتیں۔ چڑھاوا صدہا روپیہ کا چڑھتا۔ تعزیہ کا ساتویں اور نویں کی شب میں "نانت شہر" کا گشت کرایا جاتا تھا۔ عمائد شہر ہاتھ باندھ کر ساتھ ساتھ تعزیہ کے چلتے اور کاندھا دیتے۔ دسویں کی صبح الوداع پڑھی جاتی۔ ہزارہا مسلمان عورت مرد جمع ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ مولانا غلام امام شہید الوداع پڑھتے تھے۔ بچوں کو تعزیہ پر رہن رکھا جاتا (وغیرہ وغیرہ) مسلمانوں میں عام طور سے ہندوانی رسوم کی گرم بازاری تھی۔ دیوالی اور ہولی میں برابر ہندوؤں کے شریک ہوتے۔ اس کیفیت کا پورا نقشہ میاں نظیر نے اپنی نظمیات میں کھینچا ہے۔ ان کے پوتے سوانگ بھرتے تھے اور شہر کا گشت لگاتے سیتلا کے مندر کے ہندو اور مسلمان ہر دو مجاور اور مہنت۔ چڑھاوے کے برابر کے حصہ دار ہوتے تھے یہی حال کمال خاں کے کنوئیں کا تھا۔ یہ تھی عام حالت مسلمانوں کی۔ صدر نظامت ۱۸۲۵ء میں الہ آباد سے آگرہ آیا تو علماء جو وابستگان صدر تھے وہ بھی ساتھ آئے تب یہاں علماء کی صورتیں نظر آنے لگیں۔ پہلے جمعہ میں مولوی سراج الاسلام (؟) پیشکار نے نماز جمعہ پڑھائی تو اسّی آدمی اس میں شریک تھے تمام شہر میں یہ شہرہ تھا کہ عظیم الشان جمعہ ہوا۔ ......

([illegible])

لالہ زار ایسا ہی گلستان بن سکتا تھا - دہلی کے ارباب بصیرت نے اسی مصلحت سے آگرہ کو منتخب کیا اور حضرت مولانا سید احمد اللہ صاحب شہید کی عنان توجہ دہلی کے بجائے آگرہ کی طرف منعطف کی۔

لیکن آگرہ حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب کے لئے بالکل اجنبی شہر تھا اس کے لئے ایک عرصہ درکار تھا کہ مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب آگرہ پہونچکر اعتماد حاصل کریں۔ اور وہاں کے سربراہ ہوں اور کلیدی حضرات تک پہونچ سکیں۔

حضرت مولانا مفتی صدر الدین صاحب جیسا اعلیٰ مدبر جس نے حضرت سید احمد اللہ شاہ صاحب کی سیاسی تگ و دو کے لئے آگرہ کا میدان منتخب فرمایا۔ آپ نے خود ہی اس کی ذمہ داری بھی لی کہ حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب جیسے ہی آگرہ پہونچیں بلا کد و کاوش کلیدی حضرات تک ان کی رسائی ہو جائے اور یہ اُن کا اعتماد حاصل کرلیں۔ چنانچہ حسب روایت مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی

> مفتی انعام اللہ خان بہادر جو محکمہ شریعت کے مفتی رہ چکے تھے اب سرکاری وکیل تھے۔ حضرت آزردہ (مفتی صدر الدین صاحب آزردہ) کے خط کے ذریعہ شاہ صاحب (مولانا احمد اللہ شاہ صاحب) اُن کے یہاں آکر مقیم ہوئے اُن کا گھر علماء کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مفتی صاحب کے صاحبزادے مولوی اکرام اللہ صاحب "تصویر الشعراء" مرید ہوئے۔

مجلس علماء علماء و فضلاء کرام کا یہ گلدستہ جس کی شیرازہ بندی اب تک علمی اور ادبی ذوق نے کر رکھی تھی مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے پہونچنے کے بعد اُس میں سیاسی رنگ پیدا ہونا شروع ہوا اور مجلس کی شکل میں اس اجتماع کی تشکیل کیگئی

اس کے ارکان کی مختصر فہرست ملاحظہ ہو۔

مولوی شیخ اعتقاد علی بیگ صاحب۔ مولوی امام بخش صاحب۔ سیّد باقر علی صاحب ناظم محکمہ دیوانی۔ مولوی نورالحسن صاحب۔ سید مراتب علی صاحب۔ مولوی خواجہ تراب علی صاحب سید حسن علی صاحب۔ رحمت علی صاحب۔ مفتی ریاض الدین صاحب۔ مولوی غلام جیلانی صاحب غلام مرتضیٰ صاحب۔ شیخ محمد شفیع صاحب۔ مولوی عبدالصمد صاحب۔ مولوی منصب علی صاحب مولوی محمد عظیم الدین حسن صاحب۔ رسول بخش صاحب۔ باسط علی صاحب۔ مومن علی صاحب محمد قاسم صاحب داناپوری۔ معین الدین صاحب۔ مولوی کریم اللہ خاں صاحب صدر الصدور قاضی محمد کاظم علی صاحب۔ تاج الدین صاحب طفیل احمد صاحب خیرآبادی۔ مولانا غلام امام شہید۔ مفتی عبدالوہاب صاحب گوپاموی۔ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب۔ مولوی فیض احمد صاحب بدایونی۔ مفتی انعام اللہ صاحب۔

یہ حضرات صدارت نظامت کے مختلف عہدوں پر فائز تھے یا وکلاء تھے جنھوں نے اس مجلس کی رکنیت منظور کی۔ اور دامے درمے قدمے شاہ صاحب کی تائید و اعانت شروع کردی۔

حلقۂ ارادت حضرت سیداحمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کے حالات شاندار ماضی جلد دوم میں گذر چکے ہیں انہیں کا نمونہ حضرت مولانا سیداحمداللہ شاہ صاحب کے حالات میں بھی نظر آتا ہے فرق یہ ہے کہ جو گرمی وہاں صرف ذکراللہ سے پیدا کی جاتی تھی شاہ احمداللہ صاحب کے یہاں اس کے لئے "سماع" سے بھی کام لیا جاتا تھا۔[۱]

---

[۱] شاہ مولوی احمداللہ از مفتی انتظام اللہ شہابی ص۱۵

بہرحال حضرت سید احمد اللہ شاہ صاحب کے حلقۂ بیعت و ارادت نے وسعت اختیار کی محفل سماع خود ایک کشش رکھتی ہے یہاں علم و فضل اور اخلاص کے ساتھ قوت خطابت کا بھی یہ عالم تھا کہ جہاں آپ کے وعظ کا اعلان ہوتا ہندو مسلمانوں کا بے پناہ ہجوم ہو جاتا۔ اب ایک وقت ذکر و شغل اور مراقبہ کا سلسلہ ہوتا۔ دوسرے وقت محفل سماع کی گرمجوشی[۱]۔ کبھی عام جلسے ہوتے جن میں دس دس ہزار کا اجتماع ہوتا۔ سننے والے بے قرار ہو جاتے ہر شخص قربان اور فدا ہونے کا عہد کرتا۔ دوسرے تیسرے روز نماز عصر کے بعد قلعہ اکبرآباد کے میدان میں فن سپہ گری کی مشق کرائی جاتی خود شاہ صاحب بہترین نشانہ باز تھے تلوار کے ہاتھ بھی بہت نپے تلے ہوتے تھے۔

آپ کہیں تشریف لے جاتے تو مریدین کا ہجوم ساتھ ساتھ رہتا آگے آگے ڈنکا بجتا۔ اس لئے آپ کو ڈنکے والا پیر یا ڈنکا شاہ کہا جاتا۔

وہی آگرہ جس کی جامع مسجد کو جمعہ کے روز بمشکل بیس پچیس نمازی نصیب ہوتے تھے اب اس کی ایک ایک مسجد میں سیکڑوں کا ہجوم ہوتا تھا جو مسجدیں عرصہ سے ویران تھیں

---

[۱] مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی راوی ہیں کہ شاہ صاحب کے یہاں محفل سماع کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ مریدین پر توجہ ڈالی جاتی اور ہر طرف دہکتے ہوئے کوئلہ کے انگارے بھرے رہتے تھے وہ مجلس میں پھیلا دیئے جاتے تھے ان پر مریدین لوٹتے تھے آگ ان پر بالکل اثر نہ کرتی تھی۔ میری پھوپی محترمہ عمدۃ النساء زوجہ خواجہ غلام غوث خاں بہادر ذوالقدر بیجر الہ آبادی فرمایا کرتی تھیں کہ ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر الہام اللہ مرحوم پر شاہ صاحب کی خاص توجہ تھی اور وہ ان کے مرید تھے۔ یہ بھی شریک محفل سماع ہوتے اور دہکتے ہوئے کوئلوں پر مثل ماہی بے آب تڑپتے۔ مگر جسم پر نشان تک نہ پڑتا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۲۳)

اب اُن کی آبادی پر لوگ حیرت کرتے تھے۔ آگرہ شہر اس طرح مسخر ہو گیا تو آپ نے مضافات کا قصد کیا۔ جہاں آپ پہنچتے۔ مریدین کی جماعت ساتھ رہتی اور ایک ہی دورہ میں اس کا رنگ بدل جاتا۔ عوام کو یاد ہو یا نہ یاد ہو مگر انگریز کو حضرت سید احمد شہید کا دور یاد تھا۔ حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ کے اس دور میں یہی رنگ دیکھا تو تیس سال پہلے کی تمام تاریخ سامنے آگئی

حضرت شاہ صاحب سے تعلق رکھنے والوں پر مقدمہ

انگریز حکام نے حضرت شاہ صاحب پر ہاتھ نہیں ڈالا یا بقول مولوی سید طفیل احمد صاحب مرحوم پولیس نے اُن کو (مجسٹریٹ کے حکم پر) گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔[۱] البتہ وہ جماعت جو انگریزوں سے ملازمت کا تعلق رکھتی تھی اور اب حضرت شاہ صاحب سے وابستہ ہو گئی تھی اور انہیں کے ذریعہ حضرت شاہ صاحب آگرہ میں قیام کر کے اپنا اثر جما سکے تھے۔ اُس پر رشوت کا مقدمہ چلا دیا۔ مراد آباد کے جج "مسٹر ولسن" مقدمہ کی سماعت کے لئے مقرر کئے گئے حضرت شاہ صاحب اس وقت قصبات و مضافات کے دورہ پر باہر تشریف لے گئے تھے۔ آپ کو سفر ہی میں اس مقدمہ کا علم ہوا۔ تو آپ نے فرمایا۔ یہ امتحان کی پہلی منزل ہے۔ گھبرائیں نہیں۔ انشاء اللہ کامیاب ہوں گے کسی پر بھی کوئی آنچ نہیں آئے گی؟

بہرحال مقدمہ شروع ہوا۔ پولیس نے گواہ پیش کئے۔ مگر یہ بناوٹی گواہ بیکار ثابت ہوئے۔ خدا جانے پولیس نے کیا کہہ کر ان کو تیار کیا ہوگا۔ مگر جب وہ اجلاس میں یہ دیکھتے کہ جس کے برخلاف وہ گواہی دینا چاہتے ہیں وہ ایک باخدا عالم دین ہے تو گھبرا جاتے اور بقول مفتی انتظام اللہ شہابی۔

جھوٹی گواہی دینے کی جرأت نہ ہوتی

---

[۱] روشن مستقبل صفحہ (بار چہارم)

بہرحال جوں توں کر کے ابتدائی عدالت میں سخت سخت سزائیں تجویز کی گئیں۔ مولوی غلام جیلانی وکیل صدر مولوی غلام امام شہید پیشکار اور مفتی سراج الدین پیشکار کو چار چار سال کی قید بامشقت مفتی محمد قاسم صاحب دانا پوری مسل خواں کو تین سال مولوی بدرالحسن صاحب مسل خواں اور مولوی آل حسن مصنف کو دو دو سال۔

ایک اخبار "سعدالاخبار" نے اس خبر کو شائع[1] کرتے ہوئے لکھا۔

"دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مولانا محمد قاسم دانا پوری جن کا شمار اولیاء کرام میں ہے اور اُن کے ہزار ہا مرید صاحب ریاضت و مجاہدہ ہیں اُن کو رشوت سے متہم کیا جاتا ہے۔ تعجب ہے۔ دوسرے صاحب مولانا غلام امام شہید جو عاشق رسول کہلاتے ہیں اور اُن کے بھی ہزار ہا مرید آگرہ۔ حیدرآباد و مراد آباد میں ہیں اُن پر بھی رشوت کا الزام ہے۔"

بہرحال فوراً ہی اپیل دائر کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب حضرات بری کر دیئے گئے۔ بقول حضرت شاہ صاحب کسی کا بھی بال بیکا نہیں ہوا۔

خان بہادر مفتی انعام اللہ صاحب[2] وکیل صدر جن کے نام شاہ صاحب حضرت مولانا

---

[1] سعدالاخبار ص۱۴۸ جلد اوّل مورخہ ۱۷ رجمادی الاول ۱۲۶۶ھ مطابق مارچ ۱۸۵۰ء

[2] خان بہادر مفتی انعام اللہ ابن مفتی محمد اسحاق سہروردی ابن مفتی محمد ولی نبیرہ ملا وجیہ الدین (یکے از ترتیب دہندگان فتاویٰ عالمگیری) ۱۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے والد ماجد سے علوم عربی کی تحصیل کی۔ فراغت کے بعد لکھنؤ گئے۔ عرصہ تک نظامت کی تمنا میں رہے۔ ناکامی پر مرشدآباد گئے۔ پھر کلکتہ پہونچے۔ وہاں سر ایڈورڈ کول برک سے تعلق ہو گیا۔ ان کا لڑکا مسٹر شیر ان سے فارسی پڑھتا تھا۔ کول برک دلی کے ریزیڈنٹ مقرر ہوئے تو مفتی صاحب اس کے ہمراہ دلی آئے۔ اُس نے اپنے محکمہ کا سر رشتہ کر دیا۔ عرصہ تک وہاں رہے۔ محکمہ قضا میں بعہدہ وکالت (مفتی) مقرر ہوئے جس زمانہ میں صدر نظامت الہ آباد میں قائم ہوا محکمہ قضا شکست ہو گیا (باقی ۴۶۵ پر

مفتی صدر الدین صاحب آزردہ کا خط لائے تھے جو سب سے پہلے حضرت شاہ صاحب کے میزبان بنے تھے۔ یہ بھی معطل کیے گئے۔ الزام یہ تھا کہ مشتبہ خطوط اُن کے یہاں سے برآمد ہوئے ہیں[1]۔

آگرہ سے کانپور اور لکھنؤ

مولانا احمد اللہ شاہ صاحب آگرہ میں مقیم تھے کہ اودھ میں مولانا امیر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کا ہنگامہ پیش آگیا آپکو اس کی تفصیلات کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا "اب ہمارے کام کا وقت آگیا" چنانچہ آپ نے سفر کی تیاری شروع کردی۔ مریدین کا بھی ایک جم غفیر ساتھ ہولیا۔ اس طرح کہ ہر ایک مُرید نے توشہ ساتھ لے لیا تھا اور گھر بار کا معقول انتظام کر دیا تھا۔ ماؤں نے بیٹوں کو اجازت دی تھی اور بیویاں شوہروں کو رخصت کر رہی تھیں۔ ہر ایک کا دل لگن تھا مرشد ساتھ ہے کوئی خطرہ نہیں ہے[2]۔

شاہ صاحب آگرہ سے روانہ ہوکر پہلے کانپور پہنچے۔ یہاں عظیم اللہ خاں وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ پھر آپ اناؤ ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ گھاس منڈی میں قیام کیا۔ یہیں مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی سے ملاقات ہوئی۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی تحریر فرماتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آپ الہ آباد آئے۔ اور محکمہ صدر میں وکیل مقرر ہوئے۔ صدر آگرہ آیا تو آپ بھی اس کے ہمراہ آگرہ آگئے۔ سنہ ۱۲۶۹ھ عہدہ داران صدر پر رشوت کا مقدمہ چلایا گیا تو آپ کو بھی اس الزام میں معطل کردیا گیا کہ آپ کے یہاں سے کچھ خطوط برآمد ہوئے تھے۔ اپیل میں آپ بحال کردیئے گئے۔ لیکن آپ اس تعلق سے خاطر برداشتہ ہوچکے تھے۔ بحالی کے بعد آپ نے استعفےٰ دیدیا۔ پھر آپ نواب وزیر الدولہ کے پاس ٹونک چلے گئے۔ وہاں آپ کو بندوبست کا مہتمم بنادیا گیا وہیں سے آپ حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کو امداد پہونچاتے رہے۔ انقلاب سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد ۲۱ر ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۵ھ ۱۸۵۸ء کو آپ کا انتقال ہوا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۲۷ تا ۲۸)

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۲۷ [2] ایضاً ص ۳۳

"مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی جو خالص سرکاری آدمی تھے ان دنوں لکھنؤ میں صدر الصدور تھے کچھ دن گذرے تھے کہ مولوی عبد الرزاق صاحب فرنگی محلی کی تائید میں مولانا امیر علی شاہ صاحب کے خلاف فتویٰ صادر کر چکے تھے۔ وہ (مولانا خیر آبادی) شاہ صاحب سے ملنے آئے۔ شاہ صاحب

لہ مولانا رحمان علی صاحب مصنف تذکرہ علماء ہند نے آپ کا پورا نام۔ امیر الدین علی۔ لکھا ہے وطن عزیز امیٹھی تھا۔ یہی اجودھیا جہاں ۱۹۴۹ء سے بابری مسجد کا قضیہ چل رہا ہے۔ کہ ہندوؤں نے اس بنا پر کہ اس مسجد کے ایک حصہ کو وہ رام چندر جی کا رسوئی گھر کہتے ہیں اس پر قبضہ کرکے اس میں مورتی رکھ دی ہے مسلمان اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ مقدمہ چل رہا ہے۔ اسی اجودھیا میں ایک قطعہ کا نام ہنو مان گڑھی ہے جہاں عالمگیر کی بنائی ہوئی ایک قناتی مسجد تھی سو سال پیشتر ۱۸۵۵ء میں بھی یہاں یہی شورش ہوئی تھی۔ چنانچہ اس قناتی مسجد پر اور ساتھ ہی بابری مسجد پر ہندوؤں نے قبضہ کرلیا تھا واجد علی شاہ کا دور حکومت تھا وہ بذات خود کمزور ہو یا مضبوط۔ مگر اس کی حکومت کے ساتھ انگریزی ریزیڈنٹ نے غیر معمولی اقتدار اور جا بیجا مداخلت نے جو عملی کر رکھی تھی اس کا قدرتی اور لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نظام حکومت معطل اور معلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ اجودھیا اور اس کے قرب و جوار کے ہندوؤں نے بذات خود یا کسی کے ایماء سے اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور من مانی کارروائی کرلی۔ واجد علی شاہ کے عمال نے اس دست درازی کو ختم کرنا چاہا تو آس پاس کے زمیندار اور با اثر ہندو مقابلہ پر آگئے۔ واجد علی شاہ کے افسروں کے پاس صلح مصالحت کے سوا چارۂ کار نہ تھا لیکن مسلمان ایسی صلح پر راضی نہ تھے جس کے نتیجہ میں ان کو مسجد سے دست بردار ہونا پڑے۔ چنانچہ غلام حسین شاہ کی زیر قیادت مسلمانوں کی ایک جماعت خانہ خدا کو دوبارہ اذان و نماز سے آباد کرنے کے لئے وہاں پہونچی۔ ان کے رفقاء اور معاونین میں مولوی محمد صالح۔ حسن علی خاں بن احسان علی خاں رسالدار رستم علی خاں بہادر علی خاں۔ کسی قدر ذی حیثیت اور نمایاں تھے۔ باقی ساتھی وجاہت دنیاوی سے بے نیاز۔ شوق شہادت میں سرشار تھے۔ انگریز اور ہندوستانی افسر بھی پولیس اور فوج کی جمعیت کے ساتھ وہاں پہونچے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان سب کی موجودگی میں ان تمام مسلمانوں کو جو مسجد میں دو تین روز سے بھوکے پیاسے پڑے تھے ذبح کر دیا گیا۔ ان کی تعداد ۲۶۹ بتائی جاتی ہے (باقی ص ۴۶۷ پر)

ے ایسی گفتگو ہوئی کہ گھر جاتے ہی صدرالصدوری سے استعفیٰ دیدیا اور ....

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ : . (قیصر التواریخ جلد دوم ص۱۱۲ و تاریخ اودھ ج ۵ ص۲۰٦ - عذر یہ کیا گیا کہ حملہ آور ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی جس پر پولیس اور فوج کی موجودہ تعداد قابو نہیں پا سکتی تھی - یہ حادثہ ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ ۲۸ جولائی ۱۸۵۵ء کو پیش آیا - بتغ الحطٰ بکمالہ (۱۲۷۱) سے اس کی تاریخ نکالی گئی - بہر حال اس ہنگامہ سے پورے ہندوستان میں بے چینی پھیل گئی - واجد علی شاہ کی حکومت نے کچھ ہندوؤں سے معذرت کرا کر اور کچھ تحقیقات کا سلسلہ شروع کرا کر اس قصہ کو رفع دفع کرانا چاہا مگر دوسری طرف عام اضطراب جو دن بدن بڑھ رہا تھا بقول سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی مصنف قیصر التواریخ - جب فساد و ہنگامہ ہنود بڑھا اور بظاہر ثابت و تحقق ہوا کہ رعایت و پاسداری ہنود بطمع دنیا ارکین دولت کو منظور ہے - مولوی سید امیر علی بندگی میاں کے پوتے ساکن نقصبہ امیٹھی نسبتی بھائی شیخ حسین علی کارندہ راجہ نواب علی خاں رئیس محمود آباد - بہ سبب جوش حرارت اہل اسلام چاہا کہ دفع توہین اسلام کریں - چنانچہ پہلے سندیلہ میں اہل اسلام نے مولویوں کی تحریک سے بعد مشورہ اجماع کر جہاد پر باندھی (قیصر التواریخ ص۱۲۰) بہر حال یہ پس منظر تھا مولوی امیر علی شہید کے جہاد کا - مولانا امیر علی رحمۃ اللہ علیہ نے جب علم جہاد بلند کیا تو مولانا رحمان علی کے الفاظ میں - علماء سنی و شیعہ بہ پس و پیش افتادند کسے بعقدان شرائط فرضیت جہاد لب کشادہ - دیگرے - شرط امامت پیش نہادہ - علماء کی یہ پس و پیش اور واجد علی کی طفل تسلی اور لیت و لعل جاری رہی مگر جو موت کو زندگی پر ترجیح دے چکا تھا جس کو مولانا رحمان علی صاحب امیر المجاہدین فرماتے ہیں - وہ عزم بالجزم بسوئے مقصود کردہ روانہ شد - واجد علی شاہ اب بھی پس و پیش ہی میں تھے، ریزیڈنٹ نے کپتان بارلوگی کو حکم دیا وہ لشکر جرار اور توپخانہ لیکر پہونچا - شجاع گنج میں تمام مجاہدین کا محاصرہ کر کے توپ دم کر دیا - مجاہدین کی تعداد چھ سو تھی - سب ہی شہید ہو گئے مگر مقابلہ بھی ایسا کیا کہ توپوں کی زد میں ہونے کے باوجود اپنے سے دو چند (۱۲۰۰) کو مقتول و مجروح کر دیا - خاص معرکہ کے وقت کسی ارادتمند نے حضرت شاہ امیر علی رح سے عرض کیا - حالات اچھے نہیں کسی محفوظ مقام پر نکل چلئے - شہید کی زبان حق ترجمان نے فوراً جواب دیا - سر میدان کفن بردوش دارم - عجیب اتفاق شہادت کے بعد تاریخ کی جستجو ہوئی تو یہی مصرعہ موزوں ہوا - منشی ظہیر الدین خلف منشی مسعود بلگرامی نے اس کی تضمین کر کے یہ قطعہ بنا دیا -

بتاریخ شہیدان کفن پوش :: چہ حاجت تا سخن من بر نگارم :: کہ خود فرمود آں میر شہیداں ::
سر میداں کفن بر دوش دارم (تذکرہ علماء ہند ص۲۰)
۱۲۷۱ھ

اور چلے گئے اور انگریزوں کے جتنے خیر خواہ تھے اتنے ہی دشمن ہو گئے۔ ۵۲

لکھنؤ نے تقریباً چالیس سال پیشتر حضرت سید احمد شہیدؒ کا استقبال بھی بڑی شان سے کیا تھا۔ وہی روح وہاں بھی کار فرما تھی اور اہل لکھنؤ حضرت سید صاحب کے زمانہ کی بہ نسبت اب زیادہ زخم خوردہ ہو چکے تھے انتہا یہ کہ انکا بادشاہ واجد علی شاہ جسکو انگریز خواہ کچھ بھی کہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ والوں کی آنکھ کا تارا اور باشندگان اودھ کی آزادی کا آخری نشان تھا۔ وہ بھی انتہائی ذلت و خواری کے ساتھ اُن سے جُدا کر دیا گیا تھا یا جُدا کیا جانے والا تھا

بہرحال حضرت سید صاحب شہیدؒ کی طرح حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب بھی مقبول اور محبوب ہونے لگے اور باشندگان لکھنؤ کی والہانہ وابستگی آپ سے دن بدن بڑھنے لگی۔ مگر اس انتہائی نازک دور میں کہ بارک پور والی فوج برخواست کی گئی تھی جس کے سپاہی زیادہ تر اودھ کے رہنے والے تھے۔ ادھر واجد علی شاہ کو معزول کر کے گرفتار کر لیا گیا تھا یا گرفتار کرنے کا منصوبہ تیار کیا جا رہا تھا۔ حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب جیسے انقلابی امام کا لکھنؤ میں قیام کرنا خود شاہ صاحب کے لئے خطرناک تھا اور تحریک کے لئے بھی تشویشناک۔ اس لئے شاہ صاحب نے لکھنؤ کا قیام مختصر کر کے فیض آباد کا رُخ کیا۔ اب شاہ صاحب نے تمام تکلفات برطرف کر دیئے تھے اور بقول مولانا فتح محمد تائب لکھنوی

نصارا سے جو حکم پیکار تھا ہر ایک شخص سے اس کا اظہار تھا

ا۵ بیشک یہ حضرت شاہ صاحب کی گفتگو اور اُن کی قوت ارادی کا ماثرہ ہے کہ حضرت مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کی زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا۔ لیکن یہاں حضرت مولانا مفتی صدر الدین صاحب آزردہ کی فرزانگی اور دوراندیشی کی بھی داد دینی چاہیئے کیونکہ اگر زمام قیادت حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے کسی جانشین کے ہاتھ میں ہوتی اور مرکز دہلی ہوتا تو شاید مولانا خیر آبادی میں یہ انقلاب اب بھی برپا نہ ہوتا۔

۵۲ باغی علماء ص۳۵۔

اس عریانی کا نتیجہ ظاہر تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمال نے آپ کو گرفتار کرنا چاہا مگر عوام کے ہجوم اور اُن کی بے پناہ عقیدت کے باعث پولیس یہ جرأت نہ کر سکی تو فوج سامنے آئی حضرت شاہ صاحب اور آپ کے ساتھیوں نے مقابلہ شروع کر دیا۔ مگر چونکہ فوج کا یہ اقدام دفعتہً تھا۔ شاہ صاحب اور آپ کے ساتھی پہلے سے تیار نہ تھے اس لئے یہ مقابلہ بھی ناکام ہی رہا۔ حضرت شاہ صاحب کسی فوجی کی تلوار کی ضرب سے بے ہوش ہو کر گر پڑے آپ کو فوراً گرفتار کر کے جیل خانہ بھیج دیا گیا۔ آپ کے ساتھی بھی گرفتار کر لئے گئے۔

تحریک انقلاب ۱۸۵۷ء کا آغاز

یہ ۱۸۵۶ء کے اواخر یا ۱۸۵۷ء کے شروع کا واقعہ ہے۔ چند ماہ بعد ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کی طوفان انگیز تاریخ آئی جس نے پورے شمالی ہند کی زمین ہلا دی۔ حضرت شاہ صاحب اس وقت جیل میں تھے۔ فیض آباد میں عنان قیادت ایک اور صاحب نے سنبھالی۔ اُن کا اسم گرامی مولانا سکندر شاہ صاحب فیض آبادی تھا۔ آپ نے جیل خانہ پر دھاوا بول کر حضرت شاہ صاحب کو تو چھڑا لیا لیکن خود انگریزی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ مگر مولانا احمد اللہ شاہ صاحب نے جھنڈے کو گرنے نہیں دیا اپنی رہائی کے بعد پورے ہندوستان کی رہائی کے لئے پرچم لہرایا۔ اور جو فدایان وطن جمع ہوئے تھے اُن کو ساتھ لیکر لکھنؤ کا رُخ کیا[1]۔

بقول مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی (مرحوم)

۱۔ لکھنؤ میں مولانا احمد سعید سبط شاہ غلام علی نے علم محمدی اٹھا رکھا تھا اور عوام میں عام بے چینی پیدا ہو گئی تھی مگر کرتا دھرتا کوئی نہیں تھا۔ حضرت احمد اللہ شاہ کے پہنچتے ہی ہر ایک ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ تمام منتشر مجاہدین آپ کے پاس آ جمع ہوئے۔ سر ہنری لارنس چیف کمشنر لکھنؤ نے حتی الوسع بغاوت کو فرو کرنا چاہا مگر سعی بے نتیجہ رہی (باغی علماء ص ۳۵)

> جس طرح میرٹھ وغیرہ کے باغی سمٹ کر دہلی میں جمع ہوئے تھے اور ظفر کو ہندوستان کا شہنشاہ بنایا تھا ویسے ہی الہ آباد اور فیض آباد کے باغی بھی ۱۸۵۷ء میں جوش وخروش کے ساتھ لکھنؤ پہنچے۔ اُن کے آتے ہی یہاں کے بہت سے بے فکرے اُٹھ کھڑے ہوئے اور برجیس قدر کی بادشاہی قائم کردی۔ تھوڑی سی انگریزی فوج اور یہاں کے تمام یورپین عہدہ داران مملکت جو باغیوں کے ہاتھ سے جاں بر ہوسکے "بیلی گارڈ" میں قلعہ بند ہوگئے (گذشتہ لکھنؤ)

بہرحال مولانا شرر کے الفاظ استعمال کیجیے۔ یا ان کو انقلاب پسند محبان وطن کہیے۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ برجیس قدر جن کی عمر صرف دس سال تھی۔ بادشاہ بنائے گئے[۱] ۔ اُن کی والدہ حضرت محل جو ایک بہادر خاتون تھیں اُن کی ولی اور قانونی سرپرست مقرر ہوئیں ۔ ناصر الدولہ علی محمد خاں عرف ممو خاں وزیر اعظم یا مدار المہام مقرر ہوئے لیکن اس قیامت خیز دور میں جس کے بل بوتے پر یہ سب کچھ ہوا وہ مولانا احمد اللہ شاہ صاحب تھے جن پر ستی اکثریت پورا اعتماد کرتی تھی۔

مقابلہ۔ ناکامی اور وجوہات ناکامی

بیشک حکومت کا نقشہ قائم ہوگیا۔ عام ہندو مسلمانوں نے دلوں کی گہرائیوں سے وفاداری کا عہد بھی اس حکومت سے کرلیا مگر جو مرض دہلی میں تھے وہی بیماریاں لکھنؤ کی فضا میں بھی

---

[۱] ۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو رسالدار سید برکات احمد اور راجہ لال سنگھ اور شہاب الدین وغیرہ نے شہزادہ مرزا برجیس قدر خلف واجد علی شاہ کو اودھ کا بادشاہ بنا کر تخت پر بٹھا دیا۔ مسند نشینی کے وقت جہانگیر بخش صوبہ دار توپ خانہ فیض آباد نے ۲۱ ضرب توپ کی سلامی دی۔ شرف الدولہ محمد ابراہیم علی خاں کو خلعت وزارت عطا ہوا۔ جرنیلی کا خلعت حسام الدولہ کو ملا۔ مگر کل وجزو کے اختیارات ناصر الدولہ علی محمد خاں عرف ممو خاں کے ہاتھ میں تھے۔ (باغی علماء ص۳۵)

موجود تھیں ۔ بلکہ اُن سے کسی قدر زیادہ
یہاں شیعہ سُنی کا مسئلہ بھی موجود تھا ۔ اربابِ اقتدار کی جنگی نااہلیت بھی اپنا رنگ جمائے ہوئے تھی اور مرزا مغل کی طرح ممو خاں کی ریشہ دوانیاں بھی احمد اللہ شاہ جیسے بہادر اور دیانتدار جرنیل کے راستہ میں ہر قدم پر رکاوٹ کے لئے موجود تھیں ۔ نتیجہ ظاہر تھا یعنی بہادرانہ معرکوں کے باوجود ناکامی جس کی تفصیل کے لئے مستقل جلد کی ضرورت ہے ۔
مولانا احمد اللہ شاہ صاحب لکھنؤ سے ہٹ کر شاہجہان پور پہنچے ۔ شاہزادہ فیروز ۔ جنرل بخت خاں ۔ تجمل حسین خاں رئیس فرخ آباد ۔ جنرل اسمٰعیل خاں (فتح گڈھ) نانا راؤ پیشوا ۔ غرض تمام ہی سرغنہ جنھوں نے بار بار شکست اٹھانے کے بعد بھی ہمت نہیں ہاری تھی اور جو پورے عزم کے ساتھ طے کر چکے تھے

یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

یہ سب یہاں جمع ہو گئے ۔ شاہجہان پور میں جو معرکے ہوئے اُن کا مختصر تذکرہ واقعات شاہ جہان پور کے سلسلہ میں پہلے گذر چکا ہے ۔ اور جب یہاں بھی ناکامی ہوئی تو شاہ صاحب اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ قصبہ محمدی پہنچے اور یہاں از سر نو تنظیم کی ایک عارضی حکومت بھی قائم کر لی جس کی کابینہ کے ارکان یہ تھے ۔

جنرل بخت خاں وزیر جنگ ۔
مولانا سرفراز علی صاحب ۔ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس)
نانا راؤ پیشوا دیوان (وزیر مال)
مولانا لیاقت علی صاحب الہ آبادی ۔ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اکبر آبادی ۔
مولانا فیض اللہ صاحب بدایونی ۔ شاہزادہ فیروز شاہ ۔ (ارکان حکومت)

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامی دین محمد احمد اللہ بادشاہ

پھر کیا ہوا۔ تاریخ شاہجہان پور اور صحیفہ زریں کے حوالے سے مفتی انتظام اللہ شہابی تحریر فرماتے ہیں۔

"ابھی شاہ صاحب پوری طرح جمنے نہ پائے تھے کہ سر کالن کیمبل نے قصبہ محمدی پر حملہ کر دیا۔ خوب خوب مقابلہ رہا۔ شاہ صاحب کے ہٹتے ہی محمود خاں معہ

---

۱۵۱ ممو خاں، اصل نام علی محمد خاں۔ ناظر دیوان خاص۔ برجیس قدر کو مسند حکومت تک پہنچانے میں ان کی کوشش کو خاص دخل تھا۔ حضرت محل کے خاص معتمد تھے۔ مگر اس عارضی شوکت و اقتدار کے دور میں بھی زیادہ ستانی اور خویش پروری کی شکایت رفع نہیں ہوئی بلکہ زیادہ ہوگئی۔ جس کی بنا پر حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کو بار بار مداخلت کرنی پڑی جس کی وجہ سے ممو خاں حضرت شاہ صاحب سے بھی برگشتہ ہوگیا تھا۔ حضرت محل کے ساتھ لکھنؤ سے نکلا اور جب حضرت محل اور برجیس قدر نیپال روانہ ہوئے تو یہ بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ دونوں ماں بیٹوں کو نیپال کے افسروں نے اپنے یہاں رہنے کی اجازت دی۔ اُن کے لئے بطور مدد معاش ایک ہزار روپیہ ماہانہ جاری کر دیا۔ مگر ممو خاں کی آشفتہ مزاجی اور تند خوئی اس نازک موقع پر بھی ختم نہ ہوئی اُس نے نیپالی افسروں سے ایسا انداز اختیار کیا کہ انھوں نے ممو خاں کو اجازت نہیں دی۔ وہ دوسرے سپاہیوں کی طرح یہ بھی انگریزوں کی گرفت میں آگیا۔ گرفتار ہوا۔ مقدمہ چلا۔ ممو خاں نے انگریزوں کی وفاداری کے ثبوت میں بہت سی چٹھیاں بھی جو بالواسطہ یا بلا واسطہ لکھی تھیں پیش کیں۔ بڑے شد و مد سے دعویٰ کیا کہ میر واجد علی جس کو کمپنی نے دس لاکھ روپیہ عطا کیا ہے میرا نائب تھا۔ اُس نے جو کچھ انگریزوں کی وفاداری میں کام دوائیا کیں وہ سب میرے مشورے سے کیں۔ بہرحال ان تمام صفائیوں کا نتیجہ اتنا ہی برآمد ہوا کہ پھانسی کی سزا منسوخ ہوئی، چند سال کی قید تجویز کی گئی۔ مگر آپ نے فرار ہونے کی کوشش کی کوشش ناکام رہی دوبارہ گرفتار ہوئے اور انڈمان بھیج دیئے گئے۔ تقریباً پانچ سال جزیرہ انڈمان میں گذارے۔ پھر مرادک بھیج دیئے گئے۔ وہیں انتقال ہوا۔ قیصر التواریخ جلد دوم ص۲۶۶ و ص۳۶۹۔ تواریخ عجیب ص۲۴۲ و ۲۴۳

حضرت محل اور نانا راؤ۔ عظیم اللہ خاں اور بخت وغیرہ نیپال کی طرف چلتے ہوئے۔

لیکن شاہ صاحب نے پوائیں کا رخ کیا جو بندیل کھنڈ اور اودھ کی سرحد پر شاہجہان پور سے شمال مشرق تقریباً ۱۰ میل ہے۔ راجہ پوائیں اگر تعاون کے لئے آمادہ ہوجاتا تو شاہ صاحب کو پھر سانس لینے کا موقع مل سکتا تھا۔ مگر اس نے غداری کی۔ اول وہ آپ سے گفتگو کے لئے آمادہ ہوا اور جب شاہ صاحب گفتگو کے لئے پہونچے تو راجہ نے اپنی گڈھی کا پھاٹک بند کرلیا اور اوپر سے گولیوں کی بوچھار کر کے شاہ صاحب کو شہید کر دیا اب مفتی انتظام اللہ صاحب کا بیان ہے کہ :-

راجہ بلدیو سنگھ نے سر مبارک جسم اطہر سے اتارا اور صاحب کلکٹر بہادر شاہجہانپور کے سامنے پیش کر دیا۔ جو عرصہ تک کوتوالی پر لٹکا رہا۔ نعش کو آگ میں پھونک دیا۔ اس پر سرکار برطانیہ نے پچاس ہزار روپیہ نقد اور خلعت فاخرہ راجہ پوائیں کو عطا کیا۔ یہ واقعہ شہادت ۵ رجون ۱۸۵۸ء مطابق ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ کو پیش آیا۔ دریا پار محلہ جہان آباد متصل احمد پور مسجد کے پہلو میں سر دفن کر دیا گیا۔ مولوی سید طفیل احمد صاحب علیگ مصنف روشن مستقبل و حکومت خود اختیاری نے کتبۂ تاریخ نصب کرادیا ہے[1]

شاہ صاحب کے متعلق جو لکھا گیا اس کی تصدیق کے لئے چند انگریز مورخین کے بیانات ملاحظہ فرمائیے :- چارلس نال لکھتا ہے -

"ایک لمبا۔ لاغر۔ مگر مضبوط آدمی۔ دبلے جبڑے۔ پتلے پتلے ہونٹ، اونچا

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص۹۴

یا نسہ ۔ بڑی بڑی آنکھیں ۔ تیغ نما ابرو ۔ لمبی داڑھی ۔ سخت کالے
بالوں کی زلفیں، دونوں کانوں پر پڑی رہتی تھیں ۔

چارلس نال حلیہ بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے :۔

اودھ کے باغیوں کی تجاویز اور سازش کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس مولوی کو انگریزی حکام بحیثیت احمد شاہ فقیر اور صوفی عرصے سے جانتے تھے ۔ شمال مغربی صوبجات میں ظاہرا مذہبی تبلیغ کی خاطر دورہ کر چکے تھے لیکن فرنگیوں کے لئے یہ راز ہی رہا ۔

اپنے سفر کے دوران وہ ایک عرصے تک آگرہ میں مقیم رہے ۔ حیرت انگیز اثر شہر کے مسلم باشندوں پر تھا ۔ شہر کے مجسٹریٹ ان کی جملہ نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے ۔ عرصہ بعد یقین ہو گیا کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف ایک سازش کر رہے ہیں لیکن پھر بھی اُن کو کسی باغیانہ جرم میں ملوث نہ پایا گیا وہ آزاد رہے ۔ آخر کار جب بغاوت رونما ہوئی اور فیض آباد کے فوجیوں میں بھی یہ لوگ پہنچے تو یہ مولوی جو سابقاً غیر منظم طریقے پر اپنے مریدوں کو اُبھار رہا تھا ۔ گارد کی نگرانی میں تھا ۔ ہنگامہ کرنے والوں نے ان کو چھڑا کر اپنا سردار بنا لیا ۔ اس طرح مولوی صاحب ایک طاقتور فوج کے سپہ سالار بن گئے ۔ گرچہ کچھ عرصہ تک دوسرے باغی سرداروں کی طاقت چھپی رہی لیکن اس شخص کا اثر باغیوں پر بھرپور تھا ۔ کیونکہ یہ قابل آدمی اور ظلم کے دھبے سے پاک تھا جو ناناصاحب کے انتقامی جوش کی خصوصیت تھی ۔ اس سے یہ بالکل پاک و صاف تھا ۔ اس لئے برطانیہ بھی ایک حد تک ان کو اچھا

اور قابلِ نفرت نہیں سمجھتی تھی [۱]
جنرل ٹامسن جو ایک بہادر انگریز تھا۔ اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں شریک تھا۔ شاہ صاحب کی بابت لکھتا ہے:۔

مولوی احمد اللہ شاہ بڑی لیاقت و قابلیت رکھتا تھا وہ ایسا شجاع تھا کہ خوف اُس کے نزدیک نہیں آتا تھا۔ یہ عزم کا پکّا۔ ارادہ کا مستقل تھا باغیوں میں اس سے بہتر کوئی سپاہی نہیں تھا۔ یہ فخر اسی کو حاصل ہے کہ اس نے دو مرتبہ "سر کالن کیمبل" کو میدان جنگ میں ناکام رکھا۔ وہ بہ نسبت اور باغیوں کے خطاب شاہ کا زیادہ مستحق تھا۔ اگر محب وطن ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے جو غلطی سے برپا ہوگئی ہو سازشیں کی جائیں اور لڑائیاں لڑی جائیں تو مولوی یقیناً اپنے ملک کا محب صادق تھا اُس نے کبھی تلوار کو مخفی اور سازشی قتل سے خون آلود نہیں کیا۔ وہ بہادرانہ اور معرزانہ طور پران سے معرکہ آرا ہوا جنھوں نے اُس کا ملک چھین لیا تھا۔ دنیا کی ساری قومیں اس کو تعظیم و ادب کے ساتھ جو شجاعت و صداقت کے لئے لازمی تھیں اور جن کا مولوی مستحق تھا۔ اس کو یاد کریں گی۔ [۲]

فارسٹر کا ایک اور نذرانہ عقیدت ملاحظہ فرمایئے۔

جن کو فیض آبادی مولوی کہا جاتا ہے اُن کے متعلق یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ عالم باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا۔ روحانی طاقت کی وجہ سے

۱؎ انڈین میوٹنی۔ از جی۔ ڈبلیو فارسٹر۔ اسکول ص۲۲ (باغی علماء ص۱۴۳)
۲؎ تاریخ شاہ جہان پور۔ بحوالہ باغی علماء ص۱۴۹ و ص۱۵۰۔

صوفی اور جنگی مہارت کی وجہ سے سپاہی اور سپہ سالار تھا۔ اس کی طبیعت ظلم سے پاک تھی۔ ہر انگریز اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ [۱]

رفقار مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی نے چند اسمار گرامی اسی عنوان کے تحت نقل کئے ہیں۔ ان فداکاران حریت کے نام ہم بھی زیب صحیفہ کرتے ہیں۔

امیر احمد۔ شاہ آفاق۔ قطب شہید۔ رستم علی۔ اسمٰعیل خاں۔ غلام محمد خاں کفایت اللہ نہری۔ فرقان علی۔ محمد شاہ خاں شہید۔ سعد اللہ خاں شہید نور احمد۔ احمد یار خاں تحصیلدار۔ نواب غلام قادر خاں (بٹول) عبدالرؤف خاں۔

اکثر انڈمان بھیجے گئے۔ کچھ کو دار نصیب ہوئی۔ کچھ گوشہ گیر ہوئے

نہ شیشہ۔ نہ مے۔ نہ ساقی رہا
فقط شکوہ بخت باقی رہا

---

[۱] ہسٹری دی انڈین نیوٹی۔

مولانا مفتی عنایت احمد صاحب[1] کاکوروی

خاندان مفتی عنایت احمد بن منشی محمد بخش بن منشی غلام محمد بن منشی لطف اللہ - قریشی النسل تھے ان کے اجداد میں امیر حسام نامی ایک شخص بغداد سے آکر قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں سکونت پذیر ہوئے اور اپنے صاحبزادے ضیاء الدین کی شادی نہیں کی وہیں کے قاضی مقرر ہوئے۔ قصبہ دیوہ میں جس محلہ میں امیر حسام نے قیام کیا وہ حجازی محلہ مشہور ہوا۔ جس کو بعد میں حجاجی کہا جانے لگا۔ اسی مناسبت سے امیر حسام کی اولاد بھی حجاجی کہلائی۔ باقی یہ خیال غلط ہے کہ امیر حسام حجاج بن یوسف ثقفی حاکم عراق کی اولاد سے ہیں۔ حجاج قریشی نہیں تھا ثقفی تھا۔

سکونت کاکوری مفتی عنایت احمد صاحب کے نانا منشی غلام محمد کی سسرال کاکوری میں تھی مفتی صاحب کے والد منشی محمد بخش اور چچا شیخ عبد الحبیب نے اسی نانہالی تعلق کی بنا پر کاکوری میں سکونت اختیار کر لی۔ پھر اُن کے تمام قریبی اعزا بھی کاکوری آکر سکونت پذیر ہو گئے اور کاکوروی کہلانے لگے۔ اب بھی وہاں ان کا بڑا خاندان سکونت پذیر ہے۔

پیدائش مفتی عنایت احمد صاحب ۹ شوال ۱۲۲۸ھ کو بمقام دیوہ پیدا ہوئے۔

---

[1] یہ پورا مضمون جناب محمد ایوب صاحب کی کاوش علمی اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں قطع برید مناسب نہیں معلوم ہوئی سند شناسی کا بھی یہی تقاضا تھا کہ یہ پوری دستاویز جوں کی توں رکھی جائے۔

تحصیل علم ابتدائی تعلیم کاکوری میں حاصل کی جب ۱۴ سال کی عمر ہوگئی تو تحصیل علم کی غرض سے رام پور گئے۔ وہاں مولوی سید محمد صاحب بریلوی سے صرف و نحو مولوی حیدر علی صاحب ٹونکی اور مولوی نور الاسلام صاحب سے دوسری درسی کتابیں پڑھیں۔ رام پور میں درسی کتابیں ختم کر کے دہلی پہونچے وہاں شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ) سے کتب حدیث سبقاً سبقاً پڑھیں اور سند حاصل کی۔ دہلی سے علی گڈھ آئے جہاں مولانا بزرگ علی مارہروی (شاگرد شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی و شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی رح) جامع مسجد کے مدرسہ میں دینی خدمات انجام دے رہے تھے۔ یہ مدرسہ عہد محمد شاہی میں بانی مسجد نواب ثابت خاں نے قائم کیا تھا۔ علی گڈھ میں مفتی عنایت احمد صاحب نے تمام منقولی اور معقولی کتابیں مولانا بزرگ علی سے پڑھیں اور فارغ التحصیل ہوئے۔ بعد فراغ اسی مدرسہ میں مدرس مقرر ہوگئے۔ کیونکہ ۱۲۶۲ھ میں مولانا بزرگ علی صاحب کا انتقال ہوگیا تھا۔

ملازمت ایک سال تک مدرسہ میں مدرس رہے اس کے بعد مفتی و منصف کے عہدہ پر علی گڈھ میں ہی تقرر ہوگیا۔ اسی زمانہ میں مولوی لطف اللہ صاحب علی گڈھی (المتوفی ۱۳۳۴ھ) کے تلمذ کا سلسلہ شروع ہوا جو کہ مفتی صاحب کے نامور شاگرد گذرے ہیں۔ مولوی سید حسین شاہ صاحب بخاری نے بھی اسی زمانہ میں پڑھا ہے۔

اجلاس میں سبق مولوی سید حسین شاہ بخاری فرمایا کرتے تھے کہ مفتی صاحب مجھ کو ہدایہ اجلاس میں پڑھایا کرتے۔ جیسے ہی کسی مقدمہ سے فرصت ہوتی اشارہ ہوتا میں پڑھنا شروع کر دیتا پھر کوئی سرکاری کام آجاتا تو اس میں مصروف ہو جاتے۔ اس دوگونہ مشغولیت کے باوجود مسائل اس طرح ذہن نشین کرا دیئے کہ کبھی فراموش نہ ہوئے۔ آپ طلبا سے خاص تعلق رکھتے تھے مولوی لطف اللہ صاحب کی تعلیم کے زمانہ میں ہی مفتی صاحب کا تبادلہ علی گڈھ سے

بریلی ہو گیا تھا مولوی لطف اللہ صاحب بریلی ساتھ گئے وہاں جملہ کتب درسیہ ختم کیں۔ صبح کی نماز کے بعد مفتی عنایت احمد صاحب تلاوت فرماتے تھے مولوی لطف اللہ صاحب خدمت میں حاضر رہتے دوران تلاوت میں اگر کوئی مشکل صیغہ آتا تو مفتی صاحب ان کی طرف دیکھتے یہ حل کرتے حل نہ کر سکتے تو بعد تلاوت خود حل کر کے بتلاتے، مفتی عنایت صاحب نے بعد فراغ مولوی لطف اللہ صاحب کو اپنے ہی اجلاس کا سررشتہ دار مقرر کر لیا۔

قیام بریلی

بریلی کے قیام میں مفتی عنایت احمد صاحب صدر امین ہوئے۔ درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ بریلی کے تلامذہ میں قاضی عبد الجمیل صاحب قاضی شہر، مولوی فدا حسین منصف اور نواب عبد العزیز خاں مشہور لوگ گذرے۔ آخر الذکر حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں کے پوتے تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا اسی زمانہ میں بریلی میں مفتی عنایت احمد صاحب کے ہم وطن مولوی رضی الدین ابن علیم الدین (المتوفی ۱۲۷۴ھ) صدر الصدور تھے۔ ۱۲۷۳ھ میں آگرہ کے صدر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ابھی بریلی سے روانگی عمل میں نہیں آئی تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ شروع ہوئی مفتی صاحب آگرہ نہ جا سکے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء

نواب خان بہادر خاں نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے روہیلکھنڈ میں عَلَمِ جہاد بلند کیا تو مفتی عنایت احمد صاحب بھی اس میں شریک ہوئے بریلی اور رام پور آپ کی سرگرمیوں کے آماجگاہ رہے جب تحریک آزادی ناکام ہوئی اور انگریزوں کا ملک پر دوبارہ تسلط ہو گیا تو مفتی عنایت احمد صاحب گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور عبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی۔

قیام انڈمان

مفتی عنایت احمد صاحب نے جزیرہ انڈمان میں بھی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا۔ جزیرہ انڈمان میں اُن کے پاس کسی علم کی

کوئی کتاب نہ تھی محض اپنی قوتِ حافظہ پر مختلف فنون میں رسالے تصنیف کردیئے اور وطن واپس آکر کتابیں دیکھیں تو تمام مسائل حرف بحرف صحیح تھے۔

ایک انگریز کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کیا جو دو برس میں ختم ہوا اور وہی رہائی کا سبب بنا۔ ۱۲۷۷ھ میں رہائی پاکر کاکوری آئے مولوی لطف اللہ صاحب علی گڈھی نے تاریخ رہائی لکھی اور خود کاکوری حاضر ہوکر پیش کی۔

چوں بہ فضلِ خالقِ ارض و سما — اوستادم شد ز قید غم رہا
بہر تاریخ خلاص آں جناب — بر نوشتم ان استاذی نجا

۱۲۷۷ھ

قیام کان پور

انڈمان سے واپس آکر مفتی صاحب نے مستقل قیام کان پور میں رکھا مدرسہ فیض عام قائم کیا جو کان پور کی مشہور دینی درسگاہ ہے کانپور کے مسلمان تاجر مدرسہ کے مصارف برداشت کرتے تھے ان میں حافظ برخوردار خاص طور سے مشہور تھے۔ مفتی صاحب اپنے مصارف کے لئے صرف پچیس تیس روپیہ ماہانہ تنخواہ لیتے تھے بقول مولانا نواب حبیب الرحمن خاں شروانی اسی مدرسہ کا فیض بالآخر ندوۃ العلماء کی شکل میں ظاہر ہوا۔

سفر حج

نو سال کے بعد حج کا ارادہ کیا۔ مدرسہ فیض عام کان پور میں مولوی سید حسین شاہ صاحب بخاری کو مدرس اوّل اور مولوی لطف اللہ صاحب کو مدرس ثانی مقرر کرکے حج کو روانہ ہوگئے مفتی صاحب ہی امیر الحجاج تھے اس زمانہ میں جہاز ہوا کی مدد سے چلتے تھے۔

شہادت

جدہ کے قریب جہاز پہاڑ سے ٹکراکر ڈوب گیا مفتی صاحب بحالت نماز احرام باندھے ہوئے غرق و شہید ہوئے یہ واقعہ ۹ شوال ۱۲۷۹ھ کا ہے۔

ریزیڈنٹ دہلی کے یہاں جب تک سر رشتہ دار رہے۔ عزت کے ساتھ رہے اور جب آبگینہ عزت میں بال آنے لگا تو نہ صرف ملازمت ترک کی بلکہ دہلی کی بود و باش بھی ترک کر دی علامہ کی قابلیت مشہور تھی۔ قدر دانوں سے دنیا خالی نہیں تھی نواب فیض محمد خاں والیٔ جھجر نے موقع غنیمت جانا اور فوراً مبلغ پانچسو روپیہ ماہانہ کی پیشکش کر دی۔ علامہ نے اس کو منظور کیا اور جھجر تشریف لے گئے۔ ایک عرصہ تک جھجر رہے۔ پھر مہاراجہ الور نے بلا لیا۔ الور سے آپ سہارنپور گئے بعد ازاں آٹھ برس رام پور میں رہے۔ پھر لکھنؤ میں پہلے صدر الصدور بنائے گئے۔ جب ایک نئی کچہری "حضور تحصیل" کے نام سے بنی تو اس کے مہتمم قرار پائے۔

ہنومان گڈھی کا فساد اور مولانا امیر علی کی شہادت

مولانا لکھنؤ میں قیام فرما تھے کہ ہنومان گڈھی کے فساد، شاہ غلام حسین صاحب اور اُن کے ۲۶۹ رفقاء کی شہادت پھر مولانا امیر علی صاحب کی دعوت جہاد اور چھ سو مجاہدین کے ساتھ توپ دم کئے جانے کا خون چکان و دل فگار حادثہ پیش آیا۔ مولانا اس عرصہ میں حکومت کے ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور بقول مولانا عبدالشاہد خاں صاحب شروانی مصنف "باغی ہندوستان"

"جب مولانا امیر علی شاہ صاحب کو سمجھانے کے لئے علماء او رامراء کو بھیجا گیا تو علامہ نے بھی عہدہ کی ذمہ داری اور بسہولت مطلب برآری کی بناء پر گفتگو میں حصہ لیا۔" [۱]

---

[۱] باغی ہندوستان ۱۵۳ حکیم نجم الغنی صاحب مصنف تاریخ اودھ اور مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی مصنف ایسٹ انڈیا کمپنی و باغی علماء نے بھی یہ ذکر کیا ہے کہ مولانا امیر علی شاہ صاحب کے خلاف جو فتویٰ مرتب کیا گیا تھا اس میں مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی نے بھی دستخط کئے تھے لیکن اسی واقعہ کے متعلق سوال اور شیعہ سنی علماء کے فتاوی قیصر التواریخ جلد دوم میں موجود ہیں اور حکیم صاحب نے بھی اپنی تاریخ میں نقل کئے ہیں ان میں مولانا خیر آبادی کا نام نہ بحیثیت مجیب ہے نہ تائید و تصویب کرنے والوں میں آپ کا نام ہے۔

یہ گفتگو ناکام ہوئی۔ مولانا امیر علی شاہ نے اپنے عزم میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ بالآخر اپنے رفقاء کے ساتھ بڑے مزے سے جام شہادت نوش کیا لیکن تعجب نہ کرنا چاہیئے اگر اس عجیب وغریب حادثہ سے مولانا جیسے ذکی اور ذہین وفہیم نے یہ اثر لیا کہ آپ انگریزوں کی ڈپلومیسی سے متنفر ہو کر انقلاب کی تمنا کرنے لگے کیونکہ اگر بالفرض یہ صحیح نہ ہو کہ اس پورے ہنگامۂ قتل وخون اور شعبدۂ جور وجفا کے آلات و ذرائع کو پس پردہ حرکت دینے والا انگریز تھا تو اس بات کے تسلیم کرنے میں تو تامل نہ ہونا چاہیئے کہ ان واقعات اور حوادث سے انگریز نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

پس منظر تقریباً پوری ایک صدی ہو چکی تھی جب سے انگریزوں کی خفیہ تدبیریں شاہان اودھ کو کمزور سے کمزور تر کرنے میں مصروف تھیں اور اب ایک آخری فیصلہ کی تیاری ہو رہی تھی کہ واجد علی شاہ کو معزول اور پورے اودھ پر بلا شرکت غیرے مکمل قبضہ کر لیا جائے۔ باشندگان اودھ کے لئے اس جرعۂ تلخ کو خوشگوار اسی صورت سے بنایا جا سکتا تھا کہ ہندو اور مسلمان تمام ہی باشندے واجد علی شاہ اور اس کی حکومت سے متنفر اور برافروختہ ہو جائیں اس موقعہ پر انگریز کا یہ مقصد بہت آسانی سے پورا ہو رہا تھا۔ کیونکہ پردۂ سیمیں پر واجد علی شاہ کی مورت تھی۔ چنانچہ ہندو اور مسلمانوں نے اسی کو ملعون اور مردود قرار دیا۔ مگر بات کی تہ کو پہونچنے والے تو اس وقت بھی اس تماشہ کو حیرت سے دیکھ کر اس کے مضمرات کا مطالعہ کر رہے ہوں گے کہ

> ہنومان گڑھی کے حادثہ کے وقت انگریز افسر موجود تھے مگر ایسے بے بس و لاچار یا ایسے بھولے کہ بیراگیوں نے مسجد میں گھس کر ۷۶ مسلمانوں کو ذبح کر ڈالا اور ان بے چاروں کو خبر بھی نہ ہوئی۔ یہ ایک درخت کے نیچے کھڑے ہوئے باتیں ہی کرتے رہے۔

قیصر التواریخ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے اپنے ایک خاص دوست کے چشم دید بیان پر (جو اس وقت وہاں موجود تھا) لکھے ہیں ۔

اس عرصہ میں بارانِ رحمت نازل ہوئی ۔ ایک ساعت تک جدال و قتال موقوف رہی ۔ اسی وقت ایک کبڑا یا ہمراہی ۔ غلام حسین کے واسطے جو دو دن سے بے آب و دانہ تھے کھانا لایا ۔ کپتان آر صاحب اور جان ہرسی نے اپنے سپاہیوں کو بھیجکر کہلا بھیجا کہ تم کمریں کھول کر بہت اطمینان سے جامع مسجد میں بیٹھو ۔ باہر نہ نکلو ۔ کوئی تم سے فساد نہ کر سکے گا ۔ وہ کمریں کھول کر کھانا کھانے لگے ۔ اب زبانی مرزا علی اعلیٰ[۱] کے ہے (جو مولف کتاب سے وقت روانگی کربلا کہ اس شب خاص کربلا میں میرے پاس رہے تھے) بیان کرتے تھے کہ یہ دونوں انگریز اور میں خود اور مرزا نثار حسین مع اپنی سپاہ اور توپ وہاں سے ہٹ کر بڑی دور درخت کھرنی کے نیچے جا کھڑے ہوئے ۔[۲] ایک ساعت نہ گزری تھی کہ بیراگی ہزاروں گولے لئے نعرہ مارتے آکر مسجد کو گھیر اور رجب علی شاہ فقیر کے کوٹھے سے چڑھکر غلام حسین کے ہمراہیوں پر گولیاں برسانا شروع کردیا اور مسجد میں آکر ۲۶۹ آدمیوں کو ذبح کیا اور ٹکڑے ٹکڑے کردیا[۳] ۔ الخ

۱؎ مرزا علی اعلیٰ منصرم مجہم راٹ (ص۱۱۱ قیصر التواریخ) اسی طرح مرزا نثار حسین بھی پولیس کے کوئی افسر ہیں مگر فوج انگریز افسران کے ماتحت ہے اور اصولاً نظم و نسق کے جملہ اختیارات فوج کے انہیں انگریز افسران کو حاصل ہیں اپنے فعل کو دوسرے کے سر تھوپنے کے لئے ان مسلمان افسران کو ساتھ رکھ رکھا ہے جیسا کہ مولانا امیر علی شاہ کے حادثہ کے وقت بھی ۔ کپتان بارلو کے ساتھ حاجی مرزا حسین علی کمیدان بٹالن گلابی ۔ کپتان بارلو کے ساتھ شریک حملہ تھے اور مولانا امیر علی شاہ کو عین نماز ظہر کے وقت توپ دم کر رہے تھے (ص۱۲۲ قیصر التواریخ)

۲؎ کیوں؟ کیا وجہ تھی ۔ ان کو کیا خوف تھا ۳؎ قیصر التواریخ ص۱۱۱ و ص۱۱۲

لیکن اسی انگریز ذات کا افسر۔ کپتان بارلو۔ مولانا امیر علی شاہ کے مقابلہ میں اتنا چاق و چوبند ہے کہ نماز ظہر ختم ہونے کا بھی انتظار گوارا نہیں کرتا۔ خاص نماز کے وقت گولوں کی زد پر رکھ کر ان کمزور نہتوں کے پرخچے اڑا دیئے اور جو باقی بچے ان کو بعد میں گولیوں کا نشانہ بنا ڈالا اور لطف یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ واجد علی شاہ کی حکومت کے نام پر۔ جو ابھی تک مولانا امیر علی کے معاملہ میں علماء سے فتوے ہی لکھوا رہا تھا۔ کیا انگریز افسروں کے اس تغافل اور اس چستی کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہندو مسلمانوں میں منافرت پیدا ہو۔ واجد علی شاہ بدنام ہو اور انگریز کا بول بالا ہو۔

چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ جس روز مولانا امیر علی شاہ صاحب اودھ میں شہید کئے گئے اسی روز حکومتِ اودھ سے واجد علی شاہ کی معزولی کا فیصلہ لندن کی پارلیمنٹ میں صادر کیا گیا۔[۱]

بہرحال یہ واقعہ بھی ایک زیرک اور فہیم کے لئے سبق آموز تھا۔ چنانچہ مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب نے اس سے یہی سبق لیا تھا کہ باعثِ فتنہ نہ ہندو ہے نہ مسلمان اور نہ مجبور و مقہور واجد علی شاہ۔ بلکہ اس فتنہ و فساد کے بیج کارپردازان کمپنی نے بوئے ہیں۔ وقت کا سب سے ضروری مطالبہ یہ ہے کہ ان بیج بونے والوں کو وطن سے نکالا جائے۔

اس حادثہ کے بعد ہی مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب آگرہ سے لکھنؤ پہونچے۔ مولانا فضل حق صاحب سے ملاقات کی۔ اس کے بعد مولانا فضل حق۔ وہ نہیں تھے جو ہمیشہ سے تھے۔ وہ اب داعی انقلاب تھے۔ لکھنؤ کو خیرباد کہا اور الور پہونچکر نئی بساط بچھائی۔[۲]

---

[۱] باغی ہندوستان ص۱۴۲ [۲] خود مولانا فضل حق صاحب نے بھی "الثورۃ الہندیہ" میں اپنے اس فکری تبدیلی کا تذکرہ فرمایا ہے اس کے اسباب میں اگرچہ اس واقعہ کا نام نہیں لیا۔ لیکن جو سبب بیان کئے ہیں اُن کے دلائل و شواہد اسی قسم کے واقعات ہو سکتے ہیں۔ مثلاً سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نصاریٰ کی کوشش ہے کہ تمام مذہب بدل کر صرف ایک مذہب نصرانیت و عیسائیت باقی رکھا جائے۔ دوسرا سبب یہ کہ جملہ ذرائع پیداوار پر قبضہ کر کے وہ ہندوستانیوں کے خورد و نوش کو بھی اپنے قبضہ میں کرنا چاہتے ہیں۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں سے اُن کے مذہبی مراسم مثلاً ختنہ و پردہ وغیرہ ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء اور مولانا خیرآبادی

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو مولانا الور میں تھے۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ وہ علمار مجاہدین جو ایک عرصہ پہلے سے اپنا نصب العین استخلاص وطن بنا چکے تھے ابتدار میں وہ بھی متامل رہے کیونکہ یہ ہنگامہ اُن کے کسی پروگرام کا نتیجہ نہیں تھا اس کی ابتدار فوجوں کی بددلی سے ہوئی تھی۔ اور پھر اگرچہ دہلی پر انقلابی فوجوں نے قبضہ کرکے بہادر شاہ کو بادشاہ بنا دیا تھا۔ مگر ان کارروائیوں میں کوئی ایسا ضبط و نظم نہیں تھا جو نظر شریعت میں قابل اعتماد ہو۔

جب ۲ر جولائی کو جنرل بخت خاں نے ایک لشکر جرّار کے ساتھ دہلی پہونچکر نظم و ضبط قائم کردیا تو ان اصحاب الرائے علمار کو بھی اطمینان ہوا۔ اب ایک فتویٰ بھی مرتب کیا گیا۔ اور بقول منشی ذکار اللہ خاں صاحب مساجد کے ممبروں پر بھی تذکرہ جہاد ہونے لگا۔

غالبًا اسی شش و پنج کے سبب سے مولانا فضل حق بھی اگست سے پہلے دہلی نہیں پہونچ سکے جب فتویٰ کی اشاعت ہوئی تب مولانا نے بھی دہلی کا قصد فرمایا۔ خود مولانا اپنی خودنوشت سوانح "قید و بند" ۔ "الثورۃ الہندیہ" میں تحریر فرماتے ہیں۔

ھذا وقد انتھض من بعض القریٰ والبلاد جمع من المسلمین الجلاد للجدال والجلاد والغزو والجہاد۔ بعد الاستفتاء والاستشہاد من العلماء الزھاد وافتاءھم بوجوب الجہاد بفتاویٰ ائمۃ الاجتہاد۔ [1]	(دہلی میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا) کہ کچھ دیہات و قصبات اور شہروں سے بہادر مسلمانوں کی جماعت جدال و قتال اور غزوہ و جہاد کے لئے اٹھی اس سے پہلے وہ خدا ترس تارک دنیا علمار سے ائمہ اجتہاد کے فتاویٰ کی روشنی میں وجوب جہاد کا فتویٰ حاصل کر چکی تھی۔

---

[1] الثورۃ الہندیہ۔

دہلی میں مولانا کی مشغولیت

منشی جیون لال نے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے۔
۱۶ راگست ۱۸۵۷ء۔ مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے۔ انھوں نے اشرفی نذر پیش کی اور صورت حال کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی

۱۸ راگست۔ مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ انگریزی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ شہر پر قبضہ ہو جانے کے بعد باشندوں کا قتل عام کیا جائے گا۔ شہر کو مسمار کر دیا جائے گا اور بادشاہ کے گھرانے میں ایک بھی آدمی ایسا نہ چھوڑا جائے گا جو بادشاہ کا نام لے یا اُسے پانی کا ایک قطرہ بھی دے سکے۔ اس کے بعد مولوی نے کہا حضور کو مناسب ہے کہ سپاہیوں کو ترغیب دے کر انگریزوں کے مقابلہ سے روک دیا جائے کیونکہ وہ کسی نوع انگریزوں پر فتح نہیں پا سکتے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ اپنی افواج کو لڑانے کے لئے لے جاؤ اور انگریزوں کے خلاف لڑاؤ۔ مولوی نے جواباً کہا۔ افسوس تو اسی بات کا ہے کہ سپاہی اُن کا کہنا نہیں مانتے جو اُن کی تنخواہ دینے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ اچھا تو اپنی افواج کو محاصل جمع کرنے کے کام پر لگا دو۔

۲ رستمبر ۱۸۵۷ء۔ بادشاہ دربار عام میں تشریف فرما ہوئے۔ مرزا الٰہی بخش۔ مولوی فضل حق۔ میر سعید علی خاں اور حکیم عبدالحق[1] آداب بجا لائے۔

۶ رستمبر ۱۸۵۷ء۔ مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے۔

۷ رستمبر ۱۸۵۷ء۔ بادشاہ دربار خاص میں رہے۔ حکیم عبدالحق۔ میر سعید علی خاں۔ مولوی فضل حق۔ بدرالدین خاں اور دیگر تمام امراء و سردار شریک دربار رہے۔

---

[1] حکیم عبدالحق بن محمد حسن بخش دہلی کے رہنے والے مدت تک راجہ ناہر سنگھ والی بلب گڈھ کے ایجنٹ رہے۔ پھر مستعفی ہو کر دہلی آ گئے۔ پھانسی کی سزا سے شہید کئے گئے۔

منشی ذکاء اللہ خاں نے یہ بھی تحریر کیا ہے، کہ مولانا نے ایک دستور اساسی کا مسودہ بھی مرتب کیا تھا۔

دہلی میں حضرت مولانا فضل حق رح کی مصروفیتوں کے متعلق معلومات کا ذخیرہ صرف یہی ہے اس کے ماسوا رقیاس ہے جس کا دامن بہت وسیع ہے یہاں اُس کی نہ ضرورت ہے نہ موقع۔

دہلی سے روانگی

۱۹ر ستمبر کو دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہوا۔ مولانا اور اُن کے اہل و عیال پانچ روز تک کسی مکان میں بھوکے پیاسے بند رہے پھر رات کی تاریکی میں اہل و عیال کو ساتھ لیکر نکلے اور پاپیادہ سفر کی مصیبتیں جھیلتے ہوئے بھیکن پور ضلع علی گڈھ پہونچے یہاں اٹھارہ روز چھپے رہے۔ پھر نواب صدر یار جنگ بہادر (مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی) کے عم محترم نواب عبدالشکور خاں رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ سے جو بھیکن پور سے آٹھ میل پر ہے دریا کے پار اُتار دیا۔ پھر کچھ مدت چھپے رہے[۱]

گرفتاری

جب ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے عفو عام کا اعلان ہو گیا تو مولانا بھی اس پر بھروسہ کرکے اپنے وطن خیرآباد پہونچ گئے۔ فرماتے ہیں۔

"مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسہ اور بے دین کی قسم پر اعتماد کسی بھی حالت میں درست نہیں ہے خصوصاً جبکہ وہ بے دین جزا و سزا ر آخرت کا بھی قائل نہ ہو۔[۲]

چند روز اطمینان سے گھر رہے پھر دو آدمیوں نے آپ کی مخبری کر دی۔ گرفتار ہوئے مقدمہ چلا۔ عبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی اور تمام مال و اسباب حتیٰ کہ کتابیں بھی ضبط کر لی گئیں

۱۔ باغی ہندوستان ص ۱۵۸ ۲۔ الثورۃ الہندیہ ص ۴۱۶

حسب ضابطہ کچھ عرصہ ہندوستان کے جیل خانہ میں رہے۔ جہاں خود مولانا کے ارشاد کے مطابق ہر ممکن اذیت پہونچائی گئی اور قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایمان و اسلام پر مضبوطی سے قائم رہے اور اُن کا شمار علماء اعلام میں ہوتا تھا۔ [1]

جیل کی اذیتوں کا خاکہ مولانا نے اپنی تصنیف "الثورۃ الہندیہ" میں ہندوستان کے جیل خانوں۔ انڈمان اور وہاں کی مصائب و تکالیف کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ چند اقتباسات کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

مکر و تلبیس سے جب نصاریٰ نے مجھے قید کر لیا تو ایک قید خانہ سے دوسرے قید خانہ اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا۔ مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہونچایا۔ میرا جوتا اور لباس تک اُتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیئے۔ نرم بستر چھین کر خراب۔ سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا۔ گویا اُس پر کانٹے بچھا دیئے گئے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈالدی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا پیالہ اور کوئی برتن تک نہیں چھوڑا۔ بخل سے ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا۔ کوئی گرم جوش دوست تو کیا ملتا۔ گرم جوش پانی دیا گیا۔ اس ضعیفی اور پیرانہ سالی میں ہر وقت اور ہر آن ذلت و توہین سے کام لیا گیا۔

جزیرہ انڈمان پھر مجھے دریار شور کے کنارے ایک ایسے پہاڑ پر پہونچا دیا گیا جس کی آب و ہوا ناموافق جہاں سورج ہمیشہ سر پہ ہی رہتا ہے۔ اس کی گھاٹیاں دشوار گذار۔ پیچ در پیچ جنہیں دریار شور

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص۱۷۔۱۸۔

۵۲ برس کی عمر پائی ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ اس سفینۂ علم کے ساتھ ایک نادر تصنیف کا مسودہ بھی غرقاب ہوا جس کی تلافی ناممکن ہے ۔ مفتی عنایت احمد صاحب نے چالیس فن کے ایک ایک مسئلہ کا انتخاب کیا تھا اور ہر ایک مسئلہ پر چالیس ورق لکھنے کا التزام اس صفت کے ساتھ تھا کہ مسئلہ بھی بے نقطہ ہو اور اس پر پوری بحث بھی شگفتہ عبارت میں اسی التزام کے ساتھ کی جائے ۔ تفسیر میں وعلم آدم الاسماء کلھا کی آیت اور حدیث میں کل مسکر حرام رواہ مسلم منتخب فرمائی تھی بڑا حصہ مکمل ہو چکا تھا

تلامذہ مفتی صاحب کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں سے اکثر نامور مدرس ہوئے چند نام یہ ہیں ۔

مولوی سید حسین شاہ صاحب بخاری ۔ مولوی امیر الدین احمد صاحب بخاری
مولوی لطف اللہ صاحب علی گڈھی ، مولوی حافظ عزیز الدین صاحب عباسی
مولوی حافظ نواب عبدالعزیز خاں صاحب بریلوی ۔ منشی مقصود احمد صاحب
برادر زادہ مولوی حکیم حبیب علی صاحب کاکوروی

تصانیف مفتی عنایت احمد صاحب کی تصانیف بھی بہت ہیں جو آپ کے علم و فضل پر دال ہیں ۔ خاص بات یہ ہے کہ آج تک کسی نے مفتی صاحب کی کتابوں پر اعتراض نہیں کیا اور مفتی صاحب نے اردو میں جو رسالے لکھے ہیں ان کی زبان نہایت صاف اور بامحاورہ ہے مضامین اخلاقی اور اسلامی ہیں ایک مختصر سا فنڈ جمع کر لیا تھا اس کی مدد سے مفتی صاحب کی یہ تصانیف طبع ہو کر تقسیم و شائع ہوتی تھیں شرح ہدایۃ الحکمۃ صدر شیرازی ۔ تصدیقات حمد اللہ اور شرح یمنی پر بھی حواشی لکھے ہیں اب آپ کی جملہ تصانیف کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا جاتا ہے

علم الفرائض :- نام سے مضمون ظاہر ہے ۱۲۶۲ھ میں لکھی گئی نام تاریخی ہے[۱]۔
ملخصات الحساب - فن ریاضی پر مفید رسالہ ہے ریاضی کے ابتدائی اصول آسان پیرایہ میں تحریر کئے گئے ہیں یہ کتاب بھی ۱۲۶۲ھ میں لکھی گئی نام تاریخی ہے ۔
تصدیق المسیح ردع کلمۃ القبیح :- نام سے مضمون ظاہر ہے ۱۲۶۶ھ میں کتاب لکھی گئی نام تاریخی ہے ۔
الکلام المبین فی آیات رحمۃ للعالمین - یہ ضخیم تصنیف ہے ۔ ۱۲۷۰ھ میں یہ کتاب لکھی گئی ۔ نام تاریخی ہے معجزات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان نہایت شرح و بسط سے کیا ہے ۔
ضمان الفردوس - ۱۲۷۲ھ میں یہ رسالہ لکھا ۔ نام تاریخی ہے بخاری کی حدیث من یضمن لی مابین لحییہ ومابین رجلیہ اضمن لہ الجنۃ کی شرح لکھی ہے ۔ کتاب دو باب پر مشتمل ہے پہلے باب میں معاصی متعلقہ زبان کا بیان ہے اور دوسرا باب عضو خاص کے گناہوں پر مشتمل ہے ۔
بیان قدر شب براۃ - یہ ایک مختصر رسالہ ہے شب براۃ کے فضائل میں ۱۲۷۲ھ میں لکھا گیا ۔ نام تاریخی ہے
رسالہ در مذمت میلہ ہا - یہ رسالہ ۱۲۷۲ھ میں لکھا گیا ۔ نام تاریخی ہے ۔ مسلمان ہندوؤں کے میلوں میں شرکت کرتے ہیں اس کے رد میں لکھا گیا ہے
فضائل علم و علماء دین - نام سے مضمون کتاب ظاہر ہے ۔ ۱۲۷۲ھ میں لکھی گئی نام تاریخی ہے
محاسن العمل الافضل مع التتمات ۔ یہ کتاب بھی ۱۲۷۲ھ میں لکھی گئی ۔ نام اس کا بھی تاریخی ہی کتاب طبع ہو چکی ہے ۔

---
[۱] اگر کتابوں کے نام تاریخی ہیں تو یہ سنہ جو لکھے ہیں صحیح نہیں ہیں سنہ وہی مانے جائیں جو ناموں سے تخریج ہوں۔

فضائل درود وسلام۔ درود وسلام کے فضائل میں یہ کتاب ۱۲۷۲ھ میں لکھی۔

ہدایات الاضاحی۔ نام سے کتاب کا مضمون ظاہر ہے۔ تاریخی نام ہے ۱۲۷۲ھ میں لکھی گئی۔

الدر الفرید فی مسائل الصیام والقیام والعید۔ نام سے مضمون کتاب ظاہر ہے ۱۲۷۲ھ میں مرتب ہوئی نام تاریخی ہے۔

وظیفہ کریمہ۔ اردو وظائف پر مشتمل ہے۔ ۱۲۷۶ھ میں انڈمان میں لکھی گئی۔ کتاب طبع ہو چکی ہے

خجستہ بہار۔ گلستاں کے طرز پر نثر میں یہ کتاب لکھی ہے ۱۲۷۶ھ میں انڈمان میں تالیف ہوئی

علم الصیغہ۔ عربی صرف کا نہایت جامع رسالہ۔ آج تک درس میں شامل ہے۔ کوئی حافظ سید وزیر علی صاحب تھے ان کی تحریک پر لکھا گیا۔ اس کا دوسرا نام قوانین جزیلہ حافظیہ بھی ہے۔ یہ رسالہ بھی ۱۲۷۶ھ میں انڈمان میں لکھا گیا نام تاریخی ہے۔ ایک مقدمہ، چار باب اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔

احادیث الحبیب المتبرکہ۔ ۱۲۷۵ھ میں قیام انڈمان کے زمانہ میں چالیس حدیثوں کا یہ مجموعہ مرتب کیا، رسالہ طبع ہو چکا ہے۔

تواریخ حبیب الہ۔ انڈمان میں ۱۲۷۵ھ میں سرکاری ڈاکٹر محمد امیر خاں کی فرمائش پر لکھی جن کا ذکر مفتی صاحب نے دیباچہ میں کیا ہے۔ واقعات نہایت تفصیل سے بقید تاریخ لکھے ہیں سیرت میں بہت خوب کتاب ہے۔

ترجمہ تقویم البلدان۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے ایک انگریز کی فرمائش پر انڈمان میں عربی سے ترجمہ کیا اور یہی رہائی کا سبب بنا۔

نقشہ مواقع النجوم۔ یہ کتاب ہیئت جدید (فیثا غورثی) پر لکھا ہے بعض انگریزوں نے اس کو پسند کیا اور مولف تذکرہ مشاہیر کاکوری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مسٹر طامسن لفٹنٹ گورنر مغربی

شمالی نے جو علم ہیئت کے عالم تھے اس کو خاص طور سے پسند کیا اور اسی کتاب کی وجہ سے مفتی صاحب کو "خان بہادری" کا خطاب ملا۔ مؤلف تذکرہ مشاہیر کاکوری کے بیان کا آخری جملہ غلط ہے مفتی صاحب کو خان بہادری کا خطاب نہیں ملا۔

لوامع العلوم واسرار العلوم ۔ اس کتاب کے متعلق اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اس میں چالیس علوم کا خلاصہ لکھنا پیش نظر تھا۔ ہر علم کا نام بھی سہ لفظ تھا۔ مثلاً علم التفسیر کا نام علم کلام اللہ، علم حدیث کا نام علم کلام الرسول، فقہ کا نام علم الاحکام وغیرہ یہ کتاب مفتی صاحب کے ساتھ غرق ہو گئی۔

حواشی کو چھوڑ کر مفتی صاحب کی جملہ تصانیف کی تعداد بیس ہے جو معلوم ہو سکی ہیں ان میں سے چھ کتابیں وظیفہ کریمہ، خجستہ بہار، علم الصیغہ، احادیث الحبیب المتبرکہ، تواریخ حبیب الٰہ اور ترجمہ تقویم البلدان تو انڈمان میں لکھی گئیں اور انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ضمان الفردوس بیان قدر شب براۃ، رسالہ در مذمت میلہ ہا، فضائل علم وعلماء دین، محاسن العمل الافضل مع التقمات فضائل درود وسلام اور ہدایات الاضاحی بریلی کے قیام میں لکھی گئیں۔ یہ ساتویں کتابیں ۱۲۷۲ھ میں تحریر میں آئیں اور اس وقت مفتی صاحب کا قیام بریلی میں تھا۔

تبحر علمی

مفتی عنایت احمد صاحب کا علم وفضل مسلم ہے آپ کی تصنیفات اس پر دال ہیں۔ معقول ومنقول ہر دو علم میں تبحر حاصل تھا۔ تمام علوم پوری قوت سے پڑھاتے تھے ریاضی میں خاص امتیاز حاصل تھا۔ ادب کا ذوق تھا۔ جب مفتی صاحب کانپور میں مقیم تھے تو روزانہ شام کو میدان میں ہوا خوری کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ مولوی سید حسین شاہ بخاری سے اکثر علمی وادبی ذکر ہو جاتے تھے مفتی صاحب کو اردو اساتذہ کا اکثر کلام یاد تھا۔

مفتی صاحب کی نثر تحریر

مفتی عنایت احمد صاحب نے اپنے استاذ مولوی بزرگ علی صاحب مارہروی کی بعض کتب پر مقدمہ و دیگر تحریرات اپنے قلم سے لکھی

ہیں یہ کتابیں مولانا نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح مفتی عنایت احمد صاحب کی تحریر بھی موجود ہے۔

مآخذ مضمون بالا مندرجہ ذیل کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے۔
(۱) تذکرہ مشاہیر کاکوری مؤلفہ مولوی محمد علی حیدر مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ (۱۹۲۷ء) (۲) اُستاذ العلماء (حالات مولانا لطف اللہ علی گڈھی) مؤلفہ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ (۳) تواریخ حبیب الٰہ (۴) علم الصیغہ (۵) ضمان الفردوس (۶) بیان قدر شب براۃ (۷) حیات حافظ رحمت خاں (۸) باغی ہندوستان (۹) مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد دوم۔

علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

ایک فاضل و کامل جو درس و تدریس میں یکتائے روزگار ہے تو شعر و سخن کا اُستاذ فن کار، محاضرہ اور مذاکرہ کے وقت میر مجلس ہے۔ تو بساطِ شطرنج پر رونقِ محفل۔ اور کبھی ایک ہی وقت میں مدرس و معلم بھی ہے اور اُستاذ شطرنج بھی۔ تذکرہ علماء ہند کے مصنف رحمان علی خاں صاحب ۱۲۶۴ھ میں (جبکہ علامہ موصوف لکھنؤ میں قیام فرما تھے) ملاقات کے لئے حاضر خدمت ہوئے تو حیران رہ گئے۔ کہ

"درعین حقہ کشی و شطرنج بازی "تلمیذے را سبق" الافق المبین"
مے داد۔ و مطالب کتب را باحسن بیانی دلنشین مے نمود"

شان جامعیت کی یہ ندرت کس قدر حیرت انگیز ہے کہ اگر ایک وقت مولانا اسمٰعیل شہید

کے مدمقابل تھے تو دوسرے وقت اسی راہ پر گامزن ۔ ایک وقت اگر انگریز کے وفادار اور انگریزی محکمہ کے سررشتہ دار تھے تو دوسرے وقت جہادِ حریت کے علمبردار اور کٹہرہ عدالت میں ایک سیاسی ملزم کی حیثیت سے حاضر۔ ایک طرف زندگی کا ہر ایک دور ناز و نعم عزت و عظمت سے ہمکنار رہے تو اسی زندگی کا ایک دور پابند سلاسل اور دیارِ غربت میں وحشت بداماں ۔

ہندوستان کے وہ قصبے جو مردم خیزی میں مشہور رہے ہیں ان میں ضلع سیتاپور کا قصبہ خیرآباد بھی ہے اب چودھویں صدی کے ربع آخر میں اس کی حالت کچھ بھی ہو مگر حلقہ درس و تدریس سے تعلق رکھنے والے جانتے ہیں کہ گذشتہ صدی کے آخر تک خیرآباد کو خیر البلاد لکھا جاتا تھا ۔

اسی خیرآباد کے مشہور فاضل حضرت مولانا فضل امام صاحب تھے ۔ سیدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے معاصر، درس و تدریس میں شہرہ آفاق ۔ انھیں مولانا فضل امام صاحب کے نورِ چشم و لختِ جگر یہ مولانا فضل حق صاحب ہیں جن کی جامعیت کا مختصر تذکرہ سطورِ بالا میں گذرا ہے ۔

سلسلۂ نسب کے لحاظ سے آپ فاروقی ہیں ۔ چودہ واسطوں کے بعد آپ کا سلسلۂ نسب سیدنا حضرتِ شاہ ولی اللہ صاحب کے شجرۂ نسب سے مل جاتا ہے [1]

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے اجداد میں ایک بزرگ شیر الملک ہیں ۔ (ملاحظہ ہو شاندار ماضی جلد دوم) شیر الملک تک علامہ خیرآبادی کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

علامہ فضل حق ابن علامہ فضل امام[1] ابن شیخ محمد ارشد[2] بن حافظ محمد صالح[3] بن ملا عبدالواجد[4] بن عبدالماجد[5] بن قاضی صدرالدین[6] بن قاضی اسمٰعیل[7] ہرگامی بن قاضی[8] عماد بدایونی[9] بن شیخ ارزانی[10] بدایونی بن شیخ منور[11] بن شیخ خطیر الملک[12] بن شیخ سالار شام[13] بن شیخ وجیہ الملک[14] بن شیخ بہاء الدین[15] بن شیر الملک

(باغی ہندوستان ص۳)

ولادت اور تعلیم و تربیت

مولانا فضل حق صاحب ۱۲۱۲ھ ۱۷۹۷ء میں اپنے آبائی وطن خیرآباد میں پیدا ہوئے والد ماجد مولانا فضل امام صاحب دہلی میں صدر الصدور تھے۔ مولانا فضل حق کی تعلیم و تربیت آپ کے ہی زیر سایہ دہلی میں ہوئی۔ حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب اور حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب قدس اللہ سرہما کے بارگاہ فیض پناہ سے علم حدیث کی خوشہ چینی کی۔ تیرہ سال کی عمر میں تمام عقلی و نقلی علوم کی تکمیل کرلی۔ چار ماہ اور چند روز میں قرآن مجید حفظ کیا۔ [1]

ملازمت

والد ماجد کے انتقال کے وقت علامہ کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ خاندانی ذمہ داریوں کا بار پڑا۔ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ دہلی میں ریزیڈنٹ رہا کرتا تھا اس کے محکمہ کے سررشتہ دار ہو گئے۔

ہر دلعزیزی بزرگی اور اہل فن سے تعلقات

سلطنت مغلیہ کا چراغ سحری اگرچہ بے نور ہوتا جارہا تھا مگر علم و فن کے کتنے ہی گوہر شب تاب تھے جن کے دم سے اس زمانہ کی دلی بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ خاندان ولی اللہ کے جانشین مولانا شاہ اسحاق صاحب، شاہ عبد الغنی صاحب۔ حضرت شاہ ابوسعید صاحب مجددی۔ حضرت شاہ غلام علی صاحب اور ان ارباب فضل و کمال کے علاوہ بڑے بڑے کہنہ مشق اساتذہ شعر و سخن مولوی امام بخش صہبائی۔ علامہ عبد اللہ خاں علوی۔ حکیم مومن خاں مومن۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ نواب ضیاء الدین خاں نیر۔ شاہ نصیر الدین نصیر۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق۔ حکیم آغا خاں عیش۔ حافظ عبد الرحمن خاں احسان۔ میر حسن تسکین۔ اللہ خدا جانے کتنے سخنوران باکمال کا جمگھٹا اسی دہلی میں تھا۔

---

[1] سیر العلماء [2] باغی ہندوستان ص ۳۹

مولانا فضل حق صاحب جیسا باکمال۔ ان سب کا قدر دان تھا۔ اور یہ سب علامہ کے قدر شناس۔

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

اسی زمانہ کا ولی عہد" ابوظفر بہادر شاہ" خود بھی شعر و سخن کا شاہ تھا اور اہل علم کی قدر دانی میں بھی شاہانہ شان رکھتا تھا۔ علامہ سے اس کو یہاں تک تعلق خاطر تھا کہ جب علامہ دہلی کی ملازمت ترک کر کے جھجر جانے لگے اور وداعی ملاقات کے لئے ولی عہد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بہادر شاہ نے اپنا خاص دوشالہ آپ کو اڑھایا اور آبدیدہ ہو کر کہا

ہرگاہ شما مے گوئید کہ من رخصت مے شوم۔ مرا جز ایں کہ بپذیرم گریز نیست اما ایزد دانا داند کہ لفظ وداع از دل بزبان تمے رسد۔ الا بصد جر ثقیل[1]

(ترجمہ) آپ فرماتے ہیں کہ میں رخصت ہوتا ہوں۔ میں بھی مجبور ہوں۔ قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ مگر خدا علیم خوب جانتا ہے کہ سیکڑوں جر ثقیل کام میں لائے جائیں، تب کہیں لفظ وداع۔ دل سے زبان تک آسکتا ہے۔

دہلی سے جھجر وغیرہ

بیشک ارباب نقر اور اصحاب توکل علماء اور مشائخ کی ایک جماعت تھی جنھوں نے کمپنی کی ملازمت تو کیا مسلمان بادشاہوں کی ملازمت بھی پسند نہیں کی۔ علامہ فضل حق کا مسلک دوسرا تھا۔ آپ نے ملازمت کی۔ مگر اس طرح کہ آپ کی نازک مزاجی نے عزت نفس۔ خود داری اور وقار علم کے دامن کو کبھی میلا نہیں ہونے دیا یظاہر یہی سبب تھا کہ کہیں آپ کا قیام مستقل نہیں رہا۔

---

[1] یادگار غالب، کلیات نثر غالب۔ فارسی۔

کی موجیں ڈھانپ لیتی ہیں۔ اس کی نسیم صبح بھی سموم سے زیادہ گرم۔ غذا خنظل سے زیادہ کڑوی اور زہر ہلاہل سے زیادہ مضر اس کا پانی سانپوں کے زہر سے زیادہ ضرر رساں۔ ہر کوٹھری پر چھپر تھا جس میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا میری آنکھوں کی طرح اُن کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں اور اُن سے بدبو مہکتی رہتی تھی۔ امراض کی کثرت۔ بیماری عام دوا ناپید اور مشکل۔ خارش اور قوبا[۱] کا رواج عام۔ بیمار کے علاج، تندرست کے بقاء صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہیں۔ دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے۔ بخار موت کا پیغام۔ مرض سرسام اور برسام[۲] ہلاکت کی علت تام ہے اور کتنی ہی بیماریاں ایسی ہیں کہ طب کی کتابوں میں اُن کا نام و نشان نہیں۔ ڈاکٹروں کی یہ حالت کہ مرض کچھ دوا کچھ۔ مرنے والوں کے ساتھ یہ سلوک کہ مردہ خاکروب کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جو اس کے کپڑے اتار کر ٹانگ پکڑ کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے۔ نہ غسل نہ کفن۔ نہ دفن نہ نماز جنازہ۔ اگر میت کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا تو یہاں کی مصیبتوں کے مقابلہ میں مرجانا سب سے بڑی آرزو ہوتی اور اگر مذہباً خودکشی ممنوع نہ ہوتی تو قید و بند کی ان مصیبتوں سے نجات پالینا بہت آسان تھا۔

میں نہیں جانتا کہ ان مصیبتوں سے کس طرح چھٹکارا ہو سکے گا خارش

---

[۱] قوبا مرض کا نام ہے جس میں بدن کی کھال چھلنے اور پھٹنے لگتی ہے۔
[۲] دماغ کے پردوں کا ورم۔

اور "قوبا" میں مبتلا ہو جانا مصیبت بالائے مصیبت ہے۔ صبح شام اس طرح
بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے روح کو تحلیل کر دینے
والے درد اور تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔[۱]

کسی قدر سہولت مولانا کو پہلے صفائی کے کام پر لگایا گیا تھا۔ برہنہ پا۔ صرف ایک لنگی اور کمبل کا کرتا۔ کوڑا کرکٹ صاف کرتے اور ٹوکرے میں اکٹھا کر کے پھینک آتے۔ مگر کچھ دنوں بعد آپ کو محرری کے کام پر لگا دیا گیا اور اس تبدیلی کا سبب آپ کا علمی تبحر ہوا۔ صورت یہ ہوئی کہ سپرنٹنڈنٹ کے پاس علم ہیئت کی ایک قلمی کتاب تھی۔ سپرنٹنڈنٹ کے یہاں ایک مولوی صاحب کام کرتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے مولوی صاحب کو دی کہ اس کی غلطیاں درست کر دیں۔ مولوی صاحب یہ کتاب مولانا کے پاس لے آئے۔ مولانا نے نہ صرف عبارتیں درست کیں بلکہ جگہ جگہ مضمون کی بھی تصحیح اور توضیح کر دی اور کتابوں کے حوالے بھی درج کر دیئے۔ سپرنٹنڈنٹ کو جب مولانا کے علم و فضل کا احساس ہوا تو اس نے صفائی کی خدمت سے ہٹا کر محرری پر لگا دیا اور حکومت سے رہائی کی سفارش بھی کر دی۔

پروانہ رہائی اور وفات علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بیخبر میر منشی لفٹنٹ گورنر کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ ادھر انڈمان کے سپرنٹنڈنٹ جیل نے بھی سفارش کی تھی۔ نتیجہ میں کامیابی ہوئی یعنی رہائی کا حکم ہو گیا۔ لیکن عجیب و غریب اور نہایت تکلیف دہ اور دلخراش صورت یہ پیدا ہوئی کہ مولانا شمس الحق صاحب پروانہ رہائی حاصل کر کے انڈمان پہونچے۔ جہاز سے اتر کر شہر میں گئے تو ایک

---

[۱] الثورۃ الہندیہ ص ۴۲۱ تا ص ۴۲۲

جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑا انبوہ علم تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۲۰ اگست ۱۸۶۱ء کو علامہ فضل حق خیرآبادی کا انتقال ہوگیا ہے۔ اب سپرد خاک کرنے جارہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت و یاس شریک دفن ہوئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

جنرل بخت خاں

یہ تعجب خیز تو نہیں حسرت انگیز ضرور ہے کہ بخت خاں جو دہلی کے محاذ پر شہاب ثاقب بن کر چمکا۔ اور ایسا چمکا کہ اس داستان سرفروشی میں دلچسپ و دلگیر ہے تو صرف اسی کی کارگذاری اور معرکہ آرائی ۔۔۔ اس کی زندگی کا آغاز اور انجام دونوں ایسے پردہ میں ہیں کہ اب تک کوئی بھی تحقیق و تفتیش اس کو بے نقاب نہ کرسکی۔ خود بخت خاں نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے اپنے متعلق بتایا تھا

میں بھی آپ ہی کے خانوادہ سے ہوں[1]۔ میں سلطان پور علاقہ لکھنؤ کا

---

[1] منشی جیون لال کے روزنامچہ میں ۲ جولائی کی روئیداد میں درج ہے:۔

بادشاہ نے جنرل کو تخلیہ میں باریابی دی جنرل نے کہا میں بھی آپ کے خانوادہ سے ہوں اطمینان کی غرض سے آپ تحقیقات فرماسکتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا تحقیقات کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ اس وقت جنرل سے اور کوئی بڑا بہادر موجود نہیں ہے۔ جنرل نے جواب میں عرض کیا۔ میں بہادر کے خطاب کا مستحق ہوجاؤں گا اگر میں دہلی اور میرٹھ سے انگریزوں کو نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔

باشندہ ہوں اور اودھ کے شاہی خاندان سے میری رشتہ داری ہے۔ [1]

اس مختصر جملہ میں نہ ولدیت اور خاندان کا تذکرہ ہے۔ نہ رشتہ داری کی تفصیل۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی نے اس اجمال کی کسی قدر تفصیل کی۔ آپ "حیات علامہ فضل حق خیر آبادی میں تحریر فرماتے ہیں:-

> اس سلسلہ میں سب سے بڑی اہم شہادت نواب دوندے خاں کی پڑپوتی چندا بیگم کی ہے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ غلام قادر روہیلہ شہید سے ان کی قرابت قریبہ تھی اور خاندان روہیلہ سے تھے۔ اُن کے والد کا نام عبداللہ خاں تھا۔ والی روہیلکھنڈ حافظ الملک رحمت خاں کا خاندان جب انگریزوں اور شجاع الدولہ کے مظالم کا شکار ہو کر برباد ہوا تو غلام قادر خاں کا خاندان بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔ اس انتشار میں جس کا جدھر منھ اُٹھا چلا گیا چنانچہ بخت خاں کے والد مع اہل خاندان اودھ کے موضع سلطان پور میں بس گئے۔ نواب عبداللہ خاں روہیلہ جو خوبصورتی اور بہادری میں منفرد زمانہ تھے۔ شجاع الدولہ کے خاندان کے ایک شہزادی کی توجہ کا مرکز بن گئے اور اس معتوب روہیلہ سردار کی نوابان اودھ سے قرابت داری ہوگئی۔ [2]

---

[1] منشی جیون لال نے ۱۱ جولائی ۱۸۵۷ء کے روزنامچہ میں لکھا ہے۔ بخت خاں نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں سلطان پور علاقہ لکھنؤ کا باشندہ ہوں اور اودھ کے شاہی خاندان سے میری رشتہ داری ہے میری درخواست ہے کہ اس بیان کی تصدیق فرمائی جائے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ تصدیق کی ضرورت نہیں آپ یقیناً شریف و نجیب خاندان سے ہیں۔ جنرل نے پھر عرض کیا میں تصدیق پر اس وجہ سے زور دے رہا ہوں کہ جب انگریزوں کو دہلی آگرہ اور میرٹھ سے نکال دیا جائے گا تو میں اعزاز کے امتیازی نشان کے لئے استدعا کروں گا۔ [2] بحوالہ ۱۸۵۷ء کے ہیرو مصنفہ سید انیس فاطمہ بریلوی ص ۶۵، ۶۶

اس بیان سے کچھ تفصیل معلوم ہوئی لیکن بخت خاں کی تاریخ ولادت ۔ شہزادی کا شاہان اودھ اور عبداللہ خاں کا غلام قادر خاں سے کیا رشتہ تھا ۔ یہ سوالات پھر بھی تشنہ تفتیش رہ گئے ۔

تعلیم و تربیت کے بارے میں ہماری واقفیت کا کل اثاثہ یہ قیاس ہے کہ جس کا عمل اس درجہ بلند تھا اس کا علم بھی لامحالہ بلند ہوگا اور دستور بھی یہی تھا کہ اونچے گھرانوں کے سرپرست اپنی اولاد کی تعلیم اور اس زمانہ کی فوجی تربیت کا پورا اہتمام کیا کرتے تھے۔

ملازمت | تعلیم و تربیت کے دور سے گذر کر خود کفیلی کا زمانہ آیا تو بخت خاں انگریزی فوج میں بھرتی ہو گئے ۔ ایک سپاہی کی حیثیت سے جنگ افغانستان میں شریک ہوئے اور اس جنگ میں مسٹر سیل کے ماتحت بمقام جلال آباد وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ "توپ خانہ یا تری" کے سب سے بڑی ہندوستانی افسر ہو گئے ۔ اس یا تری نے اپنی کارگذاریوں میں یہاں تک شہرت حاصل کی کہ اس کو ایک اعزازی نشان دیا گیا ۔ یہ پھولوں کا محراب نما تاج تھا جو اس کی توپوں پر بنایا جاتا تھا ۔[۱]

بخت خاں افغانستان سے واپس ہوئے تو نیمچ چھاؤنی بھیج دیئے گئے ۔ کچھ عرصہ وہاں رہ کر غالباً دستبردار ہو گئے ۔ پھر مولانا سرفراز علی صاحب کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے ۔ اور جس طرح مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے مرشد طریقت نے بیعت کے وقت انگریزوں سے جہاد کرنے کا عہد لیا تھا یہ مولانا سرفراز بھی بیعت جہاد ہی لیا کرتے تھے ۔

اس بیعت جہاد کی آزمائش کا وقت بھی جلد ہی آ گیا ۔ چنانچہ جیسے ہی بریلی میں نواب بہادر خاں نے علم آزادی بلند کیا تو بخت خاں اس کے دست و بازو تھے ۔

۱؎ غدر کی صبح و شام ص۱۵۲

بریلی میں خان بہادر خاں کی حکومت قائم ہوگئی۔ امن و امان میسر آیا جس کی عرصہ سے تمنائیں کی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ بقول سیدہ انیس فاطمہ بریلوی اس زمانہ میں کثرت سے شادیاں اور دوسری تقریبات ہوئیں۔ ہر چیز کی ارزانی اور بہتات تھی۔ گرانی کا کہیں ذکر نہیں تھا۔[۱]

مگر دہلی کا مرکز ہر طرح امداد کا محتاج تھا۔ لہٰذا بخت خاں ایک جرار فوج لے کر دہلی کے لئے روانہ ہوگئے۔

دہلی میں ورود

منشی جیون لال کے روزنامچہ میں یکم جولائی ۱۸۵۷ء کی روئیداد میں درج ہے۔

یکم جولائی ۱۸۵۷ء۔ محل (لال قلعہ) میں خبر آئی کہ بریلی کی فوج جمنا کے کنارے آپہونچی ہے۔ چونکہ پل خراب ہوچکا تھا اور اس پر سے گذرنے کی صورت نہ تھی لہذا بادشاہ نے چار سپہ قلیوں اور سفرمینا کی دو کمپنیوں کو میر فتح علی کی سرکردگی میں پل کی درستی کے لئے بھیجدیا۔ پھر معلوم ہوا کہ صبح تک فوج پل پر سے گذر سکے گی۔ بادشاہ نے احمد قلی خاں (زینت محل کے باپ) کو اس فوج کے استقبال کا حکم دیا۔

بادشاہ سے ملاقات

۲ر جولائی کو احمد قلی خاں استقبال کے لئے گئے۔ حکیم احسن اللہ خاں جرنیل صمد خاں[۲]۔ ابراہیم علی خاں۔ غلام علی خاں اور دوسرے

---

[۱] ۱۸۵۷ء کے ہیرو۔ [۲] عبدالصمد خاں نواب عبدالرحمٰن خاں ثانی جھجر کے خسر تھے۔ اڑھائی سو سوار اُن کے ماتحت تھے۔ ہمت اور مردانگی سے جنگی کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے ان سے جنگی مشورے بھی لئے جاتے تھے۔ ناکامی کے بعد دہلی سے نکلے۔ عرصہ تک جگہ جگہ مقابلہ کرتے رہے۔ پھر لاپتہ ہوگئے۔

اصحاب بھی ساتھ تھے۔ احمد علی خاں اور بخت خاں نے بارگاہ شاہی میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ جہاں ارشاد ہو فوج متعین کر دی جائے۔ بادشاہ نے پہلے سے حکم جاری کر رکھا تھا کہ شہر کے باشندوں کو ہرگز نہ لوٹا جائے۔ اس موقع پر فرمایا میرے احکام حاصل کرنے سے کیا ہوگا۔ ان احکام کی تعمیل تو ہوتی نہیں اور نہ یہاں کوئی ایسا آدمی ہے جو انہیں نافذ کر سکے۔ میرا فرمان یہ ہے کہ انگریزوں کے لئے یہاں رہنے کی گنجائش نہ چھوڑی جائے۔

بخت خاں نے عرض کیا کہ سپہ سالار کی حیثیت میں۔ میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں تاکہ عام ڈسپلن بحال ہو جائے۔ بادشاہ نے بطور اظہار محبت و اعتماد۔ بخت خاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

بخت خاں اپنی فوج میں پہنچا تو صوبیداروں کو آگاہ کیا کہ بادشاہ نے میری خدمات قبول فرمائی ہیں۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ میں سے کون کون میرا حکم مانے گا۔ سب صوبیداروں نے بخت خاں کے ہاتھ پر اطاعت کے حلف اُٹھائے۔

قیام گاہ پھر اُس نے دوبارہ بادشاہ سے ملاقات کی۔ عبدالرحمٰن خاں والی جھجر کو حکم ہوا کہ کالا محل (کلاں محل) بخت خاں کی فوج کے لئے خالی کر دیا جائے۔ اس کی تعمیل ہوئی۔ پھر بخت خاں نے شاہزادہ مرزا مغل سے ملاقات کی۔ [1]

خطابات منصب اور مہر محمد بخت خاں کو ایک ڈھال اور ایک تلوار کے علاوہ "جنرل" کا خطاب دیا گیا اور اُسے تمام افواج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا۔ منادی کرا دی گئی کہ تمام رجمنٹوں کے افسر محمد بخت خاں سے ہدایات حاصل کریں۔ مرزا مغل کو ایڈجوٹنٹ جنرل بنا دیا گیا۔

---

[1] روزنامچہ منشی جیون لال۔

محمد بخت خاں نے عرض کیا کہ اگر شہزادوں نے لوٹ مار کی کوشش کی تو میں اُن کے کان اور ناک کاٹ دوں گا۔ فرمایا تمہیں پورا اختیار ہے جس کام میں بہتری نظر آئے وہی کرو۔ اس فرمان کے مطابق شہر کوتوال کو اطلاع دیدی گئی کہ اب اگر لوٹ مار ہوئی تو لوٹنے والوں کو پھانسی دیدی جائے گی۔[1]

۴ر جولائی ۱۸۵۷ء۔ جنرل بخت خاں کو فرزند کا خطاب عطا ہوا۔[2]

بدرالدین خاں دہلی میں بہت اچھی مہریں بناتا تھا۔ ۷ر اگست کو اس کے نام بادشاہ کا فرمان جاری ہوا۔

"ایک بہترین وضع کی مہر تیار کر کے پیش کرو۔ اس پر بخت خاں کے تمام خطابات کندہ ہوں۔ یعنی

"معز الدولہ۔ بابدولت کا بندہ خاص۔ محمد بخت خاں۔ لارڈ گورنر بہادر۔ ناظم جملہ امور فوجی و دیوانی"

اور دستور کے مطابق اس پر سنہ جلوس اکیس ۲۱ درج ہو۔[3]

اس کے بعد بخت خاں کی کارگذاریوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی تفصیل پوری کتاب میں گذر چکی ہے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

دہلی سے روانگی اور زندگی کا آخری دور

دہلی میں ناکامی کے بعد جنرل بخت خاں ۱۹ر ستمبر کو دہلی سے نکلا تو مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کی روایت یہ ہے۔

جنرل صاحب نے مع اپنی فوج کے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ جہاں پہونچتے پہونچتے

---

[1] روزنامچہ منشی جیون لال ۷ر جولائی ۱۸۵۷ء کی روئیداد۔ [2] غدر کی صبح شام صفحہ ۱۵۶ [3] بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی صفحہ ۳۱ و صفحہ ۹۵ بحوالہ مہر۔

اُن کی ہمراہ صرف پانچ ہزار فوج۔ ۳۲ عورتیں۔ نیز دلی فرخ آباد کے
کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے۔

اس کے بعد جب لکھنؤ پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہوا تو بخت خاں مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے ہمراہ شاہجہانپور چلے گئے۔ مولانا احمد اللہ شاہ صاحب نے شاہجہان پور سے ہٹ کر "محمدی" میں محاذ قائم کیا تو یہاں پر بھی شاہ صاحب کے رفقاء خاص میں بخت خاں کا تذکرہ آتا ہے۔ اس کے بعد جنرل موصوف کے حالات نامعلوم ہیں۔ غالب یہی ہے کہ حضرت محل وغیرہ کی طرح یہ بھی نیپال چلے گئے اور وہیں زندگی کے باقی دن پورے کر دیئے۔ رحمۃ اللہ

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ جاں شد و آواز نیامد

بخت خاں ایک مرد مجاہد

بخت خاں ایک روہیلہ نوجوان۔ پھر برطانوی فوج کا ایک افسر۔ پھر جنگِ آزادی کا ہیرو اندکار نمارجن و صداقت کا مرد مجاہد۔

لیکن وہ برطانوی افسر سے مجاہد حریت کیسے بنا؟

مفتی انتظام اللہ شہابی کا بیان یہ ہے۔

"سید احمد بریلویؒ کے مریدین میں سے رئیس المجاہدین مولوی سرفراز علی گورکھپور کے اضلاع میں انگریزوں کے خلاف ایک عرصہ سے خفیہ طور پر بیعت جہاد لے رہے تھے۔ وہ دورہ خود بھی کرتے اور اپنے خلفاء کو بھی دیہاتوں میں بھیجتے تھے۔ چنانچہ جب سلطان پور پہنچے ایک صوبہ دار بخت خاں نواب دوندے خاں کے خاندان سے

تھا جس کے والد نے نواب شجاع الدولہ (لکھنؤ) کے خاندان میں شادی کرلی تھی۔ وہ مولوی سرفراز علی کا مرید ہوا اور اُس نے بیعتِ جہاد کی۔ ؎۱

بہر حال تبدیلی کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن ایک منصفانہ تبصرہ کے وقت یہ بات نظر انداز نہ ہونی چاہیئے کہ یہ تبدیلی بہت بڑی قربانی تھی۔

بخت خاں کو توپ خانہ کا وہ منصب حاصل تھا جو اس زمانہ میں شاید ہی کسی اور ہندوستانی کو حاصل ہو۔ اور بشرط استواری اس میں اضافہ کی توقع تھی۔ جنرل بخت خاں نے یہ منصب اور یہ اعزاز ہی قربان نہیں کیا۔ بلکہ زندگی کے تکلفات اور راحت وآسائش کے تمام اسباب وسامان بھی قربان کردیئے تھے اور غالباً شوقِ سادات میں وہ وضع اختیار کرلی تھی جو سب سے کم درجہ کے فوجیوں کی ہوتی تھی۔

سید ظہیر دہلوی نے بریلی والے جنرل کا نام بہت کچھ سنا تھا۔ جب سامنے سے دیکھا تو وہ پہچان بھی نہ سکے۔

"سر پہ انگوچھا لپٹا ہوا۔ کرچ گلے میں پڑی ہوئی۔ پیچھے حال کھلا بریلی والا جرنیل وہی تھا۔ ظاہر تو اس کا لباس گھس کھدر کا تھا۔ میں تو سمجھا جیسے اور پوربی سپاہی ہیں یہ بھی سپاہی ہوگا۔ ؎۲

نوبہار است جنوں چاک گریباں مددے
آتش افتاد بجان جنبشِ داماں مددے

رحمہ اللہ وطاب ثراہ

؎۱ ابوظفر بہادر شاہ ص۱۴ ؎۲ داستان غدر

شاہزادہ فیروز شاہ

حمیت تیموری کا آخری نشان

خانوادہ بابر کے وہ سیکڑوں نوجوان۔ جو قلعہ معلیٰ اور اس کے قرب و جوار میں رینگ رہے تھے جو نکبت وافلاس کے باوجود سلاطین کے نام سے خوش ہوتے تھے ان سب میں جس نے بابر کی یاد تازہ کی۔ یہ جواں ہمت فیروز شاہ تھا۔

فیروز شاہ۔ صاحب عالم مرزا ناظم بخت خلف شاہ عالم ثانی کا لخت جگر تھا اپنے والد بزرگوار کی زیر نگرانی علوم مروجہ اور فوجی تربیت مکمل کر چکا تھا۔ قدرت نے اس کی فطرت کو مذہبی رجحانات سے نوازا تھا۔ چنانچہ حج بیت اللہ شریف کا شوق پیدا ہوا اور غالباً شاہان مغلیہ اور موجودہ "سلاطین"[۱] (شاہزادوں) میں صرف یہی سلطان تھا جو حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ اقدس سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوا۔ اداء فریضہ کے بعد جب ہندوستان واپس پہونچا تو یہاں جنگ آزادی کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

شاہزادہ بظاہر بندرگاہ سورت سے جہاز پر سوار ہوا تھا اور اسی بندرگاہ پر جہاز سے اترا جس سے کچھ فاصلہ پر مالوہ کا وہ علاقہ تھا جہاں جہاد حریت نے شاہزادہ کی تگ و دو کے لئے میدان تیار کر رکھا تھا۔

مفتی انتظام اللہ شہابی تحریر فرماتے ہیں۔

حکومت کو ان کی آمد کا پتہ لگا تو ان کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔

ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے۔

---

[۱] شاہی خاندان کے افراد کو سلاطین کہا جاتا تھا۔ یہی محاورہ تھا۔

وسط اگست میں مالوہ کے اندر سرکشی نے خاصی خطرناک صورت اختیار کرلی تھی۔ اس کی سالاری کا منصب "فیروز شاہ" نام ایک مذہب دوست اور مجاہد شاہزادے نے سنبھال لیا۔ "مندسیور"[۵۱] کے مسلمانوں نے دوسرے فرقوں کو ملا کر گوالیار کی حکومت ختم کردی اور شاہزادہ کی حکمرانی کا اعلان کردیا۔ وہاں بہت سے مواتی، مکرانی اور افغانی موجود تھے۔ وہ ساتھ ہو گئے۔ مندسیور کا حاکم اور کوتوال زخمی ہوا۔ ایک افسر مارا گیا۔ پھر حاکم کے محل پر حملہ ہوا۔ خزانہ لوٹ لیا گیا۔ دفاتر جلا دیئے گئے۔ یہاں کے قدیمی امرا میں ایک شخص "مرزا جی" تھا اس کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔

ایسا بہتر نظم و نسق قائم کیا گیا کہ جنوب سے تمام روابط منقطع کر دیئے گئے تھے۔ سرکاری ڈاک کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ انگریزوں نے قاصدوں کے ذریعہ خبریں بھیجنے کی کوشش کی تو انھیں پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔[۵۲]

---

۵۱ مندسیور۔ ریاست گوالیار کا مشہور مقام ہے۔ جو اُجین سے تقریباً اسی میل شمال میں واقع ہے یہاں جولائی ۱۸۵۷ء میں ریاست گوالیار کی بعض سرکش افواج قابض ہو چکی تھیں۔ آہستہ آہستہ ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ پورے مغربی مالوہ میں انگریزوں کے خلاف آگ بھڑک اٹھی۔ اس مقام پر ادھر اُدھر سے بہت سی فوج جمع ہوگئی تھی جس نے شاہزادہ فیروز شاہ کو اپنا قائد و سپہ سالار بنا لیا تھا۔ مندسیور کے آس پاس متعدد مقامات تھے جہاں سازباز کے رشتے قائم ہو چکے تھے ریاست دھار کا نوجوان راجا اور اس کا وزیر رام چندر بالوجی۔ نیز راجہ کی والدہ اور چچا انگریزوں کے خلاف بڑی سرگرمی دکھا رہے تھے۔ نیمچ بھی اسی علاقہ میں ہے جہاں بغاوت کی آگ سلگ رہی تھی۔ ہر۔ ص۱۲۲

۵۲ غدر ہند کا ایک بھولا ہوا باب۔ از شاہ رز Shawars (۱۸۵۷ء کے مجاہدین ص۱۲۲)

"دہلی چلو" کا نعرہ[۱] اس وقت بھی بلند ہوا ہوگا۔ چنانچہ شاہزادہ گوالیار سے دہلی کی طرف بڑھا اوّل دھول پور پہونچا۔ یہاں کے تحصیلدار سے ایک لاکھ روپیہ وصول کیا۔ افغانی ملازم رکھے۔ ابھی آگے نہیں بڑھا تھا کہ شکست دہلی کی خبر اس کے کانوں میں پڑی۔ لہٰذا دہلی کے بجائے "آگرہ" کا رُخ کیا انگریزی فوج نے کالی ندی پر آکر مقابلہ کیا اور شکست پاکر قلعہ بند ہوجانے پر مجبور ہوگئی خدا جانے کیا مصلحت تھی کہ شاہزادہ یہاں سے میوات[۲] کی طرف چلا گیا۔ شیخ فضل علی رسالدار۔ جنرل عبدالصمد اور اس علاقہ کے میواتیوں نے ہمنوائی کی[۳]۔ دہلی کے بقیۃ السیف مجاہد بھی آکر مل گئے۔ اب یہ خاصی جمعیت ۲۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو متھرا پہونچی وہاں اُس کے ساتھ ایک اور فوج مل گئی جس میں زیادہ تر[۴] دیسی پیادہ فوج کے آدمی تھے اور ہیرا سنگھ اس کا "صوبیدار" تھا۔ اسی طرح وسط ہند (ناگپور) وغیرہ کے لوگ بھی اس فوج میں آکر شامل ہوگئے[۵]۔

یہ شاہزادہ اس جمعیت کے ساتھ فرخ آباد "شاہجہانپور" ہوتا ہوا لکھنؤ پہونچا۔ یہاں ان کا بہت احترام کیا گیا۔ پہلے سلطان بہو صاحبہ کے مکان میں بسبب قرابت قریبہ اُترے[۶]۔

سلطان بہو صاحبہ نے حضرت محل سے کہلا بھیجا کہ میں محتاج ہوں مجھ

---

[۱] جیسا کہ ۱۹۴۳ء میں نیتاجی سوبھاش چندر بوس کی زیر قیادت آزاد ہند فوج کا یہ ایک طے کردہ نعرہ تھا۔ [۲] غالباً بھرتپور کا علاقہ مراد ہے یہاں سے میوات کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ [۳] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۶۵ [۴] میلی سن [۵] قیصر التواریخ ص ۲۶۵

سے ان کی خدمت کیا ہو سکے گی؟ سرکار سے دوسرا مکان اُن کے رہنے کو ملے تو اچھا ہے۔ اس جہت سے ایک اور مکان علیحدہ اُنکے قریب تجویز ہوا مبلغ پانچہزار روپے دعوت کے آئے [1]

جب تک لکھنؤ میں مقابلہ جاری رہا۔ شاہزادہ فیروزشاہ اسی جگہ رہا جب لکھنؤ خالی ہوا تو اپریل ۱۸۵۸ء میں مولانا احمداللہ شاہ صاحب کے پاس شاہ جہان پور پہونچا۔ اور شاہ صاحب کے ساتھ جنگ میں شریک رہا۔

مراد آباد کے تذکرہ میں گذر چکا ہے کہ شاہزادہ فیروزشاہ اپنی فوج کے ساتھ مراد آباد بھی پہونچا تھا وہاں خان بہادر خاں کا چچا ناظم تھا۔ اُس نے کہلا بھیجا کہ شاہزادہ کے لئے چلا جانا ہی بہتر ہے۔ شاہزادہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ہم تھکے ہوئے ہیں اور روزے سے ہیں آج ٹھہرنے اور روزہ افطار کرنے کی اجازت دیجئے۔ کل نجیب آباد چلے جائیں گے۔ ناظم نے منظور نہ کیا بلکہ فوج اور توپیں بھیجدیں۔ شاہزادہ نے مقابلہ کیا۔ ناظم کی فوج کو بھگا دیا اور اس کا سارا سامان ضبط کر لیا۔

نواب رام پور انگریزوں کے سخت حامی تھے۔ نواب صاحب نے فیروزشاہ کے مقابلہ کے لئے اپنے بھائی کاظم علی خاں کو ایک فوج دیکر بھیجا۔ شاہزادہ نے اُس کو بھی شکست دی چھٹے دن نجیب آباد اور رام پور سے سات ہزار انگریزی فوج بھاری توپخانہ اور پورے ساز و سامان کے ساتھ پہونچی۔ شاہزادہ اُس کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ لہذا محصور ہونے سے پہلے مع فوج صحیح سالم نکلکر بریلی پہنچ گیا۔ جہاں نواب خان بہادر خاں نے شاندار استقبال کیا شاہزادہ کو اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھا کر جلوس کے ساتھ شہر کا گشت کیا۔

---

[1] قیصر التواریخ صفحہ ۲۱۲ ۲۱۴ [2] قیصر التواریخ وغیرہ

شکست بریلی کے بعد شاہزادہ مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے پاس شاہجہانپور پہونچا۔ محمدی میں شاہ صاحب نے اپنی طاقت کو دوبارہ منظم کر کے حکومت قائم کی تو شاہزادہ اُن کے ساتھ ہی تھا۔ محمدی کی شکست کے بعد شاہزادہ نے نیپال کے بجائے دوبارہ اودھ کا رُخ کیا۔ سندیلہ بانگرمئو، صفی پور، خیرآباد، باڑی وغیرہ میں قسمت آزمائی کی۔ پھر "بلہور" کے گھاٹ سے دریائے گنگا کو عبور کیا اور ملاحوں کو دو سو روپے انعام دیئے۔ بعد ازاں مکن پور، درگاہ مدار حوالی، اٹاوہ، وغیرہ سے ہوتے ہوئے شیر پور کے گھاٹ پر جمنا سے پار اُترا۔ جگہ جگہ مقابلہ ہوا بے جگری سے لڑا اور صحیح سالم نکلتا چلا گیا۔

جنوری ۱۸۵۹ء کو وہ اندرگڑھ میں تانتیا ٹوپے سے جا ملا۔ ۲۱ جنوری ۱۸۵۹ء کو اُس سے الگ ہوا۔ اپریل ۱۸۵۹ء میں وہ سرونج کے جنگلوں میں تھا۔[1]

اس کے بعد یہ تو تسلیم ہے کہ ہندوستان سے صحیح سالم بچ کر نکل گیا۔ اس میں اختلاف ہے کہ ہندوستان سے نکل کر کہاں پہونچا۔

کمال الدین حیدر (مصنف قیصر التواریخ) لکھتے ہیں۔

آخر کار اٹک ندیا اُتر کر کابل سے ہو کر داخل ملک ایران ہوا۔ وہاں سے رہبری پا کر داخل ملک روس ہوا۔ کہتے ہیں وہاں اپنی جماعت قلیل سے بخوبی بسر کرتے ہیں۔ وہاں کی سلطنت سے بہت تھوڑی کچھ کفالت ہوتی ہے۔

مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی تحریر فرماتے ہیں

روس ہو کر حجاز چلے گئے۔ مکہ معظمہ میں اقامت اختیار کی۔ ۱۸۹۵ء میں انتقال ہوا۔ رحمۃ اللہ و رضی عنہ

---

[1] میلی سن جلد پنجم بحوالہ مہر۔

خاتمۂ کلام اور معذرت

کئی سو صفحات سیاہ ہو گئے۔ مگر داستان ۱۸۵۷ء اب بھی ناتمام رہی۔ صرف دہلی اور روہیلکھنڈ کے جستہ جستہ واقعات اور اس علاقہ کے چند علماء اور زعماء تحریک کا تذکرہ آسکا۔ اُن کا تو شمار ممکن ہی نہیں جو لین میں کھڑے کر کے گولیوں سے اُڑا دیئے گئے یا توپ دم کر دیئے گئے یا کسی درخت پر لٹکا کر پھانسی دے دیئے گئے۔ وہ جرنیل اور مجاہدین جن کے کچھ تذکرے منتشر طور پر کتابوں میں ملتے ہیں اُن کی تعداد بھی بہت ہے، اور اُنکو یکجا لکھنے کیلئے ایک اور ضخیم جلد کی ضرورت ہے۔ مگر یہ ضرورت کس طرح پوری ہو — اس کا جواب توفیق ایزدی پر موقوف ہے۔

دہلی کی طرح لکھنؤ۔ اور کانپور کے محاذ بھی تفصیل طلب ہیں مالوہ کا علاقہ بھی آماجگاہ رہا ہے۔ لکشمی بائی (مہارانی جھانسی) کنور سنگھ (جگدیش پور ضلع آرہ شاہ آباد۔ بہار اسٹیٹ) ریاست دھا کے نوجوان راجہ اور راجہ بلب گڈھ جیسے فداکاران حریت نے جو کام کئے یہ سب تاریخ حب وطن کے زریں باب ہیں۔

عظیم اللہ خاں۔ نانا راؤ پیشوا۔ تانتیا ٹوپے۔ مولانا پیر علی۔ نواب تفضل حسین فرخ آباد۔ سید اکبر زماں کے حالات جناب غلام رسول صاحب مہر اپنی تازہ تصنیف ۱۸۵۷ء کے مجاہدین میں اس تفصیل سے پیش کر چکے ہیں کہ سردست اس پر اضافہ مشکل ہے۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کی تصانیف میں بہت سے مشاہیر کا ذکر آچکا ہے۔ یہاں اُن کو نقل کر کے کتاب کو گراں بار بنانا نہ ہمیں پسند ہے نہ ناظرین کرام اس تکلف کو پسند کریں گے۔ لہذا سلسلہ تحریر یہیں ختم کیا جاتا ہے، البتہ جیمی گرین کا دلچسپ تذکرہ یہاں اس لئے پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے فداکاران حریت کی قابلیتوں اور غیر معمولی صلاحیتوں پر ہلکی سی روشنی پڑیگی۔ یہ پورا تذکرہ العلم کراچی کے جنگ آزادی نمبر (اپریل تا جون ۱۹۵۷ء) سے ماخوذ ہے اسکے بعد شاندار ماضی جلد چہارم کے سب سے پہلے ایڈیشن[1] کے چند صفحات بطور یادگار نقل کئے جائیں گے یہ اُن مظالم کی قلمی تصویر ہیں جو ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں کمزور اور نہتے ہندوستانیوں پر بجرم حریت طلبی — مہذب اور شائستہ انگریزوں کی طرف سے روا رکھے گئے تھے۔

[1] یہ وہی ایڈیشن ہے جو ۱۹۳۹ء میں ضبط کیا گیا تھا۔

سرگذشت محمد علی خاں بریلوی عرف جیمی گرین

۱۸۵۷ء کے چشم دید واقعات اور پر اثر سرگذشتیں اکثر انگریزوں نے یادداشتوں اور سرگذشتوں کے نام سے چھاپی ہیں۔ چنانچہ ایک انگریز فوجی افسر فوربس میچل نے بھی جو کانپور اور لکھنؤ دونوں جگہ کے معرکوں میں شریک تھا اپنے روزنامچے سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی یہ کتاب میسرس میکمیلن اینڈ کو کے یہاں چھپی تھی اور اس کے ایک حصہ کا اردو ترجمہ جو محمد علی خاں عرف جیمی گرین کے حالات پر مشتمل ہے۔ منشی محمد شفیع الدین خاں مرادآبادی نے جولائی ۱۸۹۰ء میں شائع کیا تھا اصل انگریزی کتاب اور یہ ترجمہ اب قریب قریب ناپید ہے۔ ایک نسخہ مفتی محمد انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی کے پاس موجود ہے۔ اس کو اس مضمون کا ماخذ سمجھنا چاہیئے۔

گوروں کی رجمنٹ ۹۳ (ترکوں اور روسیوں کی کریمیا کی لڑائی کے بعد جس میں سلطان المعظم کو فتح نصیب ہوئی تھی) انگلستان سے مئی ۱۸۵۷ء میں لارڈ الگن موجودہ وائسرائے ہند کے والد کی ماتحتی میں روانہ ہوئی۔ افریقہ پہونچنے پر ہندوستان کا غدر فرو کرنے کے لئے یہاں بھیجدی گئی اور ۲۷ر اکتوبر ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ اور کانپور کے مرحلوں کے بعد نانا راؤ کا تعاقب اور بعض مفسدوں کی سرکوبی فتح گڈھ میں کر کے دوبارہ لکھنؤ جارہی تھی۔ ۱۰ر فروری کو اناؤ میں

قیام تھا اور دس روز تک یہیں ٹھہرنا پڑا۔

میچل صاحب (جن کی کتاب سے ترجمہ کر کے یہ سرگذشت لکھی جاتی ہے) لکھتے ہیں کہ کہ ایک روز میں خیمہ کے اندر لیٹا ہوا تھا کہ سامنے سے ایک شخص کو صدا لگاتے سُنا۔ پلم کیک نہایت عمدہ پلم کیک اوّل جلیبو بعد میں خریدو۔ چونکہ بسکٹ اور معمولی گوشت کھاتے کھاتے جی اکتا گیا تھا، لہذا اس مٹھائی والے کا وہاں نکلنا بہت ہی اچھا معلوم ہوا اور اسے فوراً اندر بلا کر جلیبو نیاں شروع کیں۔ یہ مٹھائی فروش بڑا ہی خوبصورت جوان تھا۔ اس کے کپڑے انتہا درجہ کے سفید تھے داڑھی اور مونچھیں خوب چڑھی ہوئی تھیں، ماتھا چوڑا اور ناک ذرا خمدار تھی۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی اور باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ لشکری نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جو مزدور تھا بڑا ہی شریر معلوم ہوتا تھا۔

میں نے (یعنی میچل نے) اس سے پوچھا تمہارے پاس پاس ہے؟

مٹھائی فروش۔ جی ہاں کیوں نہیں لیجئے ملاحظہ فرمائیے۔ بریگیڈیر میجر صاحب نے نہیں خود بریگیڈیر صاحب نے دیا ہے۔ میں جیمی گرین کے نام سے مشہور ہوں اور ۵۳ رجمنٹ کے خانساماں کا لڑکا ہوں۔ شیرر صاحب مجسٹریٹ کانپور کی سفارشی چٹھی جنرل ہوپ صاحب کے نام لایا ہوں۔

میں نے چٹھی دیکھی تو واقعی شیرر صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی اور جنرل ہوپ صاحب کے نام تھی۔ مٹھائی فروش کی ہیبت کے علاوہ جس بات پر مجھ کو سخت حیرت تھی وہ اس کی صاف ستھری انگریزی تھی جس کو وہ نہایت بے تکلفی سے بولتا تھا۔ مجھ سے انگریزی اخبار لے کر پڑھنے لگا اور فوج کے متعلق ہر قسم کی بات چیت شروع کر دی۔ اُس نے پوچھنا شروع کیا۔ آج کل کتنے جوان ہیں۔؟ آپ نے لکھنؤ کے محاصرے کے لئے کیا کیا تیاریاں کی ہیں؟ آپ لوگ تو ولایت سے ابھی ابھی آرہے ہیں؟ گرمی کیسے گزاریئے گا؟

میں نے اس ضمن میں اس کی شستہ وشگفتہ انگریزی کا ذکر کیا تو کہنے لگا کہ میرا باپ مسکوٹ میں خانساماں ہے اُس نے بچپن میں مجھے انگریزی سکھلائی۔ میں نے رجمنٹ اسکول میں انگلش تعلیم پائی ہے عرصہ تک مسکوٹ کا کلرک بھی رہا ہوں وہاں سارا حساب وکتاب انگریزی ہی میں لکھتا تھا۔ اس عرصہ میں اس شریر نوکر اور ایک گورے میں لڑائی ہونے لگی۔ میں نے اُس سے کہا اے میاں تمہارا یہ نوکر تو بڑا ہی لڑاکا ہے! کہنے لگا حضور آپ اس کا خیال نہ فرمائیے۔ یہ بڑا ہی شریر ہے۔ آئرلینڈ کا رہنے والا ہے۔ اس کی ماں آٹھویں ایرش رجمنٹ میں رہتی ہے اور اس کا سب پرمذ رہا ہے۔ یہ پنجاب سے ابھی ابھی آگرہ کی فوج کے ہمراہ آیا ہے کانپور کے کمانیر نے اسے موقوف کردیا ہے کیونکہ اس کی میم نو عمر تھی اور نکمی جنون پر عاشق ہوگئی تھی۔

خیر مذاق تو ہوگیا۔ مگر مٹھائی لے کر قیمت نہ دینا آپ ہی کا کام ہے ان دلکش باتوں پر سب لوگ اس قدر ریجھ گئے کہ زبردستی اس گورے سے جس نے مٹھائی اس شریر نوکر سے چھین لی تھی دام دلوا دیئے۔ اُسی روز شام کو میں نے سُنا کہ جیمی گرین جو اپنے آپ کو مسکوٹ کے خانساماں کا بیٹا بتاتا تھا لکھنو کا جاسوس نکلا چونکہ شام ہوگئی تھی اس لئے اُسے پھانسی نہ دی گئی۔ میری حراست میں بھیجدیا گیا اور زائد سنتری پہرے کے لئے تعینات کردیئے گئے اس وقت مجھ کو بڑا صدمہ گذرا کیونکہ میں اُس کی اول ہی ملاقات سے اس کا دم بھرنے لگا تھا۔ اب میرا وہ تعجب بھی جاتا رہا کہ ایسا مہذب اور تعلیم یافتہ شخص لشکری بنا ہوا ہے۔

اُس کا نوکر وہ جلاد بوچر تھا جس نے جولائی ۱۸۵۷ء میں خون کی ندیاں بہائی تھیں اور فیچٹ صاحب نے اپنی کتاب میں جو حلیہ اس کا لکھا تھا وہ قطعی ٹھیک تھا کیونکہ وہ طویل القامت بدصورت، سیاہ فام اور چیچک رو تھا۔

جب یہ دونوں میرے پہرے میں نبیئے گئے تو بعض گوروں نے کہا ان کو بازاری سور کا

گوشت کھلانا چاہیئے لیکن میں نے صاف کہدیا کہ اگر کسی نے ایسی بات کا ارادہ بھی کیا تو میں فوراً حکم عدولی کے جرم میں حوالات کر دوں گا۔ میں نے یہ الفاظ جو ڈانٹ کر کہے سب ڈر گئے اور پھر کسی نے کچھ نہ کہا۔

جیمی گرین کے چہرے سے سچے شکریہ کے آثار پائے جاتے تھے کہنے لگا خدائے کریم اور اس کا رسول پاک آپ کو اس کا اجر دے گا۔ اور اس لڑائی میں بال تک آپ کا بیکا نہ ہوگا۔

میں نے یہ سنکر کہا کہ میں حتی الوسع تمہیں آزادی دلانے کی کوشش کروں گا اور اسے نماز پڑھنے کی اجازت دے دی۔ لیکن وہ شریر نوکر کہنے لگا میں ہرگز کافروں کا احسان نہیں لوں گا اس پر اس کا مالک یعنی جیمی گرین بولا" ارے کمبخت سارجنٹ صاحب (کیونکہ میں اس وقت سارجنٹ ہی تھا) کا ہم کو ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے ہمیں سُور کی چربی سے بچالیا۔

میں نے ارادہ کیا کہ آج تمام رات جاگوں ورنہ یہ لوگ کہیں بھاگ گئے تو مفت میں بدنام ہوں گا اور یہ تو میں خوب جانتا تھا کہ یہ رات اُن کی زندگی کی آخری رات ہے لہذا میں نے ایک مسلمان دوکاندار کو بُلا کر کہا کہ یہ جو مانگیں انھیں لادو اور قیمت مجھ سے لے جاؤ وہ کہنے لگا جب آپ عیسائی ہو کر اتنا سلوک کرتے ہیں تو تف ہے اُس مسلمان پر جو ایک پائی بھی لے۔ میں نے ایک کمبل جیمی گرین کو دیا اور اُسے اپنی سرگذشت سُنانے پر مجبور کیا۔

میں نے اس سے کہا سنو جیمی گرین یہ تم اور میں خوب جانتے ہیں کہ آج کی رات تمہاری زندگی اور ہے اور صبح کو ضرور پھانسی پر لٹکا دیئے جاؤ گے لہذا اگر تم مجھے اپنی پوری اور سچی سرگذشت سُناؤ تو میں بہت شکر گذار ہوں گا۔ اُس نے کہا صاحب آپ نے ہم پر اتنی بڑی عنایت کی ہے جس کی کچھ حد نہیں۔ میری سرگذشت آپ کان لگا کر سنیئے۔

میں بیگم کی فوج کا ایک افسر ہوں اور لکھنؤ سے محض اس غرض سے آیا تھا کہ اس فوج کی

جو ہمارے مقابلہ کو جارہی ہے حالت دیکھوں۔ میرا عہدہ فوج میں چیف انجنیر کا ہے اور خفیہ حالات دریافت کرنے نکلا ہوں۔ لیکن خدا کی مرضی میں کس کو دخل۔ لکھنؤ میں میرا انتظار ہوگا اور یہاں میں موت کے منہ میں جانا چاہتا ہوں اگر نصیب یاور ہوتا تو آج رات ہی جا پہنچتا کیونکہ ضروری بات دریافت کر چکا تھا مگر ناؤ راہ میں پڑ جانے کے سبب اس لالچ میں آگیا کہ دیکھوں محاصرہ کرنے والی فوج جلدی کرے نہیں۔ اس ولدالزنا قصاب نے مجھ کو جاسوس کہہ کر گرفتار کرا دیا۔ یہ مردود وہ ہے جس نے اول انگریزوں کو پھانسی دلوائی اور خود قتل کیا اور اب خود اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے میں نے ٹوک کر کہا تمہارا اصلی نام کیا ہے؟ میں تمہارے حالات لکھ کر اپنے دوستوں کو اسکاٹ لینڈ اور لندن میں بھیجنے والا ہوں اس نے کہا آپ مجھ سے میرا نام دریافت کرنا چاہتے ہیں اور اپنے اسکاچ دوستوں کو میرا حال لکھنا چاہتے ہیں خیر مجھے اس سے کوئی تعرض نہیں۔ انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے لوگ منصف مزاج ہیں وہ میری سرگذشت پڑھ کر ضرور متاسف ہوں گے خود میرے بھی دوست لندن اور اڈنبرا میں موجود ہیں۔ میں وہاں دو دفعہ ہو آیا ہوں میرا نام محمد علی خاں ہے میں روہیلکھنڈ کے ایک بڑے شریف خاندان سے ہوں میں نے بریلی کالج میں تعلیم پائی ہے اور انگریزی زبان میں خصوصاً بڑا نام پیدا کیا ہے۔ بریلی کالج سے انجینرنگ کالج رڑکی گیا تاکہ سرکار کمپنی کی ملازمت اختیار کروں۔ رڑکی کالج کے امتحان میں اول آیا۔ اور تمام انگریزوں سے میں نے بہت زیادہ نمبر پائے۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کے انجینروں میں صرف جمعدار مقرر ہوا اور اس سارجنٹ کی ماتحتی میں دیا گیا جو سوائے جہالت اور وحشی پن کے مجھ سے ہر بات میں کم تھا۔ اگر ولایت میں ہوتا تو صرف بڑھئی ہوتا۔ ہم دونوں پہاڑ پر تعینات ہوئے۔ جیسے اکثر خر دماغ ہوا کرتے ہیں وہ بھی پورا ان عیبوں کی مجسم تصویر تھا۔

یعنی مغرور خود رائے اور خود غرض۔ انھیں باتوں سے ہم لوگ سخت نفرت کرتے ہیں۔ جب تک آپ ہم لوگوں کی زبان نہ سکھیں اور شرفاء سے میل جول پیدا نہ کریں اس وقت تک نہ آپ جان سکتے ہیں اور نہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے کندہ ناتراش سے آپ کی قومی عظمت اور ناموری پر کتنا بڑا دھبا لگتا ہے ایسی ہی مثالیں آپ کے وہ دشمن اپنے دعووں کی تصدیق میں پیش کیا کرتے ہیں جو اپنے دل کے پھپولے پھوڑنے کو آپ کی قوم کی رعونت اور خود غرضی کا ذکر کر کے آپ کے فیاضانہ خیالات اور ہمدردی کو محض دھوکے کی ٹٹی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کمپنی کی ملازمت روپیہ کے خیال سے نہیں بلکہ معزز عہدہ حاصل کرنے کی اُمید پر کی تھی مگر بسم اللہ ہی غلط ہوئی اس لئے کہ میں جس کی صورت سے متنفر تھا اسی کی ماتحتی میں دبا گیا۔ میں نے تھوڑے دنوں کے بعد اپنے والد کو لکھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں استعفےٰ دیدوں وہ راضی ہو گئے اور کہا کہ نسل ملوک سے ہو۔ ان صورتوں میں ہرگز نوکری مت کرو۔ میں فوراً ملازمت چھوڑ کر چلا آیا اور ارادہ کیا کہ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کی نوکری اختیار کروں لکھنؤ میں پہونچتے ہی سُنا کہ مہاراجہ جنگ بہادر والی نیپال آج کل گورکھپور میں لکھنؤ کے خلاف تیاری کر رہے ہیں اور انگلستان جانے کے لئے ایک لائق انگریزی داں سکریٹری چاہتے ہیں۔ میں نے فوراً درخواست دی اور بڑی سفارشوں سے اس عہدہ پر مقرر ہو گیا۔ اور مہاراجہ صاحب بہادر کے ہمراہ اوّل دفعہ انگلینڈ گیا۔ منجملہ دیگر مقامات کے ایڈنبرا بھی دیکھا جہاں آپ کی ہی رجمنٹ مہاراج کے استقبال کو آئی تھی۔ مجھے خود بخود خیال ہوا کہ یہ پلٹن کسی دن ضرور مجھے قید کرے گی۔ چنانچہ وہی ہوا۔ میں ہندوستان واپس آکر بعض رجواڑوں میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہا اور ۱۸۵۵ء میں عظیم اللہ خاں نے جس کا نام آپ نے غدر کے سلسلے میں بہت کچھ سُنا ہوگا۔ مجھ سے انگلستان چلنے کو کہا بعد وفات پیشوا۔ نانا راؤ نے عظیم اللہ خاں کو اپنا سربراہ مقرر کیا تھا اس نے بھی میری طرح ماسٹر گنگادین سے گورنمنٹ

اسکول کانپور میں انگریزی خوب تحصیل کی تھی اور اُسے قوی اُمید تھی کہ انگلستان میں پہونچکر ضرور لارڈ ڈلہوزی کا حکم اپنے آقا پر سے منسوخ کرالوں گا جب میں اُن کے پاس پہونچا تو وہ ولایت جانے کو پا بر کاب تھے ان کو بہت سا روپیہ اس غرض سے دیا گیا تھا کہ حسب دلخواہ تکمیل کریں اور درصورت ضرورت حکام کی مٹھی بھی گرم کریں۔ میں اس سفارت کا حال آپ کو بتانا نہیں چاہتا آپ خوب واقف ہیں کہ ہم لوگوں کی آؤ بھگت تو خوب ہوئی مگر مطلب خاک بھی نہ نکلا اور ہم پانچ لاکھ روپیہ خراب کر کے وہاں سے چلدیئے اور براہ قسطنطنیہ ہندوستان کو ۱۸۵۵ء میں روانہ ہوئے قسطنطنیہ سے ہم کریمیا گئے۔ اور یہیں پر ہم نے دیکھا کہ ۱۸ جون کو انگریزوں نے حملہ کیا۔ مگر شکست کھائی۔ سباسٹپول کے سامنے دونوں فوجوں کی حالتِ زار دیکھکر ہمارے دل پر بڑا اثر ہوا۔ میدانِ جنگ سے پھر قسطنطنیہ لوٹے یہاں ہمیں کئی روسی افسر ملے وہ سچے ہوں یا جھوٹے یہ ہم نہیں جانتے مگر وہ ہم سے کہنے لگے کہ اگر تم لوگ ہندوستان میں غدر پھیلادو تو ہم ہر طرح مدد کریں گے اور تمہارا بڑا فائدہ ہوگا۔ اب تو میں نے اور عظیم اللہ خاں نے ارادہ کر لیا کہ کسی طرح کمپنی کا راج سرزمین ہندوستان سے کھودیں اور خدا کا شکر ہے کہ ہم اس بارہ میں کامیاب بھی ہوگئے کیونکہ اُن اخبارات سے جو آپ نے عنایت فرمائے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور اب اُن کو لوٹ مار اور ضبطی کے لئے فرمان نہ ملے گا۔ اگرچہ ہم انگریزوں سے ملک نہ چھین سکے لیکن تب بھی ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے ملک کو کچھ فائدہ ضرور پہونچایا ہے اور ہماری جانیں بے فائدہ تلف نہ ہوں گی۔ کیونکہ میں یقینی جانتا ہوں کہ پارلیمنٹ کی حکومت کمپنی کے راج سے زیادہ عادلانہ ہوگی گو کہ میں اس زمانہ میں زندہ نہیں ہوں گا لیکن ہمارے مظلوم اور مصیبت زدہ ہموطن کسی آئندہ وقت میں ضرور زیادہ امن چین سے زندگی بسر کریں گے۔ صاحب اس بات کو آپ خوب سمجھ لیں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ہرگز نہ تو

آپ کی خوشامد کے خیال سے ہے اور نہ اس اُمید پر کہ آپ مجھ پر زیادہ مہربانی کریں گے اس لئے کہ یہ تو مجھے حاصل ہی ہے اور میں خوب جانتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر آپ کر بھی نہیں سکتے اور اگر کرنی چاہیں تو آپ کو ادائے فرض منصبی کا خیال کبھی ہرگز نہیں کرنے دیگا۔ یہ تو صاف ظاہر ہی ہے کہ ہماری موت آ پہونچی ہے لیکن جو غیر مترقبہ احسان آپ نے میرے ساتھ کیا ہے اس کی وجہ سے میں دل کھول کر آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔ اس ڈیرہ کی طرف آتے ہوئے تو ضرور میں دل میں گالیاں دیتا اور بڑا کہتا آتا تھا۔ مگر آپ کی دوبارہ عنایتوں کو دیکھکر دل میں بہت خفیف اور شرمندہ ہوں اور افسوس کرتا ہوں کہ ایامِ غدر میں کیوں اس قدر کشت و خون ہوا۔ اوّل موقع وہ تھا جب کرنیل نیپیر صاحب انجنیر کانپور گھاٹ پر حال ہی میں کچھ ہندوؤں کے مندر گرا رہے تھے کہ چند ہندو پجاری اُن کے پاس آئے اور ملتجی ہوئے کہ مندروں کو نہ تڑوائیے۔ کرنیل صاحب نے جواب دیا۔ "سُنیئے صاحب جب میمیں اور بچے قتل ہوئے تو آپ سب یہیں تھے اور یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ہم بدلہ لینے کے خیال سے مندروں کو نہیں ڈھا رہے ہیں۔ بلکہ کشتیوں کے پل اور فوجی حفاظت کے خیال سے ایسا کر رہے ہیں لیکن اگر ایک متنفس بھی تم میں سے یہ بات ثابت کر دے کہ تم نے کسی ایک بھی انگریز بچہ۔ میم کے ساتھ ذرا سا بھی سلوک کیا ہے اور یہ بھی نہیں بلکہ اتنا بتلا سکو کہ ایک لفظ بھی کسی کی جان بچانے کو کہا ہے تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ جہاں ایسا شخص پوجا کیا کرتا ہے، میں اس مندر کو بجنسہٖ قائم رہنے دوں گا" میں اس مجمع میں کرنیل کے قریب ہی کھڑا تھا اور دل میں اُن کی باتوں پر کہہ رہا تھا۔ ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اس تقریر پر سب دم بخود ہو گئے اور سارے برہمن وہاں سے کھسک گئے کرنیل صاحب نے

اشارہ کیا اور مندر ٹوٹنا شروع ہوگئے۔

مجھ پر اس تقریر کا ایسا اثر ہوا کہ میں بھی فوراً وہاں سے چل دیا۔ جس وقت کانپور میں غدر ہوا میں اپنے وطن روہیلکھنڈ میں تھا، سوائے میدان جنگ کے میرے ان ہاتھوں نے کبھی خون نہیں بہایا۔ میں سمجھتا تھا کہ طوفان اب آیا چاہتا ہے اور اسی سبب سے میں اپنے گاؤں میں بال بچوں کی حفاظت کرنے گیا تھا میں ابھی گاؤں میں ہی تھا کہ میرٹھ اور بریلی کے غدر کی خبر آئی۔ میں فوراً بریلی کی پلٹن میں جا ملا اور اس کے ہمراہ دہلی گیا وہاں میں انجینئر اور اس کے بعد چیف انجینئر مقرر ہو گیا اور سرکار کمپنی کے انجینیوں کی مدد سے جنھوں نے رڑکی سے میرٹھ جاتے ہوئے بغاوت کی تھی، قلعوں وغیرہ کی مضبوطی کرنے لگا۔ بعدہٗ میں نے اس منتشر فوج کے آدمی جمع کر کے لکھنؤ کا راستہ لیا۔ ہم لوگ متھرا پہونچے تو وہاں مقام کرنا پڑا اور جب میں نے جمنا پر کشتیوں کا پل بنا کر فوج کو پار اتار دیا تب ہم وہاں سے روانہ ہوئے اس وقت بھی فیروز شاہ اور جنرل بخت خاں کے پاس تیس ہزار فوج تھی۔ جب میں لکھنؤ پہونچا تو چیف انجینئر مقرر کیا گیا نومبر کے مہینہ میں آپکی رجمنٹ نے رزیڈنسی کو بچایا تو میں وہیں تھا۔

سکندر باغ کا قتل میں نے بچشم خود دیکھا تھا۔ اس جگہ کی مرمت پچھلی ہی رات کو میں نے کرائی تھی اور جب آپ کا دھاوا ہوا تو میں شاہ نجف سے دیکھ رہا تھا۔ لکھنؤ کی فوج کے کچھ اوپر تین ہزار چیدہ جوان میں نے سکندر باغ میں تعینات کر دیئے تھے۔ مگر وہاں سے ایک متنفس بھی بچکر نہ گیا۔ مجھے اس وقت غش آگیا اور جب میں نے دیکھا کہ ہرا جھنڈا جو میں نے رات کو نصب کیا تھا اُتر گیا۔ اس کی جگہ گھاگرا پلٹن کے جھنڈے لہرا رہے ہیں تو میرا جگر پارہ پارہ ہو گیا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو توپوں کے سر کرنے کا حکم دیا۔

اس کے بعد بار بار لکھنؤ اور اس کے قرب وجوار کے قلعوں وغیر کی مرمت کرتا رہا۔ آپ جا کر دیکھیں گے کہ سپاہی اور گولنداز اگر اُن کے پیچھے قدم جمائے کھڑے رہیں تو انگریزوں کی بہت سی فوج کام آ جائے گی۔ تب کہیں لکھنؤ جا کر ہاتھ آئیگا۔"

اتنی کہانی کہہ کر محمد علی خاں بیٹھ گیا اور پانی پی کر تھوڑا سا کھانا کھایا۔

اس کے بعد میں نے دریافت کیا کہ یہ تمہارے ساتھ والا شخص جیسے تم بیگی کہہ کر پکارتے ہو درحقیقت وہی ہے جس نے نانا راؤ کے حکم سے گذشتہ مئی میں میموں اور بچوں کو ذبح کیا تھا کہنے لگا بیشک وہی ہے مگر جس وقت میں نے نوکر رکھا تھا یہ مجھے نہیں معلوم تھا اور اگر یہ جانتا کہ اس نے میموں اور بچوں کو ذبح کیا ہے تو میں ہرگز اس کو ساتھ نہ لیتا۔ کیونکہ اسی کے سبب سے تو یہ مصیبت ہم پر نازل ہوئی تھی۔ کابل کی کوٹھری میں جا کر آدمی بے داغ نہیں نکل سکتا ہے۔ اب مجھے بھی یقین ہے کہ سختیاں جھیلنا پڑیں گی۔ ایسے ہی مردودوں کے کرتوتوں نے تو یہ قہر خداوندی ہم پر نازل کر لیا ہے۔

تب میں نے کہا کہ تمہاری رائے میں یہ افواہ کہاں تک صحیح ہے کہ میمیں اوّل خراب کی گئیں اور پھر ماری گئیں اس پر بولا صاحب آپ اجنبی ہیں ورنہ ایسا سوال نہ پوچھتے۔ جو شخص یہاں کے رسم ورواج اور ذات برادری کے سخت قاعدوں سے واقف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ یہ سب محض جھوٹی کہانیاں ہیں اور طرفین کے بھڑکانے کو گڑھی گئی ہیں حالانکہ اب کیا کم نفرت ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ عورتیں اور بچے نہایت بیرحمی سے مارے گئے مگر کسی کی آبرو ریزی نہیں کی گئی اور یہ عبارتیں جو کانپور کے بنگلوں پر لکھی ہیں کہ "ہم حبشیوں کے ہاتھ قید ہیں انھوں نے بوڑھی اور جوان سب عورتوں کو بے عزت کیا ہے اور اسی قسم کی جو خبریں ہندوستان کے اخباروں میں شائع ہوئی ہیں اور اُن سے لندن کے اخبارات نے نقل کی ہیں قطعی بناوٹ

ہیں۔ اور جنرل سرہنری ہیولاک اور جنرل سر جیمس اوٹرام کے کانپور فتح کرنے کے بعد لکھی گئی ہیں
گو میں وہاں نہیں تھا مگر میں نے اُن سے یہ سب باتیں سنی ہیں جو وہاں موجود تھے اور میں
جانتا ہوں یہ بالکل سچ ہے۔

پھر میں نے پوچھا کہ نانا راؤ نے کیوں اس قدر خونریزی کی؟ کہنے لگا ایشیا کے باشندے
کمزور ہیں اور اُن کے اقرار بھروسے کے قابل نہیں ہوتے مگر اس کی وجہ ہمیشہ یہ نہیں ہوتی کہ
وہ ظلم کا ارادہ ہی کر لیتے ہیں بلکہ احسان کرنے میں بے پروائی سے کام لیتے ہیں جب وہ
پورا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو پورا بھی کرتے ہیں۔ جب اس کو پورا کرنے میں انھیں کسی قسم کی
تکلیف ہوتی ہے تو وہ اُسے بھول جاتے ہیں۔

اور غالباً یہی حال نانا راؤ کا تھا۔ وہ عورتوں اور بچوں کو بچانا چاہتا تھا۔ مگر اس
کے حرم میں ایک عورت تھی جو غلامی سے آزاد کر کے زنانے میں داخل کر لی گئی تھی وہ مجسم شیطان
اور میموں کی جانی دشمن تھی۔ اس کے علاوہ خود نانا راؤ عظیم اللہ خاں وغیرہ ایسے لوگوں میں
گھرا ہوا تھا جو چاہتے تھے کہ وہ ایسا غدر میں گھر جائے جس سے رہائی ناممکن ہو۔

اس طرح اس عورت کو مدد ملی اور اُس نے میموں کو قتل کرنے کی زبردستی اجازت لے لی
مگر جب چھٹی کالی پلٹن اور نانا راؤ کے باڈی گارڈ نے انھیں قتل کرنے سے انکار کر دیا تو اس عورت
نے ان بدذاتوں کو ڈھونڈھ بلایا۔

یہ حالات میں نے جنرل تانتیا ٹوپے سے سُنے ہیں اس سے اور نانا سے اس بات میں
جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔

میں سچ کہتا ہوں کہ کانپور کی عورتوں اور بچوں کا قتل صرف اسی عورت کے سبب سے
ہوا۔ اور عورت سے بڑھکر کوئی شیطان بھی نہیں ہے۔ مگر میں نے کبھی پوچھا نہ مجھے معلوم ہے

کہ وہ کیوں انگریزوں سے اس قدر جلتی تھی۔ اس چھوکری کا ذکر ہندوستان کے گواہوں نے کیا ہے جو قتل کانپور کے بارہ میں سُنے گئے ہیں۔

اس کے بعد میں نے پوچھا کہ ان افواہوں کی بھی کوئی اصل ہے کہ جنرل وہیلر کی بیٹی چار پانچ آدمیوں کو پستول سے ٹھنڈا کر کے کانپور کے مشہور کنوئیں میں کود پڑی،

اس کے جواب میں کہا کہ یہ گپیں ہیں اور بالکل بے اصل، جنرل وہیلر کی بیٹی اب تک زندہ ہے وہ لکھنؤ میں ہے اور مسلمان ہوگئی ہے اور از روئے شرع شریف جس نے اس کی جان بچائی ہے اس سے نکاح کر لیا ہے مگر میں یہ نہیں کہتا کہ وہ پھر اپنے ہم قوموں میں آملے گی یا نہیں

اس قسم کی باتوں میں میں نے آنکھوں میں رات کاٹی اور صبح کو میں نے محمد علی خاں کو اجازت دیدی کہ وضو کر کے نماز فجر ادا کرلے۔ بعد فراغ نماز اُس نے دعا مانگی کہ یا خدا اس شخص کو ان احسانوں کا جو تیرے مظلوم بندوں پر اس نے کئے ہیں جزائے خیر دے۔

یہ کہکر اس کا دل بھر آیا۔ میں نے رونے کا سبب پوچھا تو اُس نے اپنی بی بی اور بچوں کا ذکر کیا اور کہنے لگا اُنھیں مجھ بدنصیب کا کیا حال معلوم ہوگا، مگر فوراً ہی دل مضبوط کر کے کہنے لگا میں نے فرانس اور انگلستان کی تاریخیں پڑھی ہیں اور ایسا تھڑدلا نہیں بننا چاہیئے یہ کہہ کر ایک سونے کی انگوٹھی جو اُس کے بالوں میں چھپی ہوئی تھی نکالی اور مجھ سے کہا کہ اس کو آپ مری دلی احسانمندی کی نشانی سمجھ کر رکھئے، میری ساری چیزیں چھین لی گئیں جب میں گرفتار ہوا تھا۔ اور اب سوائے اس کے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ انگوٹھی ظاہرا دس بارہ کی معلوم ہوتی ہے مگر جب آپ اس کے خواص سُنیں گے تو لاکھ روپیہ سے زیادہ پائیں گے یہ مجھے ایک بزرگ نے قسطنطنیہ میں حرز جان بنا کر دی تھی لیکن جب سے اس شہر پر نوکر قصائی کا سانحہ ہوا اس کا اثر اُتر گیا ہے۔

میں نے اُسے قبول کر لیا اور اس نے دُعا دی کہ خدا تمہیں ہمیشہ امن و امان میں رکھے محمد علی خاں نے یہ بھی مجھ سے کہا کہ جب آپ لکھنؤ کے قلعوں کے پاس پہونچیں تو اسے دیکھ کر مجھے یاد کر لیجیے گا پھر آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ وہ بات بھی پوری نہیں کرنے پایا تھا کہ گارڈ لینے کے لئے آ پہونچا اور میں نے بادل ناخواستہ اسے حوالہ کیا۔ ہماری فوج کو فوراً صبح کے وقت لکھنؤ کی طرف کوچ کرنے کا حکم ملا۔ مگر میری خاص کمپنی کو حکم تھا کہ سب سے بعد کو جائے۔ جب ہم چلے تو دن خوب چڑھ گیا تھا اور جو سڑک کانپور سے لکھنؤ کو جاتی تھی اس پر جاتے ہوئے ایک درخت کے نیچے سے گذرے میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو محمد علی خاں اور اس کے نوکر بوچہ کی لاشیں ننگی لٹکی ہوئی تھیں اور کسی قدر راکھ بھی گئی تھیں۔ میں کانپ گیا اور میرے آنسو ٹپکنے لگے۔

۱۱ مارچ کو بیگم کی کوٹھی پر دھاوا کرتے وقت میں نے محمد علی خاں والی انگوٹھی دیکھی اور اس کو یاد کیا۔ میں سچے دل سے کہتا ہوں کہ بعد کے معرکوں میں میرے رگڑا تک نہ لگی زخم کا تو ذکر کیا ہے۔

جب کبھی مجھے ان احسانات کا خیال آتا ہے جو میں نے اُس نامراد محمد علی خاں کے ساتھ کئے تھے تو کیسا ہی خطرہ ہوتا میں ذرا بھی نہ جھجکتا۔ یہ انگوٹھی میرے پاس اب تک موجود ہے اور غدر کی لوٹ مار میں صرف یہی ایک چیز ہے جو مجھے ملی۔ جب میں مرتے وقت اپنے بچوں کو دوں گا تو انھیں محمد علی خاں کا بھی حال بتا دوں گا۔

مترجم
محمد شفیع مراد آبادی مرحوم
۲۷ جولائی ۱۸۹۶ء

(مصنف علی گڈھ بابتہ مارچ ۱۸۹۳ء)

تصویر کا دوسرا رُخ
انتقامی جذبات کی دردانگیز داستان
انگریزی درندگی کے خونیں نظارے

مذہبی، سیاسی، اقتصادی، تباہی کا ایک سچا تقاضا تھا جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب انگیز ہنگامے کی شکل میں رونما ہوا جس کے متعلق "مسٹر لیکی" کا یہ قول ہے۔

"اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جا سکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کی بغاوت ہے۔"

لارڈ رابرٹس نے مسٹر اتین کے نام ایک خط بنام لارڈ کیننگ وائسرائے ہند کا ایک آخری جملہ نقل کیا ہے۔

"میرے نزدیک ان کارتوسوں کے استعمال سے سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو ناقابل برداشت طریقہ سے ٹھکرا دیا گیا تھا۔[1]"

مگر اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ تہذیب و اخلاق کے دعویداروں نے اس حق بجانب بغاوت کا کیا علاج کیا۔ اور مذہبی مجنونوں کی اصلاح کے لئے ان ہوشیار دانشمندوں کا طرزِ عمل کیا تھا جو یورپ سے خدمتِ خلق کے لئے سات سمندر پار کر کے ہندوستان آئے تھے۔

کلیجہ تھام لوگے جب سنوگے
نہ سنوائے خدا شیون کسی کا

---

[1] انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ۔ ص ۲۸

ابتدائے انتقام کارتوسوں کے انکار پر جو انسانیت سوز سزا دی گئی تھی ایک انگریز مورخ نے اس کا فوٹو مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچا ہے۔

بندوقوں اور سنگینوں کے پہرہ میں پچاسی جوانوں کو اُن کے اپنے فوجی لباس میں سپاہیوں کی حیثیت میں فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور سزا کو بلند آواز سے سُنایا گیا جس کا مقصد سپاہیوں کو بدکار مجرموں کی فہرست میں داخل کرنا تھا۔ فوجی نشانات اُن سے چھین لئے گئے۔ وردیاں اُن کی پشت کی طرف سے پھاڑ دی گئیں۔ پھر لوہار زنجیریں اور اوزار لیکر آگے بڑھے اور آناً فاناً میں وہ پچاسی جوان اپنے ساتھیوں کے اس عظیم الشان مجمع کے سامنے انتہائی بے عزتی کی تمام نشانات اور ظاہر علامات کے ساتھ۔ یعنی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے نظر آئے۔

یہ نہایت ہی دردناک اور ذلت آفریں نظارہ تھا جس سے سپاہی بے حد متاثر ہوئے۔ بالخصوص جب اُنھوں نے اپنے بدقسمت ساتھیوں کی اس ناگفتہ بہ حالت اور مایوسانہ انداز کو دیکھا۔ حالانکہ بعض اُن میں سے اپنی پلٹن میں نہایت ہر دلعزیز تھے اور متعدد دفعہ انھوں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر برٹش حکومت کی ترقی اور وفاداری کا ثبوت بھی دیا تھا۔ قیدیوں نے ہاتھ اُٹھا کر باآواز بلند جرنیل سے گڑگڑا کر رحم کی التجا کی کہ ان کو اس شدید مصیبت اور ہلاکت سے بچایا جائے۔ پھر یہ دیکھ کر کہ اس طریقے سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہو سکتا وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور اس بے عزتی کو خاموشی سے برداشت کرنے پر اُنھیں شرمندہ کیا اور غیرت دلائی۔ اس وقت ایک بھی سپاہی اس میدان میں ایسا موجود نہ تھا جس نے اپنے سینہ میں اس واقعہ سے رنج اور نفرت کے جذبات اُٹھتے ہوئے محسوس نہ کئے ہوں۔ لیکن بھری ہوئی میدانی توپوں اور بندوقوں اور سواروں کے چمکتے

ہوئے خنجروں کی موجودگی میں حملہ کرنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ قیدیوں کو اُن کی کوٹھریوں میں لے گئے جن پر پہرہ دینے کے لئے اُنھیں کے ساتھیوں کو متعین کیا گیا۔[۵]

پھانسی

یہ سزا انگریز کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ اُس نے بغاوت کی ہو۔ چنانچہ کوپر ڈپٹی کمشنر امرتسر لکھتا ہے۔

مسٹر مونٹ گمری کے حکم سے پنجاب میں بھی جہاں عام طور پر لوگ ابھی تک وفادار ہیں ایک سکھ پلٹن کے صوبیدار سوار پولیس کے رسالدار اور ایک داروغہ جیل کو فرض کی کوتاہی کے الزام میں پھانسی پر لٹکانا ضروری سمجھا گیا اس سے مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بخوبی ذہن نشین ہو جائے کہ پنجاب کے حکام ابتدا ہی میں بلا توقف تشدد دانہ کارروائی کرنے کی پالیسی سے لوگوں کے دلوں میں اپنا رعب قائم کرنا چاہتے ہیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے اس نیم وحشی ملک میں وقار قائم رکھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف ایک سخت پالیسی کا مقصد

۵؎ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ایک عرصہ تک تو ظالم نے اپنے ظلم کا اعتراف ہی نہ کیا اور مظلوم اتنا تباہ ہو چکا تھا کہ اس کو بھی چار و ناچار سکوت اور خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مگر دلوں کی دبی ہوئی چنگاریاں جن کو ظالم کے آئے دن کے نئے نئے ظلم ہوا دیتے ہیں آخر کب تک چھپی اور دبی ہوئی رہ سکتی ہیں۔ انھوں نے اہل ہند کے جگر اور دل کو اندر ہی اندر جلانا اور پکانا شروع کیا۔ تب کچھ انگریزوں نے محسوس کیا کہ اُن کو بھی ہندوستانیوں کا ہمنوا ہو کر ان چنگاریوں کو بجھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دبی ہوئی چنگاریاں برطانیہ کے خرمن شہنشاہیت کے لئے برق سوزاں بن جائیں۔ اس نظریہ کے بموجب مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے ساٹھ سال گذرنے کے بعد اعتراف ظلم کرتے ہوئے جدید ڈپلومیسی سے ان چنگاریوں کو بجھانا چاہا۔ چنانچہ ایک کتاب "اَدر سائیڈ آف دی میڈل" جس کا ترجمہ شیخ حسام الدین صاحب بی اے نے اُردو میں کیا اور اس کا نام انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ رکھا۔ یہ اسی کتاب کا اقتباس ہے۔

یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ حکومت رعایا سے غیر مشروط اور غیر مبہم وفاداری چاہتی ہے۔ نہ کہ رعایا کی بردباری کے بھروسہ پر جو ایک حد تک گورنمنٹ کے استقلال کی شکست کے مرادف ہی[۵۱] کو یہ ہمیں بتاتا ہے۔

قیدیوں کی دائمی نجات کا راستہ نہایت آسان تھا یعنی باغیوں کو دیکھکر فی الفور نکلسن کا نعرہ بلند کیا جاتا تھا "پھانسی پر لے چلو"[۵۲]

ایک پادری کی بیوہ نہایت فاتحانہ انداز میں لکھتی ہے۔

"جب بہت سے باغی گرفتار کر لئے گئے تو انھیں حکم دیا گیا کہ وہ گرجے کے فرش کو صاف کریں مگر باوجودیکہ یہ لوگ اپنے مذہبی معتقدات کی بنا پر اس قسم کا کام خلاف سمجھتے تھے پھر بھی سنگین کی نوک سے انھیں اس حقیر کام کے لئے مجبور کیا گیا۔ ان میں سے بعض نے نہایت پھرتی کے ساتھ اس کام کو سرانجام دیا۔ محض اس خیال سے کہ شاید پھانسی کی سزا سے بچ جائیں۔ لیکن بے سود۔ کیونکہ وہ سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔"[۵۳]

مجینڈی لکھتا ہے:۔

"وہ رات ہم نے جامع مسجد پر پہرہ دیتے ہوئے بسر کی اور ہمارا زیادہ تر وقت ان قیدیوں کو گولی سے اڑا دینے یا پھانسی پر لٹکا دینے میں گذرتا تھا جن کو ہم نے صبح کے وقت گرفتار کیا تھا ان میں سے بہت سے بیچارے تو اسی جگہ ختم ہو گئے۔ لیکن آخر وقت تک ان کے چہروں سے شجاعت اور ضبط کے آثار ہویدا تھے۔ جو اس سے کسی بڑے مقصد کے شایان شان علامات تھیں۔"[۵۴]

---

۵۱ تصویر کا دوسرا رخ ص۴۰ ۵۲ ایضاً ص۴۵ ۵۳ ایضاً ص۴۵ ۵۴ ایضاً ص۴۶

پلٹن نمبر ۱۰ کا قصور اور اس کی سزا پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار ٹائمز نے لکھا تھا
"بغاوت کے اعلان سے ۴۸ گھنٹے کے اندر پانچسو آدمیوں کو پھانسی دی گئی
سوال ہوتا ہے کہ جرم کیا تھا۔ درانحالیکہ خود ذمہ دار حکام کی رپورٹ سے
تصدیق ہو چکی ہے کہ باغی بالکل نہتے تھے اور طوفان سے ڈر کر بھاگ نکلے
تھے۔ نیز محاصرے کے وقت بھوک اور مسافت کی تکلیف اور صدمے سے اُن
کی حالت نیم مردہ انسانوں کی تھی[۱]

بہر حال ہندوستانیوں کو اس کثرت سے پھانسیاں دی گئیں جو بیان سے باہر ہے (الٰہ آباد سے کانپور آتے ہوئے) دو دن کے اندر بیالیس آدمیوں کو سڑک کے کنارے پھانسی دی گئی اور بارہ آدمیوں کو تو صرف اس جرم میں پھانسی دی گئی کہ جب فوج مارچ کرتی ہوئی اُن کے سامنے سے گذری تو اُن کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے۔

جہاں جہاں فوج نے پڑاؤ ڈالے وہاں پر قرب و جوار کے تمام دیہات جلے ہوئے تھے یہ کہنا کہ یہ سب کانپور کے مظالم کے حادثہ کا جواب تھے صحیح نہیں ہے کیونکہ کانپور کا شیطانی واقعہ ان خوفناک حوادث کے بہت بعد پیش آیا۔

آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے عورتوں، مردوں، بچوں، بوڑھوں تک کو بھی پھانسی کے تختوں پر لٹکایا گیا[۳]

میں نے ایک گوالے سے کہا میں تمہاری جان بخشی کر دیتا ہوں۔ بشرطیکہ تم اس کے عوض میں کوئی تین نام ایسے بتاؤ جن کو تمہارے عوض میں پھانسی دی جائے[۴]

۱؎ تصویر کا دوسرا رُخ ص۵۹ ۲؎ ایضاً ص۶۰ ۳؎ ایضاً ص۶۳ ۴؎ ایضاً ص۶۴

(دہلی میں) خونریزی کے عادی سپاہیوں نے جوش انتقام کو فرو کرنے کے لئے پھانسی دینے والے جلادوں کو رشوت دیکر آمادہ کیا تھا کہ وہ پھانسی کے تختہ پر زیادہ دیر تک لٹکتے رہنے دیں تاکہ لاش کے تڑپنے کی دردناک کیفیت دیکھکر جیسے وہ ناچ کہتے تھے اپنی خونخوار طبائع کے لئے دلچسپی کا سامان بنا سکیں۔ جھجر کے نواب صاحب کو جان دینے میں بہت عرصہ لگا۔[۵۱]

درختوں پر لٹکاکر پھانسی

بنارس اور الہ آباد میں کانپور کے واقعہ سے پہلے ایک موقعہ پر چند نوجوان لڑکوں کو محض اس بناء پر پھانسی دی گئی کہ انھوں نے شوقیہ طور پر باغیوں کی جھنڈیاں اُٹھاکر بازاروں میں منادی کی تھی، سزائے موت دینے والی عدالت کے ایک افسر نے پُرنم آنکھوں سے کمانڈنگ افسر کے پاس جاکر درخواست کی کہ ان نابالغ مجرموں پر رحم کر کے پھانسی کی سزا کو تبدیل کر دیا جائے۔ لیکن بے سود۔

اس تمام سلسلے میں بیشمار ایسے واقعات ملیں گے جن میں اس قسم کی نمائشی عدالتوں تک سے بھی گریز کیا گیا۔ اور بے گناہ انسانوں کو بیدریغ قتل کیا گیا۔ پھانسیاں دینے کے لئے رضاکارانہ ٹولیاں بنائی گئیں جنھوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے دیہات کا دورہ کیا اس حالت میں کہ اُن کے پاس پھانسی دینے کا سامان بھی مکمل نہیں تھا۔ اور نہ ہی کسی کو پھانسی دینے کے طریقہ سے پوری واقفیت تھی۔ چنانچہ اُن میں سے ایک شریف آدمی اپنی شاندار کامیابی کا اس طرح فخریہ اظہار کرتا تھا کہ ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی استعمال کرتے تھے یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھاکر درخت کے نیچے لیجاتے تھے اور اوپر سے رسہ ڈالکر ہاتھی کو ہنکایا جاتا تھا یہاں تک کہ ملزم اس طرح تڑپنے اور جانکنی کی حالت میں اکثر اوقات انگریزی کے آٹھ (8) کے ہندسہ کی دلچسپ شکل بن کر رہ جاتا تھا۔[۵۳]

---

۵۱ عبدالرحمٰن خاں شہید ۵۲ تصویر کا دوسرا رُخ ص۶۵ ۵۳ ایضاً ص۶۴

لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا۔ چنانچہ ہر ایسے ہندوستانی کو قطع نظر اس سے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی بے دریغ تہ تیغ کیا گیا یہاں تک کہ نہ کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا اور نہ اس قسم کا کوئی تکلف روا رکھا جاتا بلکہ محض سیاہ رنگ ہی اس کے مجرم ہونے کے لئے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ اور ہلاکت کے لئے ایک رسّہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا[۵۱]

سولی

(دہلی وغیرہ) میں شہر کے بلند مقام پر ایک چوگوشہ سولی نصب کی گئی تھی۔ جہاں پانچ اور چھ اشخاص کو روزمرہ پھانسی دی جاتی تھی جس کے قریب ہی انگریز افسران سگرٹوں کے کش پر کش اڑاتے ہوئے لاشوں کے تڑپنے کے نظاروں میں محو دکھائی دیتے تھے[۵۲]

جلتی ہوئی سلاخوں سے داغ کر مارنا یا جلا دینا

مسٹر نکلسن، مسٹر ایڈورڈز کو ایک خط میں لکھتا ہے۔ دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیئے جس کی رو سے ہم اُن کو زندہ بھی جلا سکیں یا زندہ اُن کی کھال اتار سکیں یا گرم سلاخوں سے اذیت دیکر اُن کو فنا کے گھاٹ اُتار سکیں۔ ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کئے دیتا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ کاش میں دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں۔ جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں سنگین انتقام لیکر دل کی بھڑاس نکال سکوں[۵۳]

نکلسن کو اپنی آرزو کے پورا ہونے میں کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ مسٹر ہوبری تھامسن"

---

۵۱ تصویر کا دوسرا رُخ صفحہ ۶۰ ۵۲ ایضاً صفحہ ۶۱ ۵۳ ایضاً صفحہ ۳۸

نے اپنے بعض قیدیوں کی دردناک سرگذشت سرہنری کاٹن کو ذیل کے الفاظ میں سنائی۔

شام کے وقت ایک سکھ اردلی میرے خیمہ میں آیا اور سلام کر کے پوچھنے لگا۔ آپ غالباً یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ میں فوراً ایک کے قیدیوں کے کیمپ میں گیا جہاں اُن بدبخت مسلمانوں کو عالم نزاع میں بے حال دیکھا یعنی مشکیں اُن کی بندھی ہوئی تھیں اور وہ برہنہ زمین پر پڑے ہوئے تھے اور سر سے لے کر پاؤں تک تمام جسم کو گرم تانبے سے داغ دیا تھا۔ اس روح فرسا نظارہ کو دیکھکر میں نے اپنے پستول سے اُن کا خاتمہ کر دینا ہی اُن کے حق میں مناسب سمجھا[۱]۔

ایک عینی شاہد کا بیان ہے

بدنصیب قیدی کے جلتے ہوئے گوشت سے مکروہ بدبو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی۔

انیسویں صدی میں جب کہ تہذیب اور شائستگی پر ناز کیا جاتا تھا ایک ایسا دردناک نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک انسان نہایت وحشیانہ طریق سے زندہ آگ میں جلایا جا رہا ہے اور سکھ اور یورپین نہایت اطمینان اور متانت سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر اردگرد کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ گویا کہ وہ ایک تفریح کا سامان تھا[۲]۔

ٹائمز آف انڈیا اخبار کے فوجی نامہ نگار مسٹر رسل نے بھی اس واقعہ کی تصدیق کی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

چند دنوں بعد میں نے اس شخص کی جلی ہوئی ہڈیوں کو اسی میدان میں پڑا ہوا پایا[۳]۔

ایڈورڈ ٹامسن لکھتا ہے۔

---

۱ تصویر کا دوسرا رخ ص ۴۱ ۲ ایضاً ص ۴۲ ۳ ایضاً ص ۴۲

دماغ پر سزا کا ایسا مہلک اثر پڑتا ہے کہ بعض دفعہ تو انسان نواب معین الدین حسن کے بیانات کو جن میں اس دردناک سزا کا ذکر ہے پڑھنے یا سُننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا لیکن گورنمنٹ بنگال کے سرکاری کاغذات میں اب بھی ایسی دستاویزات محفوظ ہیں جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انگریز نہایت کثرت سے اس ہولناک سزا کا استعمال کرتے تھے چنانچہ ایک انگریز افسر کی چٹھی ابھی تک محفوظ ہے جس میں اٹھارہویں صدی کے آخری دور کے حالات پر بحث کرتے ہوئے اس دردناک طریق سزا کی ذیل کے الفاظ میں مذمت کی ہے

"آخر کب تک ہم بنی نوع انسان کو اس دلخراش طریق سے گرم سلاخوں پر سکڑتے اور بھنتے دیکھنے کی اذیت برداشت کرتے رہیں گے"[۱]

سور کی کھال میں سیکر جلانا

ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر ڈی لین نے لکھا تھا۔ زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا۔ یا پھانسی سے پہلے اُن کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں۔ ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب بھی کبھی اجازت نہیں دیتی ہماری گردنیں شرم وندامت سے جھک جاتی ہیں اور یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہیں جن کا کفارہ ہمیں بھی ایک دن ادا کرنا پڑے گا۔

توپ سے باندھکر اڑا دینا

لارڈ رابرٹس اپنی والدہ کو ایک چٹھی میں لکھتا ہے۔

ہم پشاور سے جہلم تک پا پیادہ سفر کرتے ہوئے پہنچے اور راستہ میں کچھ کام بھی کرتے آئے یعنی باغیوں سے اسلحہ چھیننا اور اُن کو پھانسیوں پر لٹکانا چنانچہ توپ سے باندھکر اُڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے اکثر استعمال کیا ہے اس کا لوگوں پر خاص اثر ہوا۔ یعنی

---

[۱] تصویر کا دوسرا رخ صہ ۳

ہماری ہیبت لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ اگرچہ یہ طریقہ سزا نہایت دلخراش ہے[۱]

لڑائی کے اختتام پر بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اور یہ معلوم ہونے پر کہ اس قسم کی موت کی وہ کوئی خاص پرواہ نہیں کرتے تو اُن میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھکر اڑا دیا گیا۔ چنانچہ ایک روز ایک توپ کے بہت بڑے دھماکے کی آواز سے ہم چونک پڑے جس کے ساتھ ہی ایک ناقابل بیان نیمی مگر وحشتناک چیخ بھی سنائی دی۔ دریافت کرنے پر ہمیں ایک افسر نے بتایا کہ یہ نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا۔ یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارود زیادہ بھرا ہوا تھا جس کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضاء آسمانی میں اُڑا اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے اور اس کا سر ایک راہ رو پر اس زور سے گرا کہ اس کو بھی چوٹ آگئی[۲]

بھوکا رکھکر یا دم گھونٹ کر مارنا

"مسٹر کوپر" لکھتا ہے۔

پہلی اگست کو بقرعید کا دن تھا اس لئے مسلمان سواروں کو وہاں سے علیحدہ کرنے کے لئے ایک مفید عذر تھا۔ چنانچہ اُن کو تیوہار منانے کے لئے امرتسر بھیجدیا گیا۔ اور صرف ایک عیسائی افسر وفادار سکھوں کی امداد سے ایک مختلف قسم کی قربانی کرنے کے لئے وہاں پر اکیلا رہ گیا جو نہایت اطمینان سے اپنا کام کرتا رہا اب مشکل یہ پیش آئی کہ لاشوں کو کس طرح دبایا جائے تاکہ اُن کا تعفن نہ پھیلے۔ لیکن اتفاق سے قریب ہی ایک ویران کنواں مل گیا۔

جب دس دس کی ٹولی کو یکے بعد دیگرے گولی سے اڑاتے ہوئے ڈیڑھ سو سپاہی مار جاچکے تو قتل کرنے والوں میں سے ایک شخص غش کھا کر گر پڑا جو ہلاک کرنے والوں میں سب سے

---

۱ تصویر کا دوسرا رخ صفحہ ۳۴ ۲ ایضاً صفحہ ۳۶

بوڑھا سپاہی تھا۔ اس لئے آرام کرنے کے لئے تھوڑا سا وقفہ دیا۔ اس کے بعد پھر قتل کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ جب تعداد دو سو سینتیس تک پہونچ چکی تو ایک افسر نے اطلاع دی کہ باقی باغی برج سے باہر آنے سے انکار کرتے ہیں جہاں وہ چند گھنٹے پیشتر عارضی طور پر بند کر دیئے گئے تھے۔ اس برج کے دروازے کھولے گئے تو معاً ایک نہایت دردناک نظارہ دیکھنے میں آیا جس سے ہولول بلیک ہال کی یاد تازہ ہو گئی یعنی پینتالیس آدمیوں کی مردہ لاشیں پائی گئیں جو خوف، گرمی، سفر کی صعوبت اور دم گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہو گئے تھے۔

ان مردہ اور نیم مردہ لاشوں کو گاؤں کے بھنگیوں کے ہاتھوں قریب کے ویران کنوئیں میں پھنکوا دیا گیا[1]

لطف یہ ہے کہ جنرل لارنس اور رابرٹ منٹگمری وغیرہ نے اس فعل کی داد دیتے ہوئے کوپر کو مبارکباد کے خط لکھے۔ ملاحظہ ہو ص۵۹ انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ۔

نہ صرف سولی پر اکتفا کیا گیا بلکہ دیہات میں ان کو اپنے مکانوں میں بند کر کے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا[2]

قتل عام اور بستیوں کو جلا دینا

۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کو گورنر جنرل با اجلاس کونسل کی طرف سے ہندوستان میں مفصل ہدایات جاری کی گئیں کہ غیر معین طریق سے دیہات کو آگ لگانا فی الفور بند کر دیا جائے اور مجسٹریٹوں کو حکم دیا گیا کہ وہ غیر مسلح آدمیوں کو فوج کے بھاگے ہوئے سپاہی سمجھ کر ہرگز کوئی سزا نہ دیں۔

بہت سی ایسی سول عدالتوں سے موت اور عمر قید کے اختیارات واپس لے لئے گئے کیونکہ ان کا استعمال نہایت بیدردی سے کیا جا رہا تھا۔

---

[1] تصویر کا دوسرا رخ ص۵۵ [2] ایضاً ص۶۳

۲۰ اگست کو مسٹر جان گرانٹ کو وسط ہند کا گورنر اس لئے مقرر کیا گیا تاکہ الٰہ آباد اور دوسرے مقامات پر بے تحاشا پھانسیوں کے سلسلہ کو بند کر دیں۔ باوجود اس امر کے ایک کثیر طبقہ کی طرف سے وائسرائے اور مسٹر گرانٹ کی شدید مخالفت کی گئی یہاں تک کہ تعریض کے طور پر پھانسیوں کو رد کرنے والا گرانٹ اور رحمدل کیننگ وغیرہ نام دیکر ان کی ہنسی بھی اڑائی گئی۔ پھر بھی اس مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کی گئی۔ جب اگست میں انگریزی فوج ہندوستانی دیہات جلانے کی مہم سے نابلس آرہی تھی تو راستہ میں انھوں نے وفادار سپاہیوں کی ایک جماعت کو بلا وجہ گولیوں اور سنگینوں کا نشانہ بنا دیا۔ چنانچہ انتقام کے اس خوفناک مظاہرے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ٹائمز آف انڈیا نے اس واقعہ کو جنگی یا وحشی انصاف سے تعبیر کیا لیکن جنرل آوٹرم کی رائے میں یہ واقعہ معصوم انسانوں کا سنگدلانہ قتل تھا۔ ۵۱

میجر رینارڈ کو جنرل نیل کی طرف سے ہدایت موصول ہوئی جبکہ وہ کانپور کے محصورین کی امداد کے لئے آرہا تھا "بعض دیہات کو ان کی مجرمانہ حرکات کی بنا پر عام تباہی کے لئے منتخب کر دیا گیا ہے۔ جہاں کی تمام مرد آبادی کو قتل کر دینا ہوگا۔ باغی رجمنٹوں کے تمام ایسے سپاہی فی الفور پھانسی پر لٹکا دیئے جائیں جو اپنے چال چلن کے متعلق اطمینان بخش ثبوت بہم نہ پہنچا سکیں۔ قصبہ فتحپور کی تمام آبادی کو محاصرہ میں لیکر تہ تیغ کر دیا جائے۔ باغیوں کے تمام سرغنوں کو فی الفور پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ اگر وہاں کا ڈپٹی کلکٹر قابو میں آجائے تو اس کو وہیں پھانسی دیدی جائے اور اس کا سر کاٹ کر سب سے بڑی عمارت پر لٹکا دیا جائے۔ ۵۲

مسٹر رسل اپنی ایک طویل تحریر میں لکھتا ہے۔

لیکن یہ تو انسانیت اور انصاف کے خلاف ہے کہ تمام اضلاع کو ہی تاخت و تاراج

---

۵۱ تصویر کا دوسرا رخ ص ۲۲۲ ۵۲ ایضاً ص ۲۲۸

کیا جائے۔ محض اس جرم پر کہ باغیوں نے ان علاقوں میں پڑاؤ کیا تھا[1]

کچھ افسروں کی جانب سے احتجاج کیا گیا کہ اگر اسی طرح دیہات کو جلایا جاتا رہے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ فوج کو راستہ میں رسد اور چارہ بالکل دستیاب نہ ہو سکے گا۔[2]

شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب میں اندھادھند پھانسیاں دی گئیں۔ جن میں مرد، عورت اور بچوں کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ نیز بے شمار دیہات جلانے کی وجہ سے آبادی کے اس حصہ میں بھی نفرت اور وحشت پھیل گئی جو گورنمنٹ کے خلاف نہ تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فصلیں تباہ ہوگئیں۔ اس قسم کے وجوہات کی بنا پر یہ افواہ نہایت ترقی پکڑ گئی کہ گورنمنٹ کا منشا تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو بیدریغ قتل کر دینے کا ہے۔ رپورٹ گورنر جنرل با اجلاس کونسل بحوالہ تصویر کا دوسرا رخ ص۶۷۔

انگریزوں نے راستہ میں سینکڑوں میل تک سڑک کے دونوں طرف دیہاتیوں کو بیدریغ قتل وغارت و برباد کر کے ملک کو صحرا کی طرح ویران اور سنسان کر دیا۔ دہلی سے باغیوں کے فرار ہو جانے کے بعد انگریز فاتحین نے باشندوں کا قتل عام کیا اور بے ضابطہ انگریزی عدالتوں کے حکم سے ہزاروں شہری پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیئے گئے حالانکہ ان کو بغاوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا (تصویر کا دوسرا رخ ص۵۴ و ص۶۰) مختصر یہ کہ بیشمار دیہات کو ایسے وقت میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا جبکہ عورتیں، بوڑھے اور بچے گھروں کے اندر موجود تھے (تصویر کا دوسرا رخ ص۵۸)

دہلی میں باشندوں کے قتل عام کی منادی کی گئی حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے متعلق ہمیں علم تھا کہ وہ ہماری فتح کے خواہشمند تھے۔ ہمارے اکثر جوان تو محض خون

---

[1] تصویر کا دوسرا رخ ص۵۱ [2] ایضاً ص۶۰

گرانے کی خواہش پورا کرنے کے لئے اپنی ہی فوج کے ہندوستانی اردلیوں اور پوربی گھسیاروں وغیرہ کو گولی سے اڑا دینے کی تمنا کا علانیہ طور پر اظہار کرتے تھے ۔ ۵۱

کانپور کے حادثہ سے بہت عرصہ پیشتر ایک طرف تو فوجی قانون کے نفاذ کا اعلان کیا گیا اور دوسری طرف مجلس وضع قانون نے مئی اور جون میں نہایت خوفناک قوانین پاس کئے جن پر پوری سرگرمی سے عمل کیا گیا اور فوجیوں اور سول افسروں نے خونی عدالتیں قائم کر کے ہندوستانیوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔ بلکہ بعض حالات میں تو بغیر کسی نام نہاد عدالت کے حکم کے پھانسیاں دی گئیں۔ جن میں مرد عورت کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی ۔ بایں ہمہ خونریزی کی آگ دن بہ دن اور بھڑکتی گئی ۔ چنانچہ آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو بھی پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا ۔ نہ صرف سولی پر ہی اکتفا کیا گیا بلکہ دیہات میں ان کو اپنے مکانوں میں بند کر کے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا اور شاذ و نادر ہی کسی ایک کو گولی سے مارنے کی تکلیف گوارا کی گئی ہو ۔ انگریزوں نے فخریہ لکھا ہے کہ ہم نے حتی الامکان کسی ذی روح کی آبادی کو زندہ نہیں رہنے دیا۔ ۵۲

لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا ۔ چنانچہ ہر ایسے ہندوستانی کو قطع نظر اس سے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی بیدریغ تہ تیغ کیا گیا ۔ یہاں تک کہ نہ تو کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا اور نہ ہی اس قسم کا تکلف روا رکھا جاتا تھا بلکہ محض سیاہ رنگت ہی اس کے مجرم ہونے کے لئے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی اور ہلاکت کے لئے ایک رسہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا ۔ یا اگر یہ اشیا رہیا نہ ہوں تو بندوق کی ایک گولی بے گناہ انسان کے دماغ کو چیرتی ہوئی

---

۵۱ تصویر کا دوسرا رخ صہ ۶۱ ۵۲ ایضاً صہ ۶۴

نکل جاتی تھی اور وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا تھا۔ ۵۱

دہلی میں ہماری فوج کے شہر میں داخل ہونے پر تمام ایسے لوگ جو چلتے پھرتے نظر آئے وہ سنگینوں سے وہیں ختم کر دیئے گئے ایسے بدقسمت انسانوں کی تعداد بہت کافی تھی آپ اس ایک واقعہ سے کافی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک گھر میں چالیس یا پچاس ایسے اشخاص ہمارے خوف سے پناہ گزیں ہو گئے جو اگرچہ باغی نہ تھے بلکہ غریب شہری تھے اور ہمارے عفو و کرم پر تکیہ لگائے ہوئے تھے جن کے متعلق میں خوشی سے ظاہر کرتا ہوں کہ وہ سخت مایوس ہوئے کیونکہ ہم نے اسی جگہ اُن کو اپنی سنگینوں سے ڈھیر کر دیا۔ ۵۲

بگیناہ شہریوں کو درانحالیکہ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی درخواست کر رہے تھے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ بلکہ عمر رسیدہ لوگوں کو حالانکہ اُن کے جسم رعشہ سے کانپ رہے تھے کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ ۵۳

ٹائمز کے نامہ نگار نے لکھا تھا۔

میں نے دہلی کے بازاروں میں سیر کرنا مطلقاً چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ کل ایسا دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یعنی جب ایک افسر مع سپاہی لیکر شہر کی گشت کو جانے لگا تو میں بھی اُن کے ہمراہ ہو لیا اور راستہ میں ہم نے چودہ عورتوں کی لاشوں کو شالوں میں لپٹے ہوئے بازار میں پڑا پایا جن کے سر دھڑوں سے اُن کے خاوندوں نے خود جدا کئے تھے۔ چنانچہ ایک عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دردناک حادثہ اس لئے ظہور پذیر ہوا کہ اُن کے خاوندوں کو شبہ تھا کہ اگر انگریز سپاہیوں کے قابو میں آگئیں تو وہ اُن کی عصمت دری کریں گے لہٰذا تحفظ ناموس کا یہی طریقہ مناسب خیال کیا گیا جس کے بعد خاوندوں نے بھی خودکشی کر لی۔ چنانچہ اُن کی لاشوں کو خود ہم نے دیکھا۔ ۵۴

---

۵۱ تصویر کا دوسرا رخ ص۶۸ ۵۲ ایضاً ص۶۸ ۵۳ ایضاً ص۶۹ ۵۴ ایضاً ص۶۹

ایڈورڈ ٹامسن لکھتا ہے :-

فوجی شرابیوں کی دکانیں لوٹتے اور شراب پی کر بازاروں میں گشت کرتے، بیدریغ قتل و غارت کرتے کبھی کبھی کوئی منچلا ان میں سے کسی کو ختم کر دیتا۔ لطف یہ ہے کہ اس قاتل کو مذہبی دیوانہ کہا جاتا ہے۔ یعنی عقل کا تقاضا یہ تھا کہ نہایت خاموشی سے ان شرابیوں کے سامنے ذبح کے لئے گردن کیوں نہیں جھکا دی ۱ہ

باغیوں کے جرم کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ سنگین پاداش دہلی کے باشندوں کو برداشت کرنی پڑی ہزارہا مرد و عورت اور بچوں کو بیگناہ خانماں برباد ہو کر جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھاننی پڑی اور جتنا مال و اسباب وہ پیچھے چھوڑ گئے اُن سے ہمیشہ کے لئے ان کو ہاتھ دھونے پڑے کیونکہ سپاہیوں نے گھروں کے کونے کونے کھود کر تمام قیمتی اشیاء کو قبضہ میں کر لیا اور باقی سامان توڑ پھوڑ کر خراب کر دیا جسکو وہ اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے ۲ہ

اسپیر وال پول لکھتا ہے :-

جتنی نادر شاہ نے بھی وہ لوٹ نہیں مچائی تھی جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے جائز رکھی۔ شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے اور پانچ یا چھ چھ آدمیوں کو روزانہ سزائے موت دی جاتی تھی۔ وال پول کا بیان ہے کہ تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی جن میں سے اُنتیس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤلف قیصر التواریخ لکھتا ہے کہ ستائیس ہزار مسلمان قتل کئے گئے اور سات دن تک برابر قتل عام جاری رہا۔ ۳ہ

صفر ۱۲۷۴ھ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو بادشاہ کے سمدھی الٰہی بخش کی جاسوسی سے مسٹر ہڈسن نے تین شہزادوں، مرزا مغل، مرزا حضرت سلطان اور مرزا ابوبکر وغیرہ کو ہمایوں کے

۱ہ تصویر کا دوسرا رخ ص۲ ۲ہ ایضاً ص۱ ۳ہ افسانہ غم ص۲۸، ۲۹

مقبرہ سے گرفتار کیا اور تینوں کا سر قلم کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے ہنس کر فرمایا تیموری خاندان کے بہادر فرزند اسی طرح سرخرو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتے ہیں (پنڈت سندر لال)

آخر کی چند سطور کے علاوہ آپ نے جو کچھ واقعات پڑھے وہ انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ ۔یعنی مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی کتاب "دی اَدَر سائڈ آف دی مڈل" سے نقل کئے گئے ہیں جن کے متعلق مصنف (ایڈورڈ ٹامسن) کا دعویٰ ہے کہ جتنے واقعات یہاں قلمبند کئے گئے ہیں اُن میں سے ایک بھی کسی ہندوستانی قلم یا زبان سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ اور میں نے شاذ و نادر ہی کوئی ایک فقرا انگلو انڈین اخبارات یا اس سے کم درجہ پر اپنے ملک کے اخبارات سے نقل کیا ہوگا۔ نیز یہ کہ ان بہت سے واقعات کو چھوڑ دیا جن سے اس سے زیادہ سنگدلی اور درندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ ص۷۸/۹ تصویر کا دوسرا رُخ۔

نیز اس موقعہ پر آپ کو یہ فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ لارڈ رابرٹس کے نزدیک اس قسم کی تمام درندگی کا مقصد یہ تھا کہ

> "اُن بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے" (ص۳۴ تصویر کا دوسرا رُخ)

اس دہشت انگیزی' بربریت اور درندگی کا نتیجہ انگریز کے حق میں نہایت مبارک تھا مسلمان اس قدر خائف ہوگئے کہ کانگریسی وزارتوں کے قیام سے پیشتر تک قومی اداروں کے دستور اساسی میں بسم اللہ کے بعد پہلا جملہ یہ ہوتا تھا کہ "اس ادارہ کا تعلق سیاست سے قطعاً نہ ہوگا"

هذا و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

ایک بجے شب ۴ر ربیع الاول ۱۳۵۸ھ

محمد میاں عفی عنہ - ۲۵ر اپریل ۱۹۳۹ء

ختم شد اقتباس شاندار ماضی طبع قدیم حصہ چہارم۔ نیز ختم شد
شاندار ماضی جلد چہارم طبع جدید۔

واللہ ھو الباقی وھو الکافی

محمد میاں

۲۳ رجب ۱۳۷۸ھ
۲ فروری ۱۹۵۹ء
یوم دوشنبہ ۱۱½ بجے شب

ضمیمہ (۱)

قصبہ تھانہ بھون کے باقیماندہ حالات اور مجاہد جلیل قاضی عنایت علی صاحب کے کارنامے

اس کتاب میں آپ نے بہت سے عجیب و غریب واقعات ملاحظہ فرمائے ہیں۔ آخر میں خود اس کتاب کی ترتیب و تالیف کے متعلق ایک عجیب اتفاق ملاحظہ فرمائیے:۔ ضمیمہ کے چند صفحات میں جناب رفعت صاحب تھانوی کا مضمون پیش کیا جا رہا ہے یہ ۱۳ اکتوبر پھر ۱۵ و ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو روزنامہ الجمعیۃ میں شائع ہوا تھا۔ مضمون نہایت عمدہ ہے۔ تھانہ بھون کے متعلق معلومات کا ذخیرہ ہے اور سب سے زیادہ خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جناب قاضی عنایت علی صاحب کے حالات جو آج تک سینہ بسینہ تھے اور کسی کتاب یا رسالہ میں شائع نہیں ہوئے تھے بہت ہی بہتر ترتیب سے جمع کیے گئے ہیں۔

احقر نے روزنامہ الجمعیۃ کے ان اوراق کو نہایت حفاظت سے ایسی جگہ رکھ لیا تھا کہ بظاہر نظر انداز ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر اس ظلوم و جہول انسان کی بے چارگی ملاحظہ ہو کہ یہ سارا اہتمام و انتظام بیکار گیا۔ سامنے رکھے ہوئے صفحات نظر انداز ہوتے رہے یہاں تک کہ ترتیب پھر کتابت اور تصحیح وغیرہ کے تمام مراحل طے ہو چکنے کے بعد وہ وقت آگیا کہ کاپیاں پریس میں جانے والی ہیں، ایک اور یادداشت کی تلاش میں یہ صفحات دفعتہً سامنے آگئے تو اب جس طرح ان کو نظر انداز کرنا مشکل تھا، ایسے ہی ترتیب میں لانا بھی بہت دشوار تھا۔ لہٰذا یہی مناسب معلوم ہوا کہ غیر ضروری اجزاء حذف کر کے مضمون کو کتاب کا ضمیمہ بنا دیا جائے۔

۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون

اسوقت قصبہ کی آبادی ۳۵۰۰۰ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ اس آبادی میں سے تقریباً سات ہزار اشخاص انگریزی افواج میں ملازم تھے یہاں ۳۲ تو صرف رسالدار تھے، دفعدار، جمعدار، حوالدار، نائک، اور سپاہیوں کی علیحدہ علیحدہ تعداد کا تعین دشوار ہے۔ محکمہ فوج سے ایک لاکھ چوراسی ہزار روپے تنخواہوں اور پنشنوں کی صورت میں اہالیان قصبہ وصول کرتے تھے۔ قرب وجوار میں مشہور تھا کہ تھانہ بھون والوں کی کمائی خون کی کمائی ہے۔

مئی ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کے آغاز پر جب فوجیں بگڑیں تو ساکنان تھانہ بھون بھی اپنی اپنی ڈیوٹیاں چھوڑ کر وطن آ گئے۔ یہاں انگریزی حکومت کی طرف سے پولیس اسٹیشن موجود تھا پولیس ایسے فوجیوں کی متلاشی رہتی تھی جو جنگ آزادی میں دلچسپی لے رہے تھے۔ یہ فدایان وطن شروع میں روپوش رہے اور عام باشندگان قصبہ کو جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لئے آمادہ کرتے رہے۔ اسی دوران میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ قاضی عنایت علی خاں کے بھائی قاضی رعایت علی خاں معروف قاضی عبدالرحیم بغرض خریداری فیل سہارنپور تشریف لے گئے۔ ہاتھی اس زمانہ میں نشان امارت وریاست تھا اور صرف اسی ضرورت سے اس کی خریداری مقصود تھی لیکن قاضی صاحب کے مخالفین نے الیس بنکھی کلکٹر سہارنپور کو یہ غلط اطلاع پہنچائی کہ قاضی صاحب معہ فوج آپ پر چڑھائی کے لئے آئے ہیں اور حربی ضرورتوں کے پیش نظر ہاتھی خرید رہے ہیں۔ سہارنپور اس وقت فوجی نقطہ نگاہ سے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ شمالی ہند کی جنگ آزادی کو دبانے کے لئے پنجاب سے فوجیں لائی جارہی تھیں ان کے لئے سہارنپور ہی سب سے اہم ناکہ تھا۔ الیس بنکھی روزمرہ کے نئے حملوں کی خبروں سے بے حد پریشان اور حواس باختہ تھا اس عالم میں اس کے رہے سہے ہوش گم ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس نے یہ خبر ملتے ہی قاضی عبدالرحیم کی

کی تلاش کرائی اور گرفتار کراکر بغیر تفتیش حال اُن کو مع اُن کے چند ساتھیوں کے گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ یہ خبر شب بھر میں تھانہ بھون پہونچی تو قاضی عنایت علی خاں کے یہاں صف ماتم بچھ گئی شیدائیانِ حریت کے لئے یہ واقعہ ع "سمند ناز پہ اک تازیانہ اور ہوا" کے مصداق ہوگیا قاضی عنایت علی خاں جواب تک مذبذب تھے ہمنوا بن گئے

جہاد آزادی کی تنظیم | تھانہ بھون اس وقت علم وفضل کا گہوارہ تھا۔ بڑے بڑے یکتائے روزگار عالم یہاں موجود تھے۔ ان علماء میں مرشد نا و ہادینا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قبلہ مہاجر مکی اس وقت خاص طور سے مرجع خلائق تھے۔ قرب وجوار سے علماء کا اجتماع اس صورتِ حال پر غور کرنے کے لئے تھانہ بھون میں ہوا اور بڑی بحث وتمحیص کے بعد کثرت رائے سے علم جہاد بلند کرنے کی تجویز پاس ہوئی۔

پولیس اسٹیشن تھانہ بھون یہاں کے حالات کی مسلسل اطلاعات کلکٹر ضلع کو دے رہا تھا ایس پنکھی کلکٹر سہارن پور کو اپنی غلطی کا علم ہوا تو وہ اپنی بدحواسی اور جلد بازی پر پچھتایا اور وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اُس نے قاضی عنایت علی خاں کو اپنے نمائندہ کے ذریعہ پیش کش کی کہ ہم پورا پرگنہ (جس میں اس وقت چوراسی گاؤں تھے) تمہاری حکومت میں دیکر تمہیں مستقل نواب تسلیم کئے لیتے ہیں تم تحریک آزادی سے علیحدہ رہو۔ قاضی عنایت علی خاں نے ایس پنکھی کی اس پیشکش کو ٹھکرادیا اور جہاد آزادی کا سپاہی بننا منظور کیا

مجاہدین کا پہلا حملہ | اعلان جہاد کے بعد انگریزوں کا انتظامیہ عملہ متعینہ پولیس اسٹیشن وغیرہ تھانہ بھون سے رخصت ہوگیا ان میں جو لوگ جہاد آزادی سے دلچسپی رکھتے تھے اُنھوں نے اپنی خدمات باشندگان قصبہ کے لئے وقف کردیں۔ ایس پنکھی کلکٹر سہارن پور کلکٹری کے علاوہ اس وقت فوجی کمانڈر کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ تھانہ بھون کی صورتِ حال

سے متاثر ہو کر اُس نے قرب وجوار کے انگریزی اداروں کی حفاظت کے لئے فوجی امداد بھیجی اور اُن کو وقتاً فوقتاً آلاتِ حرب اور میگزین بھیجتا رہتا تھا۔ مجاہدین تھانہ بھون نے سب سے پہلا حملہ ایسی ہی ایک پارٹی پر کیا جو سہارن پور سے شاملی میگزین لے جارہی تھی، باغ شیر علی پر جس کو اس زمانہ میں خان والا باغ اور آج کل ماتا والا باغ کہا جاتا ہے۔ میگزین کی حفاظتی پارٹی پر حملہ کیا گیا۔ پوری پارٹی اسی جگہ کام آگئی۔ صرف ایک سوار سمت مشرقی جنگل کی طرف بھاگا۔ مگر تھوڑے فاصلہ پر گھوڑے سے گر کر مرگیا۔ اور میگزین مجاہدین کے ہاتھ آیا۔

مجاہدین کا دوسرا حملہ پہلے حملہ کے بعد اطلاع ملی کہ ایس۔ بنکھی کلکٹر تحصیل کے حفاظتی انتظام کا معائنہ کرنے کے لئے شاملی آیا ہوا ہے۔ مجاہدین، تحریک آزادی کے اس دشمن اور قاضی عبدالرحیم اور اُن کے بے گناہ ساتھیوں کے قاتل کی فکر میں تھے۔ مجاہدین کا ایک لشکر شاملی پر چڑھ دوڑا اس لشکر کی قیادت حافظ ضامن علی صاحبؒ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتویؒ فرما رہے تھے۔ ایک دستہ قاضی عنایت علی صاحب کی کمان میں بھی تھا۔ شاملی پہونچکر انگریزی فوج اور مسلح پولیس سے سخت مقابلہ ہوا۔ مجاہدین کے جوشِ جہاد کا مقابلہ انگریزی فوج کو دشوار ہوا تو وہ پسپا ہو کر قلعہ بند ہوگئی۔ تحصیل کی عمارت جو ایک مستحکم گڑھی کی صورت میں تھی اب جنگی قلعہ کا کام دے رہی تھی۔ صدر دروازہ جو بہت مضبوط تھا بند کر لیا گیا اور فوج و پولیس نے چہار دیواری کی آڑ لیکر گولیاں چلائیں۔ مجاہدین کے پاس بندوقیں بہت کم تھیں۔ پھر وہ کھلے میدان میں تھے اس لئے دو یوم کی جنگ میں مجاہدین کا اتلاف جان زیادہ ہوا، تیسرے دن حافظ ضامن علی صاحبؒ نے تحصیل کا دروازہ توڑ ڈالا اور انگریزی فوج کی گولیوں سے شہید ہوئے تحصیل کو لوٹ لیا، مدافعین میں سے بعض قتل ہوئے۔ بعض نے معافی مانگ لی۔ نہ لڑنے والے

اشخاص میں سے مجاہدین نے کسی کو انگلی بھی نہ لگائی۔ تحصیل فتح ہونے کے بعد پتہ چلا کہ ایس پیکھی کی آمد کی اطلاع غلط تھی۔

انگریزی فوج کا تھانہ بھون پر پہلا حملہ

تحصیل شاملی کے لٹ جانے کی اطلاع جب سہارنپور پہنچی تو ایس پیکھی نے ایک فوج جس کے ساتھ مشہور ہے کہ تین توپیں بھی تھیں۔ ایک انگریز کمانڈر کے تحت تھانہ بھون پر تاخت کے لئے بھیجی۔ کمانڈر کے علاوہ اس فوج میں اور بھی کئی انگریز افسر کام کر رہے تھے۔ توپخانہ کا افسر مسلمان تھا اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ قبلہ کا مرید تھا اس فوج نے تھانہ بھون کا محاصرہ کر کے ریتی دروازہ کے باہر پڑاوے پر اپنا توپخانہ قائم کیا اور شب بھر قصبہ پر گولہ باری ہوتی رہی۔ افسر توپخانہ کو حضرت حاجی صاحبؒ کی قصبہ میں جلوہ افروزی کا علم تھا اُس نے دانستہ تمام توپوں کے منہ اوپر کو کرا دیئے۔ تمام شب کی گولہ باری میں ایک گولہ بھی قصبہ کی آبادی میں نہ گرا سب باہر جنگل میں گرتے رہے۔ کمانڈر نے صبح کو حالات معلوم کئے اور قصبہ کو صحیح و سالم حالت میں سُنکر آگ بگولہ ہوگیا اور اس نے فوراً تفتیش کر کے افسر توپخانہ کو حراست میں لے لیا جس کو کورٹ مارشل کے بعد گولی سے اڑا دیا گیا اس کی جگہ ایک انگریز افسر کو انچارج بنایا جس نے آبادی کا نشانہ لے کر گولہ باری شروع کرائی۔ قصبہ والوں کے پاس کوئی توپ نہ تھی دو معمولی رہکلے تھے ان سے شہر کے دروازہ کی حفاظت کا کام لیا جا رہا تھا۔ ابھی دو تین گولے ہی آبادی میں گرے تھے کہ مجاہدین میں سے ایک توپچی نے اسی معمولی رہکلے سے ایک گولہ پھینکا جو انگریزی توپ کے دہانہ پر لگا اور وہ بیکار ہوگئی دوسرا گولہ دوسری توپ کے پہیئے کو ناکارہ بنا گیا مجاہدین کے پاس آلات حرب کی بے حد کمی تھی ہزاروں مجاہدین میں سے چند سو کے پاس معمولی بندوقیں تھیں۔ تلوار، تیر کمان، نیزہ اور دوسرے معمولی ہتھیاروں اور آتشبازی سے مسلح تھے اس خیال سے کہ انگریزی فوج کو کمک نہ پہنچ جائے دوسرے روز مجاہدین نے شہر سے نکل کر محاصرین پر حملہ

کر دیا. سات گھنٹہ کی دست بدست جنگ کے بعد انگریزی فوج شکست کھا گئی مگر وہ بڑی باقاعدگی سے پسپا ہوئی اور جاتے ہوئے اپنی توپیں اور سامان جنگ بھی ساتھ لیتی گئی. بیان کیا جاتا ہے کہ اس جنگ میں طرفین کے تقریباً پانچسو آدمی کام آئے

انگریزی فوج کا دوسرا حملہ

اس شکست کے بعد سکھ آرمی کی مدد سے انگریزوں نے پہلے حملہ سے زیادہ بڑی فوج اور پہلے سے زیادہ توپوں کے ساتھ تھانہ بھون پر دوسرا حملہ کیا قصبہ پورا خالی ہو گیا تھا کچھ معذور اور کچھ فدائی یہاں رہ گئے تھے. فوج نے قصبہ کا محاصرہ کر کے پہلے توپوں سے گولہ باری کی. صدر دروازہ کو تباہ کر دیا جب آبادی کی طرف سے کوئی مدافعت نہ ہوئی تو حملہ آور فوج قصبہ میں داخل ہوگئی. لوٹ مار کا آغاز ہوا. قصبہ چھوڑنے والوں میں سے بہت کم لوگ اپنا اثاث البیت اس روا روی میں ساتھ لے جا سکے تھے. اکثر تو اپنا زیور اور نقدی بھی چھوڑ بھاگے تھے. حملہ آوروں نے خوب ہاتھ رنگے. نہ صرف مکانوں کو لوٹا بلکہ بعض پُر شوکت مکانات میں آگ بھی لگا دی جو متنفس نظر آیا اس کو یا تو گرفتار کر لیا یا گولیوں سے اڑا دیا مولوی عبدالرحیم صاحب جو قاضی عنایت علی خاں کے پرسنل اسسٹنٹ تھے ایسے ہی شہداء میں ہیں اُن کی سوتیلی ماں اُن کے ساتھ اُن ہی کے مکان میں شہید کر دی گئی. قصبہ سے گرفتار ہونے والوں کی تعداد ایک سو تیس بتائی جاتی ہے جن کو مہاجنوں والی باغیچی میں پھانسی دیدی گئی تھی.

شکست کے بعد مجاہدین کے کارنامے

علماء کرام کے ساتھ انگریزوں کے خوف سے پھر کوئی نئی جمعیت نہ بن سکی حکومت نے ان کی گرفتاری کے لئے ایڑی چوٹی کے زور لگائے عوام کو بڑے بڑے لالچ دیئے اور حکام بعض اوقات ان تک پہنچ بھی گئے مگر ہر مرتبہ محیر العقول طریقوں سے بچتے رہے اور گرفتار نہ ہوسکے.

مرشدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دو سال تک ہندوستان کے

مختلف مقامات میں روپوش رہ کر مکہ معظمہ ہجرت فرماگئے۔ صرف حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ گرفتار ہوسکے اور چھ ماہ تک جیل میں قید و بند کی سختیاں برداشت کرتے رہے اس کے بعد عام معافی کے تحت رہا ہوئے۔ بقیہ حضرات سے بھی عام معافی کے بعد ارکانِ حکومت نے کوئی تعرض نہ کیا۔ قاضی عنایت علی خاں شکست خوردہ انگریزوں کی تلاش میں تحصیل جانسٹھ سے گذر کر ضلع بجنور پہنچ گئے دوران سفر میں ان کو بہت سے محبانِ وطن ملے اور اُن کی جمعیت میں شامل ہوتے گئے بعض اہل دول نے اُن کی مالی امداد بھی کی۔ انگریزی فوج ان کی تلاش میں تھی چنانچہ ضلع بجنور میں کئی مرتبہ انگریزی فوج سے مڈبھیڑ ہوئی اور ان میں کئی لڑائیوں میں قاضی صاحب کو کامیابی ہوئی ان کی طاقت روز بروز بڑھنے سے انگریز خائف تھے اور زیادہ سے زیادہ فوج ان کی گرفتاری کے لئے مامور کررہے تھے آخر نجیب آباد کے قریب (قصبہ کے نام میں اختلاف ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی دوسرا قصبہ ہو) انگریزوں کی ایک بڑی فوج سے جس کے پاس کافی توپیں تھیں مقابلہ ہوا۔ قاضی صاحب کی جمعیت تہائی کے قریب تھی اور توپیں تو سب سے ہی کم تھیں دس گھنٹے کے سخت مقابلہ میں انگریزی فوج کے قدم اکھڑنے لگے قاضی صاحب فنون حرب میں یکتائے روزگار تھے اور میدان جنگ میں دودستہ تلوار چلاتے تھے۔ اُن کے داہنے بازو پر ان کا بچپن کا ساتھی اور فدائی دوست چودھری ہنچل سنگھ رجپوت اور بائیں بازو پر ان کا جاں نثار غلام کلو لڑتا تھا۔ چودھری ہنچل سنگھ کو یک وقت نو گولیاں لگیں اور وہ "قاضی جی خدا حافظ" کہتے ہوئے گھوڑے سے نیچے آرہے قاضی صاحب فوراً اپنے گھوڑے سے کودے اور چودھری ہنچل سنگھ کو گود میں اُٹھاکر اپنے خیمہ میں لے آئے ذمہ داران فوج نے قاضی صاحب کو توجہ دلائی کہ یہ وقت میدان سے علٰحدہ رہنے کا نہیں ہے مگر اُن کو اپنے اس فدائی کا اس قدر غم ہوا کہ وہ تادیر خود پر قابو نہ پاسکے اور متوقع فتح شکست سے بدل گئی۔ قاضی صاحب معہ اپنے چند جاں نثار رفقاء کے لڑتے بھڑتے نکل بھاگے۔ ساتھی تتر بتر ہوگئے سامان

حرب پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔

قاضی عنایت علی خاں | قاضی صاحب تھانہ بھون کے با اختیار قاضی تھے۔ ان کا خاندان عہد شاہجہانی سے اسی عہدہ پر فائز تھا اور ان کو بائیس گاؤں جاگیر میں ملے ہوئے تھے۔ متبع شرع شریعت اور بڑے صادق القول تھے۔ فنون حرب اور شہسواری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ وجیہہ و شکیل تھے۔ اُس وقت عمر کا اندازہ تیس تیس سال بتایا جاتا ہے ضلع بجنور سے نکل کر دہ میرٹھ ہوتے ہوئے بند بلکھنڈ کے علاقہ میں پہونچے اور وہاں کے محبانِ وطن کو ساتھ لیکر انگریزی فوجوں پر حملے کرتے رہے۔ یہ زمانہ اُن کا ع "دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں" کا مصداق گذرا ہے ۱۸۵۹ء تک انگریز فوجوں نے بہت سے محبانِ وطن کو گرفتار کرلیا یا شہید کردیا۔ جب ان کو اپنے ہمنوا اور ہمخیال لوگ نہ مل سکے تو بالآخر انھوں نے جنگ سے دست کشی اختیار کرلی جو چند جاں نثار رہ گئے تھے ان کو رخصت کر کے خود اپنے اعزہ کے پاس بھوپال پہونچ گئے وہاں بالکل خاموش زندگی گذار رہے تھے کہ ایک دن شاہراہ پر ہرہائی نس قدسیہ بیگم فرمانروائے بھوپال کی سواری آتی نظر پڑی یہ بھی اپنے گھوڑے پر سوار تھے۔ مردم شناس بیگم نے ایک ہی نظر میں جوہر قابل کو پہچان لیا۔ مصاحب بھیجکر بلوایا۔ استفسار پر انھوں نے خود کو مسافر اور متلاشی روزگار ظاہر کیا۔ سواری ان کی شہسواری کو ظاہر کر رہی تھی۔ چند سوالات کے بعد بیگم صاحبہ نے معقول مشاہرے پر سواروں اور گھوڑوں کی تربیت واصلاح کے لئے اُن کو ملازم رکھ لیا اور ہفتہ میں دو دن ان کی ڈیوٹی مقرر کی۔ پُرانے ملازمین کو ان کی اِس قدر افزائی پر رشک و حسد ہوا اور وہ گاہ بگاہ بیگم صاحبہ سے ان کے خلاف شکایت کرنے لگے۔ بیگم صاحبہ نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ ریاست کی کسی سالانہ تقریب پر ملازمین ریاست میں سے ایک شہسوار کچھ خاص کرتب دکھاتا تھا اور اس کا آخری کرتب ایک باولی کے اوپر سے گھوڑا گذارنا تھا جس پر صرف

ایک بالشت چوڑا تختہ بچھا ہوا تھا۔ قاضی صاحب کے علم میں اس کا یہ کرتب آ چکا تھا جب وہ یہ آخری کرتب دکھانے کے لئے باؤلی کے ایک طرف سے روانہ ہوا تو قاضی صاحب نے مخالف سمت سے اُس تختہ پر اپنا گھوڑا بڑھایا۔ ریاستی شہسوار چلایا" یہ کیا کرتے ہو۔ دونوں باؤلی میں ڈوب مریں گے"! قاضی صاحب نے جواب دیا" ڈوب مرنے کی ضرورت نہیں۔ اُستادی کا دعویٰ ہے تو گھوڑا موڑ کر واپس ہو جاؤ ورنہ شاگردی کا اقرار کر کے ہنر پیش کرو"۔ اس شہسوار نے عاجزی کا اظہار کر کے شاگردی کا اقرار کیا۔ قاضی صاحب نے اپنے گھوڑے کو چمکار کر اس کی گردن پر تھپکی دی، باگ کے اشارے کے ساتھ ہی گھوڑا اپنی پچھلی ٹانگوں پر الف ہو کر مڑا اور پورا گھوم کر واپس ہو گیا۔ تماشائی عش عش کر اُٹھے۔ ریاستی شہسوار پار ہو کر گھوڑے سے کودا۔ رکاب بوس ہوا اور ہنر پیش کر کے شاگردی کا باضابطہ اعلان کیا۔ اُن کی یہ شہرت اور مقبولیت ہی اُن کے احوال کے تجسس کا ذریعہ بنی اور کچھ عرصہ کے بعد ان کو احساس ہوا کہ لوگ میرے متعلق مشکوک ہیں تو وہ بھوپال چھوڑ کر حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں بھی ان کی شہسواری اور سپہ گری نے ان کو پوشیدہ نہ رہنے دیا اور بعض عمائدین اُن پر شک کرنے لگے تو وہ ریاست الور میں قصبہ تجارہ کے قریب ایک موضع میں اپنے ایک شمشیر ساز دوست کے یہاں تشریف لے آئے اور دمِ واپسیں تک خاموشی سے وہیں مقیم رہے۔ غالباً ۱۹۰۱ئ؁ میں تراسی یا پچاسی سال کی عمر میں اس شیر بیشہ جرأت نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اسی گاؤں میں مدفون ہوئے۔ انتقال کے بعد اُن کے شمشیر ساز دوست کو پتہ چلا کہ مرحوم تھانہ بھون کے مشہور مجاہد قاضی عنایت علی خاں تھے۔ ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

قاضی صاحب کی اولاد میں سے دو لڑکے عرصہ تک میرٹھ میں مقیم رہے اب نہ اُن کے پہچاننے والوں میں سے کوئی صاحب رہے اور نہ اُن کا کسی کو پتہ ہے۔

غدر کے بعد تھانہ بھون کی حالت | انگریزی فوج کے آخری حملہ سے قصبہ بالکل ویران ہو گیا تھا۔ باشندگان قصبہ بعض قرب وجوار میں اور بعض دور دراز مقامات پر پناہ گزیں ہوئے اس وقت کے گئے ہوئے کچھ خاندان اب بھی حیدرآباد دکن، بھوپال، جودھ پور، الور اور دوسری ریاستوں میں موجود ہیں جن کی اولاد تھانہ بھون سے بالکل بیگانہ ہے جن انگریزی ملازمین نے تحریک آزادی میں حصہ نہ لیا تھا اُن کے گھر بھی حملہ آور فوج کی دستبرد سے نہ بچ سکے مجاہدین میں سے جن ملازمین کو معافی دیگئی ان کی ترقیاں محدود کردی گئیں۔ فوجی ملازمین کو بالادست جنگی خدمات سے ہٹا کر فوج کے دوسرے شعبوں میں لگا دیا گیا ان میں سے اور مجاہدین قصبہ میں سے اکثر پر بغاوت کے الزام میں مقدمات چلے اور بیشتر کو سزائے موت دی گئی۔ قاضی صاحب کے ملازمین اور متوسلین میں سے تو کوئی بھی نہ چھوڑا گیا۔ دیوان روپ سنگھ جو کالیستھ خاندان کے فرد تھے اور قاضی صاحب کے مختار عام تھے پھانسی دیدیئے گئے اور ان کی جائداد ضبط کرلی گئی اور مجاہدین قصبہ کی بارہ ہزار بیگھہ زمین ضبط کر کے محال باغیان بنادیا گیا۔ قاضی صاحب کے بائیس گاؤں جو ان کی مستقل اور نسلاً بعد نسلٍ جاگیر میں تھے ضبط کرلئے گئے۔ بڑے بڑے عالی شان مکانات اور کھیت کوڑیوں کے مول نیلام کردیئے گئے۔ قصبہ دو سال تک بالکل غیر آباد رہا فوج کی تاخت سے جو مکانات بچ رہے تھے وہ مناسب مرمت نہ ہونے کی وجہ سے منہدم ہو گئے۔ بعض مکانات کے کڑی تختے قرب وجوار کے بدمعاش اتار کر لے گئے۔ ملکہ وکٹوریہ کے اعلان معافیٔ عام کے بعد جب دوبارہ قصبہ آباد ہوا تو اس وقت تک ۱۳۲ شہدا کی نعشیں درختوں پر ٹنگی ہوئی تھیں جن کو مہاجنوں والی باغیچی میں انگریزوں نے پھانسیاں دی تھیں یہ دیکھ کر لوگ غرق حیرت ہو گئے کہ ان نعشوں کو نہ گدھوں نے کھایا تھا نہ اور کسی جانور نے چھوا تھا گوشت و پوست سوکھ کر رہ گئے تھے ۵

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

ایسا کوئی ریکارڈ دستیاب نہ ہو سکا جس سے تھانہ بھون کے شہدائے جنگِ آزادی کی صحیح تعداد معلوم ہو سکتی۔ بزرگوں کے بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً ایک ہزار افراد نے اس جنگ میں شہادت پائی وہ لوگ اس تعداد کے علاوہ ہیں جو نقل مکانی کی بدولت حادثات کا شکار ہوئے

تھانہ بھون سے انگریزوں کا عناد | انگریزوں پر باشندگان تھانہ بھون کی حریت پسندی کی ہیبت مدت تک طاری رہی۔ تھانہ بھون برٹش حکومت کی "بلیک لسٹ" میں برسوں تک رہا، عرصہ تک یہاں کے باشندوں کو سرکاری ملازمت نہ دی گئی۔ پولیس میں غدر کے برسوں بعد تک یہاں کا کوئی آدمی نہ لیا گیا اور فوج میں تو پہلی جنگ عظیم تک یہاں کا کوئی باشندہ نہ لیا جاتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں تھانہ بھون سے ایک پلٹن گذر رہی تھی اس کے انگریز کمانڈر کے دریافت کرنے پر لوگوں نے قصبہ کا نام بتایا تو وہ حیرت زدہ سا ہو کر بولا "اوہ تھانہ بھون ابھی تک آباد ہے" ۱۹۱۷ء میں مسٹر سی مور کلکٹر مظفر نگر بسلسلہ دورہ تھانہ بھون آئے تو انھوں نے قاضی احسان الحق صاحب سے دریافت کیا کہ "آپ کے اور قاضی عنایت علی خاں کے کیا تعلقات تھے؟" موصوف نے واسطہ داری بتائی تو سی مور بولے "وہ اب تک زندہ ہیں اور سنا ہے کبھی کبھی یہاں آتے ہیں" انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ سی مور نے سنا ہے تھانہ بھون دیکھنے کے بعد بایں الفاظ اپنی رائے کا اظہار کیا تھا:۔ "تھانہ بھون سے اب بھی بوئے بغاوت آتی ہے"

حکومت کی اس معاندانہ ذہنیت کا اثر قصبہ کی معاشیات پر بے حد بُرا پڑا دوبارہ آبادی پندرہ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جو اقتصادی حالات کی ابتری سے روز بروز کم ہوتی گئی اور گھٹتے گھٹتے ایک وقت تو صرف ساڑھے چھ ہزار رہ گئی تھی اس حریت پسندی کی بدولت برٹش دورِ حکومت میں اہالیانِ تھانہ بھون کے حقوق جس قدر پامال کئے گئے اس کی مثال دوسری جگہ ملنی مشکل ہے اتنا بڑا قصبہ ہونے کے باوجود حکومت نے یہاں مڈل اسکول تک قائم نہ کیا نہ کوئی شفاخانہ کھولا اور نہ کوئی دوسرا پبلک ادارہ۔ اس سے کمتر آبادی کے قصبات میں حالانکہ ایسے ادارے موجود ہیں۔

آخری تبرک ———— ضمیمہ ۲

حضرت حافظ صاحب شہیدؒ کا ذکر خیر

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز ۞ کاں سوختہ جاں شد و آواز نیامد

جنگِ اُحد میں ناموس ملت پر قربان ہونے والا دہ فداءِ اعظم جس کو لسان رسالت (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) نے سید الشہداء کا خطاب دیا تھا۔ یعنی سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ ان کو اگرچہ شہداء اُحد کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ مگر سردارِ دوجہاں محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ یہی تھا کہ جسد مبارک یونہی "میدانِ اُحد" میں پڑا رہتا۔ نہ جنازہ اٹھتا، نہ مزار بنتا۔ آپ نے فرمایا پھوپی صفیہ (حضرت حمزہ کی حقیقی بہن، (رضی اللہ عنہا) کا خیال آتا ہے کہ اُن کو رنج ہوگا اور یہ بھی کہ لوگ اسی کو سنت قرار دے لیں گے اگر یہ باتیں نہ ہوتیں تو حمزہ کی اس مظلوم نعش کو جس کے کان کاٹ لئے گئے ہیں۔ پیٹ چاک کر کے جگر نکال لیا گیا ہے اور اس کو دانتوں سے چبایا گیا ہے میں یونہی رہنے دیتا تاکہ میدانِ حشر میں احکم الحاکمین کے سامنے جسد حمزہ کے ٹکڑے وحشی درندوں اور پرندوں کے پیٹ سے برآمد ہوتے اور داستانِ مظلومیت سناتے۔[۱]

یعنی مظلومیت کی انتہا اور فدائیت وفنائیت کی معراج یہ ہے کہ اس دنیا ہست و بود میں "نشانِ ہست" بھی باقی نہ رہے۔

تھانہ بھون کے محاذ پر میدان شاملی میں قربان ہونے والے سیدنا حضرت حافظ ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ اسی کی ایک مثال ہیں۔

ساورکر، میلی سن وغیرہ غیر مسلم مورخین کو تو اُن کا نام بھی نہیں معلوم ہو سکا۔ شمس العلماء

۱؎ سیرۃ ابن ہشام جلد دوم ص۸۷ وطبقات ابن سعد قسم اول جزء ثالث ص۷

ذکاء اللہ خاں صاحب جیسے مصنفین کو نام معلوم ہوگا۔ مگر داستانِ شہادت تو کیا لکھتے' اشارہ کنایہ بھی کہیں نہیں کیا ضلع سہارنپور و مظفر نگر سے تعلق رکھنے والوں کا حلقہ نام نامی سے بھی واقف ہے اور آپ کی شہادت کا قصہ بھی اس کو ازبر ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس آخری سانحہ کے علاوہ باقی "سوانح حیات" سے ناواقف' یہ ماجرا کیا ہے - کیا یہ اسی شہیدِ وفا کے جذبۂ محویت کا کرشمہ تو نہیں ہے؟

ترا خیال ہے ۔ ترا جمال ہے ۔ تو ہے ✤ مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ ہوں کیا میں

اس شہیدِ عشق کی سوانح حیات کے دو قصے بزرگوں سے سنے ہیں۔ امیر الروایات اور ارواح ثلاثہ میں بھی انہیں کو قلمبند کر دیا گیا ہے ان دونوں سے بھی اگر کچھ معلوم ہوتا ہے تو یہی ذوقِ فنا جو درجہ جذب تک بڑھا ہوا ہے - ایک واقعہ یہ ہے -

آپ اپنے شیخ طریقت حضرت میانجی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ اُن کی جوتیاں[1] بغل میں لیکر اور توبرہ گردن میں ڈالکر جھنجانے جاتے۔ آپ کے صاحبزادے کی سسرال وہیں تھی۔ لوگوں نے کہا اس حالت میں جانا مناسب نہیں ہے' ہو سکتا ہے سمدھیانے کے لوگ حقیر سمجھ کر رشتہ توڑ دیں۔ حافظ صاحب نے فرمایا:-

رشتے کی پرواہ نہیں۔ لیکن میں جس طرح جھنجانے جاتا ہوں اُسے اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔ اپنی سعادت ہرگز نہ چھوڑوں گا -

عشق اول عشق آخر عشق کل ✤ عشق شاخ و عشق نخل و عشق گل

یہ بارگاہِ شیخ میں اپنی شخصیت کو مٹا دینے کی ایک مثال ہے جس کی اصطلاحی تعبیر "فنا فی الشیخ" ہوتی ہے اب دوسرا قصہ ملاحظہ فرمایئے۔ وہ تکمیل فنا کی ایک نادر مثال ہے یعنی جہاں تک "انانیت" کا تعلق ہے' اس کا گرد بھی آئینہ قلب پر باقی نہ رہے اور جادہ پیما طریقت اپنے آپ کو ہیچ در ہیچ

---

[1] دیہات و قصبات میں پیدل مسافت طے کرنے والے جوتیاں نکال لیتے ہیں اور برہنہ پا چلتے ہیں کہ اس طرح قدم ہلکا ہو کر تیزی سے اُٹھتا ہے۔

سے بھی کمتر سمجھنے لگے۔ دوسرا قصہ یہ ہے۔

آپ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے آستانہ پر چارپائی بچھائے بیٹھے رہتے۔ حقہ آپ کے سامنے رہتا۔ جب کوئی شخص آپ کے پاس آتا تو فرماتے۔ اگر مسئلہ پوچھنا ہے تو مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھو۔ مرید ہونا ہے تو وہ بیٹھے ہیں حاجی صاحب اُن کے پاس جاؤ۔ حقہ پینا ہے تو یاروں کے پاس بیٹھو۔

آج کی انانیت پرست تہذیب "نمود شخصیت" کو ذاتی ترقی کی بنیاد قرار دیتی ہے جس کا نتیجہ ہوتا ہے خود پرستی۔ اغراض پرستی۔ جاہ پرستی۔ پھر رشک وحسد۔ بخل وطمع۔ پھر باہمی رقابت۔ سیاسی کشمکش، جنگ وجدال۔ فتنہ وفساد۔

لیکن اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ نمود ختم کرو۔ للّٰہیت پیدا کرو۔ انانیت کا نام ونشان نہ رہے۔ جو کچھ رہے للّٰہیت رہے۔ اپنی چاہ۔ اپنی خواہش۔ اپنی پسند۔ سب کچھ فنا۔ صرف ایک چیز باقی۔ یعنی رضاء مولیٰ۔ پھر رضاء مولیٰ کی بقا بھی اس شان سے ہو کہ نمود اس کی بھی نہ ہو۔

از دروں شو آشنا واز بروں بیگانہ وش ٭ ایں چنیں زیبا روش کمتر بود اندر جہاں

حضرت حافظ صاحب انھیں کمتر اور نایاب بزرگوں میں سے تھے۔ جن کا باطن سوزاں و بریاں۔ اور ظاہر شاداں وخنداں۔

بلبل نیم کہ نعرہ زنم و درد سر کنم ٭ قمری نیم کہ طوق بگردن در آورم
پروانہ نیستم کہ بسوزم بگرد شمع ٭ شمعم کہ جاں گدازم ودم بر نیاورم

شاندار ماضی کی سابق جلدوں میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ جہاد جو نظر شریعت میں محمود اور مطلوب ہے وہی جہاد ہے جو نتیجہ ہو فنائیت کا۔

مطلب یہ ہے کہ کائنات عالم کے خلاق و پروردگار پر جس کا یقین واذعان اس درجہ پختہ

ہو گیا ہو اور ذوق خدا پرستی یہاں تک بڑھ گیا ہو کہ نماز اس کے لئے دل کا سکون اور آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائے اور رضاء مولیٰ کو پورا کہنے کی راہ میں جو بھی مصیبت آئے اس کو ہنسی خوشی برداشت کرنا (جسکو قرآن حکیم نے "صبر" سے تعبیر کیا ہے) فطری جوہر اور ایک لازوال قوت بن جائے تو قرآن حکیم اُن کو زندہ جاوید قرار دیتے ہوئے ہدایت کرتا ہے کہ اُن کو مُردہ کہنا بھی بے ادبی ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین ہ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاءٌ ولکن لا تشعرون ہ

اے ایمان والو، مدد حاصل کرو صبر و صلوٰۃ سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور مت کہو ان کو جو راہِ خدا میں قتل کر دیئے جائیں۔ مُردہ۔ بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا احساس نہیں ہوتا۔

واللہ اعلم بالصواب

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

خاتمہ کتاب۔

درس اصلاح۔ بُرائی کی نقل مت کرو۔ بھلائی کا سبق دو

قانون جنگ میں انسانیت نوازی اور اعتدال پسندی کی بہترین مثال

سیدنا و سید الشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ جو ضمیمہ ۲ کے آغاز میں پیش کیا گیا ہے اس وقت جبکہ یہ کتاب ختم ہو رہی ہے دل چاہتا ہے کہ اس روایت کا باقی حصہ بھی پیش کر دیا جائے کیونکہ وہ مردہ قوموں کے لئے نہیں بلکہ ترقی پذیر زندہ قوموں کے لئے انسانیت نوازی۔ شرافت اور اعتدال

پسندی کا زریں درس ہے اور اگر ۱۸۵۷ء کی اس ہیبت انگیز تحریک میں مسلمانوں نے اسلامی جہاد تصور کر کے
حصہ لیا تھا تو اس روایت سے قرآنی اصول جہاد کے پیش نظر شکست و ناکامی کا سبب بھی واضح ہو جاتا ہے
محمد بن جعفر بن الزبیر (رضی اللہ عنہم) کی روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ
عنہ کے اس مظلوم نعش کو دیکھ کر جس طرح اپنے اس جذبہ کا اظہار فرمایا کہ (اگر یہ موانع درپیش نہ ہوتے کہ
حضرت صفیہ کے رنج اور صدمہ میں اضافہ ہوگا اور یہ کہ مسلمان اسی کو سنت قرار دے لیں گے) تو میں
اس نعش کو یونہی چھوڑ دیتا۔ درندے اور پرندے اس کا گوشت نوچتے اور میدان قیامت میں جسد حمزہ کی
بوٹیاں درندوں کے پیٹ اور پرندوں کے پوٹوں سے برآمد ہوتیں۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا
اگر کسی بھی موقع پر اللہ تعالیٰ نے قریش پر غلبہ عطا فرمایا تو میں قریش کے تیس مقتولین کے اسی طرح ناک
کان کاٹوں گا (مثلہ کروں گا)
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صحابہ کرام نے یہ اندوہگیں اور غضب آلود کلمات سنے تو
آپس میں عہد کر لیا کہ جب بھی ہمیں کبھی کامیابی میسر آئیگی تو ہم ایسا عبرت انگیز مثلہ کرینگے کہ تاریخ عرب میں اس کی نظیر نہ ہوگی
اس دردناک اور توہین آمیز نظارہ کی بنا پر حاملین ملت کی زبانوں سے اس طرح جذبات کا اظہار ہو رہا تھا
لیکن وحی الٰہی جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین اور آپ کی اُمت کو اُمتِ وسط
اور نمونہ کی اُمت قرار دیا تھا۔ اس کے برخلاف نازل ہونے والی تھی۔ چنانچہ رموز شناس قرآن حضرت
ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کی روایت ہے کہ اسی واقعہ کے بعد سورہ نحل کی یہ آخری آیتیں نازل ہوئیں۔

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ○
وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۔ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ○
إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ (سورۂ نحل آخری آیات)

(یعنی بے گناہ عورتوں اور بچوں کے قتل جیسی انسانیت سوز حرکتوں کا تو سوال ہی نہیں۔ وہ تو
مسلمان کے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں نہ ابتداءً نہ انتقاماً۔ مُثلہ اور مُردوں کی توہین و

تذلیل جیسی حرکت کا اگر، بدلا دو تو بدلا دو اسی قدر جتنی تم کو تکلیف پہنچے (اگر زیادتی ہوئی تو خود آپ ظالم بن جائیں گے)، اگر تم صبر کرو تو یہ بہت ہی اچھا ہو صابرین کے لئے[۱] (پھر خاص طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہی) صبر کرو اور آپ کا صبر کرنا نہیں ہے مگر اللہ کی مدد سے (اللہ تعالےٰ نے ہی آپ کو صبر کی توفیق بخشی ہے) اور ان لوگوں کے حال پر (کہ ہائے یہ کیسے ظالم ہیں اور اپنا مستقبل خود اپنے ہاتھوں کس طرح برباد کر رہے ہیں) آپ غم نہ کھائیں اور نہ اُن کی مخالفانہ تدبیروں سے تنگ دل ہوں۔ یقیناً اللہ تعالےٰ انھیں کا ساتھی ہے جو متقی ہیں اور نیک عمل میں سرگرم رہتے ہیں (سورہ نحل کی آخری آیتیں)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ان ارشادات کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی اس حرکت کو معاف فرمادیا اور صحابہ کرام کو مثلہ کرنے سے منع فرمادیا۔ ابن سعد کی روایت میں یہ بھی ہے کہ مثلہ کرنے کی جو قسم کھائی تھی اس کا کفارہ ادا کر دیا۔

تسلیم و رضا اور تدارک

ایک طرف وہ جذبہ تھا۔ اب تسلیم و رضا کی شان ملاحظہ فرمایئے کس طرح سر تسلیم خم کیا جاتا ہے اور اُس وقت جذبہ میں جو الفاظ صادر ہو گئے تھے یہ بھی غور فرمایئے کہ ان کا تدارک کس طرح کیا جاتا ہے۔

حضرت سمُرہ بن جُندُب روایت فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد جہاں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ خطاب فرمانے کا موقع ملا۔ آپ اپنے خطاب اور تقریر میں دو باتوں کا ضرور التزام فرماتے تھے (۱) ہمیں صدقہ کا حکم فرماتے تھے (۲) مُثلہ کی ممانعت فرماتے تھے[۲] (کہ ہرگز ہرگز کسی مُردہ یا زندہ کے ناک کان نہ کاٹے جائیں)

اللہ تعالےٰ ہم سب کو اپنی اور اپنے رسول کی منشاء پر عمل کرنے اور راضی برضا رہنے کی توفیق بخشے (آمین) محمدؐ میاں

---

[۱] جن کو بشارت دی گئی ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے [۲] سیرۃ ابن ہشام جلد دوم ص۹۷

فہرست مضامین و مردان کار

مردانِ کار

اس اشاریہ میں اسمار کی ترتیب میں اصل ناموں کا عام طور پر اور غیر ملکی و دیگر بعض ناموں کے لئے القاب یا تخلص کا خیال رکھا گیا ہے اور الفاظ تعظیم یا خطابات نام سے پہلے لائے گئے ہیں۔
حضرت مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی کا اسم گرامی اصل نام کا خیال رکھتے ہوئے الف کی تختی میں آیا ہے
وقس علی ھذا۔

مرتبہ :-
(حافظ سید) خالد میاں

مصنّف کی چند دوسری تصانیف

علماء ہند کا شاندار ماضی

جلد اوّل: اس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ ان کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء اور ان کے معاصرین کے حالات، سیاسی کارنامے، سیاسی ماحول اور سلطنت مغلیہ کے چار مشہور سلاطین اکبر، جہانگیر شاہجہاں اور عالمگیر کے حالات، سیاسیات اور ان کے نظام حکومت کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے آٹھ آنے۔ آجکل نایاب ہے صاحب ذوق حضرات کو طبع جدید کا انتظار کرنا پڑیگا۔

جلد دوم۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سیاسی اور اقتصادی نظریات، ان کی تعلیم و تربیت کے مرکز، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی سیاسی خدمات اور آپ کا سیاسی فتوٰی، حضرت سید احمد صاحب شہید، حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور ان کے رفقاء کے مجاہدانہ کارنامے اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے نصف اول کا سیاسی ماحول، شاہانِ اودھ حافظ رحمت خاں شہید، روہیلے اور مرہٹے، مرہٹوں کی ریاستیں۔ لفظ وہابی کی ایجاد، وغیرہ وغیرہ بیشمار علمی اور تاریخی معلومات، عجیب و غریب انکشافات جو ہزاروں صفحات کے مطالعہ کے نتائج ہیں قیمت مجلد ۸/۳

جلد سوم۔ علماء صادق پور اور ان کے پُر اسرار مجاہدانہ کارنامے ایک عظیم الشان انقلابی تحریک جسکو ۱۸۵۷ء کا خونیں طوفان بھی ٹس سے مس نہ کرسکا جسکو ختم کرنے کے لئے انگریز کو بار بار فوج کشی کرنی پڑی۔ پھر مقدمات، سزائیں، سکھوں کی حکومت کا زوال وغیرہ وغیرہ عجیب و غریب کتاب ہے قیمت صرف دو روپے (عہ)